مجموعہ القاسم

Jamiatul Qasim Darul Uloom-il- Islamia, Supaul Bihar (INDIA)

قرآن کریم ۱ جلد اوّل

ترتیب

ناموس رسالت کے علمبردار، امین ملت

مفتی محفوظ الرحمن عثمانی

جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول بہار کا علمی، دینی، دعوتی، فکری اور اصلاحی ترجمان

ماہنامہ معارف قاسم جدید، دہلی

کی

تحقیقی، تاریخی اور دستاویزی پیش کش

مجموعہ القاسم

﴿قرآن کریم - ۱﴾

ترتیب

ناموس رسالت کے علمبردار امین ملت

بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

تقدیم

ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی

ناشر

جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، سپول، بہار

© جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : مجموعہ القاسم (قرآن کریم-۱)

ترتیب : ناموس رسالت کے علمبردار امین ملت بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

تقدیم : ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی

صفحات : ۵۹۵

اشاعت : ۲۰۱۸ء

تعداد : ۲۵۰۰

ناشر : جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، سپول، بہار، الہند

﴿ملنے کے پتے﴾

- امام قاسم اسلامک ایجوکیشنل ویلفیئر ٹرسٹ انڈیا
K-79, 2nd Floor, Street No.5, Abul Fazal Enclave, Part-I
Jamia Nagar, New Delhi-110025 (India)
Ph: +91-11-26981876, 26982907, **Mob.:** +91-9811125434
9899766786, 9931906068, 9931515312, 9708056420
- حرا انٹرنیشنل اکیڈمی، فاربس گنج، ارریہ بہار، الہند
- خدمت خلق ٹرسٹ انڈیا، ہرپور بیشی، اورائی، مظفر پور بہار، الہند۔ موبائل: 9891763977

انتساب

استاذ الکل مولانا مملوک علی النانوتوی، حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند، مجاہد فی سبیل مولانا محمد مظہر النانوتوی بانی مظاہر علوم سہارنپور، امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الحدیث اوّل مولانا محمد یعقوب نانوتوی، امیر لشکر میدان شاملی مولانا محمد منیر نانوتوی، کتب فقہ اسلامی کے مصنف مولانا محمد احسن نانوتوی اور مصلح قوم سرسید احمد خان بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام منسوب کرتا ہوں۔ جن کے جلائے ہوئے چراغ کی لَو سے آج پوری دنیا ڈیڑھ صدی سے روشن ہے، اور جن کے اخلاص کا تاج محل، کتاب وسنت، فقہ اسلامی کی ترویج کے علاوہ اسلامی تحریک، ناموس تحفظ ختم نبوت، مدارس ومساجد اور انسانی خدمات کا وہ روشن باب جن کا شمار ہمیشہ قدر ومنزلت کی نگاہ سے تاریخ داں لکھے گا انشاء اللہ۔ یقیناً یہ کارہائے نمایاں ہمیشہ انجام پاتے رہیں گے اور آئندہ بھی مورخ اِن کارناموں کو سنہری حروف میں لکھتا رہے گا۔

بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

رونق بزم

نمبر شمار	عناوین	اہل قلم	صفحہ
۱	حرف معتبر	مولانا محمد سالم قاسمی	۸
۲	مقدمہ	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۹
۳	کلمۂ تہنیت	مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی	۱۱
۴	پیغام	مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری	۱۴
۵	سخن اوّلیں: آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا	مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی	۱۵
	مقالات و مضامین		۲۵
۶	قرآن کریم کا اعجاز	مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی	۲۷
۷	قرآن مقدس، ملعون رشدی اور ذمہ داریاں	ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی	۴۶
۸	قرآن مجید کے تعلق سے چند کوتاہیاں	مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ	۵۴
۹	ہدایت کی دو بنیادیں: قرآن اور شخصیت	مولانا قاری محمد طیبؒ	۸۴
۱۰	عصر حاضر کے چند اہم تقاضے	مولانا محمد سالم قاسمی	۹۲
۱۱	تدوین قرآن کی تاریخ: آغاز وحی اور ...	ڈاکٹر حمید اللہؒ	۹۷
۱۲	ماحولیاتی آلودگی کے مسائل کا حل ...	پروفیسر اختر الواسع	۱۰۴

۱۳	برمحل گفتگو کا قرآنی اعجاز	نسیم اختر شاہ قیصر	۱۲۰
۱۴	قرآن کریم کا عالمگیر تصور اخوت	مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی	۱۲۵
۱۵	قرآن کریم اور رمضان المبارک	ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی	۱۳۸
۱۶	فضلائے مدارسِ عربیہ میں قرآن فہمی کا ذوق	ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ	۱۴۵
۱۷	قرآن کریم اور اس کی تفاسیر	مولانا محمد اسلام قاسمی	۱۷۰
۱۸	ہدایت ربانی اور قرآن مجید	مولانا انیس الرحمان قاسمی	۱۷۸
۱۹	قرآن اللہ کا ازلی، ابدی اور غیر فانی پیغام	مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی	۱۸۸
۲۰	قرآن اور امن عالم	مولانا وحید الدین خاں	۱۹۳
۲۱	قرآن کریم پر مستشرقین کے اعتراضات	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۱۹۸
۲۲	قرآن کریم کی انقلاب آفریں تاثیر	مولانا شاہد عادل قاسمی	۲۰۶
۲۳	قرآن کریم اور تخلیقات عالم: ایک مطالعہ	پروفیسر شفیق احمد خان ندوی	۲۱۴
۲۴	'الغرانیق العلیٰ'۔ حقیقت یا افسانہ	ڈاکٹر مفتی محمد شمیم اختر قاسمی	۲۲۰
۲۵	قرآن کریم کا تصور عدل اور معاشرتی ...	پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	۲۴۳
۲۶	قرآن کریم اللہ کا کلام ہے (چند دلائل)	پروفیسر رضاء اللہ خاں	۲۵۳
۲۷	قرآن کا تصور جہاد	شارق الاسلام	۲۵۸
۲۸	نباتات قرآنی ''المن'' (ایک تحقیقی جائزہ)	ڈاکٹر منور حسن کمال	۲۶۴
۲۹	قرأت قرآن کریم کا ایک محقق و مجدد	ڈاکٹر تابش مہدی	۲۷۰
۳۰	قرآن پاک کا تاریخی اعجاز اور اس کی سحر انگیزیاں	مولانا سیف الاسلام قاسمی	۲۷۶
۳۱	''قرآن کریم'' کتاب انقلاب	مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی	۲۸۲
۳۲	''قرآن کریم''، عظیم ترین سرچشمہ قانون و ...	مولانا سید عقیل الغروی	۲۹۰

۳۳	ترجمہ معانی قرآن مجید (مشکلات ومسائل)	مولانا محمد فاروق خاں	۲۹۵
۳۴	قرآن کریم میں غیر عربی اصل الفاظ	ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی	۳۰۵
۳۵	حفظ قرآن مجید (نصاب اور طریقۂ کار)	مولانا اسعد اعظمی	۳۱۲
۳۶	قرآن کریم اور سائنسی علوم	ایس ایم شریف قریشی	۳۳۲
۳۷	قرآن اور سائنس	ڈاکٹر رضی احمد کمال	۳۴۲
۳۸	تفسیر بالماثور کی نمائندہ کتابوں کا طریقۂ تدریس	مولانا محمد ارشد مدنی	۳۴۹
۳۹	قرآن کریم اور نظام معیشت	مولانا عبداللہ ابن القمر الحسینی	۳۶۶
۴۰	قرآن کریم اور عقیدۂ آخرت	مولانا قمر عثمانی	۳۷۲
۴۱	القرطبی کی الجامع الأحکام القرآن	ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی	۳۷۷
۴۲	قرآن کی تدریس میں سائنسی تحقیقات سے استفادہ	مولانا محمد مظہر الاعظمی	۳۹۳
۴۳	قرآن کریم اور نظام زکوٰۃ	مولانا رضوان الحق قاسمی	۴۱۵
۴۴	سنن ترمذی میں ابواب فضائل القرآن	مولانا عبداللہ مدنی جھنڈانگری	۴۲۳
۴۵	قرآن کریم علم وحکمت کا خزانہ	اشرف فردوسی ندوی	۴۳۷
۴۶	عظمت قرآن اور اس کے تقاضے	مولانا ارشد سراج الدین مکی	۴۴۱
۴۷	نزول قرآن کا مقصد اور انسانی دنیا پر اس ...	مولانا محمد عظمت اللہ ندوی	۴۴۷
۴۸	القرآن الکریم-ایک معجزہ	مولانا محمد احترام الحسن کاندھلوی	۴۵۲
۴۹	قرآن کریم کی تفاسیر (ایک جائزہ)	ڈاکٹر سید شاہد علی	۴۵۶
۵۰	علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے دینیات فیکلٹی کی قرآنی خدمات	ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی	۴۷۲
۵۱	متوازن اقتصادی نظام کے قرآنی اصول	محمد ارتضاء الحسن رضی قاسمی کاندھلوی	۴۸۳
۵۲	قرآن کریم: ایک زندۂ جاوید معجزہ	محمد ارتقاء الحسن رضی قاسمی	۴۸۸

۵۳	قرآن کریم اور آسمانی صحیفے	اجمل فاروق ندوی	۴۹۳
۵۴	اشاعت قرآن مجید کی تجارت عظیم دینی خدمت	فاروق ارگلی	۴۹۹
۵۵	عورت، قرآن کی نظر میں	ڈاکٹر ثمینہ تابش	۵۰۶
۵۶	عورت، بائبل اور قرآن میں	ڈاکٹر حنا باری	۵۱۲
۵۷	قرآن اور برگزیدہ خواتین	بیگم خورشید انور ادیب	۵۱۶
۵۸	برصغیر میں قرآن کریم کے خطاط	مولانا طارق بن ثاقب	۵۲۳
۵۹	قرآنی پیشین گوئیاں اور واقعات عالم	مولانا عبدالحمید نعمانی	۵۳۵
۶۰	قرآن کریم ایک ناقابل تحریف کتاب	محمد صابر طیبی اعظمی	۵۴۳
۶۱	قرآن کریم دعا بھی دوا بھی	ذکیہ کوثر	۵۴۶
۶۲	قرآن عظیم — ایک تعارف	ساحل احمد	۵۵۱
۶۳	آیات ورکوع		۵۵۴
۶۴	نقشہ تعداد حروف تہجی		۵۶۸

☆☆☆

حرفِ معتبر

● متکلم اسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی دامت الطافکم
جانشین حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ مہتمم دارالعلوم، دیوبند

محترم مولانا محفوظ الرحمٰن عثمانی بحمداللہ اہل قلم میں ہیں کہ جو وقت کے تقاضوں کو پہچان کر قلم اٹھاتے ہیں، اور وہ چیز ملت کے سامنے پیش کرتے ہیں جس کا وقت مطالبہ کرتا ہوتا ہے۔ یہ محض تخیل نہیں بلکہ اس پر شواہد موصوف کی وہ تصنیفات ہیں کہ ملت کے اہل نظر میں قبولیت عامہ حاصل کر چکی ہیں اور وقت کے پیدا کردہ مسائل میں ملت کی کما حقہ رہنمائی کر چکی ہیں۔

موصوف کا یہ طرز خدمت بحمداللہ ملت میں بڑی حد تک قبولیت عامہ حاصل کر چکا ہے، یعنی موصوف کی ہر کتاب رہنمائی کا وہ فریضہ انجام دیتی ہے کہ جو عوام ملت کو بڑی حد تک پیش آمدہ موضوع پر مزید تجسس وتلاش سے مستغنی کر دیتی ہے۔

حق تعالیٰ موصوف کے علم وقلم کی قبولیت وافادیت میں مزید برکت وافادیت ارزانی فرمائے اور ملت کو اس سے زیادہ سے زیادہ مستفید فرمائے۔ موصوف کی مصنفات کے یہ نام ''اسلام اور امن وآشتی''، ''مجموعۃ القاسم'' اور ''متاع زندگی'' اور ''خوشبوؤں کا سفر'' وہ تصنیفات ہیں کہ جو ملت میں اپنا مقام بنا چکی ہیں۔

حق تعالیٰ ان کے فیضان میں برکت وترقی مزید عطا فرمائے، آمین۔

۱۱؍فروری ۲۰۱۶ء

مقدمہ

● جانشین مفکر اسلام حضرت اقدس مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

الحمد للہ و کفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی اما بعد.

اجتماعی زندگی کی صالح اور بااخلاق تشکیل وتنظیم وہ عمل ہے جس کے ذریعہ کوئی انسانی معاشرہ جنگل کے معاشرہ سے برتر اور بہتر بنتا ہے، اور اس سلسلہ میں غفلت کرنے سے جنگل کے معاشرہ سے قریب تر ہو جاتا ہے، اس لئے ذی علم وحساس افراد کو اپنے معاشرہ کی بہتری کے لئے اسلامی تعلیمات کے مستند ذخیرہ میں سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر خاصا مواد ملتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم وتربیت کا کوئی اہم پہلو نہیں چھوڑا ہے سب کے لئے واضح ہدایات دی ہیں، اور اس طرح انسانوں کی سماجی زندگی کو ستھرا اور شائستہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ آپؐ کی یہ کوشش صرف فکر وہدایات کے دائرہ تک محدود نہیں رہی بلکہ انسانوں کے جس معاشرہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو براہ راست واسطہ پڑا، آپؐ نے اس کی عملاً تربیت فرمائی اور یہ تربیت بے مثال ثابت ہوئی، پوری انسانی تاریخ میں اس معاشرہ سے اچھا معاشرہ آج تک قائم نہیں ہو سکا اور آئندہ بھی اس کی توقع نہیں یہ وہ معاشرہ ہے کہ کم از کم مسلم معاشروں پر اس کی نقل کرنے کی کوشش کرنا رہتی دنیا تک فرض ہے، بلکہ یہ معاشرہ تمام انسانی معاشروں کے لئے بھی بہترین اسوہ اور معیار ہے، غیر مسلم معاشرے

بھی اگر اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں تو اس کے مفید نتائج کا وہ بھی تجربہ کر سکتے ہیں۔

سیرت کے ان پہلوؤں پر ماہنامہ ''معارف قاسم'' کے چھ ۶ ضخیم جلدوں پر مشتمل قرآن کریم، سیرت محسن انسانیت ﷺ، تحفظ ناموس رسالت ﷺ، مسلم پرسنل لاء، مسلم مسائل اور ان کا حل اور انسانیت کے مضامین کا مجموعہ القاسم مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن صاحب عثمانی زید توفیقہ بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول بہار شائع کر رہے ہیں۔ اس کی قبولیت اور نافعیت کے لئے ہم دعا گو ہیں، اور ان کو اس پر مبارکباد بھی پیش کرتے ہیں، اور امید کرتے ہیں کہ اس کے اچھے اثرات انشاء اللہ ظاہر ہوں، **وما ذلک علی العزیز.**

۱۳ ربیع الثانی ۱۴۳۹ھ مطابق یکم جنوری ۲۰۱۸ء

☆☆

کلمۂ تہنیت

● عالم ربانی حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی مدظلہ العالی
مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء وامام المرسلين والمتقين محمد وعلى آله وصحبه أجمعين، أما بعد:

ضلع سپول مشرقی بہار کا ایک ایسا علاقہ ہے، جو کسی بڑے تعلیمی مرکز سے کسی حد تک محروم تھا، اسی بنا پر اس علاقے میں دینی علوم کا ایک قابل اعتماد ادارہ قائم کرنے کا عزم یہاں کے عالم ومفتی اور داعی الی اللہ حضرت مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی صاحب نے آج سے ۲۸ رسال قبل ایک بڑے تعلیمی اور دعوتی ادارے کا سنگ بنیاد رکھ کر کیا، جو جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ کے نام سے مشرقی بہار کے دور افتادہ گاؤں مدھوبنی ضلع سپول میں متعارف ہوا، اور اس کی نسبت قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (رحمہ اللہ تعالیٰ) کے نام نامی سے قائم ہوئی، اور اس عظیم علمی خاندان کے فرزندان کرام میں حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی (دامت برکاتہم) جانشیں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ تعالیٰ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی سرپرستی میں اس کے جملہ پروگرام مرتب کرنے کے لئے مستقل مشورے کی روشنی ملتی رہی، اس تعلق اور اخلاص کے نتیجے میں جامعۃ القاسم صحیح معنوں میں حجۃ الاسلام الامام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی نسبت کا فیض حاصل کر کے فکر نانوتوی کا علم بردار ادارہ قرار پایا۔

اب اس ادارہ کا ۲۸ رسالہ جشن تعلیمی بفضلہٖ تعالی ۲۸۔۲۹۔۳۰ جمادی الأ ولی ۱۴۳۹ھ مطابق ۱۴۔۱۵۔۱۶ رفروری ۲۰۱۸ء ایک بڑے تعلیمی دعوتی اور فکری پروگرام کے ماتحت منعقد ہو رہا ہے، اس موقع پر کئی اہم ترین اور بنیادی امور انجام پذیر ہوں گے، مسابقہ القرآن الکریم، تعمیر ملت کنونشن کا انعقاد، اور عظیم جامع مسجد کا افتتاح جو امام نانوتوی کی نسبت سے جامع الامام محمد قاسم نانوتوی کے اسم گرامی سے منسوب ہے، اور ''القاسم اسلامک یونیورسٹی'' کا سنگ بنیاد، یہ سارے بنیادی پروگرام اس جشن تعلیمی کی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسی کے ساتھ حضرت مفتی عثمانی صاحب کی اہم تصنیفات کا اجراء بھی عمل میں آئے گا، ان کتابوں میں ایک اہم ترین کتاب ''مجموعۃ القاسم'' بھی ہے، جو مندرجہ ذیل عناوین کے ساتھ ۶ رضخیم جلدوں پر مشتمل ہے:

(۱) قرآن کریم (۲) سیرت محسن انسانیت ﷺ (۳) تحفظ ناموس رسالت ﷺ (۴) مسلم پرسنل لا کا تحفظ (۵) مسلم مسائل اور ان کا حل (۶) تیری عظمتوں کو سلام، اسی آخری جلد میں برما کے دلخراش مظالم اور حکیم الاسلام حضرت اقدس مولانا قاری محمد طیب صاحب (رحمہ اللہ) سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کے سفرنامۂ برما اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (رحمہ اللہ) سابق ناظم ندوۃ العلماء وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی پیام انسانیت کے پیغام کو عوام الناس تک پہونچانے کے لئے ماہنامہ ''معارف قاسم'' کے ''پیام انسانیت نمبر'' کے علاوہ حالیہ برسوں میں رحلت فرمانے والے ہندوستان کے مشہور ومعروف جید علمائے کرام کی حیات وخدمات پر خصوصی گوشے شامل ہوں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ مفتی صاحب کی یہ مخلصانہ کوششیں بارآور ہوں گی، اور ان کا نفع عام ہوگا، خاص طور سے اس جشن تعلیمی کے موقع پر عوام وخواص ہر طبقے کے لئے یہ کتاب ایک

عظیم علمی اور تاریخی تحفہ ثابت ہوں گی، اور اس کی نافعیت اور اس کے دوررس اثرات دعوت وتعلیم کے میدان میں نمایاں طور پر ظاہر ہوں گے۔

میں دل کی گہرائیوں سے حضرت مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن صاحب عثمانی کی ان مخلصانہ جدوجہد کو محض توفیق الٰہی کا ایک باب تصور کرتا ہوں، اور یقین رکھتا ہوں کہ ان کی ذات سے عالم انسانیت کے ایک وسیع حلقے میں دین اسلام کی معنویت اور اسلامی شریعت کی عظمت، اس کے خلود ودوام کا مخلصانہ پیغام برابر پہونچتا رہے گا، اور جشن تعلیمی میں اس کتاب کا اجراء ایک تاریخی دستاویز کے مرادف ہوگا، اللہ تعالی اس دعوتی اور علمی مخلصانہ عمل کو قبولیت سے سرفراز فرمائیں اور میزان عمل میں اس کو زیادہ سے زیادہ باوزن بنائیں اور آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہو۔ **ربنا آتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة، وقنا عذاب النار.**

۱۱ ربیع الثانی ۱۴۳۹ھ مطابق ۳۰ ردسمبر ۲۰۱۷ء

☆☆

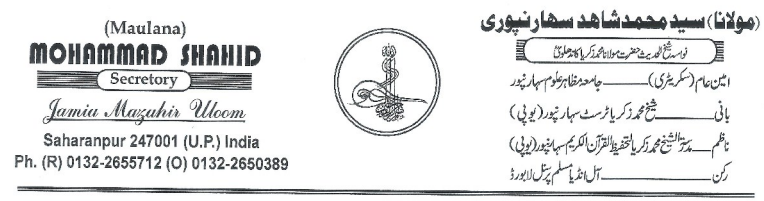

(مولانا) سید محمد شاہد سہارنپوری
نواسہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ
امین عام (سکریٹری)۔۔۔۔۔۔ جامعہ مظاہر علوم سہارنپور
بانی۔۔۔۔۔۔ شیخ محمد زکریا ٹرسٹ سہارنپور (یوپی)
ناظم۔۔۔۔۔۔ مدرسۃ الشیخ محمد زکریا لتحفیظ القرآن الکریم سہارنپور (یوپی)
رکن۔۔۔۔۔۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

(Maulana)
MOHAMMAD SHAHID
Secretory
Jamia Mazuhir Uloom
Saharanpur 247001 (U.P.) India
Ph. (R) 0132-2655712 (O) 0132-2650389

تاریخ.................. حوالہ..................

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ

ارشاد ربانی ہے ھو الذی بعث فی الامیین رسولاً منھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ

خلاصہ اس آیت شریفہ کا یہ ہے کہ جناب نبی پاک ﷺ کو دنیا میں تین اہم کاموں کے لئے بھیجا گیا ہے، جن میں ایک یتلوا علیھم آیاتہ ہے دوسرا ویزکیھم اور تیسرا اہم مقصد ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ہے۔

قابل صد رشک اور لائق صد تہنیت و تبریک ہیں وہ اشخاص اور ادارے جو ان تینوں مقاصد بعثت کو پوری ذمہ داری اور نیک نامی کے ساتھ اپنا فرض منصبی سمجھ کر پورا کر رہے ہیں اور اس فریضہ کی ادائیگی میں اپنی بھوک پیاس، رات اور دن کی راحت و آرام سفر کی مشکلات اور حضر کی مصروفیات کو نہ خاطر میں لاتے ہیں اور نہ ہی آنکھ اٹھا کر ان چیزوں کی طرف دیکھتے ہیں۔

میرے لئے قابل صد احترام حضرت مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی زید مجدہ بھی انہیں خاصان خدا اور مجاہدین فی سبیل اللہ میں شامل ہیں جو ان تینوں نبوی بعثت کے مقاصد کو پورا کرنے میں اپنی زندگی کو داؤ پر لگائے ہوئے ہیں اور سفر ہو یا حضر، یسر ہو یا عسر، درس و تدریس تزکیہ نفوس اور حکمت و بصیرت کی تعلیم اور اس کی نشر و اشاعت میں نہ صرف مسلسل مشغول اور منہمک رہتے ہیں بلکہ مثال خورشید بن کر کبھی اس ملک میں کبھی اُس ملک میں اور کبھی اِس اقلیم میں اور کبھی اُس اقلیم میں مسلسل دوڑتے رہتے ہیں۔

مجھے یہ معلوم ہو کر بے انتہا مسرت و خوشی ہے کہ مورخہ ۲۸/۲۹/۳۰ رجمادی الاولیٰ ۱۴۳۹ھ/۱۴/۱۵/۱۶ فروری ۲۰۱۸ء کی انتہائی مبارک اور زریں تاریخ میں متعدد پروگراموں کے ساتھ ساتھ حضرت مفتی صاحب موصوف کا چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ایک وقیع مجموعہ "القاسم" کی رونمائی بھی ہو رہی ہے۔ اس کے علاوہ مفتی صاحب موصوف کے سولہ سال کے طویل عرصہ میں لکھے اور پڑھے جانے والے رشحات قلم بھی رشحات عثمانی کے نام سے منظر عام پر آ رہے ہیں۔

اللہ جل شانہ ان تمام خدمات علمیہ، دینیہ کو قبول فرمائے، مثمر ثمرات و برکات فرمائے اور خلق عظیم کو ان سے نفع پہنچا کر ان میں دینی تصلب اور مذہبی پختگی پیدا فرمائے تا کہ آنے والی نسلوں کے دل و دماغ اسلامی تعلیمات کی روشنی سے جگمگاتے رہیں اور ان کے دلوں کی ایمانی حرارت قائم رہے۔

بندہ محمد شاہد غفرلہ
امین عام جامعہ مظاہر علوم سہارنپور
۲۲ ربیع الثانی ۱۴۳۹ھ/۱۰ جنوری ۲۰۱۸ء

سخن اوّلیں

آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

مجموعہ القاسم کی ترتیب واشاعت کی خواہش ایک عرصہ سے دل میں موجزن تھی۔ جس دن سے یہ خیال ذہن میں آیا، بس اسی دن سے اس کی تکمیل کی فکر ستانے لگی، لیکن یہ سوچ کر کلیجہ منہ کو آنے لگتا کہ اتنے منتشر کام کو یکجا کس طرح سے کیا جا سکے گا۔ جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول بہار کی ذمہ داریاں، مسلسل اسفار اور طبیعت کی ناسازی کے ساتھ دوسرے فرائض نے اس طرح سے اپنا شکنجہ کس رکھا ہے کہ یہ پہاڑ سا کام ناممکن سا لگ رہا تھا، مگر یہ سوچ کر کہ دنیا میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو اپنے ارادوں کو متزلزل نہیں ہونے دیتے، منزل کے حصول میں آنے والی رکاوٹوں کا جم کر مقابلہ کرتے ہیں اور اپنے خوابوں کو ادھورا نہیں رہنے دیتے۔ دنیا کی بیشتر اہم شخصیات نے دل جمعی اور ثابت قدمی سے راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو عبور کیا اور منزل کی جانب بڑھتے چلے گئے۔ ارادے کو انجام تک پہنچانے کیلئے میری خواہش بھی تڑپ کی شکل اختیار کرتی گئی۔ جان بوجھ کر اپنے کرم فرما، اساتذہ اور مخلص دوست واحباب کی محفل میں اس کا ذکر چھیڑ دیتا کہ شاید ان کے مشوروں سے کوئی نئی راہ نکل سکے۔ اچھی بات یہ تھی کہ جن کے سامنے بھی اپنے اس مدعا کو رکھا انہوں نے حوصلہ افزائی کی، دعائیں دیں، لیکن کام کی نوعیت ایسی تھی کہ مسلسل تاخیر ہوتی رہی۔

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا

اس درمیان ملت اسلامیہ کی عظیم ہستیاں مخدوم گرامی قدر متکلم اسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ العالی، مدبر اسلام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی، عالم ربانی حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی مدظلہ العالی، شیخ ذکریا کے علوم و معارف کے ترجمان حضرت مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری مدظلہ العالی، خادم القرآن والمساجد حضرت مولانا غلام محمد وستانوی مدظلہ العالی، حضرت مولانا حکیم محمد عثمان قاسمی مدنی مسجد نبوی شریف، ماہر تعلیم، معروف اسلامک اسکالر پروفیسر اختر الواسع جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، ڈاکٹر مفتی زاہد علی خان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی وغیرہم کی مجالس میں بھی موقعہ کو غنیمت جان کر اس کا ذکر کیا تو ان بزرگوں نے نہ صرف دلی مسرت کا اظہار فرمایا، بلکہ اپنے نیک خواہشات پیش کئے اور کام کی نوعیت وضرورت کے پیش نظر مجموعہ القاسم کی جلد اشاعت کا بھی حکم دیا۔

اس وقت یہ حضرات اکابر نہ صرف میرے لئے بلکہ پوری ملت کے عظیم سرمایہ ہیں۔ ان کے حکم نے فکر کو عملی شکل میں تبدیل کرنے کی سبیل نکال دی، ہمت بڑھی تو راستے بھی بنتے گئے۔ کبھی کبھی عزم وحوصلے کی کمزوری کے سبب چھوٹی چھوٹی رکاوٹیں بھی بہت بڑی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ ایسی صورت میں چشم تصور سے خود کو اس منزل کا حامل دیکھنا اور کامیابی کے ذائقے کو محسوس کرنا کافی تقویت دیتا ہے۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جو پھر سے آگے بڑھنے کی لگن پیدا کرتا ہے، پھر ہم محنت، لگن اور جوش وجذبے سے اپنے مقصد حیات کو پانے کی سعی کرتے ہیں اور بالآخر اس میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

وقت کی قدر اور اس کا صحیح استعمال:

آپ اسے المیہ کہیے یا حالات کی ستم ظریفی کہ موجودہ زمانے میں وقت کی قدر کرنی ہم نے بالکل چھوڑ دی ہے، جبکہ ہمارے اکابر پوری زندگی اپنی عمر کے ایک ایک لمحے کی حفاظت کرتے تھے، کام میں لاتے تھے جس کے باعث انہوں نے دینی، دعوتی، علمی اور تحقیقی میدان

میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جس کی مثال پیش کرنے سے آج دنیا قاصر ہے۔ دنیا میں جتنے کامیاب لوگ گزرے ہیں ان کی ترقی کا اہم راز وقت کی قدر اور اس کا صحیح استعمال ہے۔ صوفیائے کرام کے یہاں ایک اصطلاح ہے 'نظام الاوقات' اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ زندگی کے کسی لمحہ کو ضائع نہ کیا جائے اور ہر لمحہ کو بہتر سے بہتر کام میں صرف کیا جائے۔

نحو وعروض کے امام، خلیل ابن احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے:

مجھ پر وہ گھڑیاں سب سے زیادہ بوجھ ہوتی ہیں جن میں، میں کھانا کھاتا ہوں' مفسر کبیر امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ امت کو دوسو کتابوں کا ذخیرہ دینے کے باوجود فرماتے تھے: خدا کی قسم! کھانا کھاتے وقت علم میں اشتغال کی محرومی سے مجھے بہت افسوس ہوتا ہے۔

جن حضرات نے وقت کی قدر کی اور اپنے آپ کو لغویات سے بچایا، انہوں نے اپنی آخرت کے لیے بھی بہت کچھ کیا اور پیچھے امت کے لیے بھی بہت کچھ چھوڑا، ان کے زندہ وجاوید کارناموں کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ انہوں نے کس کمال احتیاط کے ساتھ وقت کا استعمال کیا ہوگا۔ شیخ یحییٰ ابن معین رحمۃ اللہ علیہ بڑے محدث گزرے ہیں، انہوں نے اپنی زندگی میں اپنے ہاتھوں سے دس لاکھ حدیثیں لکھیں۔ علامہ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے دینی علوم کے تین لاکھ اٹھاون ہزار (358000) صفحات تحریر میں آئے۔ مسلم شریف کے شارح اور ریاض الصالحین کے مولف علامہ یحییٰ بن شرف النووی رحمۃ اللہ نے صرف 45 سال کی عمر پائی، لیکن ان کی تصنیفات کا جب حساب لگایا گیا تو روزانہ چار کاپیاں لکھنے کا حساب نکلا۔ علامہ سید محمود آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ، تفسیر روح المعانی کے مصنف پورے دن میں چوبیس اسباق پڑھاتے تھے اور تفسیر وافتاء میں مشغولیت کے زمانے میں تیرہ اسباق پڑھاتے اور رات کو جب فراغت ہوتی تو تفسیر لکھتے اور دوسرے دن لکھنے کے لیے کاتبوں کے حوالے کرتے۔ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ رات کو اتنا لکھ لیتے کہ کئی کاتب مل کر دس گھنٹے میں اسے پورا کر پاتے۔ علامہ ابن القیم الجوزی

رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق ان کے غسل کے لیے پانی گرم کرنے کے لیے صرف وہ برادہ اور چورا استعمال کیا گیا جو احادیث لکھنے کے لیے قلم تراشنے میں جمع ہوا تھا۔ پانی گرم ہونے کے بعد اس میں بچ بھی گیا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صرف اور صرف احادیث کے لکھنے میں اتنا برادہ جمع ہوا تو باقی علوم کے ساتھ کتنا ہوا ہوگا!

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اے انسان! تو ایام ہی تو ہے، جب ایک دن ختم ہو جائے تو تیرا ایک حصہ ختم ہو جاتا ہے۔ جو دن گزر گیا وہ واپس نہیں آتا، ہر روز طلوع آفتاب کے وقت دن یہ اعلان کرتا ہے: ''جو شخص بھلائی کرنے کی قدرت رکھتا ہے تو کرلے، اس لیے کہ میں کبھی بھی دوبارہ لوٹ کر آنے والا نہیں ہوں''

حضرات اکابر کا معمول:

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے بارے میں حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفیؒ ارشاد فرماتے ہیں: حضرت کی نظر میں وقت کی بڑی قدر تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے وقت کی اہمیت کو آپ کی فطرت میں پیوست کر دیا تھا، ایک ایک لمحہ کو صحیح جگہ پر خرچ کرنے کا اہتمام فرماتے تھے، ہر وقت نظر گھڑی پر رہتی تھی اور ہر کام نظام الاوقات کے تحت کرتے تھے، اسی اہتمام کی برکت سے دین کی اشاعت کا اور رشد وہدایت کا ایک بہت بڑا اور قیمتی ذخیرہ امت کے لیے تیار کر کے چھوڑا۔

آپ کا یہ واقعہ بھی بہت مشہور ہے اور اس سے نظام الاوقات کا کس قدر اہتمام تھا اس کا پتہ چلتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ کے استاذ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ دیوبندی (جنہیں آپ انتہائی عقیدت سے شیخ العالم فرمایا کرتے تھے) آپ کے یہاں مہمان ہوئے، آپ حضرت کی خدمت میں تھے کہ تصنیف کا وقت آ گیا، استاذ مکرم کی خدمت میں با

ادب عرض کیا، حضرت! میرا اس وقت کچھ لکھنے کا معمول ہے، اگر اجازت ہو تو اپنا معمول پورا کرلوں؟ حضرت شیخ الہندؒ نے آپ کو اجازت مرحمت فرما دی، استاذ مکرم کی تشریف آوری کی وجہ سے گو اس روز آپ کا دل لکھنے میں نہ لگا، لیکن پھر بھی ناغہ نہ ہونے دیا، تھوڑا سا لکھ کر حاضر خدمت ہو گئے۔ حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ کے بارے میں مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ نے لکھا ہے کہ حالات جو کچھ بھی ہوں۔ حضرت کے نظام الاوقات اور معمولات کی پابندی میں کوئی تغیر نہیں دیکھا۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے نزدیک وقت کی قدر کتنی تھی اور اپنے کام میں کتنے انہماک کے ساتھ مشغول رہتے تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت کو بسا اوقات کھانا کھانا بھی یاد نہیں رہتا تھا، عصر کے وقت جب تقریباً 30 گھنٹے کھانے کے بغیر گزر جاتے تھے اور کمزوری محسوس ہوتی تھی اس وقت احساس ہوتا تھا کہ دوپہر کا کھانا باقی ہے۔ اسی انہماک کی وجہ سے آپ پر بزرگوں کی خاص توجہ رہی۔ آپ اپنی ''آپ بیتی'' میں تھانہ بھون کا ایک قصہ بیان فرماتے ہیں کہ ''**بذل المجہود**'' کی طباعت کے سلسلہ میں آپ کا تھانہ بھون جانے کا سلسلہ رہا۔ ظہر کے وقت آپ کو مسودات مل جاتے تھے، جنہیں شام تک واپس کرنا ہوتا تھا، اس لیے آپ مسجد کے ایک حصہ میں بیٹھ کر عصر تک ان مسودات کو بڑی توجہ سے دیکھتے رہتے تھے، لیکن چونکہ یہی وقت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی عمومی مجلس کا تھا، اس لیے آپ کو مجلس میں شریک نہ ہونے کا قلق بھی بہت زیادہ رہتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے حضرت حکیم الامتؒ کی خدمت میں اپنے اس قلق کو ظاہر فرماتے ہوئے عرض کیا:

حضرت! لوگ دور دور سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور یہ ناکارہ یہاں رہ کر بھی حاضری سے محروم ہے۔ حضرت نے ارشاد فرمایا: ''آپ فکر نہ کیجیے، آپ اگرچہ میری مجلس میں نہیں ہوتے، مگر میں آپ ہی کی مجلس میں رہتا ہوں اور بار بار آپ کو دیکھتا

ہوں اور رشک کرتا ہوں کہ کام تو یوں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی توفیق عطا فرمائیں''۔

ہو رہی ہے عمر مثل برف کم
چپکے چپکے رفتہ رفتہ دم بدم

اپنے بزرگوں اور اسلاف کی زندگی سے کچھ روشنی حاصل کر کے کچھ کرنے کی کوشش کی ہے، میں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا اندازہ تو قارئین کریں گے۔

مقصد ترتیب:

''مجموعہ القاسم'' یہ کوئی مستقل تصنیف یا تالیف نہیں ہے، بلکہ یہ ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ماہنامہ ''معارف قاسم'' کے خصوصی نمبرات اور شماروں میں شائع ہوئے تھے، انہیں کو کتابی شکل میں ترتیب وایڈیٹنگ کے مراحل سے گزر کر شائع کیا ہے، جس کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ یہ مضامین کتابی شکل میں آجائیں گے تو انھیں نئی زندگی مل جائے گی اور ضائع ہونے سے محفوظ ہو جائیں گے۔ دوسرے یہ کہ ان میں جن موضوعات پر مضامین یکجا کئے گئے ہیں ان سے دلچسپی رکھنے والے اور ریسرچ وتحقیق سے وابستہ اشخاص کے لئے استفادہ آسان ہو جائے گا اور تیسرا مقصد جو سب سے اہم ہے، وہ دین کی اشاعت ہے، ورنہ ان میں بہت سے اکابر حضرات کے وہ مضامین بھی ہیں جو پہلے ہی سے ان کی کتابوں میں مطبوعہ ہیں۔ جیسے حضرت تھانویؒ، حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ وغیرہ کے مضامین۔ بہت سے قاری حضرات کے ذہن میں یہ سوال آسکتا ہے کہ جب یہ پہلے ہی سے مطبوعہ ہیں، پھر ان کو ہی مجموعہ میں شامل کرنے کا فائدہ کیا ہے؟۔ میرا مقصد تکرار طباعت نہیں ہے، بلکہ عربی کا مشہور محاورہ: ''اذا تکرر تقرر'' کے پیش نظر تکرار اشاعت دین ہے۔

نیز اس کے مقصد کے تحت یہ وضاحت بھی اہل علم کی دلچسپی کے پیش نظر کرتا چلوں،

کہ ''معارف قاسم'' یہ ماہنامہ ہی نہیں، بلکہ علمی تحریک ہے جس کا مقصد دین وشریعت اور قوم وملت کو زندگی دینے والے تمام مواد کا حتی الامکان علمی اور تحقیقی مواد جمع کر کے امت کے سامنے پیش کرنا ہے، اس وقت ''مجموعہ القاسم کے نام سے جو چیز اہل علم وذوق کے سامنے آرہی ہے، اسی علمی وتحقیقی تحریک کی ابتدائی سنہری کڑی ہے۔

مجموعہ القاسم چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور ہر جلد اپنے آپ میں منفرد خصوصیات کی حامل ہے۔ جنہیں ہر طرح سے سجا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی، معیار اور مضمون نگار کی شخصیت کو مدنظر رکھتے ہوئے فہرست مضامین ترتیب دی گئی ہے۔ ہزاروں صفحات پر مشتمل ان چھ جلدوں کی ترتیب درج ذیل ہے:

جلد اول: قرآن کریم
جلد دوم: سیرت محسن انسانیت ﷺ
جلد سوم: تحفظ ناموس رسالت ﷺ
جلد چہارم: مسلم پرسنل لا
جلد پنجم: مسلم مسائل اور ان کا حل
جلد ششم: تری عظمتوں کو سلام

(۱) فقیہ العصر قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی، حیات و خدمات۔ (۲) حضرت مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ کی حیات وخدمات۔ (۳) امیر شریعت سید نظام الدینؒ۔ (۴) رمضان کریم سے متعلق مسائل و برکات۔ (۵) پیام انسانیت۔ (۶) برما کا سفرنامہ۔ (۷) برما کے مظالم۔ (۸) متفرقات۔

آخری بات:

مجموعہ القاسم کی ترتیب کا کام فضل رب سے مکمل ہوا تو ان کی طباعت پر خرچ ہونے

والی خطیر رقم کا مسئلہ درپیش تھا، ہزار، دس ہزار اور لاکھ کا صرفہ ہوتا تو کچھ بڑی بات نہ تھی، لیکن ۶ جلدوں کی طباعت کا خرچ پرنٹنگ پریس کی طرف سے جو دیا گیا تو ہوش اڑ گئے، ہمت ایک بار پھر جواب دے گئی، مگر ارادے میں استحکام نے حوصلے کو پست نہیں ہونے دیا، چونکہ اس کام کو کسی بھی صورت میں انجام تک پہنچانا تھا، اس لئے فکر کے ساتھ ساتھ جدوجہد جاری رہی، دعا بھی کرتا رہا کہ مسبّب الاسباب کوئی آسان راہ نکال دے۔ کہتے ہیں کہ منزل پانے کی سچی طلب ہو تو راہ کی دشواریوں کا احساس نہیں ہوتا، ساری رکاوٹیں کافور ہوجاتی ہیں، پھر منزل یاب ہوکر جو خوشی ملتی ہے اس کا کوئی مول نہیں۔ میں نے بھی اس کار خیر کیلئے اپنے کرم فرماؤں اور مخلصین کے سامنے دست دراز کیا، کام کی نوعیت ان کے سامنے رکھی اور ضرورت کو بیان کیا تو کئی ہاتھ سامنے آئے، انہوں نے ہماری آواز پر لبیک کی صدا بلند کی اور تعاون کا وعدہ کرکے مجھ پر احسان عظیم کیا، اس طرح فضل رب سے یہ بڑا مسئلہ بھی حل ہوگیا۔

ربّا اس بندۂ خدا کے ہاتھ کو قیامت تک خیر اُمت پر باقی رکھئے اور حق جل مجدہٗ ان کے حسنات کو میزان عمل میں اپنے اعتبار سے بھاری کردے۔ **جزاکم اللہ خیراً**.

ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے اور ہر وقت کے لئے ایک کام۔ کہتے ہیں کہ ''اگر وقت کی قدر انسان نہیں جان پایا تو سمجھو کہ وہ اپنی زندگی کا مقصد کبھی نہیں جان پائے گا''۔ اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لئے یہی وقت مقدر کر رکھا تھا اس لئے اپنے وقت پر انجام پذیر ہوا۔

اس موقع پر اس بات کا اعتراف بھی ہمارا فرض ہے کہ میں سب سے پہلے رب کائنات کے حضور سربسجود ہوں کہ اس کی مرضی شامل حال نہ ہوتی تو میں اپنے مقصد میں ہرگز کامیاب نہیں ہو پاتا۔ یہ سب اللہ پاک کے فضل وکرم اور نبی امی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے ہی ممکن ہوسکا ہے۔ میں بیحد شکرگزار ہوں معارف قاسم کے مدیر برادر گرامی قدر ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی کا جن کی انتھک کوششیں اور محنت ولگن کی بدولت ''مجموعہ القاسم''

اس خوبی سے مزین ہوکر آپ کے سامنے ہے۔ رفیق محترم مفتی احمد نادر القاسمی، ڈاکٹر عبدالقادر شمس قاسمی، مصعب انیس، مولانا ارشد ندوی، عبدالکریم، مولانا آصف ندوی، مظفر حسین رحمانی، مظہر حسین رحمانی، سلام الدین خان قاسمی، مولانا رضوان الحق قاسمی، مولانا حسان جامی قاسمی، مولانا نوراللہ جاوید قاسمی، مولانا یوسف انور قاسمی، مفتی شمس تبریز قاسمی، حافظ ظفر اقبال مدنی، فاتح اقبال مکی اور شمیم اختر کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے بہت سی مصروفیات کے باوجود محض تعاون علی البر کے جذبہ سے از ابتدا تا انتہا اپنا مکمل تعاون پیش کیا۔

آخیر میں رب الٰہ سے التجا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس علمی ذخیرہ کے نفع کو عام فرمائے اور ہم سب کے لئے صدقۂ جاریہ اور نجات اخروی کا ذریعہ بنائے۔ (آمین یارب العالمین)۔

ناموس رسالت کے علمبردار، امین ملت

بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

بانی ومہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، مدھوبنی، ضلع سیپول، بہار
سجادہ نشین خانقاہ امدادیہ اشرفیہ
سکریٹری جنرل امام قاسم اسلامک ایجوکیشنل ویلفیئر ٹرسٹ انڈیا
خلیفہ ومجاز متکلم اسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی
جانشین حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند

11 ربیع الاوّل 1439ھ
مطابق یکم دسمبر 2017ء

☆☆☆

مقالات و مضامین

قرآن کریم کا اعجاز

● مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

الحمد للّٰہ الذی خلق الانسان وعلمه البیان وأنزل القرآن والصلوٰة والسلام علی محمدالکرام وعلیٰ آله واصحابه الابرار. اجمعین امابعد!

قرآن کریم کے اعجاز پر نقد ونظر کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہوسکتی، اس لئے کہ یہ کلام جس مقدس ذات کا ہے، انسان اس کی پیدا کردہ مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے البتہ اشرف ضرور ہے، مگر اشرف اور ذی عقل ہونے کے باوجود انسان اس کلام احسن کی تفسیر وتوجیہ اور تنقیح وتوضیح کا بھرپور حق ادا کرنے سے قاصر ہے۔ قرآن پاک کی ہر آیت کا ہر لفظ اپنے اندر جامع مفاہیم رکھتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا اعجاز یہ ہے کہ اسے کسی خاص زمانہ، خاص وقت اور کسی خاص قوم وملک سے مقید ومحدود کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ اس کے اعجاز کی وسعت وہمہ گیری انسان کی تمام تر علمی صلاحیتوں کے احاطہ سے ماوراء ہے۔ اس لئے تمام بڑے اور جید علماء تفسیر وترجمہ نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں اور لیاقتوں کو بروئے کار لانے اور بہتر سے بہتر ترجمہ وتفاسیر کر دینے کے باوجود خود کو عاجز وکمزور پایا اور اعتراف کیا کہ قرآن کا اعجاز علوم ومعارف کا وہ بحر بیکراں ہے جس کی غوطہ خوری انسان کے بس کی بات نہیں۔

قابل ذکر ہے کہ علوم قرآن کے تمام مباحث پر قرن اول سے اب تک ہر پہلو اور ہر زاویہ سے بحث کی جاتی رہی اور غور وفکر ہوتا رہا ہے، لیکن پھر بھی اس کا حق ادا نہ ہوسکا اور

اب بھی وہ تشنہ معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرے مباحث کی طرح اعجاز قرآن کا موضوع بھی ابتدا ہی سے زیر بحث رہا ہے۔ قرآن کریم کن معنوں میں معجزہ ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس کی وجہ سے ادب، فصاحت و بلاغت اور بدیع و بیان کے نام سے مستقل فن کی بنیاد پڑی۔ سلیقہ مند الفاظ و معانی کی ادائیگی کا یہ شائستہ فن یہ نہ صرف یہ کہ خالصۃً اسلامی ہے، بلکہ قرآنی اعجاز ہی کا مرہون منت ہے۔

قرآن اللہ کی آخری کتاب ہے اس کی حقانیت کی واضح دلیل خود اس کا اعجاز ہے۔ یعنی جس کی نظیر پیش کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے، اسی وجہ سے اس کو سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے کا سب سے بڑا معجزہ کہا جاتا ہے۔

فصاحت و بلاغت اور سحر انگیزی ایک ایسی صفت ہے جس کا تعلق سمجھنے اور محسوس کرنے سے ہے اور پوری حقیقت و ماہیت کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن بھی نہیں۔ آپ تلاش وجستجو اور استقراء کے ذریعہ فصاحت و بلاغت کے اصول وقواعد مقرر فرما سکتے ہیں، لیکن درحقیقت ان اصول وقواعد کی حیثیت فیصلہ کن نہیں ہوتی۔ کسی کلام کے حسن وقبح کا آخری فیصلہ ذوق اور وجدان ہی کرتا ہے۔ جس طرح ایک حسین چہرے کی کوئی جامع تعریف نہیں کی جاسکتی، اسی طرح کسی کلام کی فصاحت و بلاغت کو بیان کردینا ممکن ہے، لیکن جب کوئی صاحب ذوق انسان اسے سنے گا تو اس کے محاسن ومعائب کا خود بخود اسے اندازہ ہوجائے گا۔ دوسرے یہ کہ فصاحت و بلاغت کے معاملہ میں ذوق بھی صرف اہل زبان کا معتبر ہے، کوئی شخص کسی غیر زبان میں خواہ کتنی مہارت حاصل کرلے لیکن ذوق سلیم کے معاملہ میں وہ اہل زبان کا کبھی ہم سر نہیں ہوسکتا ہے۔

اب ذرا زمانہ جاہلیت کے اہل عرب کا تصور کیجئے۔ خطابت وشاعری ان کے معاشرہ کی روح میں شامل تھی۔ عربی شعر وادب کا فطری ذوق ان کے بچے بچے میں سمایا ہوا تھا۔ فصاحت و بلاغت ان کی رگوں میں خون حیات بنکر دوڑتی تھی۔ ان کی مجلسوں کی رونق، ان

کے میلوں کی رنگینی، ان کے فخر و ناز کا سرمایہ اور ان کی نشر واشاعت کا ذریعہ سب کچھ شعر وادب تھا اور انہیں اس پر اتنا غرور تھا کہ وہ اپنے سوا تمام اقوام کو ''عجم'' (گونگا) کہا کرتے تھے۔

ایسے ماحول میں جب نبیٔ امی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا کلام پیش کیا تو یہ حکیمانہ کلام ان کی فصاحت و بلاغت کے خرمن پہ ایک بجلی بن کر گرا۔ اپنی زبان دانی پر فخر کرنے والا معاشرہ تلملا اٹھا، یقیناً ان کے لئے کسی چیلنج سے کم نہیں تھا، چنانچہ انھوں نے اسے نہ صرف اللہ کا کلام تسلیم کرنے سے انکار کردیا، بلکہ رسول امی پر کلام گڑھنے کا الزام بھی عائد کردی۔ قرآن نے اس کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے:

''اَمْ یَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ بَل لَّا یُؤْمِنُوْن. فَلْیَأْتُوْ بِحَدِیثٍ مِّثْلِه اِنْ کَانُوْا صَادِقِیْن'' (سورة طور: 34-33)

(کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ قرآن خود گڑھ لیا ہے دراصل بات یہ ہے کہ یہ ایمان لانا ہی نہیں چاہتے، اچھا اگر یہ اپنے قول میں سچے ہیں تو اسی جیسی شان کا کلام بنالائیں۔)

''اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِه مُفْتَرَیٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْن''. (سورہ هود: 13)

(کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ کتاب خود گڑھ لی ہے! کہو اچھا یہ بات ہے تو تم اسی جیسی صرف دس سورتیں تصنیف کرلاؤ اور اللہ تعالیٰ کے سوا تم اور جو بھی تمہارے معبود ہیں ان کو اپنی مدد کے لئے بلا سکتے ہو تو بلالو۔ اگر تم سچے ہو)

اسی طرح رفتہ رفتہ صرف ایک سورۃ لانے کا مطالبہ کیا اور چیلنج میں شدت وقوت پیدا کرتے ہوئے فرمایا:

''اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِثْلِه وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُوْنِ

اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْن". (سورۃ یونس: 38)

(کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ نبی نے اسے خود گڑھ لیا ہے۔اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہو کہ اگر تم اپنے الزام میں سچے ہوتو ایک سورۃ ہی اس کی جیسی (شان وعظمت والی) تصنیف کرلاؤ،ایک اللہ کے سوا تم اپنی مدد کے لئے جس جس کو بلا سکتے ہو بلاؤ)۔

اس تحدی اور چیلنج کے دو زاویئے تھے،ایک رسول امی کی صداقت ونبوت کو ثابت کرنا کہ رسول جو کچھ بھی پیش کرر ہے ہیں وہ اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں، یہ ان کے الفاظ نہیں ہیں، بلکہ یہ اللہ کا کلام ہے، جو رسول امی کی زبان سے تم تک پہونچ رہا ہے، اگر یہ محمد کا کلام ہوتا تو یقیناً تمہارے ہی معیار، فصاحت کے مطابق ہوتا،مگر یہ تو کلام الٰہی ہے، بھلا اس کے معیار کو تمہاری فصاحت و بلاغت کیسے پہونچ سکتی ہے، دوسرے یہ کہ اگر پھر بھی تم اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہو اور انسان (محمد) کا کلام سمجھ رہے ہوتو۔

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے"

تم تو بڑے زبان داں ہو!اس کی ایک چھوٹی سورت کے برابر ہی اس جیسا بلیغ کلام پیش کر کے دکھاؤ!اور ہمارا چیلنج یہ ہے کہ تم سارے عرب مل کر بھی یہ کام نہیں کر سکتے۔کوشش تو بہت کی،مگر فصاحت و بلاغت کے قرآن حکیم سے معارضت یا مقابلے کی جنگ میں عاجز ہو کر گویا زبان وبیان کے شہسوار سارے کے سارے گونگے ہو گئے تھے۔

قرآن مجید کا ہر چیلنج علم وخرد اور دلوں پر حاوی ہوتا جارہا تھا، ان کی انانیت مجروح ہورہی تھی۔حق تو یہ ہے کہ وہ حق جان کر رعونت میں ماننا نہیں چاہتے تھے اور نہ ہی ان کی ضد اور ہٹ دھرمی، بلکہ ان کی جاہلانہ عصبیت اجازت دیتی تھی کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول برحق اور قرآن مجید کو کتاب الٰہی مان کر گھٹنے ٹیک دیں۔ورنہ لغت کے اعتبار سے یہ ان کی جہالت نہیں، بلکہ جیسا کہ تاریخ ادب عربی کے مؤلف ڈاکٹر عمر فروخ نے کلمہ جاہلیت کی

تعریف میں لکھا ہے:

"الجهل ضد الحلم تھا،الجهل ضد العلم"نہیں۔یعنی علم کے خلاف نہیں، بلکہ عقل ودانش اور حق پرستی کے خلاف تھی اس لئے وہ قرآن کے زوردار حملوں سے گھبرا کر آپس میں ایک دوسرے سے کہتے:

"لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْن". (سورۃ حم سجدہ: 26)

(اس قرآن کریم کو سنو ہی نہیں، بلکہ جب محمد ﷺ سنائیں تو ایسا شور مچاؤ کہ قرآن مجید سنائی نہ دے،شاید اسی طرح تم غالب آجاؤ۔)

مذکورہ ساری صورت حال مکی دور کی ہے،اس کے بعد اس چیلنج کی تجدید مدنی دور میں ہوئی،سورۃ بقرہ میں ان کو توحید کی دعوت دی گئی اور یہی ان کی دکھتی رگ تھی۔ارشاد ہوا:

"وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِه وَادْعُوْا شُهَدَاءَ كُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْن. فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكَافِرِيْن". (سورۃ بقرۃ: 23-24).

(اگر تمہیں اس قرآن پر شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو تم اس جیسی عظمت والی ایک ہی سورۃ بنا کر لے آؤ اگر تم سچے ہوتو یہ کر کے دیکھا دو اگر تم یہ نہ کر سکے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تم ہرگز ایسا کر ہی نہیں سکتے تو پھر اس جہنم کی آگ سے بچنے کے لئے تیاری کرلو جس کا ایندھن انسان اور پتھر بنیں گے۔)

اس خوفناک انداز میں جو دھمکی دی گئی وہ محض وقتی نہیں تھی، بلکہ آئندہ بھی وہ اس چیلنج کو قبول نہیں کر سکتے تھے اور حقیقت اب ان پر روشن ہوگئی تھی۔

منکرین قرآن پر اعجاز قرآن کے ثبوت میں یہ قول حق بھی ثابت ہوگیا:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّأْتُوا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَايَأْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۔ (سورة بنی اسرائیل: 88)

(اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان سے کہہ دیں کہ اگر انسان اور جنات سب مل کر بھی کوشش کریں کہ اس قرآن عظیم جیسی کوئی کتاب تیار کرلیں تو وہ کبھی ایسی کتاب نہ پیش کرسکیں گے، خواہ وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔)

وجوہ اعجاز قرآنی:

یعنی وہ کیا وجوہ ہیں جن کے سبب ساری دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اس پر علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ ہر ایک نے اپنے اپنے طرز میں اس مضمون کو بیان کیا ہے۔ یہاں پر مختصراً ان وجوہ کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔

پہلی وجہ:

اولاً غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ قرآن مجید کس جگہ، کس ماحول میں، اور کس پر نازل ہوا؟ کیا وہاں ایسے علمی ماحول کا وجود تھا جن کے ذریعہ ایسی جامع بے نظیر کتاب تیار ہوسکے، جو علوم اولین وآخرین کی جامع، اور انسان کی انفرادی واجتماعی زندگی کے ہر پہلو کے متعلق بہترین ہدایت پیش کرسکے۔

جس سرزمین پر یہ کتاب مقدس نازل ہوئی اس کو بطحاء مکہ کہتے ہیں، جو نہ زرعی ملک ہے، نہ صنعتی، اکثر دنیا سے کٹا ہوا ایک جزیرہ نما ہے، جہاں دور تک نہ کہیں بستی نظر آتی ہے، نہ کوئی کھیت، نہ درخت۔ جس میں کسی قسم کے علم وتعلیم کا کوئی چرچا نہیں، نہ وہاں کوئی اسکول اور کالج ہے نہ کوئی یونیورسٹی یا دارالعلوم، لیکن وہاں کے رہنے والوں کو اللہ نے پیدائشی طور پر فصاحت وبلاغت کا ایک فن ضرور دے دیا ہے، جس میں وہ ساری دنیا سے فائق اور ممتاز ہیں، وہاں کی چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ایسے فصیح وبلیغ اشعار کہتی ہیں کہ دنیا بھر کے ادیب

حیران رہ جاتے ہیں۔

لیکن یہ سب ان کا فطری فن ہے، جو کسی مکتب یا مدرسہ میں حاصل نہیں کیا جاتا، الحاصل نہ وہاں تعلیم وتعلّم کا کوئی سامان ہے، نہ وہاں کے رہنے والوں کو ان چیزوں سے لگاؤ ہے۔ اسی مکہ شہر میں ایک شریف گھرانے میں وہ ذات مقدس پیدا ہوئی جو مہبط وحی ہے اب اس ذات مقدس کا حال سنئے۔

پیدا ہونے سے پہلے ہی والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، سات سال کی بھی عمر نہ تھی کہ والدہ کی بھی وفات ہوگئی، آباء واجداد نے اپنے گھر میں کوئی اندوختہ نہ چھوڑا تھا جس سے یتیم کی پرورش کا سامان ہوسکے اور عمر کا ابتدائی حصہ گذار سکے جو تعلیم وتعلم کا اصلی وقت ہے، اس وقت اگر مکہ میں کوئی دارالعلوم یا اسکول وکالج بھی ہوتا تو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس سے استفادہ مشکل تھا۔ الغرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر قسم کی تعلیم وتعلم سے بے خبر رہے، وہاں کوئی بڑا عالم بھی نہ تھا جس کی صحبت میں رہ کر یہ علوم حاصل کئے جاسکیں، جن کا قرآن حامل ہے۔ یہ امی محض چالیس سال تک مکہ میں اپنے برادری کے سامنے رہتے ہیں، ٹھیک چالیس سال کے بعد ان کی زبان مبارک پر وہ کلام آنے لگتا ہے جس کا نام قرآن ہے اور لفظی فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے محیر العقول ہے، تو پھر اس کے معجزہ ہونے میں کسی انصاف پسند کو کیا شبہ رہ سکتا ہے۔ فرض کر لیجئے کہ یہ کتاب بے نظیر بھی نہ ہوتی جب بھی ایک امی کی زبان سے اس کا ظہور وجوہ اعجاز کی تفصیل میں جائے بغیر بھی قرآن کریم کے معجزہ ہونے کے لئے کم نہیں جس کو ادنیٰ شعور رکھنے والا انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔

دوسری وجہ:

عرب سرداروں نے قرآن اور اسلام کے مٹانے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم

کومغلوب کرنے میں جس طرح اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگایا، وہ کسی لکھے پڑھے آدمی سے مخفی نہیں اور عربوں نے اپنی خاص مجلسوں میں قرآن کے بے مثل ہونے کا اعتراف کیا اور جو ان میں منصف مزاج تھے انہوں نے اس اعتراف کا اظہار بھی کیا۔ قریشی سردار نضر بن حارث نے ایک مرتبہ اپنی قوم کو خطاب کر کے کہا:

''اے قوم قریش! آج تم ایک مصیبت میں گرفتار ہو کہ اس سے پہلے کبھی ایسی مصیبت سے سابقہ نہیں پڑا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے قوم کے ایک نوجوان تھے اور تم سب ان کے عادات واخلاق کے گرویدہ اور اپنی قوم میں ان کو سب سے زیادہ سچا اور سب سے زیادہ امانت دار جانتے اور کہتے تھے، اب جب کہ ان کے سر میں سفید بال آنے لگے، خدا کی قسم وہ جادوگر نہیں، ہم نے جادوگروں کو دیکھا اور برتا ہے، ان کے کلام سنے ہیں، اور طریقوں کو سمجھا ہے، وہ بالکل اس سے مختلف ہیں اور کبھی تم ان کو کاہن کہنے لگے، خدا کی قسم وہ کاہن بھی نہیں، ہم نے بہت سے کاہنوں کو دیکھا اور ان کے کلام سنے ہیں، ان کو ان کلام سے کوئی مناسبت نہیں اور کبھی تم ان کو شاعر کہنے لگے، خدا کی قسم! وہ شاعر بھی نہیں، ہم نے خود شعر وشاعری کے تمام فنون کو سیکھا ہے اور بڑے بڑے شعراء کے کلام ہمیں یاد ہیں، ان کے کلام سے اس کو کوئی مناسبت نہیں، پھر کبھی تم ان کو مجنون بتاتے ہو، خدا کی قسم! وہ مجنون بھی نہیں، ہم نے بہت سے مجنوؤں کو دیکھا ہے، ان کی بکواس سنی ہے، ان کے مختلف کلام سنے ہیں، یہاں یہ کچھ نہیں، اے میری قوم تم انصاف کے ساتھ ان کے معاملہ میں غور کرو؟ یہ سرسری ٹال دینے کی چیز نہیں''۔ (خصائص کبری ص 144 ج 1)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قرآن کے اس دعوے اور چیلنج پر صرف یہی نہیں کہ پورے عرب نے ہار مان لی اور سکوت اختیار کی، بلکہ اس کے بے مثل وبے نظیر ہونے اور اپنے عجز کا کھلے طور پر اعتراف بھی کیا ہے، اگر یہ کسی انسان کا کلام ہوتا تو اس کی کوئی وجہ نہ تھی کہ سارا عرب

بلکہ ساری دنیا اس کا مثل لانے سے عاجز ہوتی، یہ ہے قرآن کا وہ کھلا ہوا معجزہ جس کا دشمنوں کو بھی اعتراف کرنا پڑا ہے۔

تیسری وجہ:

قرآن کریم میں غیب کی اور آئندہ رونما ہونے والے واقعات کی بہت سی خبریں ہیں جو قرآن نے دیں، اور ہو بہو اسی طرح واقعات پیش آئے جس طرح قرآن نے خبر دی تھی، مثلاً قرآن نے خبر دی کہ روم وفارس کے مقابلہ میں ابتداءً فارس غالب آئیں گے اور رومی مغلوب ہوں گے، لیکن ساتھ ہی یہ خبر دی کہ دس سال گذرنے نہ پائیں گے کہ پھر رومی اہل فارس پر غالب آجائیں گے، مکہ کے سرداروں نے قرآن کی اس خبر پر حضرت صدیق اکبرؓ سے ہار جیت کی شرط کر لی اور پھر ٹھیک قرآن کی خبر کے مطابق رومی غالب آگئے تو سب کو اپنی ہار ماننا پڑی، اور ہارنے والے پر جو مال دینے کی شرط تھی، وہ مال ان کو دینا پڑا، رسول کریم ﷺ نے اس مال کو قبول نہیں فرمایا، کیوں کہ وہ ایک قسم کا جوا تھا، اسی طرح اور بہت سے واقعات اور خبریں ہیں جو امور غیبیہ کے متعلق قرآن میں دی گئیں اور ان کی سچائی بالکل روز روشن کی طرح واضح ہوگئی۔ (معارف القرآن ص 97 ج 1)۔

چوتھی وجہ:

قرآن عظیم میں پچھلی امتوں اور ان کی شرائع اور تاریخی حالات کا ایسا صاف تذکرہ ہے کہ اس زمانہ کے بڑے بڑے علماء یہود ونصاریٰ جو پچھلی کتابوں کے ماہر سمجھے جاتے ان کو بھی اتنی معلومات نہ تھیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کبھی نہ کسی مکتب میں قدم رکھا، نہ کسی عالم کی صحبت اٹھائی، نہ کسی کتاب کو ہاتھ لگایا، پھر یہ ابتداء دنیا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک تمام اقوام عالم کے تاریخی حالات اور نہایت صحیح اور سچی سوانح اور ان کی شریعتوں کی تفصیلات کا بیان! ظاہر ہے، کہ بجز اس کے نہیں ہوسکتا کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ ہی

کا ہو، اور اللہ تعالیٰ نے ہی آپ کو یہ خبر دی ہو۔ (معارف القرآن ص 98 ج 1)

پانچویں وجہ:

کتاب اللہ کی بے شمار آیات میں لوگوں کے دل کی چھپی ہوئی باتوں کی اطلاع دی گئی ہے اور پھر ان کے اقرار سے ثابت ہو گیا کہ وہ بات صحیح اور سچی تھی، یہ کام بھی عالم الغیب والشہادۃ ہی کر سکتا ہے، کسی بشر سے عادۃً ممکن نہیں۔

چھٹی وجہ:

چھٹی وجہ اعجاز قرآنی کی، وہ آیات ہیں جن میں قرآن نے کسی قوم یا فرد سے متعلق یہ پیشین گوئی کی کہ وہ فلاں کام نہ کر سکیں گے، اور پھر وہ لوگ باوجود ظاہری قدرت کے اس کام کو نہ کر سکے۔ جیسے یہود کے متعلق قرآن نے اعلان کیا کہ اگر وہ فی الواقع اپنے آپ کو اللہ کا دوست اور ولی سمجھتے ہیں تو وہ موت کی تمنا کر کے دکھائیں اور پھر ارشاد فرمایا:

''ولا یتمنّونہ ابداً''. (سورہ جمعہ: آیت نمبر: 7) (وہ ہرگز موت کی تمنا نہ کر سکیں گے) کیونکہ ان کے دل جانتے تھے کہ قرآن سچا ہے۔ اگر موت کی تمنا ہم اس وقت کریں گے فوراً مر جائیں گے اس لئے قرآن کے اس کھلے ہوئے چیلنج کے باوجود کسی یہودی کی ہمت نہ ہوئی کہ ایک مرتبہ زبان سے تمنائے موت کا اظہار کر دے۔ (معارف القرآن ص 99 ج 1)۔

ساتویں وجہ:

فرمان ربانی کے اعجاز کی ایک وجہ وہ خاص کیفیت ہے جو قرآن کے سننے سے ہر خاص وعام اور مومن وکافر پر طاری ہوتی ہے، جیسے حضرت جبیر ابن مطعم رضی اللہ عنہ کو اسلام لانے سے پہلے پیش آیا کہ اتفاقاً انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز مغرب میں سورہ طور پڑھتے ہوئے سنا، جب آپ ﷺ آخری آیت پر پہنچے تو جبیرؓ ابن مطعم کہتے ہیں کہ میرا

دل گویا اڑنے لگا، اور یہ سب سے پہلا دن تھا کہ میرے دل میں اسلام اُتر گیا۔ (معارف القرآن ص 99 ج 1)۔

آٹھویں وجہ:

قرآن کے اعجاز کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کو بار بار پڑھنے اور سننے سے کوئی اکتاتا نہیں، بلکہ جتنا زیادہ پڑھا جاتا ہے اس کا شوق اور بڑھتا ہے۔ دنیا کی کوئی بہتر سے بہتر اور مرغوب کتاب لیجئے اسے دو چار مرتبہ پڑھا جائے تو انسان کی طبیعت اکتا جاتی ہے۔ پھر نہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے، نہ سننے کو، یہ صرف قرآن کا خاصہ ہے کہ جتنا کوئی اسکو زیادہ پڑھتا ہے اتنا ہی اس کو شوق و رغبت بڑھتا جاتا ہے۔ یہ بھی قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا اثر ہے۔ (معارف القرآن)

نویں وجہ:

کلام اللہ کا یہ اعجاز نہیں تو اور کیا ہے کہ قرآن نے خود اعلان کیا ہے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ وہ قیامت تک بغیر کسی ادنیٰ تغیر و ترمیم کے باقی رہے گا، اللہ نے اپنے اس وعدے کو اس طرح پورا فرمایا کہ جب سے قرآن نازل ہوا ہے، آج چودہ سو برس کے قریب ہونے کو آئے ہیں ہر زمانے میں لاکھوں انسان ایسے رہے ہیں اور رہیں گے جن کے سینوں میں پورا قرآن اس طرح محفوظ رہا کہ ایک زیر و زبر کی غلطی کا امکان نہیں، ہر زمانے میں مرد، عورت، بچے، بوڑھے اس کے حافظ ملتے ہیں۔ بڑے سے بڑا عالم اگر کہیں ایک زیر و زبر کی غلطی کر جائے تو ذرا ذرا سے بچے وہیں غلطی پکڑ لیں گے، دنیا کا کوئی مذہب اپنی مذہبی کتاب کے متعلق اس کی مثال تو کیا اس کا دسواں حصہ بھی پیش نہیں کر سکتا۔ یہ بے نظیر حفاظت بھی صرف قرآن ہی کا خاصہ اور اس کے کلام الٰہی ہونے کا نمایاں ثبوت ہے، اس کھلے معجزے کے بعد قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں کیا کسی کو شک وشبہ کی گنجائش رہ

سکتی ہے۔(معارف القرآن ص100 ج1)

الفاظ کم اور معانی زیادہ:

عربی زبان جس کا دامن ہزاروں الفاظ کو سمیٹے ہوئے ہے، انہی الفاظ کے ذریعے انفرادی واجتماعی مسائل سے لے کر مابعدالطبعی حقائق تک تمام مسائل کو احسن طریقے پر سلجھایا اور نکھارا ہے۔یعنی کم از کم ذخیرۂ الفاظ سے زیادہ سے زیادہ معانی کی نشاندہی کی ہے۔مثلاً لفظ ہدایت کو لیجئے۔قرآن حکیم نے اس ایک لفظ کو سیاق وسباق کی مناسبت کے پیش نظر تقریباً تین معانی میں استعمال کیا ہے۔

1۔اس معنی میں کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں ہر شئ کی تخلیق کی ہے وہاں اس کے فرائض کا تعین کیا ہے۔

"رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شیءٍ خَلْقَهٗ ثمَّ هُدیٰ". (طه: 50)

(ہمارا وہ پروردگار ہے جس نے ہر چیز کو شکل وصورت بخشی اور پھر اس کے فرائض کی طرف اس کی رہنمائی بھی کی۔)

2۔دینی رہنمائی کے معنوں میں: وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا. (انبیاء:73)

(اور ہم نے ان کو قوموں کا پیشوا ٹھہرایا کہ ہمارے حکم سے لوگوں کو سیدھی راہ دکھاتے ہیں۔)

3۔توفیق ہدایت کے معنوں میں: "وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدیً". (محمد: 17) (جو لوگ ہدایت سے بہرہ ور ہیں ان کو مزید ہدایت کی توفیق فرماتا ہے۔)

حسن تالیف:

قرآن حکیم کے اعجاز کا تیسرا پہلو حسن تالیف ہے، یعنی اس بحث کے بعد کہ اعراب وحروف کی تبدیلی یا الفاظ کے انتخاب وتصرف میں قرآن کریم نے اعجاز کے کن کن پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے، یہ واضح کیا جائے کہ یہی الفاظ جب ترکیب پذیر ہوں اور آیات کے

سانچے میں ڈھل جائیں تو ترتیب وتالیف کے لحاظ سے اس میں حسن وسحر کے کون کون گوشے نکھر کر ذوق وشوق کو متاثر کرتے ہیں۔اس سوال کا جواب بھی دو طرح سے دیا جاسکتا ہے۔

ایک یہ کہ فن بلاغت وبدیع کے ایک ایک قاعدہ کو سامنے رکھ کر قرآن سے اس بات کا ثبوت فراہم کیا جائے کہ اس نے کیونکر تمام اصناف سخن کو ملحوظ رکھا اور کس طرح حیرت انگیز اور غیر معمولی طریقے سے ادب وذوق کے خوارق کی تخلیق کی ہے۔

دوسرے یہ کہ فن اور اس کی اصطلاحی باریکیوں میں غوطہ زنی کئے بغیر بدیع وبیان کی ایسی روشن مثالوں ہی پر اکتفا کیا جائے جن سے وہ لوگ بھی استفادہ کرسکیں، جن کو ادب وذوق کے ان دقائق کے مطالعہ کا موقع نہیں ملا۔اس سے پہلے کہ قرآن کریم کے اس معجزانہ پہلو کو ذکر کیا جائے چند نکات کی تشریح ناگزیر ہے۔

(1) قرآن حکیم نے جب اعجاز کا دعویٰ کیا اور مخالفین کو مقابلے کے لئے للکارا تو یہ محض مناظرانہ تحدی نہ تھی، بلکہ ایک برتر حقیقت کی طرف اشارہ تھا، جس نے ادب ولسان کا حسین روپ دھار رکھا تھا۔کارلائل نے قرآن کریم کے اس نکتہ کو بھانپ لیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ "قرآن دراصل اس آواز حق کی بازگشت ہے جو کائنات کے ذرہ ذرہ سے سنائی دے رہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ سننے والے جب اس کو سنتے ہیں تو یہ آواز انہیں پہچانی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی اجنبی کی آواز نہیں ہے، بلکہ یہ دل کے قریب سے بلند ہونے والی آواز ہے، اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جبین شوق زمین بوس ہوجاتی ہے۔اور آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگتے ہیں"۔

"اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖ اِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّداً". (بنی اسرائیل: 107)

(جن لوگوں کو پہلے علم الکتاب سے بہرہ ور کیا گیا ان کو جب قرآن پڑھ کر سنایا جاتا

ہےتو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں۔)

"وَاِذَا سَمِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرىٰ اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ". (المائدة: 83)

(اور جب اس کتاب کو جو پیغمبر اسلام پر نازل ہوئی، سنتے ہیں تو تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے حق بات پہچان لی اور وہ عرض کرتے ہیں کہ اے پروردگار! ہم ایمان لے آئے ہم کو ماننے والوں میں لکھ لیجئے۔)

اعجاز بیان کے اسی پہلو نے ولید جیسے مخالف اسلام کو متاثر کیا اور یہی وہ قرآن کی ادائے دلنواز تھی جس نے فاروق اعظمؓ کے قلب گداز میں اعجاز قرآنی کی پذیرائی کے لطیف جذبات کو ابھار دیا۔ جب ہم آیات قرآنی میں اعجاز بیان کے اس پہلو سے تعرض کرتے ہیں جس کا تعلق حسن تالیف سے ہے تو اس سے مراد حسن وکمال کی وہ نوعیت ہے جو اسلوب ومعانی دونوں میں یکساں دائر وسائر ہے، نکھر کر سامنے آتا ہے۔ خطابی نے اسے اس طرح بیان کیا ہے۔

"قرآن جن محاسن سے لبریز ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں صحیح اور بلند تر معانی کو نظم وترتیب کی حسین شکل میں پیش کیا گیا ہے، اس میں اللہ کی توحید کا بیان ہے۔ اس کی صفات کا تذکرہ ہے، تنذیر کی تفصیل ہے، تبشیر کا مژدہ ہے، حلال وحرام کی وضاحت ہے، حظر واباحت کے حدود کا تعین ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے احکام ہیں، محاسن اخلاق کی تلقین ہے اور قرون ماضیہ سے عبرت پذیری کے اصول ہیں۔ یہ سب معانی اور مضامین بجائے خود بلند اور حسین ہیں، باوجود اس کے ان سب کے اظہار کے لئے قرآن حکیم نے جو اسلوب اختیار کیا ہے اس سے زیادہ موزوں اور بہتر اسلوب اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ (بیان اعجاز القرآن: ص24)

ان اہم خصوصیات کا ذکر بھی ناگزیر جن کی بنا پر قرآن کریم معجز ہے، حالانکہ ان

خصوصیات کا احاطہ بشری طاقت سے باہر ہے، تاہم انسان کی محدود بصیرت کے مطابق ان خصوصیات کو چار عنوانات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(1) الفاظ کا اعجاز (2) ترکیب کا اعجاز (3) اسلوب کا اعجاز (4) نظم کا اعجاز۔

الفاظ کا اعجاز:

کسی زبان کا کوئی شاعر یا ادیب، خواہ اپنے فن میں کمال کے کتنے ہی بلند مرتبے کو پہنچا ہوا ہو یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ، اس کے کلام میں کہیں بھی کوئی لفظ غیر فصیح استعمال نہیں ہوا، کیونکہ بسا اوقات انسان اپنے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے کسی نہ کسی غیر فصیح لفظ کے استعمال پر مجبور ہو جاتا ہے، لیکن پورے قرآن میں نہ صرف یہ کہ کہیں کوئی ایک لفظ بھی غیر فصیح نہیں ہے، بلکہ ہر لفظ جس مقام پر آیا ہے وہ فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے ایسا اٹل ہے کہ اسے بدل کر اسی فصاحت وبلاغت کے ساتھ دوسرا لفظ لانا ممکن ہی نہیں، عربی زبان ایک انتہائی وسیع زبان ہے جو اپنے ذخیرہ الفاظ کے اعتبار سے دنیا کی زبانوں میں کوئی بھی زبان خصوصیت کی حامل نہیں ہے کہ جتنے الفاظ ایک مفہوم کو ادا کرنے کے لئے معمولی معمولی فرق سے اس میں پائے جاتے ہیں، اتنے الفاظ اس میں پائے جاتے ہوں، قرآن کریم الفاظ کے اس وسیع ذخیرے میں سے اپنے مقصد کی ادائیگی کے لئے وہی لفظ منتخب کرتا ہے، جو عبارت کے سیاق، معنی کی ادائیگی اور اسلوب کے بہاؤ کے لحاظ سے موزوں ترین ہو۔

مثلاً ہر زبان کے بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو صوتی اعتبار سے فصیح اور پسندیدہ نہیں سمجھے جاتے، لیکن چونکہ ان کے مفہوم کی ادائیگی کیلئے کوئی اور متبادل لفظ نہیں ہوتا، اس لئے اہل زبان انہیں استعمال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، لیکن قرآن کریم ایسے مواقع پر ایسی خوبصورت تعبیر اختیار کرتا ہے کہ ذوق سلیم وجد کر اٹھتا ہے، جیسے عربی میں تعمیر مکان کیلئے پکی

ہوئی اینٹوں کے لئے جتنے الفاظ مستعمل ہیں وہ سب ثقیل اور ناپسندیدہ سمجھے جاتے ہیں مثلاً اجرّ، قرمد اور طوب۔ اب قرآن کریم میں یہ بیان کرنا مقصود تھا کہ فرعون نے اپنے وزیر ہامان کو حکم دیا کہ ایک اونچا محل تعمیر کرنے کے لئے اینٹیں پکاؤ، اس واقعہ کو ذکر کرنے کیلئے اینٹ کا لفظ استعمال کرنا ناگزیر تھا، لیکن قرآن کریم نے اس مفہوم کو ایسے معجزانہ انداز سے ذکر کیا ہے کہ مفہوم بھی نہایت حسن کے ساتھ ادا ہوگیا اور ثقیل الفاظ کے استعمال کی قباحت بھی پیدا نہیں ہوئی، غور فرمائیے مندرجہ ذیل آیت میں:

''وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰاَيُّهَاالْمَلأُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرِى فَاَوْقِدْلِى يٰهَامَانُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَل لِّى صَرْحًا''. (يتيمة البيان لمشكلات القرآن بحواله علوم القرآن ص256).

(اور فرعون نے کہا! اے سرداران قوم! مجھے اپنے سوا تمہارا کوئی معبود معلوم نہیں، پس اے ہامان! گیلی مٹی پر آگ روشن کر کے میرے لئے محل تعمیر کرو۔)

ترکیب کا اعجاز:

الفاظ کے بعد جملوں کی ترکیب، ساخت اور نشست کا نمبر آتا ہے۔ اس معاملے میں بھی قرآن کریم کا اعجاز اوج کمال پر ہے، قرآن کریم کے دروبست میں وہ شوکت، سلاست اور شیرنی ہے کہ اس کی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی، جیسے قاتل سے قصاص لینا اہل عرب میں بڑی قابل تعریف بات تھی اور اس کے فوائد ظاہر کرنے کے لئے عربی میں مقولے مشہور تھے۔ مثلاً: ''**القتل أحياء للجميع**'' (قتل اجتماعی زندگی ہے) اور ''**اكثروا القتل ليقل القتل**'' (قتل زیادہ کرو تاکہ قتل کم ہوجائے) ان جملوں کو اتنی مقبولیت حاصل تھی کہ یہ زبان زد خاص و عام تھے، اور فصیح سمجھے جاتے تھے، قرآن نے بھی اسی مفہوم کو ادا کیا، لیکن کس شان سے؟ غور فرمائیے!

''وَلَكُمْ فِى الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ''

(اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے)۔

اس جملے کے اختصار، جامعیت، سلاست، شوکت، اور معنویت کو جس پہلو سے دیکھئے بلاغت کا معجزہ شاہکار معلوم ہوتا ہے۔ اور پہلے کے تمام جملے اس کے آگے سجدہ ریز دکھائی دیتے ہیں۔

اسلوب کا اعجاز:

قرآن کریم کے اعجاز کا سب سے زیادہ روشن مظاہرہ اس کے اسلوب میں ہوتا ہے، اور یہ وہ چیز ہے جس کا مشاہدہ ہر کس و ناکس کرسکتا ہے، اس کے اسلوب کی اہم معجزانہ خصوصیات:

(1) علماء بلاغت نے اسلوب کی تین قسمیں قرار دی ہیں، خطابی، ادبی، علمی۔ ان تینوں قسموں کے دائرے الگ الگ ہیں، ہر ایک کی خصوصیات جدا جدا اور مواقع مختلف ہیں اور ایک ہی عبارت میں ان تینوں اسالیب کو جمع کر دینا ممکن ہے۔ آپ جب تقریر کرتے ہیں تو آپ کا انداز اور ہوتا ہے، اور جب کوئی ادبی نثر لکھتے ہیں تو اس کا اسلوب بالکل جدا ہوتا ہے، اور جب کوئی علمی مقالہ لکھتے ہیں تو اس کا اسلوب کچھ اور اختیار کرتے ہیں، لیکن قرآن کریم کا اعجاز یہ ہے کہ وہ ان تینوں اسالیب کو ساتھ لے کر چلتا ہے، اس میں خطابت کا زور، ادب کی شگفتگی اور علمی متانت ساتھ ساتھ چلتی ہے، اور کسی چیز میں کوئی کمی نہیں آنے پاتی ہے۔

(2) اگر ایک ہی بات کو بار بار دہرایا جائے تو کہنے والا ادب و انشاء میں خواہ کتنا ہی بلند پایہ مقام رکھتا ہوا ایک مرحلے پر پہنچ کر سننے والے اکتا جاتے ہیں زور ٹوٹ جاتا ہے اور اس کی تاثیر کم ہوجاتی ہے، لیکن قرآن کریم کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں ایک ہی بات بعض

اوقات بیسیوں مرتبہ کہی گئی ہے، ایک ہی واقعہ بار بار مذکور ہے، لیکن ہر مرتبہ نئے کیف، نئی لذت اورنئی تاثیر محسوس ہوتی ہے۔

(3) کلام کی شوکت اور راس کی نزاکت وشیرینی دومتضاد صفتیں ہیں، دونوں کے لئے الگ اسلوب اختیار کرنا پڑتا ہے، ان دونوں صفتوں کوایک عبارت میں جمع کر دینا انسانی قدرت سے باہر ہے، لیکن یہ صرف قرآنی اسلوب کا اعجاز ہے کہ اس میں یہ دونوں اوصاف بدرجہ کمال یکجا پائے جاتے ہیں۔

(4) قرآن کریم نے بعض ان مضامین میں بلاغت کواوج کمال تک پہنچا کر دکھایا ہے جن میں کوئی بشری ذہن ہزار کوشش کے بعد کوئی ادبی چاشنی پیدا نہیں کرسکتا۔ مثلاً قانون وراثت کو لیجئے یہ ایک ایسا خشک اور سنگلاخ موضوع ہے کہ اس میں دنیا کے تمام ادیب وشاعرمل کر بھی ادبیت اور عبارت کا حسن پیدا نہیں کر سکتے، لیکن آپ ''سورہ نساء'' میں:

یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُم الخ والے رکوع کی تلاوت کیجئے آپ بے ساختہ پکار اٹھیں گے کہ یہ کوئی غیر معمولی کلام ہے۔ اس پورے رکوع میں قانون وراثت کو بیان کیا گیا ہے، لیکن اس حسن وجمال کے ساتھ کہ ایک ایک جملے پر ذوق سلیم وجد کرتا ہے۔

(5) اختصار اور ایجاز قرآن کریم کے اسلوب کا امتیازی وصف ہے۔ اور اس وصف میں اس کا اعجاز نہایت نمایاں ہے۔ اس نے چند مختصر جملوں میں سیاست اور جہاں بانی کے وہ اصول بیان فرما دیئے ہیں، جو رہتی دینا تک انسانیت کی رہنمائی کریں گے، وہ فلسفہ اور سائنس کی کتاب نہیں، لیکن اس نے فلسفہ اور سائنس کے بہت سے عقدے کھول دیئے ہیں۔ وہ معاشیات اور عمرانیات کی کتاب نہیں، لیکن دونوں موضوعات پر اس نے اختصار کے ساتھ ایسی جامع ہدایات دیدی ہیں کہ دنیا کے علوم وفنون سیکڑوں ٹھوکریں کھانے کے بعد آج ان کے قریب پہنچ رہے ہیں۔

قرآن کریم کے اعجاز کے اسباب و وجوہ بے شمار ہیں، علماء امت نے ان کو تفصیل

سے بیان کیا ہے، کررہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ نہ یہ سمندر کبھی ختم ہوگا اور نہ یہ تشنگی کبھی دور ہوگی۔ نہ قرآنی عجائبات وانکشافات کا سلسلہ تمام ہوگا اور نہ تحیر واستعجاب کو راحت ملے گی، نئی نئی باتیں اور نکتے سامنے آتے رہیں گے اور قرآن مجید کی حقانیت واضح سے واضح ہوتی چلی جائے گی۔ حتی کہ وہ وقت آجائے گا جب انسانیت کا کوئی فرد قرآن کا انکار نہ کر سکے گا (انشاءاللہ)۔

ترے وجود پر جب تک نہ نزول کتاب
گرہ کشاں ہے رازی نہ صاحب کشا

☆☆

قرآن مقدس، ملعون رشدی اور ہماری ذمہ داریاں

● ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی

جنوری ۲۰۱۲ء کے آخری عشرہ (۲۰ سے ۲۴ تک) میں راجستھان کی راجدھانی جے پور میں منعقدہ پانچ روزہ بین الاقوامی ادبی میلے میں شاتم رسول متنازع مصنف مرتد وملعون سلمان رشدی کی شرکت کی سبھی تیاریاں تقریباً مکمل تھیں۔ اسلام مخالف ذہنیت کی حامل شخصیات اور فرقہ پرست جماعتیں بڑے زور وشور سے گستاخ رسول کی آمد کو مشتہر کر رہی تھیں۔ نیوز چینلوں اور ہندی، انگریزی پرنٹ میڈیا میں شہ سرخیوں میں اس تعلق سے خبریں پہلے صفحات کی زینت بن رہی تھیں، مگر اچانک ان کی خوشیوں میں اس دن گہن لگ گیا جب از ہر ہند دارالعلوم دیوبند نے ملعون رشدی کی ہندوستان آمد کے خلاف آواز بلند کی اور ملک بھر کی ملّی جماعتوں نے دارالعلوم دیوبند کے ہم زبان ہوکر زبردست مخالفت کی اور اس کی آمد کو آئین ہند کے منافی قرار دیا ساتھ ہی ساتھ اس فتنہ پرور مصنف کے ملک میں داخلے پر پابندی عائد کرنے کا پرزور مطالبہ کیا۔ بالآخر مسلمانوں کے مسلسل احتجاج و مظاہرہ کے پیش نظر جے پور بین الاقوامی ادبی میلے کے منتظمین نے رشدی کے دورہ کی منسوخی کا اعلان کیا۔ ادبی میلے کے ڈائریکٹر ولیم ڈیلریمپل نے کہا کہ اب وہ ویڈیو لنک کے ذریعہ میلے کی تقاریب میں حصہ لیں گے اور ویڈیو کانفرنسنگ کے توسط سے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ اس دوران بعض تنظیموں کے کارکنان نے رشدی کی متنازع کتاب ''شیطانی آیات'' کے اقتباسات ادبی میلے میں پڑھنے والے چار ادیبوں کے خلاف مقدمہ

درج کروایا اور اس کی ویڈیو کانفرنسنگ پر بھی احتجاج کیا۔ ملّی تنظیموں کا کہنا تھا کہ جس طرح سلمان رشدی کو یہاں آنے سے روکا گیا ہے اسی طرح اسے ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعہ خطاب کرنے کی بھی اجازت نہیں ملنی چاہیے۔ ان حالات میں راجستھان کے ڈپٹی پولیس کمشنر وجیند رجھالا نے منتظمین سے ملاقات کی اور کہا کہ ویڈیو کانفرنسنگ نہیں روکی گئی تو حالات کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ پھر صورت حال کے پیش نظر کمشنر جھالا نے یہ اعلان کیا کہ ہمیں منتظمین کی جانب سے یہ پیغام ملا ہے کہ ان حالات میں ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعہ رشدی کا خطاب نہیں ہوسکتا۔ اس طرح سے مسلمانوں کا احتجاج رنگ لایا اور دشمن اسلام سلمان رشدی کو ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ گزشتہ چند سالوں سے مذہب اسلام کے دشمنوں نے قرآن کریم اور سیرت نبویؐ کے تعلق سے جو روش اختیار کر رکھی ہے وہ پوری ملت کے لیے تشویش کا باعث ہے۔ قرآن کریم کو نذر آتش اور گستاخانہ خاکوں کی اشاعت اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اسلام دشمن عناصر نے امت مسلمہ کے خلاف جو محاذ کھول رکھا ہے اس کا مقابلہ کرنے اور جواب دینے کے لیے پوری امت کو مکمل اتحاد و یکجہتی کا مظاہرہ کرنے کے لیے میدان میں نکلنا ہوگا۔ نائن الیون کے ڈرامے کے بعد سابق امریکی صدر (جارج ڈبلیو بش) نے ایک طویل جنگ کا اعلان کرتے ہوئے ''کروسیڈ'' مقدس صلیبی جنگ کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اسے مسلم دنیا نے سنجیدگی سے نہیں لیا، مگر کئی ملکوں سے مسلمانوں کو مشتعل کرنے کی جو دانستہ کوششیں سامنے آرہی ہیں اور امت مسلمہ پر دباؤ ڈالنے کے جو طریقے استعمال کیے جارہے ہیں وہ پوری دنیا کے مسلمان بالخصوص مسلم ممالک کے اہل دانش کے تدبر اور تفکر کے متقاضی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مغربی دنیا اپنے اشتعال انگیز طرز عمل کو آزادئ اظہار کا نام دیتی ہے، مگر اس پر ردّعمل برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس صورت حال پر مسلم دنیا کے تمام حلقوں کو سر جوڑ کر بیٹھنا اور اس کا حل نکالنا ہوگا۔

قرآن کے دفاع کے لئے خود کو تیار کرنا:

قرآن کریم کی حفاظت اور اس کے تقدس کو برقرار رکھنا پوری امت کی اجتماعی ذمہ داری اور ایمان کا جزو ہے، اس کے بغیر مسلمان اپنی بخشش اور نجات کا تصور بھی نہیں کرسکتا، لیکن کیا اس کے تدارک کا یہی صرف ایک راستہ ہے کہ احتجاج اور مظاہرہ کیا جائے؟۔نہیں، اس طرح سے تو ہم مسلمانوں کو مشتعل کر کے دشمن اسلام کے ناپاک منصوبوں کو عملی شکل دے کر انہیں مضبوطی فراہم کررہے ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ انھیں سنجیدگی سے ان کے انداز میں جواب دیا جائے، تاکہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی محفوظ رہے۔ہمیں یہ اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ ہم نے کبھی یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ ملعون رشدی نے ''شیطانی آیات'' میں کیا گستاخانہ حرکت کی ہے اور اس کا خالص علمی انداز میں جواب دیا جائے۔دعوت حق اور دفاع عن القرآن کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جن آیات کو بطور خاص تنقید واعتراض کا نشانہ بنایا گیا ہے ان کی اس طرح تفسیر کی جائے کہ شبہات خود بخود ختم ہوجائیں۔یہ بھی سچ ہے کہ قرآن کریم پر جس منصوبہ بندی کے ساتھ حملے ہورہے ہیں اسی منصوبہ بندی کے ساتھ ہم اس کا دفاع کرنے کے لئے خود کو تیار نہیں کرسکے ہیں۔اس تعلق سے ہمیں کیا حکمت عملی اختیار کرنی چاہئے اس پر گفتگو کرنے سے پہلے ایک نظر جے پور ادبی میلے کے اس خصوصی مہمان کی شیطانی زندگی پر ڈالتے ہیں جس کے لیے اسلام دشمن عناصر پلکیں بچھائے رہتے ہیں۔

فارس نیوز ایجنسی کے مطابق ''شیطانی آیات'' کے مرتد مصنف سلمان رشدی کا شمار بیسویں صدی کے ایسے بیمار ذہن مؤلفین میں ہے جن کے بارے میں سب سے زیادہ خبریں شائع ہوئیں، مگر وہ اچھی شہرت کی بجائے بدنامی اور قارئین کی داد حاصل کرنے کے بجائے کم وبیش ڈیڑھ ارب مسلمانوں کی نفرت اور اشتعال کا نشانہ بنا۔اس نے اپنی گندی

ذہنیت کے باعث ایسی نفرت ابھاری کہ اب وہ ذاتی محافظ کے بغیر گھر سے باہر نہیں نکل سکتا۔آج اس کتاب کی تصنیف اور سلمان رشدی کے واجب القتل ہونے پر امام خمینی کے فتوے کے صدور کے ایک عرصہ گزر جانے کے بعد اسلام دشمن عناصر اور صہیونیوں کے دل میں اس قدر خوف وہراس بیٹھ چکا ہے کہ کوئی دوسرا ملعون اسلام کی توہین کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔سلمان رشدی ۱۹۶۸ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں حصول تعلیم کے دوران بائیں بازو کی جماعت میں شمولیت اختیار کرلیتا ہے۔انھیں ایام میں اس میں یہ شوق پیدا ہوتا ہے کہ کوئی آرٹسٹک کام کرے، چنانچہ تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ ایک چھوٹی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں نوکری کرلیتا ہے اور اسی دوران اپنا پہلا ناول لکھنا شروع کردیتا ہے جو ایک مسلمان روحانی شخصیت سے متعلق تھا، تاہم وہ اسے پبلش کرانے میں ناکام ہوتا ہے۔اسی طرح اس کی دوسری کتاب ''گریموس کی کہانیوں کا مجموعہ'' بھی خاص مقبولیت حاصل نہیں کرپائی، پھر پانچ سال بعد ۱۹۸۱ء میں اس نے اپنا ناول ''آدھی رات کے بچے'' پبلش کروایا۔اس ناول نے برطانیہ کی مطبوعات کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔ یہ ناول ہندوستان کی آزادی کی کہانی ہے جو ایک مسلم نوجوان کی زبانی بیان کی گئی ہے۔اس ناول میں بھی سابق وزیراعظم آنجہانی اندرا گاندھی کو بیوہ خطاب کرنے اور اس وقت کی حکومت کو ہدف تنقید بنانے پر اسے ہندوستان میں شدید اعتراض کا سامنا کرنا پڑا تھا۔اسی طرح ۱۹۸۳ء میں اپنے ناول "Shame" میں بعض پاکستانی شخصیات پر تنقید کی تھی جس پر پاکستان میں اس پر پابندی لگادی گئی۔سلمان رشدی کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ شخصیات یا مذاہب وادیان کی توہین کرکے شہرت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ بالآخر اس لعین نے اپنی جوانی کی خفیہ اوصاف کو منظر عام پر لاتے ہوئے پیغمبر اسلامؐ کی شان اقدس میں گستاخی کی۔۴۱ر سال کی عمر میں رشدی نے اپنا ناول ''شیطانی آیات'' لکھ کر پانچ لاکھ برطانوی پاؤنڈ انعام وصول کیا۔شیطانی آیات میں ایک من گھڑت اور ضعیف روایت کا حوالہ دے کر سرکار دوعالم

ﷺ کی شان میں گستاخی کی گئی ہے۔ ۵۴۷ صفحات پر مشتمل ناول ''شیطانی آیات'' سب سے پہلے انگریزی زبان میں ۲۶ ستمبر ۱۹۸۸ء کو ہینگوئن پریس کے ایک شعبہ ''وائکنگ'' نے شائع کیا۔ یہ ناول اس کی پانچویں تصنیف تھی۔ رشدی نے یہ ناول وائکنگ پریس کے یہودی سربراہ ''گیلن ریٹیکن'' کی سفارش پر ۵/لاکھ ۸۰/ہزار برطانوی پاؤنڈ کے عوض لکھا۔ کہا جاتا ہے کہ اتنے خرچ اور مہنگی کتاب کی اس سے قبل کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ یہ کتاب اسلام مخالف ہونے کی وجہ سے شروع سے ہی توجہ کا مرکز بن گئی اور بہت سے ممالک میں بڑی تعداد میں اس کے نئے نئے ایڈیشن شائع ہوئے۔ آہستہ آہستہ اس کتاب کی اشاعت پر مسلمانوں کی صدائے احتجاج بلند ہونے لگی۔ بریڈفورڈ کے شہر میں کچھ مسلمانوں نے اس کتاب کے سیکڑوں نسخے جلا ڈالے۔ ہند و پاک سمیت متعدد ممالک میں مسلمانوں نے مظاہرے کی صورت میں اپنے غم و غصے کا اظہار کیا جن میں کئی افراد شہید بھی ہوئے۔ آخر کار ۱۹۸۹ء میں ایرانی مذہبی رہنما امام خمینی نے سلمان رشدی کے ارتداد کا تاریخی فتویٰ صادر کر کے اسے واجب القتل قرار دیا جس نے اس کی آسودہ زندگی کو جہنم میں تبدیل کر دیا۔ اس فتویٰ کے بعد رشدی روپوش ہو گیا اور برطانوی پولیس نے نامعلوم مقامات پر اس کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ اس کی حفاظت کا سالانہ تخمینہ خرچ ایک کروڑ پونڈ لگایا گیا ہے۔ رشدی نے عالم اسلام کے غم و غصے کے باوجود اپنی کفر آمیز کتاب کی مزید اشاعت جاری رکھی۔ جب برطانوی حکومت اس کتاب کے سستے ایڈیشن کو شائع کرنے پر آمادہ نہیں ہوئی تو رشدی نے اسے امریکہ لے جا کر شائع کروایا۔

قابل ذکر ہے کہ ملعون رشدی کی اس شیطانی تصنیف پر مسلمانوں نے احتجاج و مظاہرے تو خوب کئے، مگر اس کے دفاع میں خالص علمی انداز میں باضابطہ کسی کتاب یا تحقیقی کام پر توجہ کم دی، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک بڑا حلقہ اس سے اب بھی ناواقف ہے کہ رشدی نے کن آیات کو نشانہ بنایا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اسلام، قرآن کریم اور پیغمبر اسلامؐ کے تعلق سے گستاخانہ اقدام و اعتراضات کا علمی انداز میں بھی دفاع کیا جائے۔ اس سلسلہ میں کئی مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ ہمارے اکابر علماء نے اسلام اور پیغمبر اسلام پر بہتان تراشی کرنے والوں کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کیا، بلکہ اسی انداز میں اس کا تشفی بخش جواب دیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خانؒ کی مشہور تصنیف ''خطبات احمدیہ'' اسلام اور پیغمبر اسلام کے دفاع میں ایک عظیم علمی سرمایہ ہے۔ سرسید علیہ الرحمہ اس کتاب کی وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''ولیم میور صاحب نے جو کتاب آنحضرت ﷺ کے حالات پر لکھی ہے اس کو میں دیکھ رہا ہوں، اس نے دل کو جلا دیا۔ اس کی ناانصافیاں اور تعصّبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت ﷺ کی سیرت میں جیسا کہ پہلے بھی ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے، اگر تمام روپیہ خرچ اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت میں تو یہ کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد ﷺ کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا، حاضر کرو۔''

سرسید نے اپنی کتاب ''خطبات احمدیہ'' کے ذریعہ گستاخان اسلام و پیغمبر اسلام کا بھرپور دلائل کے ساتھ جواب دیا جس سے پوری دنیا اسلام کی صحیح صورت حال سے روشناس ہوئی۔

علامہ شبلی نعمانی کی ''سیرت النبیؐ'' کی تصنیف کا محرک بھی جذبہ عشق محمدیؐ تھا۔ آکسفورڈ کے ایک پروفیسر مارگولیتھ کی ایک زہریلی کتاب ''محمد'' تھی جو ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی، جس میں ماضی کی طرح اس گستاخ رسول نے بھی اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف اپنے خبث باطن کا اظہار کیا تھا۔ اس تعلق سے علامہ رقم طراز ہیں۔

''یورپ کی غلط بیانیوں کا ایک دفتر ہے، یہ کمبخت لکھتے تو جھوٹ ہیں، لیکن پتا نہیں

لکھتے۔انھوں نے بستر مرگ پر وصیت کی کہ ''سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے، سب چھوڑ کر سیرت (سیرت النبی) تیار کرو۔'' چنانچہ ان کے شاگرد مورخ اسلام سید سلیمان ندویؒ نے اپنے استاد محترم کی اس وصیت پر عمل کرتے ہوئے سیرت النبیؐ کی بقیہ جلدوں کو مکمل کیا اور اس کے ذریعہ ان تمام الزامات، بہتان تراشیوں و گستاخیوں کا مدلل جواب دیا جو مستشرقین و اسلام دشمنوں نے اپنے زہریلے پروپیگنڈے سے پھیلا رکھے تھے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ''الجہاد فی الاسلام'' بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ مولانا محمد علی جوہرؒ کی تحریک پر اس اہم کتاب کو تحریر کرنے کا سبب بتاتے ہوئے مولانا مودودی لکھتے ہیں:

''دسمبر ۱۹۲۶ء میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مجھے مشکلات سے قطع نظر کر کے اقدام عمل پر مجبور کیا۔ یہ واقعہ شدھی تحریک کے بانی سوامی شردھانند کے قتل کا واقعہ تھا جس سے، جہلاء و کم نظر لوگوں کو اسلامی جہاد کے متعلق غلط خیالات کی اشاعت کا ایک نیا موقع مل گیا، کیونکہ بدقسمتی سے ایک مسلمان اس فعل کے ارتکاب کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا اور اخبارات میں اس کی جانب سے یہ خیالات منسوب کیے گئے کہ اس نے اپنے مذہب کا دشمن سمجھ کر سوامی کا قتل کیا ہے اور یہ نیک کام کرنے سے وہ جنت کا امیدوار ہے۔ان کی وجہ سے اسلام کے دشمن علمائے اسلام کے اعلانات اور اسلامی جرائد و عمائد ملت کی متفقہ تصریحات کے باوجود الزامات عائد کرنے لگے کہ قرآن کریم کی تعلیمات امن وسلامتی کے خلاف ہیں اور گاندھی جی نے اظہار خیال کیا کہ ''اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہوا ہے جس کی فیصلہ کن طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے۔''

مولانا مودودیؒ مزید کہتے ہیں کہ ایسے ہی مواقع ہوتے ہیں جن میں اسلام کی صحیح تعلیم کو زیادہ صفائی کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ انھوں نے اس اہم دینی فریضے کی ادائیگی اور اسلام و پیغمبر اسلام کی اصل تعلیمات سے دنیا کو باخبر کرنے کے لئے

کتاب ''الجہاد فی الاسلام'' تصنیف کی اور اس کے ذریعے ہی بھرپور دلائل کے ساتھ ثابت کیا کہ اسلام امن وسلامتی، رواداری، تحمل و برداشت کا دین ہے اور پیغمبر اسلام پوری دنیا کے لیے رحمت ہیں۔دشمن اسلام کے حوالے سے لگائے گئے الزامات محض بہتان تراشی ہیں۔

ان کے علاوہ بھی متعدد علماء کرام نے اپنی تخلیقات وتحقیقات، مقالے ومضامین کے ذریعے دشمنان اسلام و گستاخان رسولؐ کا بھرپور علمی وفکری محاسبہ کیا ہے۔آج بھی ہمیں اسی روش اور طریقے کو اپنانے اور اسی علمی وفکری محاذ کو مزید فعال کرنے کی ضرورت ہے۔

علماء کرام اور اہل دانش کو چاہئے کہ وہ اس ضمن میں امت کے عظیم مفکر و دانشوران کی علمی وفکری خدمات کا جائزہ لیں جنھوں نے ایسے واقعات میں ہمیشہ عدل وانصاف و برداشت کی عظیم اسلامی روایات کا دامن نہیں چھوڑا اور جذباتی ردّعمل و وقتی اشتعال پیدا کرنے کے بجائے ٹھوس و مستقل بنیادوں پر دلیل کی قوت سے اسلام دشمن عناصر اور مغرب کی اس سازش کو ناکام بنایا۔آج بھی ان کی کتاب ہماری رہنمائی کا ذریعہ ہیں۔

معارف قاسم کا قرآن کریم نمبر بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو انھیں مقاصد کی تکمیل کی غرض سے ترتیب دیا گیا ہے۔اسی خصوصی شمارہ میں جید علماء کرام ومحققین کے مضامین و مقالے کو ترجیحی طور پر شامل کیا گیا ہے۔جن کی تحریریں سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان کے علاوہ جو دیگر شمولات ہیں وہ بھی بیش قیمتی ہیں۔اللہ پاک ہماری اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے۔(آمین)۔

☆☆

قرآن مجید کے تعلق سے چند کوتاہیاں

● حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ

قرآن مجید کے معاملہ میں چند کوتاہیاں کی جارہی ہیں، ایک یہ کہ بعض لوگ تو اس کے پڑھنے کو قابل اہتمام نہیں سمجھتے، پھر ان میں بھی دو گروہ ہیں۔ ایک یہ کہ ان کا عدم اہتمام محض عملاً ہے، یعنی اس کا استحسان یا نافع ہونا تو ان کے اعتقاد میں ہے، مگر بوجہ غفلت کے اشتغال یا دوسری حاجات معاشیہ کے اس کو حاصل نہیں کرتے، نہ اپنی اولاد کے لیے اس کی سعی کرتے ہیں۔ اس گروہ کی حالت ایک درجہ میں اخف ہے، کیونکہ یہ لوگ ایک امر نافع کے تارک ہیں۔ کسی امر مضر کے مباشر و مرتکب نہیں، کیونکہ پورے قرآن کا پڑھنا مجموع امت کے اعتبار سے بغرض اس کی حفاظت کے فرض علی الکفایہ ہے، البتہ قدر ما یجوز بہ الصلوۃ فرض علی العین ہے اور قدر ما تبادی بہ واجب القرأۃ واجب علی العین ہے۔ تو یہ لوگ کسی فرض یا واجب علی العین کے تارک نہیں ہوئے۔ گو ایک برکت سے محروم ہیں، اسی وجہ سے ہم نے اس کو کوتاہی کی فہرست میں شمار کیا ہے۔

مکاتب قرآن کی ضرورت:

علاج اس کا یہی ہے کہ ان لوگوں کو اِدھر متوجہ کیا جائے اور جتنا ان کا خرچ دنیوی سمجھا جائے کسی قدر امداد مالی سے اس کا تدارک کیا جائے۔ کم از کم ان بچوں ہی کو خوراک و پوشاک کے لیے وظیفہ دیا جائے اور ہر بڑے گاؤں میں ایک ایک مکتب قرآن مجید کا قائم کیا

جائے اور وہاں کے گرد و نواح کے دیہات کے بچوں کو اس میں تعلیم دی جائے۔

بڑوں کو بھی جب فرصت میسر ہو تھوڑا وقت اس میں دیا جائے۔ یہ ممکن ہے کہ جتنوں نے شروع کیا ہے بوجہ قلت مناسبت کے یا بسبب عروض عوارض کے سب ختم نہ کرسکیں، تاہم ایک عدد عظیم ختم کرنے والوں کا اس سے بھی حاصل ہو جائے گا اور ایسے مکتبوں کا چونکہ خرچ زیادہ نہ ہوگا، اس لیے بیرونی امداد کی طرف مضطر نہ ہوں گے۔ ہر جگہ کے مکتب کے لیے خود وہاں کے چند صاحبوں کی امداد کافی ہوسکتی ہے، مگر اس امداد سے اس کا لحاظ رہے کہ ''کسی شخص پر دباؤ ڈال کر یا شرما کر اس سے وصول نہ کیا جائے کہ علاوہ خلاف دین ہونے کے اور بے برکتی کے ایسے چندوں کو ثبات بھی نہیں ہوتا۔

دوسرا گروہ وہ ہے کہ ان کے اس عدم اہتمام کا منشا سوء اعتقاد ہے، یعنی تحصیل الفاظ کو ایک فضول و لایعنی حرکت، بلکہ معاش میں مخل سمجھ کر مضر جانتے ہیں اور پڑھنے والوں کو احمق اور تاریک دماغ خیال کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی تلبیس میں ڈالتے ہیں۔

کوئی صاحب کہتے ہیں کہ جب معنی نہ سمجھے تو طوطے کی طرح پڑھنے سے کیا فائدہ؟ کوئی صاحب کہتے ہیں کہ جب دو سال اس میں صرف ہو گئے یا حفظ کرنے میں دماغ صرف ہو گیا، پھر علوم معاش کے وقت میں گنجائش نہیں ہوگی یا اس میں دماغ کام نہ دے گا۔ کوئی صاحب کہتے ہیں کہ بچوں کو قرآن مجید پڑھانے میں اس کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ لڑکے بے وضو ہاتھ لگاتے ہیں، سیپارے پھاڑتے ہیں، کہیں بے تعظیمی سے رکھ دیتے ہیں، اس لیے ادب کا مقتضا یہ ہے کہ ان کو پڑھایا نہ جائے... اس قسم کی باتیں ابلہ فریب تراشتے ہیں۔

یہ حضرات غور فرمائیں کہ فضول اس کو کہتے ہیں جس میں کوئی فائدہ نہ ہو اور جو شخص خدا کو خدا، رسول کو رسول اور دونوں کے کلام کو صادق مانتا ہے وہ اس کا انکار نہیں کرسکتا ہے کہ فائدہ منحصر نہیں ہے۔ فائدہ دنیویہ میں، پھر محض اس کے انتفاء سے مطلق کا انتفاء کیسے لازم آیا؟... یہ مسئلہ عقلیہ ہے کہ خاص کا انتفاء مستلزم نہیں ہوتا عام کے انتفاء کو۔

حرف کے بدلہ دس نیکیاں:

جب مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے کلام ہدایت فرجام سے ثابت ہے کہ خالی الفاظ پڑھنے سے بھی ایک ایک حرف پر دس دس نیکیاں ملتی ہیں اور ثابت ہے کہ خالی الفاظ کا پڑھنا بھی اعظم سبب ہے، حق تعالیٰ کی توجہ اور قرب کا۔

ہاں! کوئی ان نیکیوں کو اور حق تعالیٰ کی توجہ اور قرب ہی کو مدفضول میں شمار کرے تو اس مقام پر اس سے گفتگو نہیں ہے۔ مخاطب خاص وہی شخص ہے جو خدا اور رسول کی عظمت اور صدق کا قائل ہو اور جو اسی کا منکر ہو۔ اس کو بجائے اس وقت مخاطب بنانے کے قیامت کے روز انشاء اللہ تعالیٰ دکھا کر کہا جائے گا: ''ھذا الذی کنتم بہ تکذبون''. (مطففین: ۱۷) یہ ہی ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔

احمق کون؟:

یہ حضرات غور فرمائیں کہ اب پڑھنے والے احمق ہوئے یا ان کو احمق کہنے والے؟ اور اگر اب بھی سمجھ نہ آیا ہو تو بس یہ کہہ کر بات کو ختم کیا جائے:

''ان تسخروا منا فانّا نسخر منکم کما تسخرون. فسوف تعلمون من یأتیہ عذاب یُخزیہِ ویحل علیہ عذاب مقیم''. (ھود: 38)

(اگر تم ہنستے ہو ہم سے، ہم ہنستے ہیں تم سے جیسے تم ہنستے ہو۔ اب جلد جان لوگے کہ کس پر آتا ہے عذاب کہ رسوا کرے اس کو اور اترتا ہے اس پر عذاب دائمی)۔

یہ حضرات غور فرمائیں کہ جب الفاظ کا فائدہ علاوہ معانی کے فائدہ کے مستقل بھی ہے تو پھر اس کو طوطے کی سی پڑھائی کہنا کیسے صحیح ہے؟ ہم نے بہت سے انگریزی طالب علم دیکھے ہیں کہ وہ اقلیدس کی کسی شکل کا ثبوت نہیں سمجھتے، مگر پھر بھی اس امید پر عبارت یاد کر لیتے ہیں کہ امتحان میں عبارت لکھ دیں گے، چنانچہ وہ ایسا ہی کرتے ہیں اور پاس

ہو جاتے ہیں۔ چونکہ سمجھنے کے علاوہ اس پر بھی یہ فائدہ خاص پس ہو جانے کا مرتب ہوتا ہے۔ ہم نے کسی کو اس پر بیکار ہونے کا حکم لگاتے نہیں دیکھا، پھر ان سارے قضایا کی مشق کے واسطے بس دین ہی رہ گیا ہے۔ افسوس! افسوس!

یہ حضرات غور فرمائیں کہ کیا کبھی جاہ و عزت کی طلب کے لیے کوئی بڑا سفر انگلستان وغیرہ کی طرف کرنے میں یا کسی دربار میں رسائی کی کوشش کرنے میں یا کسی حاکم اعلیٰ کی خوشنودی و تقرب کی امید میں مالی خرچ یا بار گوارا نہیں کیا جاتا؟ تو کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے کہ خدا کی رضا و قرب و عنایت کی اتنی بھی وقعت نہیں ہے؟ ''وما قدروا اللّٰہ حق قدرہ''. اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کی قدر نہیں کی جتنا اس کی قدر کا حق تھا۔

حفظ قرآن سے قوت حافظہ بڑھتی ہے اور علوم معاشیہ میں کام دیتی ہے:

یہ حضرات غور فرمائیں کہ حفظ کرنے میں اگر اعتدال کے ساتھ مشقت ہو تو اس میں دماغ کا زیادہ کام نہیں، زیادہ کام ذہانت کا ہے، جیسا کہ ایک ڈاکٹر نے بھی بیان کیا، البتہ کسی قدر اشتراک قوت حافظہ کا ہے، جو کہ قوی دماغیہ سے ہے، سو حکماء نے اس کی تصریح کی ہے کہ جس قوت سے اعتدال کے ساتھ کام لیا جائے تو وہ اس کی ریاضت ہے اور اس ریاضت سے اس قوت میں ترقی ہوتی ہے۔ سو اس بنا پر تو ''حفظ قرآن سے قوت حافظہ بڑھے گی جو آگے علوم معاشیہ میں کام دے گی'' اور اس حافظہ کے بڑھ جانے سے دوسرے علوم میں دوسرا شخص جو کام چھ ماہ میں کر سکتا ہے، یہ شخص اتنا کام چار ماہ میں کر سکے گا۔ سو حفظ قرآن میں اتنی مدت بھی صرف نہ ہوگی، جتنی کفایت آگے نکل آئے گی....

البتہ جس کو حفظ سے مناسبت ہی نہ ہو، اس کا ذکر نہیں ہے۔ ایسے شخص کے لیے حفظ کرانے کا ہم بھی مشورہ نہیں دیتے۔

یہ عذر تو سب سے زیادہ عجیب ہے کہ قرآن کی بے حرمتی ہوتی ہے، کیا یہ حضرات خدا کو

مافی الضمیر پر حاضر و ناظر اعتقاد اور خیال کر کے اس پر قسم کھا سکتے ہیں؟ کہ بچوں کو قرآن نہ پڑھانے کی رائے اس نیت پر مبنی ہے کہ قرآن کی بے حرمتی نہ ہو، کیا خدا سے بھی اپنے اس مخفی حیلے کو چھپا سکتے ہیں؟ اگر یہی نیت تھی تو اچھا ہوش و عقل آنے کے بعد کتنے صاحبوں نے تحصیل قرآن کی طرف توجہ کی، بہرحال اس گروہ کی حالت پہلے گروہ سے زیادہ خطرناک ہے اور پڑھنے کا اہتمام نہ کرنا دونوں میں مشترک ہے، پس ایک کوتاہی تو یہ کی جاتی ہے۔

دوسری کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ بہت لوگ پڑھتے پڑھاتے ہیں، مگر پڑھ کر پھر اس کا نام تک نہیں لیتے، بلکہ ان میں جو حافظ ہیں وہ فخر کرتے ہیں کہ ہم نے سال بھر تک کھول کر بھی نہیں دیکھا باوجود اس کے ہم نے رمضان میں سنا دیا۔ اس ناواقفی کی بھی کوئی حد ہے؟ کہ جو بات عیب کی تھی اس کو ہنر سمجھ کر اس پر فخر کیا جاتا ہے...

جس چیز کا انسان ارادہ کر لیتا ہے کسی نہ کسی صورت میں اس کو کر ہی لیتا ہے:

ان صاحبوں کو سمجھنا چاہئے کہ مقصود پڑھنے سے تو یہ تھا کہ ہمیشہ اس کی تلاوت سے برکات حاصل کی جائیں، جب یہ نہ ہوا تو پڑھا نہ پڑھا برابر ہو گیا، پھر تجربہ سے معلوم ہوا ہے اور ایک حدیث میں بھی یہی مضمون آیا ہے کہ قرآن مجید نہ پڑھنے سے اس سے ایسی بے مناسبتی ہو جاتی ہے کہ پھر دیکھ کر بھی نہیں چلتا۔ یہ تو ناظرہ خواں کے بھولنے کی حد ہے اور حافظ کے بھولنے کی حد یہ ہے کہ حفظ نہ پڑھ سکے۔ صحیح یہ ہے اور نسیان قرآن پر حدیثوں میں وعید شدید آئی ہے، پھر یہ کہ اتنے دنوں کی، کی کرائی محنت جو کہ پڑھنے میں برداشت کی تھی، اس کے ضائع کر دینے کے لیے دل کیسے گوارا کرتا ہے؟ دوام تلاوت میں بعض لوگ کم فرصتی کا عذر کرتے ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ جس چیز کا انسان ارادہ کر لیتا ہے کسی نہ کسی صورت میں اس کو کر ہی لیتا ہے، خاص کر جبکہ کام بھی آسان ہو۔ کیا یہ بھی کوئی مشکل کام ہے کہ ۲۴ گھنٹے میں سے آدھا گھنٹہ کہ مجموعہ روز و شب کے ساتھ ۴۸/۱ کی نسبت رکھتا ہے، نکال کر

اس میں اگر ناظرہ خوان ہے تو ایک پارہ اور اگر حافظ ہے تو ایک یا ڈیڑھ پارہ بے تکلف پڑھ لیا کرے اور اتفاقاً ناغہ ہو جانا دوسری بات ہے، اس سے زیادہ وقت تو فضولیات و خرافات میں صرف ہو جاتا ہے جس میں نہ نفع دین، نہ نفع دنیا۔

کیا توبہ توبہ قرآن مجید کی ان فضولیات کی برابر بھی وقعت نہیں ہے کہ فضولیات کے لیے تو فرصت ہو جایا کرے اور قرآن مجید کے لیے نہیں ہوتی؟۔

تیسری کوتاہی یہ ہے کہ بعض دواماً بھی پڑھتے ہیں، مگر اس کی تصحیح کی طرف اصلاً توجہ نہیں فرماتے مراجعت نہ مخارج کی خبر نہ صفات کا اہتمام نہ نقص و زیارت سے تحاشی۔

کوئی صاحب ''ض'' کو صاف مخرج ''ظ'' سے ادا کرتے ہیں اور کوئی صاحب مخرج ''د'' سے ط-س-ص میں ان کے نزدیک کوئی فرق ہی نہیں، الف کے موقع پر نرا فتح پڑھنا اور فتح کی جگہ الف ملا دینا، بعض کی عادت ہو گئی ہے۔ نہ بے موقع وقف کر دینے سے اجتناب کیا جاتا ہے، حالانکہ اس سے بعض مواقع پر معنی میں فساد ہو جاتا ہے۔ اگر سانس ٹوٹنے سے اس کی طرف مضطر ہو تو ایسا کرے کہ جس لفظ پر وقف کیا ہے، اس کا پھر آگے بڑھنے میں اعادہ کرے، البتہ وصل سے ایسا فساد لازم نہیں آتا۔

اہل علم کی کوتاہیاں:

نہایت افسوس سے کہا جاتا ہے کہ اس کوتاہی میں اہل علم کا نمبر غیر اہل علم سے کچھ بڑھا ہوا ہے، حتیٰ کہ ایک صاحب سورہ ناس میں ''من الجنة و الناس'' کو اس طرح پڑھتے ہیں: ''من الجنات و النس'' پھر بعضے اس میں مساجد کے امام ہوتے ہیں۔ اس وقت اس غلطی کا اثر دوسروں تک بھی دو طور سے پہنچتا ہے۔

ایک یہ کہ اگر کوئی مقتدی صحیح خواں ہوا تو ان کی نماز ان امام صاحب کے پیچھے نہیں ہوتی اور چونکہ غلط خواں کا حکم صحیح خواں کی نسبت سے اُمّی کا سا ہے بہ نسبت قاری کے، اس

لیے اس خاص صورت میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ نہ امام کی نماز ہوتی ہے نہ دوسرے مقتدیوں کی، پس کتنی بڑی تباہی کی بات ہے۔

دوسرے اس طور سے کہ یہ امام صاحب اگر زمرہ اہل علم ہوئے تو علماء کی عوام میں سخت بے وقعتی ہوتی ہے جس کا اثر ایک گونہ علماء کے اتباع واقتداء تک بھی سرایت کرسکتا ہے، ہر چند کہ تجوید کے وجوب کے متعلق کلام طویل ومقتضی تفصیل ہے، مگر اتنی قدر میں کسی کو کلام نہیں کہ جس قسم کی غلطیوں کا ذکر اوپر ہوا ہے ان کی تصحیح واجب علی العین ہے جب تک کہ عدم قدرت وعدم مساعدت لسان متیقن نہ ہوجائے، جس کی موٹی دلیل یہ ہے کہ بدون اس قدر تصحیح کے قرآن کی عربیت باقی نہیں رہتی اور عربیت بدلالت خصوص لوازم قرآن سے ہے۔ پس اس کے نہ رہنے سے قرآن نہ رہے گا، اس کی ضرورت میں کیسے اشتباہ ہوسکتا ہے؟

اس میں قرآن کی یا عربی کی کیا تخصیص ہے؟ ہر زبان کی صحت اس کے خاص طرز ادا پر موقوف ہے، مثلاً لفظ ''پنکھا'' اور ''رنگ'' میں اخفا ہے۔ اگر نون میں اظہار کیا جاوے تو یقیناً لفظ غلط ہوجاوے گا، اور لفظ ''کھمبا'' اور ''دنبہ'' میں تلاب ہے، اگر یہ نہ ہو تو یقیناً لفظ غلط ہوجائے گا، مگر بات یہ ہے کہ قلوب میں ادراک نہیں رہا۔ نعماء آخرت کی رغبت، نعماء دنیا کے برابر نہیں رہی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (بقرۃ: ۱۵۵) (ہم اللہ تعالیٰ ہی کا مال ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں)۔

تصحیح قرآن صرف دو ہفتہ میں:

کل حروف اٹھائیس ہیں۔ ان میں بعض بعض تو قریب قریب صحیح نکلتے ہیں۔ ان کو مستثنیٰ کرکے جن میں اہتمام کی حاجت ہے، تقریباً ایک ربع یعنی سات ہیں، جیسے ث- ح- د- ص- ض- ط- ظ اور جو بالکل دیہاتی ہیں ان کے لیے اتنے ہی اور ہیں جیسے خ- ز- ش- ع- غ- ف- ق- اگر کسی ماہر کو تلاش کرکے ایک گھنٹہ روزانہ مشق کے لیے نکالا

جائے تو روزانہ ایک حرف کی ضروری مشق ہوسکتی ہے جس میں ایک ہفتہ اور دیہاتی کے لیے دو ہفتہ کافی ہیں۔ اگر احتیاطاً اس سے دونی مدت لی جائے تو آدھا مہینہ اور ایک مہینہ غایت غایت صرف ہوتا ہے تو کیا دین کی اتنی بڑی ضرورت کے لیے اپنی اتنی بڑی عمر میں سے اتنا حصہ بھی نہیں دے سکتے ہو؟ کتنا بڑا غضب اور ستم ہے؟

اسی طرح فتح اور الف کی مقدار کا فرق، اگر ایک پارہ میں اس کی درستی ہوجائے تو تمام قرآن یکساں ہی تمام کے لیے کافی ہے۔ اگر ایک رکوع روزانہ درست کرلیا جائے تو یہ کام بھی پندرہ بیس روز سے زیادہ کا نہیں ہے۔ پھر بقیہ قرآن بھی ہے۔ تھوڑا تھوڑا کرکے کسی ماہر کو سنا دینا، جو متفرق اوقات میں نہایت سہل ہے، زیادہ اطمینان اور احتیاط کی بات ہے۔

بعض لوگوں کو ماہر قرآۃ میسر نہ آنے کا بہانہ ہوتا ہے، لیکن اوّل تو اتنی تھوڑی مہارت رکھنے والے اکثر جگہ ایک دو پائے جاتے ہیں اور اگر بالفرض کوئی میسر نہیں تو چند آدمی مل کر کسی ماہر کو بلا کر رکھ سکتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جہاں کوئی طبیب نہیں رہا بستی والوں نے چندہ کرکے تنخواہ دار طبیب کو رکھا ہے۔ پس فرق وہی ضرورت اور عدم ضرورت کے اعتقاد یا استحضار اعتقاد کا ہے، یا بستی میں سے دو چار ہونہار شخصوں کو سفر میں بھیج کر ماہر بنوا سکتے ہیں۔ حق تعالیٰ کے عموم کلام میں یہ صورت بھی داخل ہے۔ ''**فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا فی الدين**''. (التوبة: ۱۲۱) (سو کیوں نہ نکلا؟ ہر فرقہ میں سے ان کا ایک حصہ تاکہ دین میں تفقہ حاصل کرنا)، اس کی روشنی میں بھیج کر ماہر بنوایا جائے تو اس میں ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیے کہ بچے جس وقت قرآن پڑھیں، پڑھنے کے ساتھ ہی اس تصحیح کا اہتمام رہے، یعنی اس میں ایک گونہ تکلیف ہے کہ غلط یاد کرکے پھر تصحیح کی جائے۔ اگر ابتدا ہی سے صحیح پڑھایا جائے، پھر بالخصوص زمانہ صبا میں تو یہ صحت ان کے لیے مثل امر طبعی کے ہوجائے اور مشقت کا ایک بڑا حصہ مختصر ہوجائے۔

امام مقرر کرنے کے آداب:

اس کا بھی التزام رکھیں کہ جب کسی کو مسجد میں امام مقرر کریں۔ کسی ماہر کو اس کی متعدد مختلف سورتیں سنوادی جاویں۔ اگر وہ صحت کی تصدیق نہ کرے تو کسی ماہر کو تلاش کریں۔ اگر ارزاں نہ ملے گراں لاویں۔

کیسی ظلم کی بات ہے کہ ہر دنیوی کام کے لیے ذی ہنر اور ذی لیاقت آدمی ڈھونڈا جاتا ہے، حتیٰ کہ لوہار، معمار، نجار، بلکہ گانے بجانے والا تک بھی، اور خدا کے روبرو جو سب کی طرف سے وکیل بن کر کھڑا ہوتا ہے وہ چھانٹ کر ایسا رکھا جاتا ہے جس میں نہ کمال نہ جمال، تمام محلّہ میں جونا کارہ، اندھا چندھا، فاتر الحواس، گنوار، بدتمیز، جاہل ہو۔ غرض جو کسی مصرف کا نہ رہے، اس کو امامت کے لیے انتخاب کیا جاتا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ البقرۃ:۱۵۵) ہم تو اللہ ہی کا مال ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

مشائخ اور اہل مداس کے لیے دستور العمل:

اہل مدارس اس کا التزام رکھیں کہ جو طالب علم ان کے مدرسہ میں داخل ہونا چاہیں امتحان داخلہ کا ایک جز اور اجزاء سے زیادہ نہیں تو برابر درجہ میں سہی صحت قرآن کو بھی قرار دیں اور بدون تجربہ صحت یا بعض حالات میں کم از کم وعدہ تصحیح تو ضرور لے لیا جاوے، بدون اس کے داخل نہ کریں اور وعدہ کی صورت میں جتنے سبقوں کا وہ مستحق ہے ان میں سے ایک سبق کی جگہ اس تصحیح کو رکھیں اور اس مرحلے کو طے کرنے کے بعد پورے سبقوں کی اجازت دیں اور نیز جن مدارس میں گنجائش ہے ان کو ایک مدرس تجوید کا مدرسہ میں بڑھانا ضرور ہے۔ اس طریق سے یہ فن عام ہوسکتا ہے۔

اسی طرح مشائخ کو چاہئے کہ اپنے مریدوں کو خصوصی خلفاء کو صحت قرآن پر مجبور کریں۔ کیا ظاہر یا باطن کا مقتدا بنایا جائے اور بچوں سے بھی کم ہو، کیا یہ معیوب نہیں؟

تجوید میں افراط وتفریط:

چوتھی کوتاہی یہ ہے کہ بعضے تصحیح وتجوید کو بھی ضروری سمجھتے ہیں مگر کاوش اور بحث ہی تک پہنچ کر رہ جاتے ہیں۔ جیسا اس وقت لوگ ض، ظ میں الجھنے والے دیکھے جاتے ہیں، مگر انشاء اللہ تعالیٰ ادا کے نام خاک بھی نہیں، بعضے عمل تک پہنچنے کا ارادہ کرتے ہیں، مگر اس کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ یعنی صرف لہجہ کا نام قراءت سمجھ کر اسی کا اہتمام کرتے ہیں اور یا تو خود کوئی طبعی لہجہ اختراع کرتے ہیں اور یا کسی مشاق کی نقل اتار لیتے ہیں اور اتار چڑھاؤ صحت وزن میں اس قدر غلو کرتے ہیں کہ بعضے ضروریات یا مستحسنات قرأۃ بھی فوت ہوجاتے ہیں، یعنی حرف گھٹا بڑھا دیتے ہیں۔ یا غنہ یا مد حذف کردیتے ہیں، تاکہ وزن ٹھیک رہے۔

سو اس کی نسبت سرکار نبوی ﷺ کا ارشاد ہے:

اقراء والقرآن بلحون العرب وأصواتها و إياكم ولحون أهل العشق وأهل السكتابين. (مشكوٰة شريف، ض ۱۹۱، عن حذيفة رضى الله تعالىٰ، بحواله بيهقى ۱۲ محمد على غفرله)

''تم قرآن شریف کو عربوں کے طریقے اور ان کے لہجے میں پڑھو عاشقوں اور اہل کتاب کے طریقوں سے بچو''۔

یعنی ایسے لحن سے منع فرمایا ہے اور اس کو لحون عرب سمجھنا خطاء عظیم ہے۔ جیسا شراح حدیث نے تصریح کی ہے بلکہ یہ لحن اہل عشق واہل کتاب میں داخل ہے جس کو منع فرمایا ہے اور اگر یہ لحن عرب ہوگا تو لحن اہل عشق کون ہوگا؟ پس خود حدیث کے الفاظ تو اس زعم کا تخطیہ کررہے ہیں اور لہجہ کا اہتمام تجوید میں تفریط ہے اور بعضے حقیقت صحیح سمجھتے ہیں، مگر خوش لحنگی کے ایسے مخالف ہیں کہ اس کا اہتمام بلیغ کرتے ہیں کہ تحسین فوت نہ ہونے پائے اور کسی کو ذرا تحسین صوت کرتا دیکھتے ہیں تو اس پر گانے کا طعن کرتے ہیں اور یہ تجوید میں افراط ہے۔ مثل تفریط مذکور کے یہ بھی نصوص کے خلاف ہے۔

حسن صوت اور گانے کا فرق:

زین القرآن بأصواتکم اورنحوہ حدیث قولی (قرآن شریف کو اپنی آوازوں کے ساتھ مزین کرو) اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے اس عرض پر کہ ''**لو علمت أنک تستمع لقرآنی لحبرته تحبیراً أو نحوه**''. (اگر میں جانتا کہ آپ میری قرأۃ سن رہے ہیں تو میں اس کو اور سنوارتا) آپ کا انکار نہ فرمانا حدیث تقریری اس تحسین صوت بالقصد کی مشروعیت و مطلوبیت میں نص صریح ہیں۔ اور یہی ہے وہ تغنی جس کا امر چند حدیثوں میں مروی ہے اور اس میں اور گانے میں فرق ظاہر ہے۔ یعنی گانے میں تو لہجہ مقصود اور دوسرے قواعد تابع ہیں۔ اگر لہجہ کے بنانے میں قواعد رہ جاویں تو پروا نہیں کی جاتی اور تحسین صورت میں قواعد مقصود اور حسن صوت تابع ہے، یعنی اگر قواعد کو محفوظ رکھ کر خوش آوازی ہو سکے تو اس کی رعایت کی جاتی ہے، ورنہ اس کی پروا نہیں کی جاتی ہے۔ اور بلا مقصد اگر کسی شخص کی قرأۃ کا کوئی جز کسی قاعدہ موسیقی پر بھی طبیعت کے تناسب یا موزونیت کی وجہ سے منطبق ہو جاوے تب بھی وہ گانے میں داخل نہیں، جیسا کہ خود قرآن مجید میں شعریت کی جا بجا نفی کی گئی ہے، مگر بعض عبارت یقیناً اوزان شعر پر منطبق ہیں۔

جیسے: ''**ثم اقررتم وانتم تشهدون ثم انتم هؤلاء تقتلون**''. (البقرة: ۸۳) پھر تم نے اقرار کر لیا اور تم جانتے ہو پھر تم وہ لوگ ہو کہ ویسے ہی خون کرتے ہو آپس میں) فاعلاتن فاعلاتن فاعلات پر منطبق ہے، مگر باوجود انطباق ہرگز اس کے پڑھنے والے کو شعر کا پڑھنے والا نہ کہا جائے گا۔

البتہ اگر بقصد تطبیق پڑھے گا شعر پڑھنے والا اور قرآن میں ایسا کرنے سے ناجائز فعل کا ارتکاب کرنے والا کہا جائے گا، بس یہی حالت لہجہ کی بالقصد تطبیق کی ہے، غرض اس چوتھی کوتاہی کی دو جانبین ہیں۔ تفریط، افراط، دونوں سے بچنا یہ وہ ہے جس کو لحون عرب و اصواتہا (عربوں کا طریقہ اور ان کی آوازیں) فرمایا گیا ہے۔

تجوید لارضاء خلق:

پانچویں کوتاہی یہ کہ بعضے تجوید پر قدرت حاصل کر لیتے ہیں۔ مجالس یا حالت امامت میں جب پڑھنے کا اتفاق ہوتا ہے اس پر عمل بھی کرتے ہیں، مگر جب خلوت میں تلاوت یا حالت انفراد میں نماز ادا کرتے ہیں۔ اس وقت اس کی طرف التفات بھی نہیں کرتے جس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی تصحیح سے غرض، ارضاء خلق تھی نہ کہ ارضاء خالق، کیا کسی فعل کے کسی ثمرہ کے ترتب کے لیے قوت و استعداد کا مرتبہ کافی ہے؟ یا صدور و فعلیت کی ضرورت ہی کیا تجوید پر صرف قدرت ہونے سے تجوید کے ثمرات مثل ادائے واجب و تضاعف اجر و رضائے حق و ادائے حق حاصل ہو سکتے ہیں؟ یا اس کے عمل و اجراء کی بھی ضرورت ہے؟

کیا کسی خارشی کو محض نسخہ کے یاد کر لینے سے اچھا ہوتا ہوا بھی دیکھا ہے؟ یا اس کے استعمال کی بھی ضرورت ہوتی ہے؟ بالخصوص سری نمازوں میں تو غنہ اور مد و اظہار و اخفاء کا تو کیا ذکر ہے؟ غالباً بلکہ یقیناً مخارج و صفات حروف پر بھی نظر نہیں ہوتی جو کہ لوازم حروف سے ہیں اور وہ نہیں تو حروف نہیں، اور جب حروف نہیں جو کہ بسائط ہیں تو قرآن کی عبارت نہیں جو کہ مرکب تھی اور جب عبارت نہیں تو قرأت نہیں، تو نماز کہاں؟ **فلیتدبروا ولیتذکروا** (بار بار غور و فکر کریں) اور یوں ابتلاء عام کو پیش نظر رکھ کر اس پر فتویٰ نہ دینا یہ دوسری بات ہے، مگر ترک واجب کے گناہ سے بچنے کے لیے بھی عموم بلویٰ کافی ہو سکتا ہے۔ **ومن لنا بذلک** (اس کی گارنٹی دیتا ہے؟) اور اگر مستحسنات سے قطع نظر کی جائے، مگر ضروریات کی حفاظت سے تو چارہ نہیں۔

معانی قرآن سے غفلت:

چھٹی کوتاہی یہ ہے کہ قرآن کے معنی جاننے کی رغبت جس قدر کہ کم پائی جاتی ہے، قریب قریب نہ ہونے کے ہے، سخت افسوس کی بات ہے کہ جو اصل مدار ہے اسلام کا، جو منبع

ہے تمام دینی علوم کا، جو اساس ہے دارین کے فلاح کا، جو خاص علاقہ ہے معاملہ وخطاب کا، اللہ تعالیٰ ورسول اللہ ﷺ سے اور آپ کی امت کو نہ خبر، نہ خبر کا شوق، ہماری اس جمود و خمود کی کوئی انتہا بھی ہے!!.....شاید بعض طالب علم ناز کرتے ہوں کہ ہم کو تو شوق تھا جب ہم نے تفسیر پڑھی سو کہنا تو اور بات ہے اور انصاف سے کہنا اور بات ہے۔

اگر انصاف سے غور کریں تو اس کا نام رغبت رکھنے سے خود ان کو ضرور شرم آوے گی۔ غور کر کے بتلاویں کہ اگر تفسیر، درس میں داخل نہ ہوتی، کیا اس وقت بھی پڑھتے، چنانچہ جو کتاب تفسیر کے درس میں داخل ہے اس سے زیادہ بھی کوئی پڑھتا ہے، بلکہ اس سے بھی مختصر کر دینے پر نظر ہوتی ہے۔ اگر آخر سال میں پانچ پارے جلالین کے رہ جاویں تو کیا آئندہ سال یا پھر کسی موقع پر اس کو پڑھتے ہیں؟ یا مر مار کر جلالین ہی ختم کر لی تو کیا تمام ضروری مضامین پر اس سے عبور ہو گیا؟

کیا مدارک یا ابوالسعود یا پوری بیضاوی میں کوئی مضمون جلالین سے زائد نہیں ہے، پھر اس کو کوئی پڑھتا ہے؟ میں سچ کہتا ہوں، اگر جلالین بھی درس میں نہ ہوتی تو اس کو کوئی بھی نہیں پڑھتا اور جلالین بھی پڑھی تو کیا پڑھی؟ اس کو ختم کر کے اتنی استعداد بھی تو نہ ہوئی کہ اگر بدون جلالین کے خالی غیر مترجم قرآن ان کے ہاتھ میں دے دیا جائے کہ ایک رکوع کا ترجمہ اور ضروری حل کر دو تو اسی کو حل کر سکیں؟ ہرگز نہ کر سکیں گے۔ ہاں جلالین منگا کر دے دو تو کچھ دال دلیا کر لیں گے، اس سے ثابت ہوا کہ قرآن کے معنی مقصود حاصل کرنے نہ تھے، بلکہ جلالین مقصود تھی۔ پھر کیا اس کو شوق ورغبت قرآن کہا جا سکتا ہے؟ میری رائے میں خاص اس جزو کا کہ بدون جلالین کے مطلب قرآن نہ بیان کر سکیں گے۔

اہل مدارس کو مشورہ:

تدارک یہ ہے کہ اہل مدارس طرز تعلیم میں کچھ ترمیم کریں، جیسے بعضی متون بدون

شرح کے پڑھائی جاتی ہیں۔ اسی طرح جلالین سے پہلے قرآن مجید بھی بدون کسی خاص تفسیر کے زبانی حل کے ساتھ پڑھایا جایا کرے۔ (جلالین، مدارک، ابوالسعود، بیضاوی، اتقان قرآن شریف کی مشہور تفسیر ہیں۔)

یا تو پورا قرآن پہلے پڑھا دیا جائے یا ایسا کریں کہ مثلاً ربع پارہ اوّل خالی قرآن میں پڑھا دیا پھر اسی قدر جلالین پڑھا دی اور مدرس اپنی سہولت کے لیے خواہ جلالین پاس رکھیں یا اور کوئی مبسوط تفسیر، تو طلباء کو اسی طرح پڑھنے میں اسی طرح یاد کرنے کی اور مطالعہ کر کے حل کرنے کی عادت پڑ جاوے گی۔

پس اس جزو کا بہت آسانی سے تدارک ہو جاوے گا۔ چونکہ جلالین میں جمیع فنون تفسیر مذکور نہیں، اس لیے کم از کم ''اتقان'' کو ضرور داخل درس کیا جاوے، یہ بیان تھا بدرغبتی کی کوتاہی کا۔

معانی قرآن میں رغبت کرنے والوں کی بے پروائی:

ساتویں کوتاہی ان کی ہے جن کو معانی قرآن کی کسی درجہ میں رغبت ہے...مگر کوتاہی یہ ہے کہ وہ بدون اس کے کہ کسی استاد سے یہ فن حاصل کیا ہو، یا دوسرے علوم عالیہ و درسیہ پڑھے ہوں۔ اردو کا کوئی ترجمہ یا تفسیر خرید کر (گو مصنف کا معتبر ہونا بھی محقق نہ ہو یا اس میں احتیاط ہی کر لی ہو) بطور خود اس کا مطالعہ شروع کر دیتے ہیں، پھر ان میں بھی دو قسم کی جماعت ہیں: ایک معتقد علماء کی، دوسرے کچھ انگریزی پڑھ کر یا انگریزی خوانوں کے پاس رہ کر خود اجتہاد کا دعویٰ کرنے والے۔ مشترک خرابی تو یہ ہے کہ اس حالت میں فہم معانی میں بکثرت غلطیاں رہ جاتی ہیں چنانچہ اس پر واقعات کثیرہ شاہد ہیں اور راز اس میں یہ ہے کہ

(۱) اوّل تو ایک زبان جب دوسری زبان میں ترجمہ ہو کر آتی ہے، ضرورت بعض مفہومات اصلی رنگ پر نہیں رہتے۔

(۲) دوسرے بہت سے مقامات میں خود اجمال ہے، جو بدون تفصیل کے وجوہ متعدد کو محتمل ہوتا ہے۔ بعض وجوہ کی تعیین بلا دلیل کر لی جاتی ہیں، جس طرح قانون کی کوئی کتاب اردو کے بڑے فاضل کو دی جائے اور وہ اس کو بیان کرے، مگر قانون داں اس کو سن کر بہت جگہ غلط بتلا دے گا۔

(۳) تیسرے یقیناً فہم قرآن میں بعض دوسرے فنون نقلیہ وعقلیہ کی حاجت ہے، جو شخص اُن سے بے خبر ہے وہ قطعاً غلطی میں پڑے گا۔

دوسری جماعت میں بالخصوص یہ خرابی ہے کہ ان کی غلطی پر بھی اگر کوئی مطلع کرے تو وہ اپنے کو اس بتلانے والے سے افضل اور عاقل سمجھ کر اس کی نہیں سنتے اور عقیدے میں یا عمل میں اس غلطی پر جم جاتے ہیں، پھر بعض اوقات بنا فاسد علی الفاسد کے طریق پر دوسرے اور فاسد کو اس پر متفرق کر لیتے ہیں۔

اصلاح کا طریقہ:

ان دونوں یعنی چھٹی اور ساتویں کوتاہی کے مجموعہ کی اصلاح یہ ہے کہ اگر کسی قدر علم یا صحبت علماء کی برکت سے فہم مع حرف شناسی حاصل ہو تب تو کسی محقق عالم سے کوئی ترجمہ یا مختصر یا متوسط تفسیر دریافت کر کے ان ہی عالم سے سبقاً سبقاً تمام قرآن کا ترجمہ بالتفسیر خوب سمجھ کر ختم کر لیں اور بعض مقامات جو باوجود سمجھانے کے سمجھ میں نہ آویں یا کچھ شبہ رہے، اس کے درپے نہ ہوں۔ بس زبانی مقصد شرع، اس عالم سے دریافت کر کے اس پر اعتقاد رکھ کر تفتیش چھوڑ دیں اور ایسے مقامات پر نشان بنا دیں، پھر جب تلاوت کریں تو تھوڑا سا مطالعہ اس ترجمہ یا تفسیر کا بھی کریں۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس طرح معانی قرآن سے مناسبت بڑھ جائے گی کہ یاد اور فہم دونوں میں سہولت اور ترقی ہوگی اور اس میں سہولت اور ترقی ہونے سے طبعاً رغبت بڑھے گی، پھر دوام آسان ہو جائے گا اور تدبر وعمل میں بھی جن

کا ذکر آگے آتا ہے اس سے اعانت ہوگی اور اگر اس قدر استعداد نہیں ہے تو پھر اس کے معانی پر مطلع ہونے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ

معانی قرآن پر مطلع ہونے کا سہل طریقہ اور درس قرآن کے بارے میں حضرت تھانوی کی رائے:

چند اشخاص مل کر اگر کوئی عالم بلا تنخواہ میسر ہو جاویں تو فبہا، ورنہ تنخواہ پر رکھ کر ان سے استدعا کریں کہ روزانہ یا چوتھے پانچویں روز معین وقت پر ایک یا نصف رکوع کا خلاصہ، مطلب، عام فہم زبان میں بطور وعظ فرما دیا کریں۔ اسی طرح قرآن کو ختم کر دیں۔ اگر ہمت ہو تو پھر دورہ شروع کر دیں اور جو شبہ پیدا ہو، اس کو زبانی پوچھیں جو سمجھ میں نہ آوے اس کو چھوڑ دیں اور حکم شرعی پوچھ کر اس پر کاربند رہیں۔

قرآن کے الفاظ ومعنی میں کوتاہیاں:

آٹھویں کوتاہی، جو الفاظ ومعنی دونوں کے متعلق ہے، وہ یہ ہے کہ بعضے لوگ الفاظ ومعانی کو کسب دنیا کا ذریعہ بناتے ہیں۔ مثلاً

☆ بعض تراویح اجرت پر سناتے ہیں۔

☆ بعضے مردوں پر پڑھ کر اجرت لیتے ہیں، یہ طلب مال تھا۔

☆ بعضے تعریف کرانے کی غرض سے مجالس میں یا محاریب میں امام بن کر پڑھتے ہیں۔ یہ طلب جاہ ہے اور یہ سب الفاظ کے ذریعہ سے ہے۔

☆ بعضے واعظ کہہ کر نذرانہ لیتے ہیں، بلکہ پہلے ہی نرخ طے کر لیتے ہیں۔

☆ بعضے شہرت کے لیے وعظ کہتے ہیں۔ یہ معانی کے ذریعہ مال یا جاہ کی تحصیل ہے۔

مسئلہ منصوصہ واجماعیہ ہے کہ طاعت پر اُجرت لینا اور اسی طرح کا ریـــــاءً کرنا معصیت ہے، البتہ الفاظ میں تعلیم پر اجرت لینا بقول مفتیٰ بہ اور رقیہ پر اجرت لینا بنـــاءً

عـلـىٰ انـه من اعمال الدينوية... اسی طرح معانی میں اگر وعظ کا نوکر ہی ہو اس وقت تنخواہ لینا یہ مستثنیٰ ہے۔ یہ مستثنیٰ اور بعض کتب فقیہ میں جو مذکر (واعظ) کو کچھ مال لینے کی اجازت لکھی ہے اس کا محمل یہی ہے ورنہ مجتہدین کے کلیہ سے غیر مجتہدین کا کسی جزئیہ کو استثناء کرنا غیر معتبر ہے۔

صنعت وحرفت کے ادارے کی ضرورت:

اس کی اصلاح میری رائے میں دو ہے:

ایک یہ کہ ایسے لوگوں کو کوئی دنیا کا کام بھی سکھلایا جائے تا کہ وہ مضطر ہو کر دین کو حرفہ نہ بنائیں اور اس کے لیے سہل صورت یہ ہے کہ امراء چندہ کر کے جا بجا صنعت وحرفت کے مدرسے کھلوادیں اور بچپن ہی سے سب کو کوئی نہ کوئی دستکاری ضرور سکھلائی جاوے۔

دوسری یہ کہ جو کسی وجہ سے نہ سیکھیں یا سیکھنے سے معذور ہوں اور اس لیے وہ خدمت دین ہی کے لیے فارغ ہوں تو بلا تعین لوگوں کو اتنی خدمت کرنی چاہیے کہ ان کی ضرورت وحاجات تو پوری ہوتی رہیں تا کہ ان کی نیت بگڑنے نہ پائے۔

یہ کوتاہی الفاظ ومعانی کے متعلق تو وہ تھی جس میں الفاظ ومعانی کو بحال خود باقی رکھ کر اس سے دنیوی غرض حاصل کی گئی۔ اس سے اقبح اور اشنع وہ ہے کہ ایسی اغراض مال و جاہ کے لیے الفاظ یا معانی میں تحریف کا ارتکاب کیا جائے، جیسے بعض جاہل حفاظ کو دیکھا جاتا ہے کہ امتحان کے طور پر پوچھا کرتے ہیں... کہ بتلاؤ کہ الحمد میں شیطان کا نام کئے (کتنی) جگہ آیا ہے؟ پھر خود افادہ فرماتے ہیں کہ سات جگہ: دُلل، ہرب، کنس، کنع، کیو، تعل اور بعل ہے۔

اسی طرح سات گنوادیتے ہیں۔ بھلے مانسوں نے دلل کو ترکیب دی ہے۔ الحمد کے آخر اور للہ کے اوّل سے اور ہرب کو للہ کے آخر اور رب العالمین کے اوّل سے اور کنع کو

ایاک کے آخر اور نعبد کے اوّل سے اور کنس کو ایاک کے آخر اور نستعین کے اول سے...اس کے لغو ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ یہ امر قیاسی تو ہے نہیں، نقل کی ضرورت ہے۔ پس ان سے تصحیح نقل کا مطالبہ کافی ہے۔

بچپن میں ایک حافظ صاحب سے سنا تھا کہ بتلاؤ ''لکوبل'' کہاں آیا ہے؟ پھر فرمایا: ''من قبلک وبالآخرة''. الخ

ایک صاحب نے فرمایا تھا کہ قرآن میں ایک جگہ ہے: اِدھر اللہ اُدھر اللہ۔ بیچ میں اونٹنی کا بچہ، یعنی اس آیت میں ''فقال لهم رسول الله ناقة الله''. (الشمس:۱۲) (پھر کہا ان کو اللہ کے رسول نے، خبردار رہو اللہ کی اونٹنی سے) اور بہت سی ایسی خرافات گڑھ رکھی ہیں۔ یہ تصرف فی الالفاظ ہے۔

معانی میں تصرف فاسد:

بعضے معانی میں تصرف فاسد کرتے ہیں، بعضے محض بعض لوگ شہرت یا تجارت کے لیے قرآن مجید کا ترجمہ یا تفسیر محض اپنی رائے سے یا اہل زمانہ کے مذاق کے اتباع سے لکھ لکھ کر شائع کرتے ہیں اور اس زمانہ میں اس کا فسادِ عظیم برپا ہے۔ ائمہ فن نے تصریح کر دی ہے کہ جب تک فنون عربیہ وعلوم شرعیہ میں کہ تعداد ان کی چودہ، پندرہ تک پہنچی ہے طاقت و مہارت نہ ہو تو تفسیر میں کلام کرنا حرام ہے۔ کیا اہل تحقیق کے تراجم وتفاسیر کافی نہیں ہیں؟ جو ان آراء کاسدہ واہواءِ فاسدہ کی حاجت ہوئی۔

''فی طلعة الشمس ما يغنيک عن زحل''

(سورج کے ہوتے ہوئے زحل کی کیا ضرورت ہے؟)

اس لیے ساتویں کوتاہی کے آخر پر جو مضمون عرض کیا ہے اس کو پھر یاد دلاتا ہوں کہ ایسے تراجم وتفاسیر کی خرابیوں میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

آداب تلاوت میں کوتاہیاں:

نویں کوتاہی یہ ہے کہ اس کی تلاوت کے وقت اس کے آداب کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ نہایت بے دلی سے، بے رغبتی سے، بے عظمتی سے، جتنا پڑھنا ہوا جھٹ پٹ بوجھ سا اتار کر نام کر کے اٹھ کر چلتے ہوئے، بالخصوص رمضان میں تو بعض حفاظ ایسا پڑھتے ہیں کہ قرآن کے حقوق بھی فوت ہوتے ہیں اور مقتدیوں کے حقوق بھی۔

بعض نے تلاوت میں ایک اور طریق اختراع کیا ہے کہ ایک قاری نے ایک آیت پڑھی، دوسرے نے دوسری بلکہ کبھی ایک نے آیت کا ایک ٹکڑا پڑھا اور دوسرے نے پورا کیا۔ بعض دفعہ سب مل کر گلا ملا کر پڑھتے ہیں اور اگر ایک کی سانس لینے سے دوسرا آگے بڑھ گیا تو وہ پھر درمیان کے اجزاء چھوڑ کر آگے سے شریک ہو جاتا ہے۔

یہ سب ظاہر ہے کہ ادبِ قرآن کا ضائع کرنا ہے اور اس میں تغنی مذموم وقطع کلمات اور اختلالِ نظم یہ مفاسد علیحدہ رہے۔

تلاوت کے آداب:

تلاوت کے آداب بہت ہیں، مگر طریق ذیل انشاء اللہ تعالیٰ سب کا جامع ہے۔

☆ جب قرآن پڑھنے کا ارادہ کرے، وضو کر کے روبقبلہ، اگر سہل ہو، ورنہ جیسے موقع ہو خشوع کے ساتھ بیٹھے۔

☆ یہ تصور کرے کہ حق تعالیٰ مجھ کو فرمائش کرتے ہیں کہ ہم کو پڑھ کر سناؤ۔

☆ یہ تصور کرے کہ اگر کوئی مخلوق مجھ سے ایسی فرمائشیں کرتی تو میں کیسا پڑھتا؟ تو خدا تعالیٰ کی فرمائشیں کی تو زیادہ رعایت چاہئے اور اس کے بعد تلاوت شروع کرے۔

اور جب یہ تصور ضعیف ہو جائے تلاوت بند کر کے اسی مراقبہ کو پھر تازہ کرے، البتہ اگر تکثیر تلاوت مقصود ہو اور اتنی مہلت نہ ہو کہ مقید ہو کر بیٹھ سکے تو ان آداب میں تخفیف

ہو سکتی ہے، مگر تجوید بقدر واجب میں تخفیف ممکن نہیں۔

عمل سے غفلت اور قرآن کے ساتھ ناانصافی:

دسویں کوتاہی یہ ہے کہ بعضے سب طرح کے لیپ پوت کر لیتے ہیں، مگر جو نزول سے مقصود اعظم ہے اور قرآن کا سب سے بڑا حق ہے، یعنی عمل، اس کا کچھ بھی اہتمام نہیں کرتے، چونکہ اس کے اعتقاد کی ضرورت میں کسی کو کلام نہیں، اس لیے ہم اس میں تطویل نہیں کرتے، البتہ یہ امر قابل تنبیہ ہے کہ ''عمل کا طریقہ وہی معتبر ہے جو سلف نے بتایا'' اور عمل کرنے میں ان سب علوم کو دخل ہے جن کا صحیح وحجت ہونا خود قرآن نے بتلایا ہے، یعنی حدیث وفقہ وکلام وفرائض، تصوف جو سلف کے خلاف نہ ہو۔

افسوس! بعضے لوگ اس وقت قرآن کا اتنا ہی حق سمجھتے ہیں کہ اس کی قسم کھالی، بیمار کو اس کی ہوا دے دی، اس سے فال نکال لی، بچہ کا نام نکال لیا۔ چوری کے شبہ میں لوٹے پر ''یٰسین'' پڑھ کر اس کو گھما دیا، کوئی مر گیا دو چار ختم پڑھوا دیئے یا کہیں کہیں دستور ہے کہ ایک قرآن کے عوض میت کے سارے گناہ فروخت کر ڈالے یا تعویذ بنا کر بازو پر باندھ لیا۔

افسوس! کیا رسول اللہ ﷺ پر تئیس سال تک اس کا نزول اور مخالفین کی اذیت پر تحمل بس انہی مقاصد کے لیے تھا؟۔

یہ دس کوتاہیاں ہیں جو بطور نمونہ کے بیان کی گئیں۔ کسی میں ایک ہے، کسی میں متعدد، کسی میں مجموع اور یہ سب متعلق تحصیل کے تھیں۔ اب اس کے ملحقات میں سے ایک کوتاہی استماع کے متعلق ذکر کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

الفاظ ومعنی کے آداب میں کوتاہیاں:

وہ گیارہویں کوتاہی یہ ہے، کہ اس کے الفاظ یا معنی کا ادب بھی ملحوظ نہیں رکھا جاتا، چنانچہ جہری نماز میں 'قرأۃ امام'' کی طرف توجہ نہیں کی جاتی، حالانکہ ''امر فاستمعوا لہ''.

(الاعراف:۲۰۳) ''تو اس کی طرف کان لگائے رہو'' کو داخل نماز کے وجوب کے لیے کہا گیا ہے، خارج نماز کے تلاوت کرنے والے کی آواز پر اپنے دنیوی مخاطبات میں آواز کو بلند کیا جاتا ہے، حالانکہ ''**لاترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی**''. (الحجرات:۱) یعنی بلند نہ کرو اپنی آوازیں نبی کی آواز سے۔ علماء نے درس حدیث کے وقت رفع صوت کو منع کیا ہے۔ فضلاً عن القرآن (چہ جائیکہ قرآن مجید)۔

اگر کوئی پڑھنے والا غلط پڑھتا ہے اس کو بتلایا نہیں جاتا حتیٰ کہ اساتذہ اپنے شاگردوں سے سنتے ہیں اور انھیں ٹوکتے اور وہ غلطیاں عمر بھر کے لئے ان کی گلوگیر ہو جاتی ہیں.....

بعض حفاظ تراویح میں دوسری جگہ جا کر پڑھنے والوں کو کبھی کھٹکھٹا کر، کبھی کھنکھار کر، کبھی غلط بتلا کر پریشان کرتے ہیں، کیا قرآن مجید سننے کا یہی ادب ہے؟۔

اور اسی طرح استماع معانی، یعنی وعظ کے وقت بعضے آدمی آپس میں باتیں کیا کرتے ہیں، حالانکہ آیت: ''**وإذا قرئ القرآن**'' **الخ** (اور جب قرآن پڑھا جائے) سے اور آیت: ''**فمالهم عن التذكرة معرضين**'' (پھر کیا ہوا ہے ان کو کہ نصیحت سے منہ موڑتے ہیں) سے یہ حرام ہے، ہاں کسی عذر سے وہاں نہ بیٹھ سکنا یا اٹھ کر چلے جانا مضائقہ نہیں، وہاں حاضر رہ کر دوسری طرف مشغول ہونا یہ مذموم ہے۔

غرض یہ سب مذکورہ کوتاہیاں اور جو ان کے اشباہ و نظائر ہوں ان سب کا تدارک کرنا ضروری ہے، جیسا ہم مضمون کے درمیان میں ہر ایک کے تدارک کا نہایت آسان، آسان طریقہ بھی بتلاتے آئے ہیں، ورنہ اندیشہ ہے کہ قیامت میں کہیں ہماری وہی حکایت نہ ہو۔ ''**وقال الرسول يا رب ان قومي اتخذوا هذا القرآن مهجوراً**''. (الفرقان:30) ''اور کہا رسول نے اے میرے رب میری قوم نے ٹھہرایا ہے اس قرآن کو جھک جھک) پھر اس وقت کی حالت دیکھ کر یہ کہنا پڑے:

"**نعوذ بالله من غضب الله وغضب رسول الله**". یعنی ''ہم اللہ سے اللہ کے

غضب سے اور اللہ کے رسول کے غضب سے پناہ پکڑتے ہیں۔'' مگر وقت ہوگا کہ ''**لا ينفع الندم ندمه حيث و إن الندم عمل، وهو دار الجزاء لا دار العمل. اللهم وفقنا لما تحب وترضىٰ واجعل آخرتنا خيراً من الاولى**''. یعنی ''شرمسار کو شرمندگی نفع نہ دے گی، اس وجہ سے کہ ندامت ایک عمل ہے اور وہ دار الجزاء ہے، نہ کہ دار العمل۔''

قرآن سے نام نکلوانا ادب کے خلاف ہے:

(۱) بعض کی عادت ہے کہ بچہ کا نام رکھنے کے لیے قرآن مجید میں کسی خاص طریقہ سے جو خود ان کا مقرر کیا ہوا یا ان کے کسی معتقد فیہ سے (عام اس سے کہ اس اعتقاد کا مبنی صحیح ہو یا غلط) منقول ہوتا ہے غور کرتے ہیں تو اتفاق سے اس موقع پر کوئی نام لکھا ہوا مل گیا تو وہ، ورنہ کوئی حرف جو شروع سطر وغیرہ میں مل گیا لے کر اس حرف سے جو نام شروع ہو وہ نام متعین کر دیتے ہیں۔ اور اگر جاہل ہوئے تو خود سمجھتے ہیں ورنہ دوسرے جاہل کو یوں سمجھاتے ہیں کہ قرآن مجید سے اس نام کا رکھنا نکلا ہے۔

بعضے اس نام نکلوائی پر کچھ نذرانہ بھی وصول کرتے ہیں اور جہلا یہ سمجھ کر دیتے ہیں کہ حضرت نے بڑی توجہ سے عالم غیب کا راز منگا دیا ہے، ان کی خدمت ضروری ہوگئی ہے۔ قرآن مجید میں جس غرض کے لیے موضوع نازل ہوا ہے جس کی تصریح خود کلام مقدس میں ہے:

كتاب أنزلناه إليك مبارك ليدبروا آياته وليتذكر أولوا الألباب. (ص:38) ''برکت والی کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف اتاری ہے تاکہ دھیان کریں لوگ اس کی باتوں پر اور تاکہ سمجھیں عقل والے۔''

جس کا حاصل دین کا علم و عمل ہے اور اگر اس پر کوئی شخص کاربند ہو اور برکت کے لیے اپنی کسی مباح غرض میں بھی اس سے کچھ اقتباس کر لے تو مضائقہ نہیں۔ بشرطیکہ اس میں کسی

حدشرعی سے تجاوز نہ ہو،لیکن قرآن مجید سے ان اغراض میں ایسے طور پر کام لینا کہ گویا قرآن اسی کام کا رہ گیا ہے،جس کا قرینہ اور علامت یہ ہے کہ اس کے علم اور اس پر عمل کی طرف کبھی توجہ نہ کی جائے،مگر ایسے موقعوں پر قرآن یاد آئے۔کیا یہ ظلم۔وضع الشیء فی غیر محلہ ''بیجا استعمال''۔نہیں ہے؟ پھر اس پر اور مزید اگر یہ سمجھا جائے کہ اس بچہ کا یہ نام ہونا یہ مفہوم قرآنی ہے،کیا یہ افتراء علی اللہ نہیں ہے؟ خاص کر وہ دوسری صورت کہ اگر حرف ''خ'' نکل آیا تو خدا بخش نام کو قرآن مجید کی طرف منسوب کرنا افتراء در افتراء نہیں ہے...

پھر اس پر کچھ وصول کر لینا کریلا اور نیم چڑھا کی مثال کا مصداق نہیں ہے؟۔کیا یہ اشتراء دنیا بالقرآن کی اقبح الافراد نہیں ہے؟

اگر نام برکت کا مقصود ہے تو اوّل تو وہ قرآن کے ایسے مطالعہ پر موقوف نہیں،حضرات انبیاء علیہم السلام کے نام پر،نام رکھ دو اور ''اسماء حسنیٰ الٰہیہ'' میں سے کسی نام کے ساتھ عبد لگا کر رکھ دو،بالخصوص عبداللہ وعبدالرحمٰن کی بالتعیین ترجیح وارد ہے اور اگر قرآن سے بھی اس نام کا تلبس مقصود ہے تو کسی عالم محقق سے رجوع کیجئے۔وہ قرآن کے کسی مضمون یا کسی لفظ کی مناسبت کے لحاظ سے خواہ قرآن دیکھ کر ایسے طریقے سے کہ اس میں غلو نہ ہو جیسا عنقریب نمبر۲ میں آتا ہے۔

یا قرآن کی بے دیکھے کسی اپنی محفوظ آیت سے کوئی نام بتلا دیں گے،نہ بس کی ضرورت اور نہ اس اعتقاد کی اجازت کہ قرآن میں اس نام رکھنے کا حکم نکلا ہے۔

اس قسم کی خرابیاں ان بندگان زر نے پھیلائی ہیں جو عوام کی نظر میں کوئی دینی امتیاز رکھتے ہیں،مثلاً خود،مکر وفریب سے پیر بن گئے ہیں،یا کسی بزرگ کی اولاد میں ہوئے فی الواقع یا بالادّعا ایسے امور کی نسبت حضرت عارف شیرازی کا ارشاد ہے:

دام تزویر مکن چوں دیگران قرآن را

''قرآن کو دوسروں کی طرح جھوٹ کا پھندہ نہ بناؤ۔''

قرآن سے فال نکالنا:

(۲) بعضے کسی مقصد مباح یا غیر مباح میں اوفق بالمصلحۃ پہلو کی تعیین کے لیے اور بعضے اس سے بڑھ کر کسی گزشتہ واقعہ کے معلوم کرنے کے لیے قرآن مجید میں فال دیکھتے ہیں،اس کے کسی مضمون سے اپنے مطلب کے مناسب کوئی بات نکال لیتے ہیں اور اس کی صحت کے معتقد ہوتے ہیں۔

افسوس! یہ آفت نیم علم لوگوں میں ہے،کیونکہ بے علم آدمی مضمون ہی کو نہیں سمجھے گا جو مآخذ ہے۔''فال'' کا بخلاف امر اوّل کے نام لکھا ہوا دیکھ لینا یا کسی حرف کا کوئی نام سوچ لینا یہ تو عامی بھی کر سکتا ہے۔

ہاں زبردستی کوئی بے علم یہاں بھی بین السطور ترجمہ دیکھ کر یا کسی ذی علم سے اس آیت کا ترجمہ پوچھ کر نیم عالموں میں داخل ہو جائیں تو اور بات ہے۔

بہرحال یہ کام وہ کرے گا جو اوّل قرآن کو الٹا سیدھا کچھ سمجھے،اس لیے ان لوگوں پر زیادہ افسوس ہے اور اس ناتمام علم سے اس کو''استخارہ'' پر قیاس کیا جاتا ہے،جب مقیس علیہ ثابت بمعہ مقیس بھی جائز!

بعض فال دیکھنے والوں کا یا اکثر ان لولوگوں کا جو جلسہ فال میں موجود ہوں،یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ گویا خدائے تعالیٰ نے قرآن سے یہ خبر دے دی ہے تو اب اس میں احتمال نقیض کا احتمال محال ہے اور نہایت جرأت سے کہتے ہیں کہ واہ صاحب! کیا قرآن میں غلط لکھا ہے؟ افسوس! ان حرکات پر ہنسی شروع ہو کر اخیر میں رونا آتا ہے۔

خوب سمجھ لینا چاہیے کہ نمبر ایک میں جو بعضی شکایتیں مذکور ہوئی ہیں کہ قرآن مجید کے علم وعمل کو چھوڑ کر اس سے یہ کام لینا یا اس کو مدلول قرآن اور فرمودۂ حق سمجھنا جو کہ افرادِ ظلم و افتراء سے ہیں،یہاں سبھی یاد دلائی جاتی ہیں کہ دونوں جگہ مشترک ہیں اور ان کے علاوہ اور

بھی بعض خاص تنبیہات قابل عرض ہیں۔

قرآن مجید، عملیات اور ناجائز اغراض:

(۳) بعضے قرآن مجید کو ناجائز اغراض میں بطور عملیات برتتے ہیں، یہ تو عملی تقصیر ہے اور پھر غضب یہ کہ اس کو برا نہیں سمجھتے اور یوں کہتے ہیں کہ صاحب ہم کوئی ''سفلی عمل'' تو نہیں کرتے قرآن کی آیتیں پڑھتے ہیں۔ یہ عملی، یعنی اعتقادی تقصیر ہے۔

اوّل تو اگر جائز ہی اغراض میں عملیات کے طور پر مگر غلو کے ساتھ برتے، یعنی نہ علم سے غرض رکھے، نہ عمل سے، جب قرآن کی یہ آیتیں ڈھونڈی جائیں تو اسی غرض سے کہ اس سے دنیا کا فلاں کام ہوجاتا ہے اور اس سے فلاں مطلب نکلتا ہے، جیسے بعض امراء کے گھر میں اسی غرض سے رکھا رہتا ہے کہ

☆ جب کوئی بیمار ہوگیا، اس کو قرآن کی ہوا دے دی۔

☆ ایک مصحف، نہایت خفی قلمی یا مطبوع تعویذ بنا ہوا رکھا رہتا ہے، جب کوئی بیمار ہوا گلے میں ڈال دیا، ومثل ذلک۔

اس کا بھی اس تقریر سے جو نمبر اوّل میں مذکور ہے غیر مرضی ہونا ثابت ہے اور اگر وہ اغراض بھی ناجائز ہوں جیسے: (۱) یٰسین پڑھ کر چور کا نام نکالنا۔ (۲) ناجائز موقع پر محبت کی تدبیر یا زوجین میں یا باہم اقارب میں تفریق کی یا بلا اذنِ شرعی مطلق دو شخصوں میں تفریق کی تدبیر کرنا۔ (۳) کسی کو ہلاک کر دینا۔ (۴) دست غیب کے ایسے عمل کرنا کہ روپے رکھے ہوئے مل جایا کریں۔ (۵) جنات کو تابع کر کے ان سے کام لینا گو جائز ہی کام ہو اور ناجائز کا تو کیا پوچھنا...؟۔

پس اگر ایسے ناجائز اغراض ہوں تو ناجائز کام کے قصد و اہتمام کا معمولی گناہ تو ہے ہی جو سب جانتے ہیں، یہاں وہ گناہ اس لیے اور بھی شدید ہوجائے گا کہ اس شخص نے ''کلام

پاک کو ناپاک غرض کا آلہ بنایا۔''

اور اگر ان اغراض کے ناجائز ہونے میں خفا ہو، تو مفصلاً اہل فتویٰ سے تسلی کر لیجئے۔ مختصراً اتنا یہاں بھی لکھے دیتا ہوں کہ اوّل تو چور کا نام نکلنا اس عمل سے کچھ تعلق نہیں رکھتا، یہ عامل کے یا کسی صاحب مجلس کے خیال کا تصرف ہے، اس کا سمجھنا مسمریزم جاننے پر موقوف ہے اور حاضرات وغیرہ جو عامل لوگ کرتے ہیں وہ اگر سب نہیں تو اکثر تو اسی قبیل سے ہیں تو اس صورت میں قرآن پڑھنا یہ نرا دھوکہ دینا ہے۔

پھر یہ کہ جو نام نکلتا ہے اس کے صحیح ہونے کی کوئی دلیل نہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے جب چاہے آزما لیا جائے کہ ایک عامل کے عمل سے ایک شخص کا نام نکل آیا، دوسرے کے عمل سے دوسرے شخص کا، مگر جو شخص پہلے کو چور سمجھتا ہو وہ اس دوسرے عامل کے پاس سے اس وقت بالکل علیحدہ ہوجانا چاہیے، جب یہ ایسی بودی بنیاد ہے تو کسی شخص کو محض اس بنیاد پر چور سمجھ لینا یقیناً یا ظناً کہاں جائز ہوگا؟ پھر اگر اس پر تشدد کیا یا زبان سے اوروں کے روبرو اس کا نام لیا تو یہ گناہ اور بڑھنے شروع ہوئے۔

دست غیب سے آمدنی اور تسخیر جنات ناجائز ہے:

اور حب وبغض مذکورین اور املاک کا ناجائز ہونا تو محتاجِ بیان نہیں۔ شاید دست غیب بالمعنی المذکور یا تسخیر جنات بغرضِ مباح میں شبہ ہو تو سمجھ لیجئے کہ اس دست غیب میں یہ ہوتا ہے کہ جنات اس کام پر مسلط ہوجاتے ہیں کہ بعضے عمل میں تو وہی روپیہ جس کو یہ خرچ کر چکا ہے وہ جہاں بھی ہو وہاں سے اٹھا لاتے ہیں اور بعض عمل میں دوسرا روپیہ جس جگہ سے ان کے ہاتھ آئے نکال لاتے ہیں۔ سو اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص خاص اس کام کے لیے آدمیوں کو نوکر رکھے کہ چوری کر کر کے مجھ کو دیا کرو، اس نے یہی کام جنات سے لیا اور چوری کے ناجائز ہونے کا کس کو انکار ہوسکتا ہے؟ اور اگر شبہ ہو کہ ممکن ہے کہ وہ جن اپنے

پاس سے لے آتے ہوں تو چوری کہاں ہوئی؟ سواوّل تو امکان سے دوسرے احتمالات کی نفی نہیں ہوسکتی، دوسرے اگر اپنے ہی پاس سے لادیں تب بھی ظاہر ہے کہ خوشی سے نہیں لاتے، ورنہ اوروں کو لاکر کیوں نہیں دیتے؟ محض جبر عمل سے لاتے ہیں تو کسی کو مجبور کرنا کہ اپنا مال مجھ کو دے دے خود حرام ہے اور اس تقریر سے تسخیر جنات کا ناجائز ہونا سمجھ میں آجائے گا۔

یعنی کسی آدمی سے جو نہ اس کا غلامِ شرعی ہو، نہ نوکر ہو، نہ اس کے زیر تربیت ہو، کوئی کام جبراً لیا جائے گو وہ کام گناہ کا نہ ہو تو یہ ظلم اور تعدی ہے۔ اس عامل نے اسی طرح اس جن سے کام لیا ہے جو عمل سے مقہور ہو چکا ہے اور یہ وسوسہ تو نرا جاہلانہ ہے کہ اسماء وکلمات الٰہیہ سے عمل چلانا کیسے گناہ ہوگیا؟

دیکھئے اگر کوئی شخص بڑا مجلد قرآن زور سے کسی کے سر میں اس طرح مار دے کہ وہ مرجائے تو کیا یہ قتل اس وجہ سے کہ بواسطہ قرآن مقدس کے ہوا ہے، جائز ہوجائے گا؟ اور کیا عدالت اس پر دارو گیر نہ کرے گی؟ کہ اس نے تو قرآن سے مارا ہے، اس لیے مجرم نہیں، بس اسی سے اس کو بھی سمجھ لیجئے، البتہ اگر قرآن مجید کے علم واتباع کو اصلی کام سمجھ کر اس پر کاربند ہو اور کسی موقع پر کسی جائز کام کے لیے کوئی آیت پڑھ لکھ لے تو ناجائز نہیں۔

قرآن مجید کو آلہ کسب بنانا:

(۴) بعض لوگوں نے قرآن مجید کو آلۂ کسب دینا و جلب مال کا ذریعہ بنا رکھا ہے، مختلف طور سے۔

بعض تو تراویح میں اجرت پر سناتے پھرتے ہیں، بعضے مردوں پر تیجے میں یا چالیسویں تک یا اس کے بعد بھی پڑھنے کا پیشہ کر لیتے ہیں، ان کا ناجائز ہونا مکرات ومرات علماء کے فتاویٰ میں طے ہو چکا ہے۔ بعض تو اور بھی غضب کرتے ہیں، یعنی یہ بھی نہیں کہ صرف عقد

اجارہ کے بعد ہی پڑھا کریں، بلکہ پہلا جو پڑھا ہوا ہے اس کو کچھ لے لے کر بخشتے ہیں، یہ تو اچھا خاصہ مبادلہ اور بیع ہے، جو اس اجارہ سے بھی بڑھ کر ہے کہ اجارہ میں بعض اہل تحلل تاویل تو چلاتے ہیں گو چلتی نہیں، یہاں تو اس کی بھی گنجائش نہیں۔

بعض اس کے مطالب کے بیان، یعنی وعظ پر نذرانہ لیتے ہیں اور فی نفسہٖ اس کے جائز وناجائز ہونے میں تو سردست اس لیے کلام نہیں کرتا کہ اس میں طول ہے، لیکن جو ہیئت اس کی شائع ہے کہ اس کو پیشہ مستقل بنالیا ہے، اسی لیے سفر کرتے ہیں، زبان سے مانگتے ہیں، جس امر حق سے نذرانہ میں کمی آنے کا اندیشہ ہو اس کو بیان نہیں کرتے اور اس حرفہ میں سہولت دیکھ کر سیکڑوں جاہل واعظ بن کر خلق خدا کو گمراہ کر رہے ہیں، کیا ان مفاسد پر نظر کر کے بھی اس کو جائز کہا جاسکتا ہے؟

البتہ تعلیم قرآن کی نوکری اور اسی طرح واعظ کی نوکری، اس میں اگر اور کوئی خرابی نہ ملائے تو مضائقہ نہیں۔

قرآن میں تحریف:

(۵) قرآن مجید کی آیات کو بعض اوقات غیر معنی مقصودہ میں نطقاً یا کتابتاً برتا جاتا ہے، مثلاً جنتری پر یہ آیت لکھ دی: ''**ولقد خلقنا الانسان فی أحسن تقویم**''. (التین: ۳) یعنی ''ہم نے بنایا آدمی کو خوب سے اندازے پر'' جس کا حاصل یہ دعویٰ ہے کہ ہماری جنتری ''احسن تقویم'' یعنی عمدہ جنتری ہے یا کسی کتاب کی لوح پر کوئی آیت لکھ دی جس میں مطبع یا صاحب مطبع کے نام کے مناسب کوئی لفظ یا معنی ہوں یا کوئی شخص گزرا ہے ''باؤ'' یہ کہہ دیا کہ اس کی مذمت قرآن میں ہے ''**باؤ بغضب من اللہ**''. (**البقرۃ: ۶۰**) (پھر اللہ کا غصہ لے کر) یہ سب تحریف ہے جس سے توبہ واجب ہے اور بعض اوقات اس میں بعضے اہل علم جن کو کسی دوسرے فن میں زیادہ عفووانہماک ہوتا ہے مبتلا ہوجاتے ہیں۔

چنانچہ احقر نے ایک معقولی کے کلام میں اس جملہ قرآنیہ ''الا لنعلم من یتبع'' (البقرۃ: ۱۴۲) (مگر اس واسطے کہ معلوم کریں کون تابع رہے گا) کے مشہور اشکال کے جواب میں یہ توجیہ دیکھی ہے کہ مراد یہاں ''علم تفصیل'' ہے، جو حادث ہے۔ پس اب وہ اشکال نہ رہا، حالانکہ یہ کھلی تحریف ہے کیونکہ اصطلاحِ معقول پر علم تفصیلی عین معلومات ہے، تو اس کو علم کہنا محض اصطلاح ہے بطور اس کے علم کے ہو گیا ہے، سو وہ معنی مصدری نہیں ہے کہ اس سے ''نعلم'' کا اشتقاق ماننا صحیح ہو اور علم تفصیل جس سے ''نعلم'' مشتق ہو سکتا ہے، وہ معنی مصداقی لغوی ہے اور اس کے معنی ہیں انکشاف ایک جزئی کا، سو وہ جب حق تعالیٰ کی طرف منسوب ہوگا اس کا مصداق و منشا انتزاعِ قدیم ہوگا اور اس کے مقابل جو اجمالی ہے اللہ تعالیٰ اس سے منزہ ہے۔ اور جو علم اجمالی اہلِ معقول کی اصطلاح ہے وہ عین ذات ہے۔ سو ان اصطلاحوں کے خلط سے کس قدر خبط ہو گیا۔

اسی طرح صوفیہ کی تفسیر کو تفسیر سمجھنا ناجائز ہے۔ تحقیق اس کی احقر نے ''کلید مثنوی'' میں لکھی ہے اور اقتباس ہماری اس مبحث سے خارج ہے کہ حقیقت میں اس کا ایراد من حیث القرآن نہیں ہے، بلکہ ''تشبیہ بالوارد فی القرآن وشتان بین التمثیل والتبدیل''.

(۶) بعض لوگ قرآن کو بے وضو چھوتے ہیں یا لکھتے ہیں، اس میں کاپی نویس اور تعویذ لکھنے والے بہت مبتلا ہیں، اسی طرح ورق بردار اور پتھر جمانے والے یا پریس مین، ان سب کو باوضو رہنا چاہیے ورنہ پاک کپڑے سے چھوئیں۔

(۷) بعضے لوگ قرآن مجید کو پشت کی طرف یا اپنی نشست کی جگہ سے نیچے یا متبذل جگہ پر رکھ دیتے ہیں یا قرآن کے اوپر کوئی کتاب یا قلم و دوات وغیرہ رکھ دیتے ہیں یا قرآن میں دوسرے کاغذات یا غلاف میں قرآن کے اوپر عینک وغیرہ رکھ دیتے ہیں، یہ سب خلاف ادب ہے۔ البتہ سفر میں اگر اسباب و صندوق وغیرہ میں مسطور ہو تو بہ مجبوری بعض

آداب میں تخفیف ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس پر بہت متبذل میلے کپڑے کا غلاف باوجود وسعت بدلنے کے ایک گونہ قلت ادب ہے، گو درجہ حرمت تک نہ سہی۔

(۸) قرآن مجید جب ایسا کہنہ ہو جائے کہ اس سے انتفاع ممکن نہ ہو تو اس کو پاک جگہ دفن کر دینا چاہیے، مگر اس پر مٹی نہ ڈالے بلکہ جس طرح مسلمان میت کی قبر میں تختے وغیرہ رکھ کر مٹی دیتے ہیں اسی طرح کرنا چاہئے۔

ایسے ہی اگر کوئی قرآن ایسا غلط لکھا ہو کہ اصلاح دشوار ہو تو اس کو بھی دفن کر دینا چاہیے، اس میں اکثر لوگ جو سستی کرتے ہیں وہ ''دریدہ'' ہو کر منتشر ہو جاتا ہے اور افسوس ہے کہ وہ ردّی میں جا کر دواؤں کی پڑیوں میں یا بچوں کے بعض کھلونوں میں استعمال کیا جاتا ہے، ایسا کرنا ہم لوگوں کی کتنی بے غیرتی ہے...!!

(۹) جس روشنائی میں کسی نجس چیز کا میل ہو اس سے قرآن لکھنا یا جس کپڑے میں ایسا قوی شبہ ہو اس کا غلاف بنانا یا جس وارنش میں ایسی چیز ہو اس کو جلد پر ملنا یہ سب گناہ ہے، چنانچہ ظاہر ہے۔

(۱۰) قرآن کی کتابت یا طباعت میں تصحیح کا اہتمام نہ کرنا، یہ ایسی بلا کی بات ہے جس کا ضرر دور تک اور دیر تک وبال جان رہے گا۔ جتنے لوگ پڑھیں گے اور جب تک (خواہ دو سو برس کیوں نہ ہو) یہ مصاحب رہیں گے، اس بانی مسبّب کو اس گناہ کا حصہ ملتا رہے گا۔

واللہ الموفق لکل ما یرضی اللھم وفقنا لما تحب و ترضیٰ.

☆☆☆

ہدایت کی دو بنیادیں، قرآن اور شخصیت

(یہ تقریر حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں شیخ الحدیث محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں ۲ر شوال المکرّم ۱۳۹۴ھ میں فرمائی تھی۔)

الحمد لله و كفى و سلام على عباده الذين اصطفىٰ اما بعد!

بزرگانِ محترم! ہے تو بڑی زیادتی کی بات کہ حضرت شیخ کی موجودگی میں مجھ جیسا طالب علم کچھ بات کہے، جبکہ شیخ، شیخ کامل ہیں اور طالب علم کو حکم کریں بات کرنے کا، پھر مجمع ہے عمل کرنے والوں کا، اور میں اس سے بھی خالی ہوں، تو آپ عمل کر رہے ہوں اور مجھ جیسا خالی اور بے عمل آپ لوگوں کے سامنے بات کیا کہے؟ تو مجھے کیا اچھا لگے گا بات کہتے ہوئے، اس لیے شرمندہ ہوں آپ حضرات کے سامنے کہتے ہوئے، البتہ تعمیل حکم میں چند باتیں بطور تذکیر عرض کرتا ہوں۔

شخصیت:

اسلام میں ہدایت کی دو بنیادیں ہیں: ایک قرآن کی اتباع اور پیروی اور دوسرے قانون کے ساتھ شخصیت جو قرآن کے معنی مرادی کو کھولیں، اسے سمجھائیں اور نمونۂ عمل لوگوں کے لیے پیش کریں اور اس کے لیے لوگوں کے قلوب کو اور دلوں کو صاف کریں اور مانجھیں اور ظاہر ہے کہ مانجھنا اور صاف کرنا یہ کاغذ کا کام نہیں ہے، بلکہ شخصیتوں کا کام ہے،

ان کے دلوں کی گرمی لوگوں کے دلوں میں گرمی پیدا کرتی ہے۔ اگر صحف آدم دنیا میں آئے تو حضرت آدم علیہ السلام بھی ساتھ بھیجے گئے، صحف ابراہیم کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی آئے، اگر توریت اور انجیل نازل ہوئی تو اس کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی بھیجے گئے، زبور کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام آئے، اسی طرح جب قرآن کریم کو نازل کیا گیا تو اس کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسی ذات اور شخصیت کو بھیجا گیا، تاکہ ایک طرف قرآن کی مراد کو لوگوں کے سامنے واضح کریں اور دوسری طرف لوگوں کے لیے نمونۂ عمل بھی ہوں اور ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ لوگوں کے دلوں کو مانجھیں اور صاف کریں، تاکہ ان کا تزکیہ ہو اور ان میں عمدہ اخلاق و اوصاف اور اعمال تیار ہوں۔

شخصیت کا پہلا کام تلاوت:

تو یہ چار کام شخصیت سے متعلق رکھے گئے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"هو الذى بعث فى الامّيين رسولا منهم يتلوا عليهم ايته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة". (سوره جمعه: 2)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اُمّی لباس میں، آپ کا سب سے پہلا کام قرآن کی تلاوت کرنا ہے: "يتلوا عليهم ايته"۔ قرآن کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں۔ تلاوت سے لہجہ اور طرز ادا کا طریقہ معلوم ہوتا ہے اور لہجوں اور طرز ادا سے صحیح معنوں کا پتہ چلتا ہے۔ اگر تعبیر کا لب ولہجہ بدل جائے تو مفہوم بدل جاتا ہے تو معانی اور حقائق لب ولہجہ کی تعبیر سے بدل جاتے ہیں۔ بہت سے معانی اور حقائق طرز ادا سے متعلق ہیں، اگر لہجہ بدل جائے تو معنی بدل جاتے ہیں۔ مثلاً میں کہوں "کیا بات ہے؟" اگر سوال کا انداز ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ میں کوئی بات پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ "کیا بات ہے؟" اور اسی لفظ کو میں منھ کھول کر کہوں "کیا بات ہے" تو اس کے معنی دوسرے ہو جائیں گے کہ اس لفظ

سے پوچھنا مقصود نہیں ہے، بلکہ کسی چیز کی بڑائی اور افضلیت کا اظہار ہے، اور اگر یہ کہا کہ ”کیا بات ہے؟“ (تحقیری انداز سے) تو اس سے مقصود اس چیز کی تحقیر ہوگی اور کہوں ”کیا بات ہے!“ (تعجب کے انداز سے) تو تعجب کا اظہار ہوگا، تو لفظ ایک ہی ہے ”کیا بات ہے“ لیکن لب ولہجہ بدلا تو معنی بھی بدل گئے، تو تعبیر کے بدلنے سے بدلتی ہی ہے حقیقت، لیکن لب ولہجہ کے بدلنے سے حقیقت بدل جاتی ہے۔ اب اگر یہی لفظ ”کیا بات ہے؟“ کسی جگہ لکھ دیں تو پڑھنے والا وہی معنی اخذ کرے گا جو اس کے اندر ہوگا اور وہ یہ سمجھے گا کہ میں متکلم کی مراد کو مکمل سمجھ رہا ہوں، حالانکہ متکلم کی مراد کو سمجھنے کے لیے لب ولہجہ کا جاننا از حد ضروری ہے، جو بغیر شخصیت کے ممکن نہیں، کیونکہ لب ولہجہ یہ شخصیت کا کام ہے، کتاب کا کام نہیں۔

شخصیت کا دوسرا کام تزکیہ:

تو ایک طرف انبیاء کرام علیہم السلام نے شرائع پیش کیے اور اسے پڑھ کر بتلایا اور دوسری طرف یہ ذوات قدس نے لوگوں کے دلوں کو مانجھا اور صاف کیا۔ صرف حلال وحرام بتلاتے ہیں یہ نہیں بلکہ دلوں کے زیغ کو بھی نکال دیتے ہیں۔ دلوں میں جس قسم کا اثر یا مرض ہوگا وہی اثر وہ بات سے لے گا۔ مثلاً ایک شخص کے اندر نصرانیت کا غلبہ ہے تو اسے پورے قرآن کے اندر نصرانیت نکلتی نظر آئے گی، اسی طرح کوئی یہودی یا مشرک ہے تو وہ قرآن میں سے انھیں باتوں کو نکالے گا اور پورے قرآن کی تاویل اپنے نظریے کے مطابق کرے گا، تو قرآن کریم سمجھنے کے لیے سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ سمجھنے والے کے دل میں کجی اور ٹیڑھا پن نہ ہو۔ اگر دلوں کو مانجھنے کی ضرورت نہ ہوتی اور دلوں کو صاف کیے بغیر ہی قرآن ہدایت اور رہنمائی کا کام کرتا تو یہ مناسب تھا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام قرآن کریم کا ایک نسخہ کعبہ کی چھت پر رکھ جاتے اور دنیا بھر کے انسانوں میں اعلان عام کر دیتے کہ

اے لوگو! تمہارے لیے ایک نسخہ شفاء العلیل اور تمام روحانی علاج کا خانۂ کعبہ کی چھت پر رکھ دیا ہے، اسے پڑھو اور اس پر عمل کرو، لیکن حق تعالیٰ نے صرف کتاب پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ذات قدسی کو بھی ساتھ ساتھ بھیجا، تا کہ ایک طرف وہ لوگوں میں تلاوت کریں اور تلاوت کے ذریعہ لب ولہجہ لوگوں کے سامنے آئے اور اس سے متکلم کی صحیح مراد واضح ہو اور دوسری طرف لوگوں کے دلوں کے زیغ کو دور کریں اور ان کے دلوں کو صاف کریں اور مانجھیں تا کہ سننے والا اپنی سمجھ پر نہ چلے، بلکہ مراد متکلم کو سمجھ کر عمل کرے۔

انبیاء کا تیسرا کام تعلیم کتاب اور چوتھا کام بیان حکمت ہے:

تیسرا کام تعلیم کتاب ہے کہ لوگوں کو قرآن کریم سکھاتے ہیں، اور چوتھا کام حکمت بیان کرتے ہیں۔ ”**ویعلمهم الكتاب والحكمة**“. تو انبیائے کرام کے یہ چار کام ہیں: (۱) آیات کی تلاوت کرتے ہیں۔ (۲) لوگوں کے قلوب کو مانجھتے ہیں۔ (۳) اور کتاب کی تعلیم کرتے ہیں (۴) اور اس کی حکمت بیان کرتے ہیں۔

مدارس اور خانقاہ:

تو اسلام میں ہدایت کے لیے دو بنیادیں ہیں: (۱) کتاب (۲) اور شخصیت، یعنی انبیاء کرام علیہ السلام کی ذات حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی یہی دو سلسلہ قائم ہیں۔ ایک طرف قرآن کی تعلیم کا سلسلہ جس کے لیے مدارس ہیں، اور یہاں قرآن کی مراد اور قرآن کے حقائق اور مقصود بتلائے جاتے ہیں اور دوسری طرف شخصیات جو دلوں کو مانجھتے ہیں اور اس کے لیے خانقاہوں کا نظام ہے، اسی بات کو علامہ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ سلف صالحین میں یہ دستور تھا کہ وہ کتاب کا علم حاصل کرنے کے بعد مشائخ کے پاس رہتے تھے تا کہ ذہنیت درست ہو، اگر ذہنیت درست نہ ہوئی تو پھر وہ اصل اور صحیح

راستہ سے ہٹے گا، تو ذہن درست ہو اور اس کے اندر استقامت ہو، اس کے لیے مشائخین کی ضرورت ہے تو دورِ اوّل ہی سے دونوں سلسلے چلے آرہے ہیں۔ ایک طرف معلم کا اور دوسری طرف مشائخ کا اور اگر چہ دونوں چیزیں جمع ہوں تو نورٌ علیٰ نور، پھر کیا کہنا، دونوں چیزیں ایک ہی جگہ حاصل ہو جائے گی۔ الحمدللہ ہمارے اکابر ان دونوں باتوں کے حامل رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں کو اپنی تربیت کے لیے شیخ کامل کے پاس پہنچا دیا، یہ اللہ کا بڑا انعام ہے۔

دونوں سلسلے قیامت تک:

شریعت کے ذریعہ دینی معلومات حاصل ہوتی ہیں، حلال وحرام کا پتہ چلتا ہے، تو ایک تو یہ سلسلہ اللہ نے جاری کیا اور دوسری طرف اللہ نے تزکیہ کے لیے مربیوں اور مشائخ کا سلسلہ جاری فرمایا اور وجہ یہ ہے کہ قلب کے اندر حق پر عمل کرنے کا اور باطل سے نفرت کا جذبہ بغیر شخصیتوں کے حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے تربیت کی ضرورت ہے، اس لیے قانون کے ساتھ مربیوں کی بھی ضرورت ہے، جیسے اسلام کا قانون قرآن اور حدیث ہے اور یہ حق ہے اور اس کا قیامت تک باقی رہنا ضروری ہے۔ اسی طرح مربیوں کا موجود رہنا بھی حق ہے اور ان کا قیامت تک باقی رہنا بھی ضروری ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایک جماعت حقہ میری جماعت میں قیامت تک باقی رہے گی اور وہی بات کہے گی جو میں کہہ رہا ہوں اور وہ مظفر اور کامیاب ہوگی، لوگ اسے ذلیل کریں گے، لیکن وہ ذلیل نہ ہوگی، اس لیے کہ حقیقی عزت اور ذلت خدا کے یہاں سے ہے، منجانب اللہ عزت اور ذلت آتی ہے۔ حقیقی ذلت تو وہ ہے جو خدا کے دربار سے ہٹا دیا جائے تو وہ جماعت حق پر قائم رہے گی، جس کو خدا کی طرف سے عزت ملے گی اور ذلیل کرنے والے ذلیل نہیں کر سکتے، تو وہی جماعت ہر زمانے میں قرآن وحدیث کی تعلیم بھی دے گی اور وہی لوگوں کی تربیت بھی

کرے گی۔ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس امت کو ایسے افراد ملے جو کامل تھے جنھوں نے ایک طرف لوگوں کو تعلیم دی اور دوسری طرف لوگوں کی تربیت بھی کی۔ وہ انسان بڑے خوش قسمت ہیں جنھیں یہ دونوں چیزیں میسر آجائیں۔ ایک طرف تو ان کا ذہن منور ہوگا اور دوسری طرف ان کے دل چمک جائیں گے۔ فرق اتنا ہے کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دل ایسے بنائے گئے تھے کہ ان کی استعداد کامل تھی اور دوسری طرف تربیت کرنے والے کامل اور اکمل تھے، اس لیے ان کی ایک نگاہ ہی میں تربیت ہوگئی، لیکن جوں جوں قرن اور زمانہ دور ہوتا چلا گیا فرقہ بندیوں کی وجہ سے ایسے شک وشبہ کا دور دورہ ہوا کہ اب ایسی تربیت کی ضرورت ہوئی کہ اسے خوب رگڑا جائے، مثلاً اگر نیا برتن ہے تو اس پر صرف ذرا سا رگڑ سے کام چل جائے گا، لیکن اگر برتن پرانا ہو تو پھر ذرا سی رگڑ سے کام نہیں چلے گا، بلکہ اسے مانجھنا پڑے گا، اور وہ بھی راکھ سے نہیں، بلکہ ریت سے، اور اگر برتن اور پرانا ہو تو پھر کنکر اور ہاتھ سے بھی کام نہیں چلے گا، بلکہ پیر سے رگڑ کر صاف کر کے پھر رانگ لگے گا۔ اب ہمارے دل میں بھی، اگر یہ ایک طرف چٹائی پر بیٹھ کر علم کا درس دے رہے ہیں تو دوسری طرف خانقاہ بھی چلا رہے ہیں، اس لیے عمل صرف علم حاصل کرنے سے نہیں آتا ہے، بلکہ اندرونی قوت سے آتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ اولاً اخلاق درست ہوں، اور دل کا رخ ٹھیک ہو، یعنی راستہ پر چلانا مربی کا کام ہے، علم کا کام نہیں، اس لیے ایک طرف جہاں تعلیم کی احتیاج اور ضرورت ہے، وہیں دوسری طرف تزکیۂ باطن اور اصلاح حال کی بھی ضرورت ہے تو تعلیم اور تزکیہ دونوں ہی کی ضرورت ہے اور اسی کے لیے مدارس اور خانقاہیں ہیں۔

شیخ کامل مربی ہے اور مزکی ہے:

الحمدللہ آپ لوگوں کو خدا نے علم کی نعمت تو عطا کی ہے، مزید نعمت اللہ نے یہ نصیب

فرمائی کہ حق تعالیٰ نے شیخ کامل کے پاس آپ لوگوں کو پہنچادیا۔تو یہ اللہ کی طرف سے بڑا کرم اور انعام ہے، گو آپ لوگوں میں سارے عالم نہ ہوں، لیکن دین کا خلاصہ تو سب جانتے ہی ہیں اور اگر بذریعہ تعبیر نہ جانتے ہوں تو باعتبار مسلمان ہونے کے اللہ نے دلوں کے اندر جو نور رکھا ہے اس کی وجہ سے جانتے ہیں، اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی معاملہ پیش آئے تو پہلے دل سے پوچھے اور دل سے سوال کرے۔'' **استفتی قلبک**''. (۱) پھر مفتی سے پوچھے، آپ کا ضمیر خود فتویٰ دے گا، ہر مسلمان کا ضمیر نورانیت لیے ہوئے ہوتا ہے، اسی لیے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ گناہ کیا ہے؟ تو آپؐ نے چوری، حسد وغیرہ کو نہیں فرمایا کہ یہ گناہ ہے، بلکہ اس جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب دل کے اندر کھٹک پیدا ہو تو وہ گناہ ہے، (۲) جب چوری کرنے کے لیے چور چلتا ہے تو اولاً اس کے دل میں کھٹک پیدا ہوتی ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ جتنے بھی اعضاء ہیں، اس سے حق و باطل کی تمیز نہیں ہوتی ہے، ہاتھ سے رشوت کا مال لے لے تو کانٹیں نہیں چبھیں گے، ناجائز سے بھی وہی مزہ آئے گا جو جائز سے آتا ہے اور تمام اعضاء میں حق و باطل کی تمیز نہیں ہے، صرف دل ہی وہ عضو ہے جو حق و باطل میں تمیز کرتا ہے۔اب یہ الگ بات ہے کہ وہ کسی باطل کو بھی حق سمجھ جائے، لیکن جب عمل کرے گا تو فوراً اس کا دل اس کو فتویٰ دے گا، تو دل اصل مفتی ہے، باقی مفتی سے سوال اس لیے ہے کہ دوسروں کا منھ بند کرے اور لوگوں کو بتائے کہ یہ ہے مفتی کا فتویٰ، مثلاً کسی نے کسی کی زمین غلط دبائی، اب دل اس بات کے غلط ہونے کو جانتا ہے، لیکن مفتیوں سے سوال اس لیے ہے کہ وہ غلط کو صحیح کرے۔اگر علم کا خلاصہ معلوم نہ ہو تو دل کی نورانیت تو کم سے کم ہے، اس کے ساتھ جو مرورِ زمانہ کے بعد اور غفلت کی وجہ سے بے حد میلا ہو گیا ہے اس کے لیے شیخ تعلیم دے گا اور مانجھے گا۔

حکیم الاسلام کی تواضع:

خدا کا فضل ہے کہ اس نے ایسا شیخ عطا فرمایا کہ جو دلوں کو مانجھے اور نگرانی کرے اور یہ بھی اللہ کا فضل ہے کہ اس نے ایسی جگہ پہنچایا جہاں علم بھی ہے اور نگرانی عمل بھی، تو آپ حضرات ایسے ماحول اور ایسے شیخ کے پاس رہ کر کہ جن کی پوری نگرانی ہے اور عمل میں کثرت ہے، پھر آپ ایسے آدمی سے کہنے کے لیے کہہ رہے ہیں کہ جو علم اور عمل دونوں میں ویسا ہی ہے اور خالی ہے اور جو نہ مجاہدہ کر رہا ہے، بلکہ ویسا ہی کھا رہا ہے اور پھر رہا ہے۔اب اگر وہ کہے گا تو کیا کہے گا؟ وہ تو صرف الفاظ ہی کہے گا، بخلاف اس کے کہ آپ عمل کر رہے ہیں اور شیخ کامل کی نگرانی میں عمل کر رہے ہیں تو یہ الفاظ ہیں جو آپ حضرات کی خدمت میں آپ حضرات کے حکم سے عرض کر دیئے۔اس امید پر کہ آپ ہمارے لیے بھی دعا کرتے رہیں۔

بداں کہ بخشد ... جب جماعت میں ایک بھی نیک عمل والے کا عمل قبول ہوگا تو اس کے طفیل میں سب کا عمل قبول ہو جائے گا۔گیہوں کے ساتھ کنکر بھی قابل قبول ہو جاتی ہے۔یہ الفاظ کہہ کر میں بھی آپ حضرات کے ساتھ شریک ہو گیا کہ جہاں حق تعالیٰ آپ لوگوں کے عمل کو قبول کریں گے تو وہاں ہماری حاضری بھی اور کہنا بھی قبول ہو جائے گا۔اگر دامن پر گرد لگ جائے تو جہاں بھی دامن جائے گا وہاں گرد جائے گی، تو دامن بننا ضروری نہیں ہے، بلکہ گرد بن جائے تب بھی ٹھیک ہے۔اب میں اور کیا کہوں، حضرت شیخ کے حکم سے یہ چند کلمات عرض کر دیے اور اس معنی کر ہم بھی آپ حضرات کے ساتھ شریک تھے غائب نہ تھے۔

☆☆

عصر حاضر کے چند اہم تقاضے

● حضرت مولانا محمد سالم قاسمی

اکیسویں صدی کا فکری اور نظریاتی یلغار:

کتابِ فطرت قرآن کریم نے اقوام وامم کی ترقی وتنزلی کے لیے بطور ضابطہ فہرست ''ان مع العُسر یسرا'' (سورہ الم نشرح:) کو پیش فرمایا ہے۔ یہ ایک اساسی اور فطری ربانی قانون ہے لیکن ہماری ماضی کی مذہبی، تہذیبی، تمدنی، معاشرتی اور سیاسی دائروں میں دوسو سالہ مسلسل ناکامیوں کی زور قلم سے اضافہ کردہ داستانیں، آج ہماری مبتذل ''صحافت'' کا مستقل موضوع بن گئی ہیں، جس نے زندگی میں کچھ کرنے کے حوصلہ و عزیمت پر مایوسی اور قنوطیت کو غالب کردینے کی انتہائی نامبارک روایت قائم کردی ہے۔ یہ روایت ملکی پیمانے پر قومی دور کی ہے، لیکن آج کے بین الاقوامی دور میں محدود انداز فکر کو ترک کرکے ہماری اوّلیں ضرورت یہ ہے کہ ارباب فکر ونظر دور حاضر میں عوامی ذہن سازی کے مؤثر ترین اور عالم گیر وسیلے پیپر اور الکٹرانک میڈیا کو نہ صرف اس یاس اور قنوطیت سے ملت کو یکسر نجات دلانے کو مقصدی حیثیت دیں، بلکہ نئی نسل میں فطری قوت کو زیادہ سے زیادہ بیدار کرکے صرف اسلام کی بنیاد پر اپنے اسلامی وجود کی عظمت واہمیت کے ساتھ برقراری کی ضرورت سے ان کو آج کے عالمگیر میڈیا کے ذریعہ آشنائی عطا فرمائیں۔ ایک طرف یہ ضرورت ہے وہیں دوسری طرف اس کو بھی سامنے رکھنا ہے کہ

ملت کے اسلامی قومی وجود کے شعور کو حرف غلط کی طرح مٹادینے کے لیے اکیسویں صدی، عالمی پیمانے پر اپنی بے پناہ مادی، فکری، نظریاتی اور ایجاداتی قوتوں کے ساتھ آپ کی نئی نسل پر بطور خاص حملہ آور ہے۔

مانوس طرز فکر اور مؤثر عصری تعبیر سے علماء کی ناواقفیت کا اثر:

یہاں غیر معمولی طور پر ایک قابل غور اور لائق توجہ بات یہ بھی سامنے آتی ہے کہ نئی نسل کے دینی مربی علمائے کرام اگرچہ اپنی عظیم علمی وسعت اور وقیع مخلصانہ جذبہ خدمت کے باوجود بالعموم نئی نسل کے مانوس طرز فکر اور محبوب زبان وبیان کی مؤثر تعبیر سے ناآشنا ہیں اور طویل تجربات اس پر شاہد عدل ہیں کہ اس ناآشنائی اور ناواقفیت کے نتیجے میں ان کی خدمات کا معتد بہ حصہ بے اثر وبے نتیجہ رہ جاتا ہے، اس لیے پھر یہ سوال برمحل اہمیت حاصل کرلیتا ہے کہ عصر حاضر کی لازم کردہ، یہ عظیم خدمت وضرورت تکمیل پذیر ہوگی کیسے؟ ممکن ہے کہ اس کا حل یہ پیش کیا جائے کہ ہمارے پاس وقت کی زندہ زبان، نئے طرز فکر اور جدید تعبیر وبیان سے واقفیت کے ساتھ دینی ذوق ومزاج رکھنے والا عصری تعلیم سے آراستہ وہ طبقہ بھی موجود ہے کہ جسے ہم بہ سہولت اس اہم ملّی اور دینی خدمت میں استعمال کرسکتے ہیں۔

یہ جواب ایک حد تک قابل قبول ضرور قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن قابل لحاظ تجربات کی روشنی میں یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اس طبقے کے ساتھ بذیل تعلیم جدید، بالارادہ یا بلاارادہ مغربی تہذیب وتمدن سے فکری اثر پذیری اور جدت پسندی کے تھوڑے بہت وہ جراثیم بھی ساتھ ضرور آئیں گے، جو اسلامی عقائد واعمال سے متعارف ہی نہیں، بلکہ برملا متصادم ہوتے ہیں، لہٰذا دینی مزاج اور جذبہ خدمت کے باوجود اس طبقے کو دینی بنیادوں پر پیش نظر مقصد کے تحت نئی نسل کے لئے تربیت دینی کا مدار نہیں قرار دیا جاسکتا۔

عصری اور دینی علوم کی نئی درسگاہ کی ضرورت:

نیز آنے والے دور میں غیر معمولی ارتقاپذیر مادّیت کے بالمقابل نئی نسل کی مقصود تربیت کا حق ادا کرنا بھی اس طبقے سے متوقع محسوس نہیں ہوتا، اس لیے آغاز عمل کے ساتھ ساتھ پیش آنے والے اس دشوار ترین مرحلے کا کامیاب حل اس کے سوا دوسرا نہیں ہے کہ عصری اور دینی علوم کی جامع نئی درس گاہیں قائم کی جائیں اور قدیم صالح اور جدید نافع کے حامل ایسے علما تیار کیے جائیں کہ جو اکیسویں صدی کی متوقع زبردست مادّی ترقی سے نئی نسل کے سامنے آنے والے نئے سوالات، نئے شبہات، نئے اعتراضات اور نئی تلبیسات کے نہ صرف جوابات ہی سے، بلکہ ان کے مانوس افکار ونظریات کو ملحوظ رکھ کر ان کی محبوب زبان و اصطلاحات کے ذریعہ انھیں مطمئن بھی کرسکیں اور نئے چیلنجوں کا کتاب وسنت کی روشنی میں تار و پود بھی بکھیر سکیں۔

جدید علوم اور قدیم علوم کی اصطلاح

اسلام کی بنیاد پر نئی مسلم نسل کی روشن مستقبل سازی کے لئے اس کا سدباب بھی ضروری ہے کہ گزشتہ صدی میں ایشیا پر چھائی ہوئی یورپین اقوام کی اسلام کے برخلاف برپا کردہ لاتعداد سازشوں میں سب سے زیادہ خطرناک ترین سازش یہ تھی کہ نفسیاتی طور پر مادّی علوم کو مقبول بنانے کے لئے ''جدید'' کی اصطلاح کو عالم گیر بنایا گیا اور انسانیت کو انسانیت کا حقیقی مقام رفعت وعظمت عطا کرنے والے اخلاق آمیز ''علوم اسلامیہ'' کو ثانوی درجہ دے کر ناقابل التفات بنانے کے لئے ''قدیم'' کی اصطلاح کو عالم گیر بنایا گیا اور یہ کہنا کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ آج بھی ملت اسلامیہ کا ایک بہت بڑا طبقہ ان سازشی اصطلاحوں کا شکار ہے، اس لیے عصر رواں میں اس کا توڑ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ امت کو مفسر، محدث، فقیہ، متکلم، مدرس اور مفتی عطا کرنے والے مصروف خدمت قدیم مدارس اسلامیہ کو

چھیڑے بغیر دینی اور عصری تعلیم کی جامع نسل تیار کرنے کے لئے عالمی پیمانے پر ایسے مؤقر ومؤثر نئے جامعات و مدارس کی تاسیس کو مستقل مقصدی حیثیت دی جائے کہ جن سے اسلامی نقطہ فکر کے مطابق مستفید نسل مادّی وسائنسی اور اخلاقی اور روحانی دونوں قسم کے علوم سے بدرجہ کمال بہرہ ور ہو اور آنے والے دور کے بالمقابل طوری قوت فکری، ہمت علمی اور جرأت ایمانی کے ساتھ سینہ سپر ہوسکے۔

حالات کی سنگینی:

آنے والے دور کے چند اہم ترین مطالبات پر یہ عرض داشت بصد ادب واحترام پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آج دنیائے کفر وشرک کی اسلام کے برخلاف مشترک ومتحدہ عظیم انٹرنیشنل قوت ببانگ دہل خبر دے رہی ہے کہ اگر ارباب علم دانشوران اسلام نے یہ پیش بندی نہ کی تو کوئی طاقت اس تاریک مستقبل کو روکنے والی نہیں ہوگی کہ جس میں مادّی ترقیات کی قیمت ملت اسلامیہ کو اپنی نئی نسل کے ایمان واسلام کی صورت میں خدانخواستہ ادا کرنی پڑ جائے۔ اللہ نہ کرے ایسا ہو۔

بالفاظ دیگر نئے اور تیز رفتار انٹرنیشنل وسائل علم وخبر کی موجد و مالک قوتیں نہ صرف اسلام دشمن اور مذہب بیزاری ہی کی داعی ہیں، بلکہ انسانی فطرت کے ساتھ کامل مطابقت رکھنے والے دین اسلام سے ان کا خوف کھانا اس لیے برمحل ہے کہ فکری رفعتوں اور سائنسی ترقیوں کے اس دور میں نہ دے سکنے والے ان کے اپنے غیر مطابق فطرت مذاہب خود ان کی اپنی نگاہوں میں بے قیمت بن رہے ہیں اور آج اس زندہ حقیقت کا کھلی آنکھوں دنیا مشاہدہ کررہی ہے کہ اسلام کے برخلاف اپنے عالم گیر وسائل نشر واشاعت کے بے تحاشا استعمال کے باوجود یوروپ اور امریکہ میں بتائید خداوندی، اسلام کے حلقہ بگوش ہونے والوں کی سالانہ تعداد دنیا کے تمام مذاہب کے مقابلے پر بدرجہا زائد ہے۔

اسلامک میڈیا کا قیام ازحد ضروری:

اس مختصر تحریر کے اختتام پر یہ بھی عرض کئے بغیر اطمینان نہیں ہوتا کہ آج عوامی ذہن سازی کا سب سے بڑا ذریعہ الکٹرانک اور پرنٹ میڈیا ہیں، جن کی پرتاثیری محتاج بیان نہیں ہے، لیکن بصد افسوس اس ناقابل انکار حقیقت کا اظہار بھی ناگزیر ہے کہ یہ ضروری ذرائع ابلاغ دنیا کے سب سے پہلے اور سب سے آخری بین الاقوامی دین فطرت ''اسلام'' کو کماحقہ میسر نہیں ہیں اور جس درجے میں میسر بھی ہیں تو ان کا استعمال اسلام کے لیے برمحل نہیں ہورہا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ارباب فکر اکیسویں صدی کے استقبالیہ ایجنڈے میں ''اسلامک میڈیا'' کو اسی اہمیت کے ساتھ شامل فرمائیں کہ اسلام جس کا بجا طور پر ہی نہیں بلکہ لازمی طور پر مستحق اور ضرورت مند ہے۔

ان طالب علمانہ کلمات کے ساتھ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اکیسویں صدی میں کلمہ اسلام کی سربلندی کے لئے مخلصانہ جدوجہد کی ہم سب کو توفیق مرحمت فرمائے اور ہماری حقیر خدمات کو قبولیت عامہ اور مقبولیت خاصہ ارزانی فرمائے، آمین۔

معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

☆☆

تدوین قرآن کی تاریخ

آغاز وحی اور قرآن کی کتابت

● ڈاکٹر حمید اللہؒ

اناجیل اربعہ وحی الٰہی یا سوانح مسیح:

انجیل کے متعلق مسلمانوں کا تصور عام طور پر یہ ہے کہ وہ ایک مستقل کتاب تھی جو خدا کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی، لیکن ہمارے پاس عیسائیوں کے توسط سے جو انجیل پہنچی ہے وہ ایک نہیں، بلکہ چار انجیلیں ہیں، جو یہ ہیں: متی، مرقس، لوقا، یوحنا۔ ہر انجیل ایک الگ آدمی کی طرف منسوب ہے۔ یہ چار کتابیں بھی ساری انجیلیں نہیں ہیں بلکہ خود عیسائی مورخوں کے مطابق ستر سے زیادہ انجیلیں پائی جاتی ہیں جن میں سے ان چار کو قابل اعتماد اور باقی کو مشتبہ قرار دیا گیا ہے۔ ان کو پڑھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے الہام یا وحی پر مشتمل نہیں، بلکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمریاں ہیں۔ چار شخصوں نے یکے بعد دیگرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمری لکھی اور ہر ایک نے اس کو انجیل کا نام دیا۔ لفظ انجیل کے معنی ہیں ''خوش خبری'' اور اس کی وجہ تسمیہ غالباً یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جو حالات زندگی انجیل میں ملتے ہیں ان کے مطابق عام طور پر وہ کسی گاؤں میں جایا کرتے تھے اور وہاں کے لوگوں سے کہتے تھے کہ میں بشارت دیتا ہوں کہ خدا کی حکمرانی اب جلد آنے والی ہے۔ شاید اس اساس پر کوئی کتاب

نازل ہوئی تھی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسے لکھوایا نہیں، اس لیے آج دنیا میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ اب جو انجیلیں موجود ہیں ان کی حقیقت یہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے مختلف زمانوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمریاں لکھیں اور ان سوانح عمریوں کو ہر مؤلف نے انجیل کا نام دیا۔ ان میں سے چار کو کلیسا نے قابل اعتماد قرار دیا ہے اور باقی کو رد کیا ہے۔ ان چار انجیلوں کے انتخاب کے متعلق کسی کو کوئی علم نہیں کہ ان کو کس نے انتخاب کیا، کب انتخاب کیا اور کن معیارات کو سامنے رکھ کر انتخاب کیا؟ بہر حال اس بات پر سب متفق ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی لکھوائی ہوئی کتاب دنیا میں موجود نہیں ہے۔ جو چیز اس وقت ہمارے پاس انجیل کے نام سے ملتی ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمریاں ہیں۔ انھیں ہم ''سیرت حضرت عیسیٰ علیہ السلام'' کہہ سکتے ہیں۔ بعینہٖ جس طرح مسلمانوں کے ہاں سیرت نبوی ﷺ کی کتابیں پائی جاتی ہیں۔

انجیل کو نہ لکھوانے کی وجہ:

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ پر نازل شدہ احکام کو لکھوایا کیوں نہیں تھا؟ میرے ذہن میں جو جواب آتا ہے (ممکن ہے غلط ہو) وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ ان سے پہلے کے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو توریت نازل ہوئی تھی اس کی کیا حالت ہوئی۔ دشمن حملہ کرتے ہیں، اس کی توہین کرتے ہیں، اسے جلا دیتے ہیں اور نیست و نابود کر دیتے ہیں۔ غالباً انھوں نے یہ سوچا کہ کہیں میری کتاب کا بھی وہی حشر نہ ہو، لہٰذا بہتر ہے کہ اسے لکھوایا ہی نہ جائے۔ اس طرح یہ کتاب لوگوں کے ذہنوں میں رہے گی۔ عبادت گزار نیک لوگ اسے ادب سے یاد رکھیں گے اور اپنے بعد کی نسلوں تک پہنچائیں گے۔ شاید یہی تصور ہو جس کی بنا پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی انجیل کو نہ لکھوایا۔

قرآن مجید مکمل احکام کا مجموعہ:

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ خدا چونکہ ازلی اور ابدی علم کا مالک ہے، اس لیے یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو ایک حکم دے اور بعد کے نبی کو کوئی دوسرا اس کے بالکل برعکس حکم دے۔ البتہ یہ ضرور ہوسکتا ہے کہ ایک نبی کو کچھ احکام اور بعد کے نبی کو کچھ اور احکام اضافے کے ساتھ دیے جائیں۔ فرض کیجئے کہ حضرت آدم علیہ السلام پر نازل شدہ کتابیں آج دنیا میں صحیح حالت میں موجود ہوتیں تو (میرا تصور یہ ہے کہ) خدا کو کوئی نئی کتاب بھیجنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔ وہی کتاب آج بھی کارآمد ہوتی، لیکن جس طرح ابھی ہم نے اس مختصر مطالعے میں دیکھا کہ پرانے انبیا کی کوئی کتاب بھی بلا استثنا ہم تک من وعن کامل صورت میں نہیں پہنچی ہے، اس لیے خدا نے چاہا کہ ایک مرتبہ انسان کو ایسی مکمل کتاب دی جائے جس میں تمام احکام ہوں اور اس کی مشیت یہ بھی ہوئی کہ یہ کتاب محفوظ رہے۔ وہ کتاب قرآن مجید ہے۔

قرآن کی زبان عربی کیوں؟:

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ قرآن کس طرح محفوظ حالت میں ہم تک پہنچا ہے، اولاً میں اس کی زبان کے بارے میں کچھ عرض کروں گا، یہ عربی زبان میں ہے، اس آخری نبی ﷺ کی کتاب کے لیے عربی زبان کا انتخاب کیوں ہوا؟ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ زبانیں رفتہ رفتہ بدل جاتی ہیں۔ خود اردو زبان کو لیجئے۔ اب سے پانچ سو سال پہلے کی کتاب مشکل سے ہمیں سمجھ میں آتی ہے۔ دنیا کی ساری زبانوں کا یہی حال ہے۔ انگریزی میں پانچ سو سال پہلے کے 'چاسر' کی کتاب کو آج کل لندن کا کوئی شخص، یونیورسٹی کے فاضل پروفیسروں کے سوا، سمجھ نہیں سکتا۔ یہی حال دوسری قدیم وجدید زبانوں کا ہے، یعنی وہ بدل جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ ناقابل فہم ہو جاتی ہیں۔ اگر خدا کا آخری پیغام بھی کسی ایسی ہی تبدیل ہونے والی زبان

میں آتا تو خدا کی رحمت کا اقتضا یہ ہوتا کہ ہم بیسویں صدی کے لوگوں کو پھر ایک نئی کتاب دے، تاکہ ہم اسے سمجھ سکیں، کیونکہ گزشتہ صدیوں کی کتاب اب تک ناقابل فہم ہو چکی ہوتی۔ دنیا کی زبانوں میں سے اگر کسی زبان کو یہ استثنا ہے کہ وہ نہیں بدلتی تو وہ عربی زبان ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ کی ہم عصر عربی، یعنی قرآن مجید اور حدیث شریف میں جو زبان استعمال ہوئی ہے اور جو عربی آج ریڈیو پر آپ سنتے ہیں یا جو آج عربی اخباروں میں پڑھتے ہیں، ان دونوں میں بہ لحاظ مفہوم الفاظ، گرامر (صرف ونحو)، ہجے اور تلفظ، کوئی فرق نہیں ہے۔ آج رسول کریم ﷺ حیات ظاہری میں ہوں اور میں ایک عرب کی حیثیت سے اپنی موجودہ عربی میں آپ سے گفتگو کروں تو آپ ﷺ اس کا ہر لفظ سمجھیں گے۔ اگر رسول اللہ ﷺ مجھے جواب مرحمت فرمائیں تو آپ کا ہر لفظ میں سمجھ سکوں گا، کیونکہ ان دونوں زبانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ میں اس سے یہ استنباط کرتا ہوں کہ آخری نبی پر بھیجی ہوئی آخری کتاب ایسی زبان میں ہونی چاہیے جو غیر تبدیل پذیر ہو، لہٰذا عربی کا انتخاب کیا گیا۔ عرض کرنا یہ ہے کہ اس عربی زبان میں دیگر خصوصیات مثلاً فصاحت، بلاغت، ترنم وغیرہ کے علاوہ ایک خصوصیت ایسی ہے جس کا ہم سب مشاہدہ کر سکتے ہیں، وہ یہ کہ عربی زبان غیر تبدیل پذیر ہے اور اس کے لیے ہمیں عربوں کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے مختلف علاقوں کی بولیوں کو اپنی زبان نہیں بنایا، بلکہ اپنی علمی اور تحریری زبان وہی رکھی جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے چلی آ رہی تھی۔

آغاز نزول قرآنی:

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے آپ سب واقف ہیں کہ وہ بیک وقت نازل نہیں ہوا، جیسا کہ توریت کے متعلق یہودیوں کا بیان کہ اسے خدا نے تختیوں پر لکھ کر ایک ہی مرتبہ دے دیا تھا۔ اس کے برخلاف قرآن مجید تئیس سال تک جستہ جستہ (نجماً نجماً) نازل ہوتا رہا اور یہ

ان مختلف زمانوں میں نازل شدہ اجزا کا مجموعہ ہے جو قرآن مجید کی صورت میں ہمارے پاس ہے۔ اس کا آغاز دسمبر ۶۰۹ء میں ہوا جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں معتکف تھے۔ وہاں حضرت جبرئیل علیہ السلام آتے ہیں اور آپ تک خدا کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ وہ پیغام بہت ہی اثر انگیز ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم امی ہیں۔ اس امی شخص کو جو پہلا حکم دیا گیا وہ ہے "اقرأ"، یعنی پڑھ اور پھر قلم کی تعریف کی گئی ہے۔ پڑھنے کا حکم دے کر پھر قلم کی تعریف کیوں کی جاتی ہے؟ اس لیے کہ قلم ہی کے ذریعے سے خدا انسان کو وہ چیز بتاتا ہے جو وہ نہیں جانتا۔ دوسرے الفاظ میں قلم ہی وہ چیز ہے جو انسانی تمدن اور انسانی تہذیب کی حفاظت گاہ (Depository) ہے۔ اس کا وجود اس لیے ہے کہ پرانی چیزوں کو محفوظ رکھا جا سکے۔ آنے والے اس میں نئی چیزوں کا اضافہ کرتے ہیں ۔ جب " سورۃ اقرأ " کی پہلی پانچ آیات نازل ہوئیں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غار کو چھوڑ کر گھر واپس آئے اور اپنی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو بتایا کہ مجھے آج یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ وہ شاید کسی دن مجھے نقصان نہ پہنچائے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے تسلی دی اور کہا کہ خدا آپ (ﷺ) کو ضائع نہیں کرے گا۔ ورقہ بن نوفل میرا چچازاد بھائی ہے جو ان معاملات (یعنی فرشتے، وحی وغیرہ) سے واقف ہے۔ کل صبح جا کر ہم اس سے گفتگو کریں گے، وہ آپ کو بتائے گا۔ میں ان چیزوں سے واقف نہیں ہوں، لیکن مجھے یقین ہے کہ شیطان کبھی آپ کو دھوکا نہیں دے سکے گا۔ ایک روایت کے مطابق صبح کو وہ آپ کو اپنے ساتھ ورقہ بن نوفل کے پاس لے جاتی ہیں۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ملنے ان کے عزیز دوست ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان کو یہ قصہ سنایا اور کہا کہ انھیں اپنے ساتھ لے جا کر ورقہ سے ملاؤ۔ ورقہ بن نوفل بہت بوڑھے تھے، ان کی بصارت زائل ہو چکی تھی، مذہباً نصرانی تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ ان کے پاس پہنچے اور یہ قصہ سنایا تو ورقہ نے بے ساختہ یہ الفاظ کہے: اے محمد (ﷺ) جو

چیزیں تم نے ابھی بیان کی ہیں، اگر وہ صحیح ہیں تو یہ ناموس موسیٰ علیہ السلام سے مشابہ ہیں۔ 'ناموس' کا لفظ اردو میں عام طور پر عزت کے لیے مستعمل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں یہ مفہوم نہیں ہوسکتا۔ بعض مفسرین ناموس کے معنی 'قابل اعتماد' لکھتے ہیں، وہ بھی یہاں موزوں نہیں ہے۔ بعض لکھتے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ناموس کا نام دیا جاتا ہے۔ اسلامی ادبیات میں وہ 'روح الامین' ہیں، مگر یہ معنی بھی یہاں کام نہیں دیتے۔ میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ 'ناموس' اصل میں ایک اجنبی لفظ ہے، جو معرب ہوکر عربی زبان میں استعمال ہوا۔ یہ یونانی زبان کا لفظ (Nomos) ہے۔ یونانی زبان میں لفظ توریت کو نوموس، یعنی قانون کہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ورقہ بن نوفل کا بیان ہے کہ یہ چیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توریت سے مشابہ ہے اور یہی معنی زیادہ قرین قیاس نظر آتے ہیں۔

قرآن مجید کی تبلیغ واشاعت کے متعلق قدیم ترین ذکر ابن اسحٰق کی ''کتاب المغازی'' میں ملتا ہے۔ یہ کتاب ضائع ہوگئی تھی، لیکن اس کے بعض ٹکڑے حال ہی میں ملے ہیں اور حکومت مراکش نے ان کو شائع بھی کیا ہے۔ اس میں ڈیڑھ سطر کی ایک بہت دلچسپ روایت ہے، جسے ابن ہشام نے اپنی سیرۃ النبی میں معلوم نہیں کس بنا پر یا سہواً چھوڑ دیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: ''جب کبھی رسول اللہ ﷺ پر قرآن مجید کی کوئی عبارت نازل ہوتی تو آپ سب سے پہلے اسے مردوں کی جماعت میں تلاوت فرماتے پھر اس کے بعد اسی عبارت کو عورتوں کی خصوصی محفل میں بھی سناتے۔'' اسلامی تاریخ میں یہ ایک اہم واقعہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو عورتوں کی تعلیم سے بھی اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی مردوں کی تعلیم سے۔ یہ قدیم ترین اشارہ ہے جو قرآن مجید کی تبلیغ کے متعلق ملتا ہے۔ اس کے بعد کیا پیش آیا یہ کہنا مشکل ہے، لیکن بالکل ابتدا زمانے ہی سے ہمیں ایک نئی چیز کا پتہ چلتا ہے وہ یہ کہ قرآن مجید کو لکھوایا جائے اور غالباً حفظ کرانا بھی اسی ابتدائی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پہلی وحی کے موقع پر قرآن مجید کی سورۃ اقرأ کی پہلی پانچ آیتیں رسول اللہ ﷺ تک پہنچائیں تو

ایک حدیث کے مطابق حضرت جبرئیل علیہ السلام نے دو کام اور کیے۔ ایک تو رسول اللہ ﷺ کو استنجا اور وضو کرنا سکھایا کہ نماز کے لیے کس طرح اپنے آپ کو جسمانی طور پر پاک کریں۔ دوسرے یہ کہ نماز پڑھنے کا طریقہ بھی بتایا۔ ظاہر ہے کہ نماز میں قرآن مجید کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں، لہٰذا ابتدائی زمانے ہی سے جب لوگ مسلمان ہونے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں حکم دیا ہوگا کہ قرآن مجید کو حفظ بھی کرو اور روزانہ جتنی نمازیں پڑھنی ہوں ان نمازوں میں ان کا اعادہ بھی کرتے رہو۔ گویا اس وقت ہمیں دو باتیں نظر آتی ہیں۔ قرآن مجید حفظ کرنا اور اسی کو لکھنا۔ آدمی کو کسی نئی چیز کو ازبر کرنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ اس کے سامنے کوئی تحریری عبارت ہو تو اس کو بار بار پڑھتا ہے، بالآخر وہ حفظ ہوجاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں قرآن کو حفظ کرنا اور لکھنا دونوں ایک ہی زمانے کی چیزیں ہیں۔ ہمارے مورخ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر جب کوئی آیت نازل ہوئی تو وہ اپنے صحابہ میں سے کسی ایسے شخص کو جسے لکھنا پڑھنا آتا ہوتا، یاد فرماتے اور اس کو املا کراتے تھے۔ اہم بات یہ بیان ہوئی ہے کہ لکھنے کے بعد اس سے کہتے کہ ''جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر سناؤ'' تاکہ اگر کاتب نے کوئی غلطی کی ہو تو اس کی اصلاح کرسکیں۔ یہ قرآن مجید کی تدوین کا آغاز ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ تھا کہ لکھوانے کے بعد اپنے صحابہ کو حکم دیتے کہ اسے ازبر کرلو اور روزانہ دو وقت کی نمازوں میں پڑھو۔ اس وقت دو نمازیں تھیں۔ معراج کے بعد پانچ نمازیں ہوئیں تو دو کے بجائے پانچ مرتبہ اس کو لوگ نماز میں دہرانے لگے۔ اس کا ایک عملی فائدہ یہ ہے کہ اگر آدمی کا حافظہ اچھا نہ ہو اور سال بھر میں مثلاً صرف عیدالاضحیٰ اور عیدالفطر کے دن قرآن مجید کو حافظے کی مدد سے پڑھے تو ممکن ہے کہ اس کو بھول جائے، لیکن اگر کوئی آدمی روزانہ پانچ مرتبہ دہراتا ہے تو ظاہر ہے قرآن مجید اس کے حافظے میں رہے گا اور وہ اسے نہیں بھولے گا۔ (ماخوذ)۔

☆☆☆

ماحولیاتی آلودگی کے مسائل کا حل

قرآن کریم کی روشنی میں

● پروفیسر اختر الواسع

چند برسوں کے دوران ماحولیاتی تحفظ کے شعور و احساس نے دھیرے دھیرے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اقوام متحدہ سے لے کر ملکوں کی حکومتوں تک قومی و عالمی سطح پر اس سلسلے میں غور و فکر کا سلسلہ جاری ہے۔ اخبارات اور رسائل میں اس مضمون کی خبروں اور مضامین کا چلن عام ہو گیا ہے۔ اب سے پہلے کہیں کوئی پیڑ کاٹا جاتا تھا تو یہ نہ تو کوئی واقعہ ہوتا تھا نہ کوئی خبر، مگر آج پیڑوں کا کاٹا جانا جرائم کی فہرست میں شامل ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی عمل جرائم کی فہرست میں تبھی شامل کیا جاتا ہے جب اس کا تعلق انسانی زندگی کی نفی یا نقصان سے ہو جاتا ہے، مگر ماحولیاتی خرابی کرۂ ارض پر انسانی زندگی کی ہولناک تباہی کے اندیشوں سے کتنا گہرا اور باہمی تعلق رکھتی ہے اس کا احساس عام ہو جانے کے باوجود ابھی تک اس کے اصل اسباب کا ادراک ہم سے گریزاں ہے، لیکن اسباب کی تلاش اور نشان دہی اور ان کے تجزیہ سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عربی دنیا میں انسانی زندگی کے حقیقی چہرے کو بے نقاب کیا جائے۔

آج مغرب سے مشرق تک دنیا میں کہیں بھی نگاہ ڈالیں تو انسانی زندگی شدید دیوانگی کی حالت میں نظر آتی ہے۔ سائنس و ٹکنالوجی کی ہوش ربا ترقی، خاص طور پر اطلاعاتی و

مواصلاتی انقلاب کے سبب ساری دنیا سمٹ کر ایک بہت بڑے گاؤں میں تبدیل ہو گئی ہے۔ آج آپ دنیا کے کسی بھی حصے، کسی بھی گوشے میں کسی سے بھی کسی وقت رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ انٹرنیٹ نے آپ کے سامنے اطلاعات اور معلومات کا ایک طلسم خانہ لا کر رکھ دیا ہے۔ انسانی خواہشوں کا ایک سیلاب ہے جو امنڈا چلا آ رہا ہے اور صنعت کی دنیا ان خواہشات کے مطابق روز نئی تراش خراش کی مصنوعات کے انبار لگانے میں مصروف ہے۔ زمین کے سینے پر نیزوں کی طرح گڑی ہوئی بلند و بالا اور مغرور عمارتوں والے بڑے بڑے شہروں کے بڑے بڑے مصنوعی روشنیوں والے بازاروں میں زرق برق لباسوں اور خواہشوں کی پرستش سے بھرے دل و دماغ والی مخلوق ان مصنوعات کی خرید و فروخت میں لگی ہوئی ہے۔ بازار بڑھتے جا رہے ہیں اور لباس، کھانوں، مکانات اور گاڑیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، مگر لوگ بھولے ہوئے ہیں کہ یہ سب کچھ کیا کھو کر حاصل کیا جا رہا ہے۔

شہروں کی ہوا کارخانوں اور گاڑیوں کے دھوئیں سے زہر آلود ہو رہی ہے۔ کارخانوں کے فضلات اور انسانی غلاظت سے ندیوں کا پانی زہر آلود ہو رہا ہے۔ کرۂ ارض کو سورج کی روشنی میں موجود الٹرا وائلٹ شعاعوں سے محفوظ رکھنے والا اوزون کا غلاف جگہ جگہ سے پھٹ گیا ہے جس سے اندیشہ ہے کہ کچھ برسوں بعد کئی ایسے جزیرے یا ملک جو سمندر کی سطح سے کم اونچائی پر ہیں غرقاب ہو سکتے ہیں۔ کیمیائی کھادوں اور جراثیم کش دواؤں کے کثرت استعمال سے سبزیوں اور پھلوں کے رگ و ریشوں میں بھی زہر سرایت کرتا جا رہا ہے۔ ان سب کا نتیجہ ہے کہ آج پورا کرۂ ارض ایک بھیانک ماحولیاتی فساد کی گرفت میں آ گیا ہے جس کے ختم ہونے کے آثار نظر نہیں آتے۔ یہ بھیانک صورت حال نیوکلیائی جنگ کی تباہ کاری سے بھی زیادہ ہولناک ہے، کیونکہ نیوکلیائی جنگ کے بعد بھی زندگی کے کچھ آثار باقی رہ سکتے ہیں، مگر یہ ماحولیاتی فساد ایک ایسا شدید تیزاب ہے جو دھیرے دھیرے زندگی کی رگ و پے میں سرایت کر کے اسے اندر ہی اندر ہلاک کر رہا ہے۔ یہ سلسلہ بے روک جاری

رہا تو انسان ہتھیاروں کو زحمت دیے بغیر ہی خود اپنے ہاتھوں نیست و نابود ہو جائے گا، لیکن اس کے ساتھ اتنی ہی عبرت ناک بات یہ ہے کہ آج ماحولیاتی تحفظ کے لیے ترتیب دی جانے والی تمام تر حکمت عملی مسئلے کے محض ظاہری آثار و مظاہر تک محدود ہے۔ اس کی جڑ تک پہنچنے کا کوئی شعور و احساس کہیں نظر نہیں آتا۔ ساری توجہ اس بات پر ہے کہ جنگل کاٹے جا رہے ہیں تو اس کے خلاف قوانین بنائے جائیں اور ان کا سخت نفاذ کیا جائے یا زیادہ سے زیادہ شجر کاری کی جائے یا پھر فضائی آلودگی ختم کرنے کے لیے گاڑیوں کے لیے نیا اور کم آلودہ ایندھن استعمال کیا جائے یا آبی آلودگی کی روک تھام کے لیے کارخانوں کو آلودہ کار فضلات کے اخراج سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے یا بیرونی فضا میں موجود اوزون پرت کے تحفظ کے لیے کلوفلورو کاربن پیدا کرنے والی مصنوعات ساز صنعتوں پر قدغن لگائی جائے۔ یہ تمام تدابیر مناسب اور ضروری ہیں، لیکن یہ دراصل مسئلے کے خارجی پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں، اس کی تہہ تک رسائی نہیں پا سکتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماحولیاتی خرابی اور ماحولیاتی تحفظ کا تعلق ٹکنالوجی سے زیادہ انسانی رویے سے، خارج سے زیادہ باطن سے اور جسم سے زیادہ روح سے ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ سارا فساد دراصل اس بے لگام مادیت کا نتیجہ ہے جو خدا اور مذہب سے کٹ جانے کے بعد انسان کا مقدر بن گئی ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ اس فساد کی اصلاح اس مادی حکمت عملی سے کیوں کر ہو سکتی۔ یہ فساد تو اسی وقت ختم ہو سکتا ہے جب انسان اپنا تعلق ایک ہمہ وقت حاضر و ناظر رہنے والی ذات، یعنی اللہ سے جوڑے اور اس کا احساس رکھے، تاکہ اپنی ہلاکت خیز حرکتوں پر قابو پا سکے۔ اسی ضمن میں اس مسئلہ پر غور کرنا بھی افادیت سے خالی نہ ہوگا کہ انسان کے موجودہ بحران کا سوتا کہاں سے ملتا ہے۔

موجودہ ماحولیاتی بحران کی فکری جڑیں ۱۱ رویں صدی میں یورپ کے اس ذہنی رویے میں تلاش کی جا سکتی ہیں جس کے تحت انسان کو کائنات کی تمام مخلوقات کا مرکز اور محور قرار دیا

گیا اور انسانی عقل کو علم کا واحد ماخذ و سرچشمہ تصور کیا جانے لگا۔ علم و عقل اور انسان و کائنات کے اس تصور میں کائنات کے کسی ماورائے انسان خالق اور رب کے وجود کا کوئی خانہ نہیں تھا۔ اس طرح حقیقت کا تصور صرف یہاں تک محدود ہو کر رہ گیا کہ حقیقت وہی ہے جو حواس کے ذریعے جانی جا سکے اور عقل کے ذریعے ثابت کی جا سکے، یعنی حواس کے دائرۂ علم اور عقل کے دائرہ تصدیق سے باہر کچھ بھی نہیں۔ یہ حقیقت خالص مادی حقیقت تھی۔

عقل پرستی کا یہ ذہنی رویہ اچانک ظہور میں نہیں آیا تھا، اس کے لیے مغربی فکر و فلسفہ گزشتہ تین چار سو سال سے زمین تیار کر رہے تھے۔ یہ سلسلہ دراصل شروع ہوا مغرب میں احیائے علوم یا نشاۃ ثانیہ کی تحریک سے جس کے زیر اثر قدیم یونان کے عقلی علوم کو از سر نو زندہ کیا گیا اور دھیرے دھیرے انسان کے اس تصور کو استحکام حاصل ہوا جو آپ اپنی منزل اور مقصد تھا۔ اس صورت حال کو عصر حاضر کے ایک ممتاز مسلم دانشور پروفیسر سید حسین نصر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''احیائے علوم کی تحریک کے نتیجے میں ایک ایسا انسان ابھرا ہے جس نے فطرت پر مکمل غلبے اور اس کی بربادی کو ممکن بنا دیا۔ عہد وسطیٰ کا مسیحی انسان آدھا دیوتا، آدھا انسان، آدھا فرشتہ اور آدھا ارضی انسان تھا۔ یہ ایک ایسا انسان تھا جو جنت کی طرف بھی اپنی ذمے داری سمجھتا تھا اور زمین کی طرف بھی۔ وہ ان دونوں قطبین کے درمیان سرگرداں تھا، یہ سب کچھ اس حقیقت کے باوجود ہوا کہ احیائے علوم کی تحریک نے قدیم دنیا کی دانش مندی کو دوبارہ زندہ کیا تھا اور اسے زندہ اور فعال مسیحی مسلک انسانیت نوازی سے ہم آہنگی کیا تھا، لیکن آخر کار نہ تو وہ مسیحی انسانیت نوازی اور نہ افلاطونی انسانیت نوازی، بلکہ وہ ایک ایسی قسم کا مسلک انسانیت نوازی تھا جس نے انسان کو مکمل طور پر ارضی انسان بنا دیا۔ اس کے بعد سے اس نے کسی چیز کے لیے کوئی ذمے داری محسوس نہیں کی۔ وہ کسی کا وفادار نہیں رہا اور اپنے سے پرے کسی کی بھی حاکمیت کو قبول نہیں کرتا تھا۔''

اسی تحریک نے ہی اس سائنسی انقلاب کے لیے راستہ بنایا جو ۱۷ رویں صدی میں

جدی مغربی فکر وفلسفے کے بانی ویکارت کے محور پر قائم تھا۔ ویکارت نے ایک مشینی کائنات کا تصور پیش کیا جس میں کوئی مابعد الطبیعیاتی عامل کارفرما نہیں۔ اسی دوران گلیلیو اور کیپلر ایک ایسی فلکیات کی بناڈال چکے تھے جو خالصتاً مادی تھی۔ اس کے نتیجے میں ایک سنگین واقعہ پیش آیا کہ کائنات کے تقدس کا وہ تصور منہدم ہوگیا جس نے اب تک انسان اور کائنات کے درمیان ایک گہرا قریبی رشتہ قائم کر رکھا تھا۔ اسی زمانے میں برطانیہ کے فلسفی فرانسیسی بیکن نے علم کا ایک ایسا تصور پیش کیا جس نے علم، انسان اور فطرت کے رشتوں کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ فرانس بیکن نے کہا کہ علم یا سائنس قوت ہے۔ اس سادہ سے جملے میں کیسی کیسی قیامتیں پنہاں تھیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت یورپ میں ابھرنے والے نئے سرمایہ دار بوژوا طبقے نے اسے اپنا بنیادی عقیدہ اور نعرۂ جنگ بنالیا۔ اس طرح ایک ایسی دنیا وجود میں آئی جہاں کائنات خدا سے خالی تھی اور زمین پر انسان کی رہنما تھی۔ اس کے دل میں موجزن مادی خواہشیں اس کا بنیادی محرک تھیں اور فطرت پر قبضہ، اس کا استحصال اور اس کے نتیجے میں غلبہ وتسلط اس کا نصب العین تھا۔ پھر صنعتی انقلاب شروع ہوا جس نے مصنوعات کے ڈھیر لگا دیئے۔ یہ سلسلہ آگے بڑھا تو صنعتوں کو خام مال اور اپنی پیداوار کی کھپت کے لیے بازاروں کی ضرورت ہوئی۔ اس کے لیے نوآبادیات کا راستہ اختیار کیا گیا اور ایشیا وافریقہ کے بیشتر ملک یوروپی طاقتوں کے زیر اقتدار آ گئے۔

مذکورہ بالا مباحث سے واضح ہوتا ہے کہ گزشتہ تین سو برسوں کے دوران انسان کا فکری ارتقا باطن سے خارج کی طرف ہوا ہے جس کے نتیجے میں انسان نے اپنے روحانی مرکز سے ٹوٹ کر اپنے ایک خودمختار مادی اقتدار کے قیام کا اعلان کیا اور دھیرے دھیرے ایک طرف تو کائنات کی فراخی میں گم ہوکر تنہا ہوتا چلا گیا تو دوسری طرف اس میں بلا کی بے رحمی اور سفاکی آتی چلی گئی اور اس نے ساری کائنات، دیگر مخلوقات اور خود انسانوں کو اپنا غلام اور ماتحت بنانے کی مہم چھیڑ دی۔

انسان، کائنات اور فطرت کا باہمی تعلق:

یہیں سے دراصل ہم اس نکتہ تک پہنچتے ہیں جہاں ماحولیاتی بحران کو اسلامی تصور حیات کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے۔

آیئے ذرا تفصیل سے دیکھیں کہ قرآن کریم اور سیرت رسول پاک (جو وحی الٰہی کا آئینہ عمل ہے) میں انسان، کائنات، فطرت اور ان کے درمیان تعلق کی کیا صورت پیش کی گئی ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ یہ کائنات اور اس کی ہر چیز ایک نپے تلے انداز پر، ایک نظم وترتیب اور توازن وتناسب کے ساتھ اور ایک خاص میزان پر بنائی گئی ہے۔ ''ہم نے آسمان کو بلند کیا اور ایک میزان قائم کی۔'' (الرحمٰن:۴) ''ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ اس کے درمیان ہے بیکار پیدا نہیں کیا۔ ایسا خیال تو (صرف) انہی لوگوں کا (ہوسکتا ہے) جو کافر ہیں۔'' (ص:۲۷)

''اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے (وہ سب کچھ) کھیل (تماشہ) نہیں بنایا۔ ہم نے ان کو حق کے ساتھ بنایا ہے، لیکن بیشتر لوگ نہیں سمجھتے۔'' (الفرقان:۳۸-۳۹)

''اور یقیناً ہم نے تمہیں زمین میں جگہ دی اور تمہارے لیے زندگی کا سامان مہیا کر دیا (لیکن) تم بہت ناشکر گزاری کرتے ہو۔ اور یقیناً ہم نے تمھیں پیدا کیا اور تمھیں (اچھی) صورتیں بھی دیں۔'' (الاعراف:۱۰-۱۱)

''بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھوں میں بادشاہی ہے (زمین وآسمان کی) اور وہی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (وہ ذات) جس نے موت وحیات کو پیدا کیا، تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے، اور وہ غالب ہے، بخشنے والا ہے۔ (وہی ہے) جس نے سات آسمان اوپر تلے بنائے۔ تم رحمٰن کی صنعت میں کوئی خلل نہ دیکھو گے، پھر نظر دوڑاؤ

کیا تمہیں کہیں کوئی خرابی نظر آتی ہے؟ پھر دوبارہ نظر ڈالو تو نگاہ تمہاری طرف لوٹ آئے گی تھک ہار کر اور بلاشبہ ہم نے آسمان کو چراغوں سے روشن کیا۔'' (الملک:۱-۵)

''بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات و دن کے آگے پیچھے آنے جانے میں اور کشتیوں میں جو سمندر میں نفع کا سامان (تجارت) لے کر لتی ہیں اور جو پانی اللہ آسمان سے اتارتا ہے پھر اس سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیتا ہے اور اس (زمین) میں چلنے والے جانوروں اور ہواؤں کو ادل بدل کر لانے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان اٹھائے جاتے ہیں (ان سب چیزوں میں) نشانیاں ہیں (اللہ کی قدرت) سمجھدار لوگوں کے لیے۔'' (البقرۃ:۱۶۴)

اس طرح قرآن پاک نے ایک ایسی کائنات کی تصویر پیش کی ہے جو ہر لحاظ سے ترتیب و توازن کے ساتھ بنائی گئی ہے اور یہ کائنات محض کھیل تماشے کے لیے نہیں بنائی گئی، بلکہ حق کے ساتھ بنائی گئی ہے اور اس میں نشانیاں ہیں اس کے خالق کی، تاکہ سمجھدار اور دانش مند لوگ ان پر غور کریں اور شکر گزار ہوں اور اچھے کام کریں۔ تمام مخلوقات اس لیے پیدا کی گئی ہیں کہ وہ اپنے پروردگار کی عبادت اور ایک دوسرے کی بھلائی کریں۔ اس سے کائنات میں بقائے باہم کا اصول قائم ہوتا ہے۔ انسان کائنات کا ایک بہت اہم اور خاص حصہ ہے اور کائنات کے تمام اجزاء و عناصر ایک دوسرے سے مربوط اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ قرآن پاک اور رسول اکرمؐ کی تعلیمات کے مطابق انسان پر فرض ہے کہ وہ کائنات کے اسرار پر غور کرے اور اس کے مختلف اجزا اور مختلف مخلوقات کے لیے ذمے داری اور خیر و فلاح کا رویہ اختیار کرے۔ ایک نہایت متوازن و متناسب کائنات کی تخلیق کے بعد اللہ نے انسان کو تخلیق کیا اور اسے زمین پر اپنا نائب اور خلیفہ مقرر کیا۔

پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا: ''میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔'' انھوں نے عرض کیا: ''کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر

کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خوں ریزی کرے گا؟ آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لیے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔'' فرمایا: ''میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔'' اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے، پھر انھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا ''اگر تمہارا خیال صحیح ہے تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ؟'' انھوں نے عرض کیا ''نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے، ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو دیا ہے۔'' (البقرۃ:۳۰-۳۳)

ان آیات کریمہ میں اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو اپنے خلیفہ اور نائب کی حیثیت سے پیدا کیا اور اسے اس منصب جلیل کے لیے تیار کرنے کی غرض سے تمام اشیا کے نام سکھائے، یعنی علم کی دولت سے نوازا، تاکہ وہ اپنی تخلیق کے سبب اور مقصد سے باخبر رہے اور اس خدائی منصوبے کو روبہ کار لائے جو اس کی تخلیق کے پس پشت کارفرما ہے۔ ایک اور آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انسان نے یہ امانت اپنے ذمے لی ہے:

''ہم نے (یہ) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی، سو ان سب نے اس کو اٹھانے سے انکار کیا اور وہ اس سے ڈرے اور اسے انسان نے اپنے ذمے لے لیا۔ بیشک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔ (الاحزاب:۷۲)

یہ امانت ہے زمین پر اپنے رب کے احکام کو جاری اور نافذ کرنا۔ یہاں انسان کا اپنا کچھ نہیں۔ ساری چیزیں اور ساری حاکمیت اللہ کی ہے۔ انسان کو تو صرف اپنے پروردگار کے منصوبے کو عمل میں لانا ہے۔ اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔ (الذاریات:۵۶)

کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بے فائدہ پیدا کیا اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہ آؤ گے۔ (المومنون:۱۱۵)

زمین پر انسان کو اس طرح رہنا بسنا ہے کہ اس کا ہر عمل ایک عبادت کی طرح ہو۔

رسول اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

''یہ دنیا حسین اور ہری بھری ہے اور بلاشبہ اللہ رب العزت نے تمھیں اس میں ایک امانت دار بنایا ہے اور وہ دیکھ رہا ہے کہ تم کس طرح کا عمل کرتے ہو''۔

اس طرح یہ اصول قائم ہوتا ہے کہ اللہ نے دنیا کے تمام قدرتی وسائل انسانوں کو ایک امانت کے طور پر عطا کئے ہیں۔ یہ وسائل سب کے لیے ہیں، اس لیے قرآن کے نزدیک ان کا استعمال تمام مخلوقات کی فلاح و برکت کے لیے ہونا چاہئے، پھر یہ کہ یہ وسائل کسی ایک زمانے کے انسانوں کے لیے نہیں تمام زمانوں کے انسانوں کے لیے ہیں، اس لیے انھیں باقی اور برقرار رکھنا بھی انسان کے فرائض میں داخل ہے، لہٰذا انسان کو فطرت اور قدرتی وسائل کو اس طرح استعمال نہیں کرنا چاہیے کہ وہ آئندہ زمانوں اور نسلوں کے لیے باقی نہ رہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو یہ حق نہیں کہ اپنے فطری ماحول اور قدرتی وسائل کو تباہ کرے، بلکہ اس سے مطلوب ہے کہ اسے زندگی کی جو نعمتیں اور فطرت کے جو انعامات عطا کیے گئے ہیں انھیں صحیح طور پر استعمال کرے اور دوسروں کو بھی ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کرے، مزید یہ کہ زمین پر پائے جانے والے قدرتی وسائل کو مزید ترقی دے اور ان کے ذریعہ زمین کی تزئین اور حسن کاری کا سامان کرے۔

اللہ کے رسول کا فرمان ہے: کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے کہ اگر اس نے کھیتی باڑی کی ہو، درخت لگائے ہوں اور پھر اس کھیتی یا درخت سے پرندے، آدمی یا جانور خوراک حاصل کریں تو یہ اس کے حق میں صدقہ شمار نہ ہو۔ (صحیح بخاری)

ایک اور جگہ ارشاد نبویؐ ہے: جس کے پاس کوئی زمین ہے اور وہ خود زراعت نہ کر سکے تو اپنے بھائی کو دے دے۔'' (صحیح بخاری)

اسی سلسلے کی ایک اور حدیث ہے: ''اگر تم میں سے کسی پر آخری وقت آجائے اس حال میں کہ اس کے ہاتھ میں ایک پودا ہو تو وہ پہلے اسے لگا دے۔'' (سنن ابوداؤد، صحیح بخاری)

اللہ کے پیارے رسول نے صحرا کے کسی ایسے درخت کو کاٹنے سے منع فرمایا ہے جس سے کسی انسان یا جانور کو رزق یا سایہ حاصل ہوتا ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

اللہ کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان کے مطابق وہ خالق ہے، ولی ہے، مالک الملک ہے، رزاق ہے، مقیت ہے، حافظ ہے۔ یہ تمام صفات انسانی زندگی اور قدرتی وسائل کے تحفظ اور ان کی بقاو برقراری سے تعلق رکھتی ہیں، لہٰذا انسان کو بھی اللہ کا خلیفہ ہونے کی حیثیت سے انہی صفات الٰہی کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ ارشاد الٰہی ہے: ''فساد پھیل گیا ہے خشکی اور تری میں انسانوں کے اعمال کی وجہ سے اور اللہ ان بداعمالیوں کا مزہ چکھائے گا جو انھوں نے کی ہیں، تاکہ وہ (راہ راست) پر واپس آجائیں۔ اے نبی کہہ دیجئے جاؤ ساری زمین پر گھوم پھر کر دیکھو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جو تم سے پہلے آئے تھے۔ (الروم:۴۱-۴۲)

جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ذکر ہوا قرآن کریم نے بار بار زمین پر فساد پھیلانے والوں اور حد سے گزر جانے والوں کو دردناک عذاب کی یاد دلائی ہے۔ یہ فساد اس کے سوا اور کیا ہے کہ ان چیزوں کو ان نعمتوں اور وسائل کو جو اللہ نے بطور امانت بخشے تھے تباہ و برباد کر دیا جائے اور خالق کائنات نے زندگی کا جو طریقہ مقرر کر دیا ہے اور فطرت کے جو ضابطے طے کر دیے ہیں ان کی خلاف ورزی کی جائے اور کائنات کے نظم و ترتیب اور توازن و تناسب کے بگاڑ پر روک لگانے کے بارے میں متعدد ہدایات دی گئی ہیں۔ مختلف طریقوں سے ہوا، پانی، زمین، جانوروں اور نباتات کے تحفظ اور سلامتی کی اہمیت و افادیت کو واضح کیا گیا ہے۔

خدا نے پانی کو زندگی کی بنیاد قرار دیا ہے: ''ہم نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔'' (الانبیاء:۳۰) ''ہر جان دار اپنی زندگی کی بقا اور برقراری کے لیے پانی پر منحصر ہے۔ بیشک جو پانی اللہ آسمان سے زمین پر اتارتا ہے اس سے مردہ زمین پھر زندہ ہو اٹھتی ہے۔'' (البقرۃ:۱۶۴) ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وہ اللہ ہی ہے جو آسمان سے پانی برساتا ہے اور نوع

بہ نوع پودے اور درخت اگاتا ہے۔'' (الانعام:۹۹)

اللہ نے پانی جیسی زندگی کے لیے لازمی چیز کی قدر و قیمت پہچاننے کی ترغیب دی ہے ''کیا تم نے اس پانی کو دیکھا جو تم پیتے ہو، کیا اسے بادلوں سے تم نے برسایا، ہم نے اسے اتارا؟ ہم چاہتے تو اسے کڑوا بنا دیتے۔ تو پھر تم شکر ادا کیوں نہیں کرتے۔'' (الواقعہ: ۶۸-۷۰)

پانی کی اسی اہمیت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے اسے تمام انسانوں اور جانداروں کے لیے مشترک بنا دیا ہے اور اسی لیے اس پر کسی کو بھی اجارہ داری قائم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''تمام مسلمان تین چیزوں میں شریک ہیں: پانی، گھاس اور آگ۔ (ابن ماجہ) حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا: اے اللہ کے رسول! یہ پانی اس کو تو ہم جانتے ہیں، نمک اور آگ کا کیا معاملہ ہے؟ آپ نے فرمایا: اے حمیرا، جو شخص آگ دے گویا اس نے وہ ساری چیزیں صدقہ دے دیں جو اس آگ نے پکائیں اور جس نے نمک دیا اس نے وہ ساری چیزیں صدقہ کر دیں جن کو نمک نے اچھا بنایا اور جس شخص نے کسی مسلمان کو ایسی جگہ پانی پلایا جہاں پانی نہیں ملتا تھا تو اس نے گویا کسی کو زندہ کر دیا۔ (صحیح بخاری)

اسلام میں پانی کے ضرورت سے زیادہ استعمال سے منع کیا گیا ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کہیں سے گزر رہے تھے، صحابی رسول سعدؓ وضو کر رہے تھے۔ اللہ کے رسول نے فرمایا: اے سعد! اسے کیوں ضائع کر رہے ہو؟ اس پر سعدؓ نے پوچھا کہ کیا وضو میں بھی پانی ضائع ہوتا ہے؟ رسول اکرمؐ نے جواب دیا: ''اس وقت بھی جب تم بہتے ہوئے دریا کے پاس ہو۔'' (مسند امام احمد بن حنبل، ابن ماجہ)

احادیث میں ایسے متعدد ارشادات نبوی ملتے ہیں جن میں کاشت کاری کے فروغ، پیڑ پودوں کے لگانے پر زور دیا گیا ہے اور درختوں کو کاٹنے اور انھیں گندا کرنے سے روکا گیا

ہے۔ ماحولیاتی تحفظ اور زندگی کی حرمت کا یہی عرفان ہے جس کے تحت حرم کی حدود میں کسی جاندار کے قتل یا کسی بھی درخت کو کاٹنے کی مکمل ممانعت کی گئی ہے۔

اسی طرح اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جانوروں پر ظلم اور انھیں ایذا پہنچانے کے خلاف سخت تنبیہ کی ہے اور ان پر رحم کرنے کو اعلیٰ ترین کار خیر میں شمار کیا ہے۔ امام بخاری نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ اللہ کے رسول نے فرمایا: ''ایک شخص کہیں جا رہا تھا کہ اسے پیاس لگی اور وہ ایک کنویں پر گیا اور اس کا پانی پیا۔ وہاں سے لوٹتے ہوئے اس نے دیکھا کہ ایک کتا پیاس سے تڑپ رہا ہے اور کیچڑ کھا رہا ہے۔ اس شخص نے سوچا کہ یہ کتا اسی تکلیف میں ہے جس سے میں گزر چکا ہوں۔ سو وہ کنویں پر گیا اور اس نے اپنے جوتے میں پانی بھرا اور کتے کی پیاس بجھا دی۔ اللہ نے اس کے اس عمل کو پسند کیا اور اسے بخش دیا۔ لوگوں نے سوال کیا: ''یا رسول اللہ! کیا جانوروں کی خدمت کار ثواب ہے؟'' اس پر اللہ کے رسول نے فرمایا کہ ''ہاں! بے شک جانوروں کی خدمت میں ہمارے لیے بڑا ثواب ہے۔'' (صحیح بخاری)

اللہ کے رسولؐ نے ایک پریشان حال اونٹ کو دیکھا تو اس کے ساتھ نہایت شفقت کا سلوک کیا اور اس کے مالک کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: ''کیا تمہیں اس جانور کے معاملہ میں اللہ کا خوف نہیں ہے جسے اللہ نے تمہاری کفالت میں دیا ہے؟ اس نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم اسے بھوکا رکھتے ہو اور اس پر اس کی سکت سے زیادہ بوجھ ڈالتے ہو۔'' (سنن ابوداؤد) ایک اور حدیث ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے سرزنش فرمائی کہ کسی جانور کو اس کام کے لیے استعمال نہ کیا جائے جس کے لیے اسے پیدا نہیں کیا گیا۔

صحیح مسلم میں ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: ''ایک شخص سامان سے لدے ایک بیل پر سوار جا رہا تھا کہ بیل نے اس کی جانب رخ کر کے کہا کہ مجھے اس کام کے لیے پیدا نہیں کیا گیا، بلکہ زمین جوتنے اور آب پاشی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔'' ایک

حدیث میں رسول اکرمؐ نے جانوروں کو (مشق کے وقت) نشانہ کے طور پر استعمال کیے جانے سے منع فرمایا ہے۔ (صحیح مسلم) اور اسی طرح ایک جانور کو کسی دوسرے جانور کے خلاف بھڑکانے اور اکسانے کی بھی ممانعت فرمائی ہے۔ (سنن ابوداؤد) رسول پاکؐ نے کسی گزشتہ رسول کا واقعہ بیان فرمایا، جنھوں نے اس بات پر کہ کسی چیونٹی نے انھیں کاٹا تھا اس کا بل جلا ڈالا۔ اس پر اللہ نے ان سے فرمایا: ایک چیونٹی کے کاٹنے پر تم نے ہماری مخلوق کی ایک پوری آبادی جلا ڈالی جو ہماری حمد وثنا کرتی ہے۔'' (صحیح مسلم) رسول اکرم نے اپنے ایک صحابیؓ کو حکم فرمایا کہ وہ ایک چڑیا اور اس کے گھونسلے کو جس میں اس کے چھوٹے بچے تھے، اسی جگہ پر واپس رکھیں جہاں سے وہ انھیں اٹھا کر لائے تھے۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

قرآن وسنت کی ان تعلیمات وتنبیہات کی روشنی میں ایسے اسلامی ضابطے مرتب کیے گئے جن کے تحت فطری ماحول کے تحفظ اور قدرتی وسائل کے مفاد عامہ کے لیے استعمال کو قانونی شکل دی گئی۔ اسلامی قانون کے تحت ایک ضابطہ احیاء الموات، یعنی بنجر زمین کو قابل کاشت بنانے سے متعلق ہے جس کی رو سے کوئی شخص کسی بنجر زمین کو قابل کاشت بنائے تو اس پر اس کو حق ملکیت حاصل ہو جاتا ہے۔ اس ضابطے کا مقصد لوگوں کو ناقابل استعمال اور بیکار پڑی زمینوں کو مفاد عامہ کے لیے قابل استعمال بنانے کی ترغیب دینا ہے۔ اسی ضابطے کے تحت خالی زمین لوگوں کو کاشت کاری یا دیگر استعمال کے لیے دی جاتی تھی۔ اس کام کے لیے سرکاری زمینیں بھی پٹے یا اجارہ پر دی جاتی تھیں۔

قدرتی وسائل کے تحفظ کی غرض سے محفوظ علاقے قائم کرنے کا قانون بھی تھا۔ ان میں موجود جنگلات، پانی کے ذخائر اور جانوروں کو کسی بھی طرح نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا تھا۔ یہ روایت خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کی اور ان کے بعد خلفائے راشدین نے اسے جاری رکھا اور بعد کے زمانے میں بھی اس پر عمل کیا جاتا رہا۔ اس اصول کے تحت مکہ مکرمہ کے اطراف کے سارے علاقے کو حرم قرار دیا گیا جہاں کسی بھی جاندار اور درخت

کو نقصان پہنچانے پر مکمل پابندی ہے۔ ایک حدیث کے مطابق اللہ کے رسول نے فتح مکہ کے موقع پر فرمایا: ''اسے تقدس حاصل ہے اللہ نے اسے روز قیامت تک مقدس قرار دیا ہے۔ یہاں کے کانٹے نہ کاٹے جائیں۔ یہاں کے جانوروں کا شکار نہ کیا جائے اور یہاں کوئی چیز کھو جائے تو اسے کوئی نہ اٹھائے، سوائے اس کے کہ جو اسے اٹھائے وہ اس کا اعلان کرے اور یہاں کے سبزہ نو دمیدہ کو کاٹا نہ جائے۔'' اس پر عبداللہ بن عباسؓ نے مشورہ دیا کہ اے اللہ کے رسول! سوائے اذخر (جو ایک خاص طرح کی گھاس ہے) کے۔ اللہ کے رسول نے فرمایا ''سوائے اذخر کے۔'' (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

اسی طرح اللہ کے رسولؐ نے مدینہ منورہ کے اطراف کے علاقے کو بھی حرام قرار دیا۔ فرمان نبوی ہے: ''بیشک ابراہیم نے مکہ کو حرام قرار دیا ہے اور میں مدینہ کو حرام قرار دیتا ہوں۔ یہاں کے درخت نہ کاٹے جائیں اور یہاں کے جانوروں کا شکار نہ کیا جائے۔ (صحیح مسلم، حضرت جابر ابن عبداللہؓ سے روایت)

اسلامی قانون کے تحت ہر گاؤں یا قصبے کے چاروں طرف ایسا محفوظ علاقہ رکھا جانا چاہئے جہاں کی خالی زمین پر قبضہ کرنا یا اسے ذاتی استعمال میں لانا خلاف قانون ہو۔ اس اجتماعی زمین کی دیکھ بھال علاقے کے ذمے دار افراد کے سپرد کی جاتی تھی۔ اسی طرح پانی کے ذرائع کو بھی اجتماعی علاقوں میں شامل کیا جاتا تھا۔ اوقاف کا تصور بھی اسی اسلامی ضابطے کا حصہ ہے جس کے تحت مسلمانوں کو اپنی زمین جائیداد فلاح عام کے لیے وقف کرنے کی ترغیب دی گئی۔ حضرت عمر ابن الخطابؓ نے خیبر کے علاقے میں کوئی قطعہ اراضی حاصل کیا تو اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ سے مشورے کے لیے حاضر ہوئے اور کہا: ''یا رسول اللہ! میں نے خیبر میں ایک قطعہ اراضی حاصل کیا ہے۔ میں نے کوئی جائیداد ایسی حاصل نہیں کی کہ جو میرے لیے اس سے بڑھ کر عزیز ہو۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا ارشاد ہے؟ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم چاہو تو اسے وقف کر دو اور اس کی

فصل کو خیرات کردو۔'' حضرت عمرؓ کے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ کا کہنا ہے کہ ''حضرت عمرؓ نے اسے وقف کر دیا اور اعلان کر دیا کہ اسے نہ تو فروخت کیا جائے نہ تحفے میں دیا جائے اور نہ اسے وراثت میں دیا جائے اور اس کی فصل کو غریبوں، عزیز و اقارب کے لیے، غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے اللہ کی راہ میں اور مسافروں اور مہمانوں کے لیے استعمال کیا جائے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

اس تمام گفتگو سے جو اسلامی موقف سامنے آتا ہے اسے مختصراً اس طرح مرتب کیا جاسکتا ہے:

۱- تمام کائنات اور مظاہر فطرت اللہ کی نشانیاں اور آیات و آثار ہیں، اس لیے انھیں تقدس حاصل ہے۔

۲- انسان کو زمین پر اللہ کا خلیفہ اور نائب بنا کر بھیجا گیا ہے اور اس کا مقصد حیات خیر و فلاح کے کام کرنا اور اپنے رب کی عبادت کرنا ہے۔

۳- فطرت کی تمام نعمتیں اور تمام قدرتی وسائل انسان کو بطور امانت دیئے گئے ہیں۔

۴- انسان پر فرض ہے کہ وہ ان نعمتوں اور وسائل کو خیر و فلاح کے لیے استعمال کرے۔ انھیں فروغ دینے کی کوشش کرے اور ہر قیمت پر ان کے تحفظ اور بقا کو یقینی بنائے۔

۵- انسان خدا کی دی ہوئی نعمتوں اور قدرتی وسائل کے بے رحمانہ استحصال اور ان کی تباہی و بربادی، یعنی زمین پر فساد پھیلانے سے بچے کہ یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

اسلام کا یہ تصور عالم جو انسان مرکوز نہیں، بلکہ خدا مرکوز ہے زندگی کا ایک ایسا جامع اور وسیع دائرہ کھینچتا ہے جو جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان سب کو محیط ہے اور ان سب کے مابین ایک خلقی وحرکی تسلسل کی نشان دہی کرتا ہے اور اس امر کی مرکزیت پر زور دیتا ہے کہ کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ ایک عنصری وحدت کا حصہ ہے۔ تمام عناصر کہیں بے جان

اور کہیں جاندار کی شکل میں مرتب اور مرکب ہوئے ہیں، مگر صور، انواع اور خواص کے اختلاف کے باوجود انھیں ایک دوسرے سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام کی یہی شمولیت پسندی اس کی تخصیص ہے۔

یہ قرآنی شمولیت پسندی آج کے انسان سے ایک ایسی ترقیاتی حکمت عملی کا تقاضا کرتی ہے جس کے تحت فطرت کی تسخیر سے زیادہ اس سے ایک بقائے باہم کا رشتہ قائم کرنے کو ترجیح حاصل ہو۔ فطرت کی طاقتوں کا بے محابہ اور بے دریغ استحصال اب اپنی انتہا کو پہنچ کر الٹے نتائج دینے لگا ہے۔ یہ زمین انسان کو جو کچھ دے سکتی تھی دے چکی۔ اب انسان کا فرض ہے کہ وہ اس پر مزید بار نہ ڈالے، بلکہ اس کی کھوئی ہوئی دولتوں کو بحال کرنے کی کوشش کرے، کیونکہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ دن بہت دور نہیں جب یہ کرۂ ارض اپنے موجودہ دکھوں کے ساتھ کائنات کی لامحدود فراخیوں میں غرق ہوجائے۔ کیا حاملین اسلام کی حیثیت سے مسلمانوں کو دنیا کے سامنے ایک متبادل ماحولیاتی حکمت عملی پیش نہیں کرنی چاہئے؟ یقیناً کرنی چاہیے۔

☆☆

برمحل گفتگو کا قرآنی اعجاز

● نسیم اختر شاہ قیصر

قرآن کریم ایک منشور حیات ہے، صحیفہ ہدایت ہے اور جاں بلب انسانیت کے لیے نسخہ شفا ہے۔ اجتماعی اور انفرادی مسائل کا جامع اور اخلاق و کردار کی دوستی کا سرچشمہ ہے۔ چودہ صدیاں گزر گئیں، آسمان نے کتنے انقلاب دیکھے اور زمین پر حوادث وتغیرات کی بے شمار تاریخیں اور داستانیں رقم کی گئیں، تہذیبیں بدلیں، ادوار بدلے، سوچ اور فکر کے زاویے بدلے، عدل وانصاف کے پیمانے بدلے، کردار وعمل کی خوبیاں جنس نایاب بنیں، صداقت و دیانت کی خوبیاں داستانِ ماضی کہلائیں، سب کچھ بدل گیا، ہر چیز تبدیل ہوگئی۔ اگر کوئی نہیں بدلا تو وہ ''قرآن'' ہے جو پوری صداقتوں اور عظمتوں کے ساتھ اپنے وجود کا احساس دلا رہا ہے، بلکہ اپنے وجود کی خوشبو سے پورے عالم کو معطر کئے ہوئے ہے۔

قرآن آسمانی کتاب وصحائف میں اپنی شان کی بالکل الگ کتاب ہے۔ یہ کلام اللہ ہے جس میں تعلیمات واحکامات کے ساتھ ساتھ عبرت وموعظت کے لیے اہم سابقہ کے واقعات بھی ہیں۔ انبیا وسابقین کے تذکرے بھی ہیں، جن کا منشا اور مقصد گمراہ لوگوں اور بغاوت پر آمادہ انسانوں کو سیدھے راستہ پر چلانا اور رہنمائی کرنا ہے۔ قرآن نے جہاں مختلف انداز، لب ولہجہ اسلوب اور طرز پر آقائے نامدار احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف کرایا، ان کے منفرد کمالات کا تذکرہ کیا اور ان کے مقام ومرتبہ کا اعلان کیا، وہیں ضرورت پڑنے پر اللہ وحدہٗ لاشریک کی صفات کو بھی بیان کیا۔

قرآن میں خدائی صفات کے بیان کے بظاہر دو سبب نظر آتے ہیں۔ اوّل ان نظریات وافکار کی بیخ کنی جن کو کفار ومشرکین مختلف صفات کے ذریعہ معبودان باطل سے منسوب کرتے ہیں۔ دوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ ووسلم کی حوصلہ افزائی اور ہمت افزائی، تاکہ آپ کے قلب میں عظمت خداوندی جاگزیں ہو اور کسی مرحلہ پر آپ خود کو بے یار ومددگار اور بے سہارا تصور نہ کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بے خوف ہوکر کار نبوت جاری رکھیں۔ کفار اور مشرکین کی لن ترانیاں اور دعوے آپ کے ارادوں کو متاثر ومتزلزل نہ کرسکیں، چنانچہ قرآنی تعلیمات کا ہی اثر تھا کہ خاتم الانبیاء کی نگاہیں صرف ذات خداوندی پر مرکوز ہیں اور کفار ومشرکین کا ظاہری کروفر آپ کو قطعی متاثر نہ کرتا۔ قرآن نے جن دو مقاصد کے تحت صفات خداوندی کے بیان کا یہ اسلوب اختیار کیا، اس میں وہ ہر طرح سے کامیاب ہے، وہ معبود حقیقی کے مقابل پیش کیے جانے والے بتوں اور باطل معبودوں کا نہ صرف جواب بنا، بلکہ اس نے ان کی حقیقتوں سے بھی پردہ اٹھایا، ان کی صحیح شکلیں اور صورتیں اختیار کیں، حقیقت سے بھی عالم کو واقف کرایا اور یہ احساس پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی کہ خداوند عالم اپنے اختیارات اور اقتدار کے اعتبار سے منفرد تنہا اور یکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ان صفات عالیہ اور کمالات عظیمہ کا کوئی دوسرا دعویدار اور مالک ہو ہی نہیں ہوسکتا۔ دوسری جانب آں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی استقامت عطا کی اور آپ نے پورے استقلال و دلجمعی اور بے خوفی کے ساتھ اپنے فرائض کی تکمیل اور پیغام الٰہی کو پہنچانے میں جوش جذبے اور مستعدی کا مظاہرہ فرمایا، جن خدائی صفات کا قرآن کریم میں ذکر ہوا ہے ان پر بھی تھوڑی بہت گفتگو کی ضرورت ہے۔

قرآن پاک کا ارشاد ہے: ''حق تعالیٰ 'موجد' ہے، آسمانوں اور زمینوں کا اور جب کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو بس اس کام (کی نسبت) اتنا فرما دیتا ہے کہ ہوجا (بس) وہ اسی طرح ہوجاتا ہے۔''

یہ ایک کھلا ہوا اعلان ہے کہ تم کن بتوں، دیوی، دیوتاؤں کی بات کرتے ہو، خداوند کائنات تو وہ ہے جو زمین اور آسمان کا خالق ہے اور اس کے صرف ایک اشارے سے تمام مراحل طے ہوجاتے ہیں۔قرآن کریم کی اس آیت پر اگر آپ غور کریں گے تو یہ بات کھل کر سامنے آئے گی کہ قرآن نے یہاں بھی اپنے ایجاز واختصار کے کمال اور خصوصیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور تفصیلی بیان کی بجائے مختصر انداز میں مکمل بات کہی ہے۔اس انداز پر دیگر قرآن کا مطالعہ کریں۔ یہ بات زیادہ صاف ہوکر سامنے آتی ہے۔قرآن کہتا ہے:''اور ہم نے آسمانوں سے پانی برسایا پھر اس زمین میں ہر طرح کے عمدہ اقسام اگائے۔''

ایک دوسری جگہ ارشاد قرآن میں ارشاد ہے:''وہ مشرق ومغرب کا مالک ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں تو اسی کو اپنے کام سپرد کرنے کے لیے قرار دیتے ہو۔''

اللہ وحدہٗ لاشریک کی صفات وکمالات سے متعلق قرآن کریم میں بے شمار آیات موجود ہیں، ان سب کا یہاں لکھنا مقصود نہیں، اصل مقصود ہے اس جانب اشارہ کرنا کہ خداوند قدوس نے قرآن کریم کو جو عظمت، بزرگی اور دیگر آسمانی کتابوں میں جو انفرادیت عطا کی ہے اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔منجمد اور وجوہات کے قرآن کریم کا اسلوب منفرد انداز بیان حکیمانہ، الفاظ وحروف کا انتخاب مؤثر اور اس کا خطاب عام ہے۔عمومیت کے ساتھ قرآن نے خطاب عام کو اختیار کیا ہے، چیدہ چیدہ مقامات پر اگر کچھ اشخاص یا شخصیتیں اس کا مخاطب بنی ہیں تو ان میں سے اکثر کا حکم عام ہے اور ان افراد کو مخاطب کرنے کی مصلحت اس جانب اشارہ ہے کہ پیغمبر اس پیغام کو عام کرے یا جن افراد کے سپرد یہ معاملہ کیا گیا تو وہ اس کو دوسروں کو پہنچائیں، پھر صفات ربانی کے بیان میں قرآن کریم نے یہ ذمہ داری خود کیوں اٹھائی، اس میں بھی ایک مصلحت وحکمت یہ نظر آتی ہے کہ قرآن اپنے منشا ومقصد کو خود ادا کرنا چاہتا ہے اور متکلم اپنے مطلب کی بات جس خوبی کے ساتھ ادا کرسکتا ہے ترجمانی کا فرض ادا کرنے والا اس خوبی کے ساتھ ادا نہیں کرسکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ

احکم الحاکمین ترجمانی کا فریضہ ادا کرنے والے کو اعلیٰ خوبیوں وکمالات سے نوازے۔ یہاں پر بادی النظر میں مقدس قرآن یہی نظر آتا ہے جو سطور بالا میں بیان کیا جاچکا ہے۔

ایک پہلو کمالات الٰہیہ کے ذکر کا یہ بھی سامنے آتا ہے کہ موقع اور محل کی مناسبت سے یہ اعلان ہو اور موقع اور محل کے صحیح استعمال پر جس قدر خداوند کریم واقف ہے، دوسرا کوئی واقف نہیں ہوسکتا، اس لیے قرآن کریم نے یہ کام کیا کہ جس موقع اور جگہ پر جس اسلوب کی ضرورت محسوس ہوئی اس نے اس کو اختیار کیا اور موقع جس بات کو کہنے کا تھا اس نے وہی بات کہی، اس سے دو فائدے حاصل ہوئے۔ایک تو یہ کہ قرآن بے موقع بات کہنے کے الزام سے محفوظ رہے (بے موقع بات نہ کرنے کا التزام قرآن کریم نے ہر جگہ کیا ہے) اور دوسرے اس کے اچھے اور برے نتائج بھی سامنے آئے، جب باطل دعویٰ کرنے والوں کو ہاتھ کے ہاتھ جواب مل گیا تو جو ذی شعور اور صاحب عقل تھے وہ سوچنے اور سمجھنے پر مجبور ہوئے اور انھوں نے ان گہرائیوں میں اتر کر معاملہ کو سمجھنے کی کوشش کی۔ برسوں کے بنے بنائے ذہنوں کو قرآن کریم نے انتشار سے دوچار کردیا اور اس انتشار ذہنی سے بچنے کا اور محفوظ رہنے کا طریقہ یہی تھا کہ ''قرآن'' کے دعوؤں اور اعلانات پر غور کیا جائے۔سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ان دعوؤں کی حقیقت کو جاننے کی کوشش کی جائے تو قرآن دونوں اعتبار سے کامیاب رہا۔

قرآن کریم نے اپنے دعوؤں کے سلسلہ میں کچھ اس طرح کا ڈھنگ اس وقت بھی اختیار کیا تھا جب اس نے کفار کو قرآن کا بدل لانے کا چیلنج کیا اور یہ چیلنج شروع ہوا کہ اس جیسا کوئی دوسرا قرآن لے آؤ۔چلو اچھا پورا قرآن تمہارے لیے بنا کر لانا مشکل ہے تو ایک سورت اسی طرح کی لے آؤ۔ مانا کہ تم اس پر بھی قادر نہیں، اچھا ایک آیت بطور ثبوت پیش کردو تو تم اپنے دعویٰ میں سچے قرار پاؤ گے۔قرآن کے یہ دعاوی بھی مختلف مواقع پر مناسب اور تقاضوں کے تحت سامنے آتے ہیں۔

اب سب حقائق سے ایک بات یہ بھی سامنے آتی ہے کہ قرآن کا پیغام عام ہے اور اس پر غور وفکر کے دروازے ہمیشہ کھلے ہوئے ہیں۔ یہ کلام ربانی جس کے معانی ومفاہیم کو دور اور قریب کے زمانے کے ساتھ خاص نہیں کیا جاسکتا اور نہ وقت کے دائروں میں اس کو محدود کیا جاسکتا ہے، اس کا پیغام آفاقی بھی ہے اور ابدی بھی اور آفاقیت اور ابدیت کا خاصہ اور تقاضہ یہ ہے کہ غور وفکر کا کام نہ چھوڑا جائے اور نہ موقوف کیا جائے، اس لیے کہ آفاقی اور ابدی چیزیں ہمیشہ دعوت فکر دیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اور کسی عام کا کلام نہیں ہوسکتا۔ یہ اختصاص صرف قرآن کریم کو حاصل ہے کہ وہ اپنی بات کو مدلل پیش کرتا ہے۔ مفروضات پر مبنی کوئی دعویٰ اس کے یہاں سرے سے ہے ہی نہیں، قرآن نے جو دعوت دی وہ اس جیتی جاگتی دنیا کے لیے ایک روشن حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر شبہات اور شکوک کا اظہار کیا گیا تو قرآن نے کمال خوبی کے ساتھ ان کو رفع کرنے کی واقعی اور کارآمد کوشش کی، اس لیے یہ بات تو طے ہے کہ یہ کسی فرد کا کلام نہیں ہے اور اسی سچائی کو جھٹلانے کی تمام کوششیں ماضی میں بھی بے کار ثابت ہوئیں اور ہر زمانہ میں بے فائدہ اور بے سود رہیں گی، انشاء اللہ۔

قرآن مجموعہ اعجاز ہے اور اس کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ وہ انسانوں کا ہمدرد، مونس اور غمگسار بن کر گفتگو کرتا ہے، اجنبیوں کی طرح بات چیت کرنا اور نامانوس کلام کے قریب سے بھی وہ ہو کر نہیں گزرتا، جس کا لازمی اور فکری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص کو اس میں کشش محسوس ہوتی ہے اور ہر قلب میں اس کی تاثیر دیکھی جاسکتی ہے اور اس کے مفاہیم، مطالب، معانی اور تعلیمات تک پہنچنے کا جذبہ دل میں موجزن ہو تو قرآن کی ان صداقتوں اور خوبیوں کو بآسانی سمجھا اور مانا جاسکتا ہے۔

☆☆

قرآن کریم کا عالمگیر تصور اخوت

● مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلویؒ

قرآن کریم وہ واحد مذہبی کتاب ہے جس نے انسانی تکریم وانسانی شرف وعزت کا اعلان مذہب کی ایک بنیادی سچائی کے طور پر پیش کیا، چنانچہ قرآن کریم نے انسان اوّل حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے سلسلہ میں جو اعلان کیا اس میں انسان کو خدا تعالیٰ کے نمائندہ ونائب کی حیثیت سے نمایاں کیا۔ قرآن نے اعلان کیا: ''**واذ قال ربک للملكة انی جاعل فی الارض خليفه**''. (البقرۃ:۳۰) (اے ملائکہ! میں زمین پر اپنا نائب اور خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں)۔

وہ نائب خدا حضرت آدمؑ تھے۔ آدم کا اپنے قادر مطلق مالک کے نمائندہ ہونے کے سبب انھیں اشرف المخلوقات کا رتبہ واعزاز حاصل ہوا۔ قرآن کریم نے کہا: ''**لقد خلقنا الانسان فی احسن تقويم**'' (التین: 4) (ہم نے انسان کے ظاہری وجود کو بہترین سانچے میں ڈھالا)۔ انسان کے باطنی وجود، یعنی اس کی روح کو خدا تعالیٰ نے اپنی خاص روح قرار دیا اور کہا: ''**ونفخت فيه من روحی**'' (الحجر: 29) (میں نے آدم کے وجود خاکی میں اپنی روح ڈالی)۔

قرآن نے آدم اور اولاد آدم کو عزت وفضیلت کے مرتبہ سے نوازنے کا اعلان کرتے ہوئے کہا: **ولقد كرمنا بنی آدم. الخ** (سورہ بنی اسرائیل:70) (اور ہم نے اولاد آدم کو عزت وفضیلت سے نوازا)۔ یہ عزت وشرف عقیدہ ومذہب سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ آدم

اور انسان بحیثیت انسان کے اس عزت و شرافت کے حق دار بنائے گئے اور تمام مخلوقات پر اس مخلوق کو برتری عطا کی گئی۔

انسان رب العالمین کا نمائندہ:

خدا تعالیٰ نے اپنا تعارف کراتے ہوئے اپنے آپ کو ربّ العالمین (تمام جہانوں کا رب) کہا اور اپنی پروردگاری کا تعلق صرف انسانوں سے قائم نہیں کیا، بلکہ تمام مخلوقات سے قائم کیا اور اس کا مطلب یہ قرار دیا کہ خدا تعالیٰ کا نائب خدا تعالیٰ کی اس صفت کا مظہر ہے اور آدم کی خلافت خدا تعالیٰ کی ربوبیت و پروردگاری کا عالم اسباب میں اس کا ذریعہ و سبب ہے۔ یہودی خدا تعالیٰ کو اپنی قوم میں محدود کرتے تھے اور اسے رب الیہود کہتے تھے۔ نصاریٰ باپ بیٹے روح القدس کے عقیدۂ تثلیث میں خدا کو اپنے اندر محدود کرتے تھے، لیکن قرآن کریم کا پہلا سبق (الفاتحہ) خدا تعالیٰ کی عام ربوبیت اور عام رحمت کا اعلان کر رہا ہے۔

یہ بنیادی عقیدہ قرآن کریم نے پوری اہمیت کے ساتھ پیش کیا اور اسی بنیادی حقیقت پر اولاد آدم آپس میں بھائی بھائی قرار پائے۔ ہادی قرآن حضرت محمد ﷺ نے اپنے آخری خطبہ (حجۃ الوداع) میں اعلان فرمایا: ''اے لوگو! تم سب عربی، عجمی، امیر و غریب، کالے اور گورے، آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں۔'' (حدیث پاک)

ایک باپ کی اولاد کو تقسیم کرنا ایک غیر فطری بات ہے اور ایک باپ کی اولاد کے درمیان اخوت اور بھائی چارے کا رشتہ ایک فطری حقیقت ہے۔

مذہب کا اختلاف انسانیت کو تقسیم نہیں کرتا:

عقیدہ اور مذہب کے اختلاف سے یہ رشتہ متاثر نہیں ہوتا اور اسلام نے اس رشتہ

اخوت کو بنیادی حقوق کے نام سے ایک مستقل نظام کی شکل دی ہے، تاکہ بھائی چارہ صرف ایک نعرہ بن کر نہ رہ جائے اور اس نعرہ کو دنیا والے سیاسی فائدہ اٹھانے تک محدود نہ کریں۔

رسول پاک ﷺ نے اس قرآنی اعلان کو جس انداز سے پیش کیا اس میں انسانی اخوت، توحید اور نبوت کے بنیادی عقائد کے بعد تیسرا بنیادی عقیدہ قرار پاتا ہے۔ حضور ﷺ ہر نماز کے بعد عام طور پر یہ دعا کرتے تھے: ''الٰہی! تو حقیقی پروردگار ہے، میں گواہی دیتا ہوں کہ تو واحد ہے اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد (یعنی میں) تیرے رسول ہیں اور گواہی دیتا ہوں ''**انا شهيد ان العباد كلهم**''. (ابوداؤد، جلد اوّل، کتاب الادعیہ) (میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے تمام بندے آپس میں بھائی بھائی ہیں)۔

رسول پاک کی دعا انسانی اخوت پر گواہی ہے۔ دعا کا پیرایہ اخلاص کا اسلوب ہے۔ اس پاریہ میں انسانی اخوت کا اعلان انسانی بھائی چارے کے عقیدہ میں اخلاص پیدا کرتا ہے اور ایک سیاسی فیشن اور سیاسی نعرہ نہیں رہتا۔

پڑوسی کا عالم گیر تصور:

پڑوس اور پڑوسی کا رشتہ فطری کشش رکھتا ہے۔ قرآن نے اس رشتے کے تعلق سے انسانی اخوت کے رشتے کو مستحکم کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے: ''**واعبدوا الله ولا تشركوا به شيـاء و بـالوالدين احسانا وبذى القربىٰ و اليتٰيمىٰ والمسٰكين والجار ذى القـربىٰ والـجـار الـجنب والصّاحب بالجنب وابن السّبيل وما ملكت و ايـمٰـنكم انّ الله لا يحبّ من كان مختا لا فخورا**'' (خدا کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور پڑوسیوں کے ساتھ جو تین قسم کے ہیں ان کے ساتھ بھی)۔

قرآن کے الفاظ یہ ہیں: '' **واعبدوا اللهولا تشركو به شياء**'' (سورہ: النساء)

(رشتہ دار پڑوسی کے ساتھ، اجنبی پڑوسی کے ساتھ اور پہلونشیں پڑوسی کے ساتھ)۔

یہ پہلونشین پڑوسی، پاس بیٹھنے اٹھنے والے، اس پیرایہ میں بڑی وسعت ہے۔ شارحین قرآن نے اس مفہوم میں وقتی طور پر کچھ دیر کے لیے بھی پاس بیٹھنے والے شخص کو اس وسیع دائرہ میں شامل کیا ہے اور مدرسہ میں، دفتر میں، ریل وسفر میں، بازار اور دکان میں چند منٹ کے لیے پاس بیٹھنے والا اس دائرۂ پڑوس میں شامل ہو جاتا ہے۔

غور کرو کہ قرآن کریم کے معجزانہ اسلوب میں پڑوسی کے دائرہ میں مسلمان، غیر مسلم، امیر وغریب اور مرد وعورت، سب شامل ہو جاتے ہیں اور اس طرح انسانی اخوت کے رشتے میں شہری (سماجی) زندگی کا ہر فرد بھائی نظر آتا ہے۔ قرآن سے پہلے پڑوسی دیوار بیچ کا پڑوسی تھا۔ قرآن نے اس حد بندی کو ختم کر کے شہری زندگی کے ہر فرد کو پڑوسی کے فطری رشتہ میں شامل کر دیا ہے۔ یہ ذمہ داری تھی اس کتاب ہدایت کی جو زندگی کے وسیع ترین دور اور بین الاقوامی عہد کی رہنمائی کا اعلان کرتی ہے۔

قرآن کریم کا حقیقی معجزہ:

قرآن کریم مختلف لسانی، ادبی اور تاریخی پہلوؤں سے معجزہ ہے، لیکن حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے قرآن کے اس پہلو کو اہمیت دی ہے اور اسی پہلو کے معجزہ ہونے کو ترجیح دی ہے کہ قرآن کی تعلیمات، عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات ہر دور کی انسانی ضروریات کی رہنمائی کے لیے کافی ہیں۔

رسول پاک ﷺ نے پڑوسی کے اسی مفہوم وسیع اور مفہوم عام کے اعتبار سے یہ ارشاد فرمایا: ''خدا کی قسم وہ شخص مومن نہیں'' تین دفعہ فرمایا۔ ''وہ شخص جس کا پڑوسی اور کی تکلیفوں سے محفوظ نہ ہو۔'' (مشکوٰۃ، کتاب الادب)

غور کرو! رسول پاک ﷺ نے ایک مسلمان کو کتنا امن پسند اور کس قدر انسان دوست

بتایا ہے۔ علماء کرام پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی احادیث کا تعلق دیوار بیچ پڑوسیوں سے قائم کرتے ہیں، لیکن ہادی قرآن کے ذہن میں قرآن کا وہی تصور تھا جو اوپر مذکور ہوا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''اہل زمین پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔'' (مشکوٰۃ، کتاب الادب)

مولانا حالی نے اس حدیث کا ترجمہ ایک شعر میں اس طرح کیا ہے:

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

نظام اخوت، بنیادی حقوق (تکریم انسانیت):

ضروری تھا کہ انسانی اخوت کے بنیادی تصور کو عملی زندگی میں نافذ کرنے کے لیے ایک مضبوط عملی پروگرام بنایا جائے، چنانچہ اسلام نے بنیادی حقوق انسانی کے نام سے ایک منظّم پروگرام بنایا اور مشہور امام فقہ علامہ شاطبی القرطبی (ساتویں صدی ہجری سنہ وفات) نے اس نظام کو مقاصد ضروریہ کے نام سے اپنی ''کتاب الموافقات'' میں تحریر کیا۔ قرآن کریم نے تکریم آدم کا جو نظریہ بنیادی تصور کے طور پر پیش کیا تھا اسے فقہا نے قانونی پیرایہ میں پوری تفصیل کے ساتھ مرتب کیا، جو یہ ہے:

(۱) نفس انسانی کا تحفظ، قتل ناحق کی ممانعت (۲) نسل انسانی کا تحفظ، زندگی کی ضروریات، روٹی کپڑا اور علاج کا انتظام (۳) مذہبی آزادی کا احترام، عقیدہ میں جبر و زبردستی کی ممانعت۔ (۴) ضمیر کی آزادی (۵) مال اور ملکیت کی حفاظت، معاشی آزادی

ہر انسان یہ حقوق رکھتا ہے، اس کا مذہب اور عقیدہ کچھ بھی ہو اور ہر مسلمان پر اپنی حیثیت واثر کے مطابق ان حقوق کی تعمیل لازمی قرار دی گئی ہے۔

بے قصور انسانوں کو سیاسی اور ذاتی پرخاش کے سبب ہلاک کرنا قرآن کے نزدیک

فساد کبیر اور بڑا ظلم قرار پاتا ہے۔ قرآن کریم نے کہا: ''**من قتل نفسا بغیر نفس أو فساد فی الارض فکأنما قتل الناس جمیعا و من احیاها فکأنما احیاء الناس**'' (المائدۃ:32) (جو شخص کسی انسان کو ہلاک کرے بغیر کسی قصور و جرم کے، اس نے تمام انسانی سماج کو ہلاک کرنے کے برابر قصور کیا اور جس نے کسی انسان کو زندہ رہنے کا حق دیا اور اس کے واجبی حقوق ادا کر کے اسے زندگی بخشی، اس نے پورے انسانی سماج کو زندگی بخشی)۔

قرآن کریم نے انسانی جان کی حفاظت کے سلسلہ میں آیت مذکورہ میں جو تصور پیش کیا وہ پچھلی شریعت (توراۃ) کے اندر بھی موجود تھا اور یہودیوں کو بھی یہی نصیحت کی گئی تھی۔

قرآن کریم قانون عدل ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں عدل کے معنی یہ ہیں کہ انسانی حقوق ہوں یا قرابتی حقوق، ان کا نفاذ صحیح ڈھنگ سے کیا جائے اور ان میں کوتاہی کرنے والوں کو مجروم قرار دیا جائے۔ مولانا شاہ ولی اللہ نے خلافت حقہ کی بحث میں عدل کی یہ تعریف کی ہے اور خلیفہ اسلام کو قیام عدل کا ذمہ دار قرار دیا۔ قرآن بتاتا ہے کہ ہادی قرآن حضرت محمد ﷺ کی یہ خاص ذمے داری اور آپ کا خاص مشن کا تھا کہ حقوق کے قیام میں کسی قسم کی کوتاہی نہ ہونے پائے، چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں عدل قائم کروں۔'' (الشوریٰ:۱۵) یعنی مامور ہوں قیام عدل پر۔

حضور ﷺ پوری شریعت، توحید، نماز و زکوٰۃ قائم کرنے پر مامور تھے، مگر جس پاریہ میں آپ کی زبان مبارک سے قیام عدل کی ذمے داری کو واضح کیا گیا وہ پیرایہ بالکل منفرد ہے اور یہ اس مشن (قیام عدل) کی اہمیت کا اظہار ہے۔ قرآن کریم نے رسول پاک ﷺ کے اس مشن کی پوری نگرانی رکھی اور آپ ﷺ سے اس مشن میں ذرہ برابر لغزش نہیں ہونے دی۔ اس سلسلے میں حضور ﷺ کی زندگی کا حسب ذیل واقعہ بڑا اہم ہے۔ سورۃ النساء:۱۰۵ کی آیات میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

مدینہ میں چوری کا ایک واقعہ پیش آیا اور شبیر ابن ربیرق نے حضرت قتادہ کے گھر میں سے ان کے ہتھیاروں کا تھیلا چرالیا۔ شبیر نے یہ چالاکی کی کہ وہ تھیلا ایک یہودی کے پاس امانت کے طور پر رکھ دیا۔ تھیلے میں ایک سوراخ تھا جس میں سے تھیلے کا آٹا گرتا ہوا چلا گیا۔ صبح کو قتادہ کے گھر والوں نے سراغ لگالیا اور یہودی کے پاس سے اپنا سامان حاصل کرلیا۔ یہ معاملہ حضور ﷺ کے سامنے آیا۔ یہودی نے بیان دیا کہ یہ سامان شبیر نے میرے پاس رکھوایا تھا، میں نے قتادہ کے گھر سے چوری نہیں کی۔

شبیر کے قبیلہ نے اپنے آدمی کی حمایت کی اور اسے نیک چلن بتایا۔ مقدمہ کی ظاہری روداد کے لحاظ سے یہودی مجرم معلوم ہوتا تھا، کیونکہ مال مسروقہ اس کے پاس سے برآمد ہوا تھا۔

رسول پاک ﷺ کی حیثیت ایک جج کی تھی جو مقدم کی ظاہری روداد کو دیکھ کر فیصلہ کرتا ہے، چنانچہ آپ کی رائے بھی سرسری طور پر یہودی کے مجرم ہونے کی قائم ہوئی۔ ہوسکتا تھا کہ آپ کا قانونی فیصلہ بھی اسی سرسری تاثر کے مطابق جاری ہوجاتا، مگر آپ ایک پیغمبر بھی تھے۔ قرآن نے اس معاملہ میں مداخلت کی اور علام الغیب خدا نے حقیقت کھول دی کہ یہودی بے قصور ہے اور شبیر مجرم ہے، پھر آپ نے وحی الٰہی کے مطابق فیصلہ دیا اور یہودی کو بے قصور اور شبیر کو قصوروار قرار دے دیا۔ قرآن اگر مداخلت نہ کرتا تو رسول پاک ﷺ سے ایک غلط فیصلہ صادر ہوجاتا اور اسلام کے قانون عدل پر دھبا لگ جاتا اور یہ بات ممکن نہ تھی۔

قرآن کا یہ ایک فقرہ قابل غور ہے: ''اے پیغمبر! کسی مجرم کی طرف داری نہ کرنا اور اس معاملہ میں اپنے ذاتی تاثر پر خدا تعالیٰ سے استغفار کرنا، بے شک وہ غفور الرحیم ہے۔'' (النساء)

غور کرو! قرآن اور وحی الٰہی نے عدل و انصاف کے معاملے میں اپنے پیغمبر کی کس طرح حفاظت کی۔ اسی مشن کے بارے میں آپ ﷺ فرماتے تھے: ''مجھے سورہ ہود کی

آیات کے خوف نے بوڑھا کر دیا۔'' (تفسیر ابن کثیر، جلد۳:۹۷)

جس آیت کی طرف آپ نے اشارہ کیا وہ یہ ہے: ''اے رسول! جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے اس پر استقامت کے ساتھ قائم رہو۔'' (ھود:۱۱۲)

وطن دوستی، پہلی منزل:

انسان دوستی کی پہلی منزل وطن دوستی اور اہل وطن کے ساتھ ہمدردی کرنا ہے اور یہ بات عملی زندگی کے لحاظ سے واضح ہے۔ رسول پاک ﷺ نے فرمایا: ''اہل زمین پر رحم کرو۔''

مسلمان جب اس ارشاد رسول پر عمل کرتے ہوئے گھر سے نکلتا ہے تو اس کے سامنے جو اہل زمین آتے ہیں وہ اس کے اہل وطن ہیں۔ اہل وطن، اہل محلّہ، اہل شہر کے ساتھ ہمدردی کرنا اس کی پہلی منزل ہوتی ہے، پھر وہ آگے بڑھتا ہے اور اس کا آخری دائرہ تمام اہل زمین اور تمام انسان ہوتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی کا قول ہے:

''حب الوطن من الایمان''. ''وطن کے ساتھ محبت کرنا ایمان کا جزو ہے۔'

امام فخر الدین رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ قرآن کریم نے وطن کی محبت کا اظہار رسول پاک ﷺ کی زبان مبارک سے کرایا، جب آپ نے ہجرت کے وقت دعا فرمائی: ''اے پروردگار! مجھے عزت کے ساتھ مدینہ میں داخل کر اور عزت کے ساتھ مکہ معظّمہ سے نکال اور مجھے ایک مددگار قوت عطا فرما۔'' (بنی اسرائیل:)

دعا کا اسلوب یہ ہے کہ مکہ سے نکلنے کا ذکر بعد میں ہے، حالانکہ واقعہ کے اعتبار سے اس کا ذکر دخول (ادخلنی) سے پہلے ہونا چاہیے تھا۔ اس اسلوب دعا میں وطن سے نکلنے کا صدمہ اور وطن سے جدائی کا رنج وغم پوشیدہ ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے (مقالات ماجدی، ص۵۱) حضور ﷺ کے اس خطاب سے رسول پاک ﷺ کی اپنے وطن عزیز کے ساتھ محبت پر استدلال کیا ہے۔ حضور ﷺ نے مکہ سے رخصت ہوتے ہوئے

فرمایا: ما اطیب بلدا. ''اے مکہ! تو کتنا پاکیزہ و پسندیدہ شہر ہے۔ اگر تیرے باشندے مجھے نہ نکالتے تو میں تجھ سے جدا نہیں ہوتا۔''

دریا آبادی مرحوم نے اپنے دلکش انداز تحریر میں لکھا ہے کہ خدا کے مقبول بندوں کے دل میں اہل زمین، اہل وطن اور مخلوق خدا کی محبت اسی لیے ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی مخلوق اور اپنا کنبہ اور اپنی عیال قرار دیا ہے۔ حدیث صحیح میں ہے:

''مخلوق خدا، خدا کا کنبہ ہے، اس لیے خدا کو وہی لوگ پسند ہیں جو اس کی عیال کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں۔'' (مشکوٰۃ:ص۴۱)

مسٹر مدھوک سے گفتگو:

اسلام کے پس پسندانہ نظریہ کی اشاعت

ایمرجنسی کے زمانہ میں میں نے جنتا پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ وجے کمار ملہوترا دہلی کے صدر تھے اور میں نائب صدر تھا۔ ایک میٹنگ میں ملہوترا صاحب کے مکان پر مسٹر مدھوک صدر جن سنگھ سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے اسلام کے تعارف کے بارے میں اپنی کتاب ''مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت'' انھیں مطالعہ کے لیے دی۔ ان کا ایک تازہ مضمون ''آرگنائزر'' میں چھپا تھا، جس میں مدھوک صاحب نے اسلام کو ایک جنگ جو اور جہادی مذہب لکھا تھا۔ مدھوک صاحب نے میری کتاب لے لی اور وعدہ کیا کہ وہ اس کا مطالعہ کریں گے۔

دوسری میٹنگ میں میں نے مدھوک صاحب سے عرض کیا کہ کیا آپ نے مولانا آزادی کی تفسیر پر میری کتاب پڑھی؟ ملہوترا صاحب بھی اس گفتگو میں ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔

مدھوک صاحب نے کہا: مولانا! ہم نے اور ہمارے سیکڑوں تعلیم یافتہ نوجوانوں نے

اسلام کی وہ تصویر دیکھی ہے جو پاکستانی تحریک کے دور میں سیکڑوں کتابوں اور کتابچوں کے اندر شائع کی گئی۔ وہ نفرت انگیز کتابیں ہمارے کالجوں کی ہر لائبریری میں موجود ہیں۔ اسلام کا وہ تعارف جو مولانا آزاد نے کرایا ہے وہ ان کے چند مٹھی بھر ماننے والوں تک رہا، اس میں ہم ہندوؤں کا کیا قصور ہے؟

مسلمانوں کو ہماری مخالفت کرنے کے بجائے اسلام اور قرآن کی وہ تصویر جس میں اسلام ایک امن پسند، مذہبی رواداری کا حامل، وطن دوستی اور انسانیت نوازی کا علم بردار ظاہر ہو، اس کی اشاعت ہر زبان میں شائع کرنی چاہیے، تاکہ تحریک پاکستان کا زہر دور ہو۔ یہ بہت سنجیدہ گفتگو تھی، کیونکہ میں جتنا پارٹی کا ایک ممبر تھا۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے آزاد ملک میں دو بڑی قوموں کے درمیان ہمیشہ باہمی نفرت قائم رہے۔

وجے کمار ملہوترا نے یہ فقرے درمیان میں کہے: کانگریس اور بی جے پی کی سیاسی کشمکش کو علیحدہ رکھئے اور مولانا آزاد کی یہ نصیحت سامنے رکھئے۔ مولانا نے فسادات کے دور میں جمعیۃ علماء کے ایک وفد سے فرمایا: ''مسلمانوں کو چاہیے کہ ہر مسلمان پانچ ہندوؤں سے دوستانہ تعلقات قائم کرے، یعنی سماجی سطح پر باہمی میل محبت کی فضا قائم کی جائے۔''

دعوت وتبلیغ کے اصول پر کام کرنے کی ضرورت:

آج ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی دنیا میں اسلامی جہاد کے نام پر جو زہریلا پروپیگنڈہ ہو رہا ہے اس نے پوری اہمیت کے ساتھ یہ ضرورت پیدا کر دی ہے کہ اسلام کی صحیح تصویر پیش کی جائے اور شکایت واحتجاج پر وقت صرف کرنے کے بجائے دعوت وتبلیغ کے اصول پر تعمیری کام کیا جائے۔

قرآن کا وعدہ ہے: ''اے رسول! برائی کے جواب میں اس سے زیادہ اچھائی کا مظاہرہ کیجئے۔ اس تدبیر سے دشمن دوست ہو جائیں گے، البتہ یہ راہ بڑے صبر کی ہے اور یہ

صبر بھی خدا کی توفیق ہی سے حاصل ہو سکتا ہے، اس لیے خدا کی طرف برابر رجوع رکھئے۔'' (فصلت)

تبلیغ ودعوت کی راہ میں ناامیدی اور مایوسی کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ ایمان کا تقاضا ہے کہ خدا کے وعدے پر بھروسہ کیا جائے اور مسلسل جدوجہد جاری رکھی جائے۔ اسلام مذہب دعوت ہے اور مسلمان امت دعوت ہیں اور خدا کا جو وعدہ اپنے رسول ﷺ دعوت کے ساتھ ہے وہ آپ کی امت کے ساتھ بھی ہے۔

رسول رحمت مظلوموں کے وکیل:

رسول پاک ﷺ نے فرمایا: میں قیامت کے دن مظلوم انسانوں کی حمایت میں عدالت خداوندی کے سامنے کھڑا رہوں گا اور مظلوموں کی حمایت کروں گا۔'' (مشکوٰۃ، باب العہد)

یہ مظلوم مسلمان بھی ہوں گے اور وہ غیر مسلم بھی ہوں گے جن کی حیثیت معاہد (عہد والے) کی ہوگی۔ حدیث میں معاہد کا لفظ ہے، یعنی ہم عہد غیر مسلم۔ ایک حدیث پاک کے الفاظ یہ ہیں: ''جو شخص کسی ہم عہد غیر مسلم کو قتل کرے گا اسے جنت کی خوشبو نصیب نہیں ہوگی۔'' (مشکوٰۃ)

آج پوری دنیا دارالعہد ہے:

اسلام میں عہد ومعاہدہ کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ معاہدہ امن وصلح تحریری بھی ہوتا ہے اور عہد عملی (سماجی تعاون) کی صورت میں بھی ہوتا ہے۔ مولانا تھانوی علیہ الرحمہ نے اس فقہی بحث میں وضاحت کی ہے کہ عہد عملی کی رو سے مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ اگر ایک مقام کے غیر مسلموں نے اپنی بستی کے مسلمانوں پر زیادتی کی ہو تو دوسرے مقام کے

مسلمان اپنی بستی کے غیر مسلموں سے اس کا انتقام لیں، کیونکہ یہ اعتماد شکنی ہے جو اسلام میں جائز نہیں۔

مولانا تھانوی نے ''سورہ رعد'' آیت ۱۵ کے تحت لکھا ہے کہ ہر مظلوم کی دعا خدا تعالیٰ قبول کرتا ہے، خواہ وہ مظلوم مسلمان ہو یا غیر مسلم ہو۔ الفاظ حدیث یہ ہیں:

''**دعوة المظلوم متجابة ولو كان كافراً**''.

آج کی دنیا دارالعہد کی حیثیت رکھتی ہے۔ بین الاقوامی معاہدوں (حقوق انسانی) میں دنیا کی تمام قومیں شامل ہیں اور دنیا کے جس حصہ میں مسلمان اور غیر مسلم سماجی زندگی میں باہمی میل جول اور باہمی تعاون و اعتماد کے ساتھ رہتے ہیں وہ آپس میں معاہد (ہم عہد) ہیں اور حقوق انسانی کے پابند ہیں۔

غور کرو! جو تشدد پرست بے قصور مردوں اور عورتوں کو ہلاک کرتے ہیں، رسول پاک ﷺ قیامت کے دن ان کے حق میں وکالت کرنے کا اعلان کر رہے ہیں۔ اسلام میں امن وصلح کے ساتھ اپنے پڑوسیوں اور ہم وطنوں کے ساتھ رہنے کی کتنی اہمیت ہے۔

اقوام متحدہ کے چارٹر پر دستخط کرنے والے تمام ممالک باہم معاہد ہیں:

کسی ملک کی شہریت، عہد معاہدہ ہے۔ فقہ اسلامی کی رو سے کسی ملک کی شہریت کو قبول کرنا معاہدہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے ہر باشندہ پر اس کے قوانین کی پابندی ضروری ہوتی ہے، سوائے اس قانون کے جو اصول دین سے ٹکراتا ہو، متصادم ہو بنیادی اصولوں سے۔

اسی طرح ملک جو آپس میں معاہدہ کرتے ہیں اس معاہدہ کی پابندی اس ملک کے باشندوں کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ فقہ اسلامی کی یہ مسلمہ ہدایات ہیں، جنانچہ بین

الاقوامی معاہدوں کی پابندی اقوام متحدہ میں شریک تمام باشندگان ملک پر لازمی قرار دی جاتی ہے اور ہر شریک ملک کے باشندے بھی اس کے پابند قرار پاتے ہیں۔ عہد عملی اور سماجی میل جول کی فقہی حیثیت پر علامہ سید انور شاہ کشمیری شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند اور مولانا اشرف علی تھانوی مشہور شیخ وقت نے مدلل بحث کی ہے۔ (مجالس حکیم الامت، مطبوعہ کراچی، ص ۸۱)

مدینہ منورہ میں ایک یہودی شہری کو ایک مسلمان نے قتل کر دیا۔ حضور ﷺ نے اس مسلمان قاتل کو قصاص کے طور پر قتل کرا دیا۔ کچھ لوگوں نے ایک یہودی کے بدلے مسلمان کے قتل پر تعجب کا اظہار کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''تم مسلمانوں میں بہتر شخص وہ ہے جو غیر مسلموں کے ساتھ کیے گئے معاہدہ کو پورا کرے اور میں ایک امیر و امام کی حیثیت سے معاہدہ کو پورا کرنے کا زیادہ ذمہ دار ہوں۔'' (**كنز الدقائق كتاب القصاص**)

قدیم حدیث کی کتابوں میں اس معاہدہ سے تحریری معاہدہ مراد لیا گیا ہے لیکن موجودہ عہد کے فقہا نے معاہدہ کو تحریری، تقریری اور عملی معاہدہ کی تینوں سورتوں کو اس میں شامل کیا ہے۔

☆☆☆

قرآن کریم اور رمضان المبارک

● ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی

رمضان المبارک نزولِ قرآن کا مہینہ ہے۔ اس مہینہ کا تعارف کراتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ''**شهر رمضان الذی انزل فیه القراٰن هدی للناس و بینٰت من الهدی والفرقان**'' (البقرۃ:۱۸۵) (رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہِ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں، لہٰذا اب سے جو شخص اس مہینہ کو پائے، اس کو لازم ہے کہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے)۔

رمضان المبارک کی فضیلت کے دو بڑے اسباب ہیں: ایک تو یہ کہ یہ ماہِ صیام ہے، اس ماہ میں روزہ رکھنا سارے مسلمانوں پر فرض ہے۔ جو کوئی سفر یا مرض کی وجہ سے روزہ نہ رکھے وہ دوسرے دنوں میں روزہ رکھے اور جو جان بوجھ کر ایک روزہ چھوڑ دے وہ کفارے کے طور پر مسلسل ساٹھ دنوں تک روزے رکھے۔

رمضان المبارک کی فضیلت کا دوسرا سبب اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ یہ نزول قرآن کا مہینہ ہے۔ اسی مبارک مہینہ میں قرآن کریم نازل ہوا، یعنی انسانی زندگی کے لیے الٰہی دستور اور انسانی عمل کے لیے ربانی منشور اسی مہینہ میں عطا کیا گیا اور صرف قرآن ہی نہیں جتنے صحیفے اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ رسولوں پر اتارے وہ سب رمضان ہی کے مہینہ میں نازل ہوئے، خواہ وہ صحیفہ ابراہیم ہو، یا توریت ہو یا انجیل ہو، یہ سب مقدس کتابیں اسی

بابرکت مہینہ میں نازل ہوئیں۔ قرآن پاک کے نازل ہونے کی صراحت دو اور مقامات پر کی گئی ہے، چنانچہ ''سورۃ الدخان'' میں ہے:

'' **حمٓ. والکتاب المبین. انا انزلنٰه فی لیلة مبرکة انا کنا منذرین. فیها یفرق کل امر حکیم. امرا من عندنا انا کنا مرسلین.** (سورہ دخان: 1 تا 5) (ح م، قسم اس کتاب مبین کی کہ ہم نے اسے ایک بڑی خیر و برکت والی رات میں نازل کیا ہے، کیونکہ ہم لوگوں کو متنبہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، یہ وہ رات تھی جس میں ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ ہمارے حکم سے صادر کیا جاتا ہے۔ ہم ایک رسول بھیجنے والے تھے)۔

تیسری جگہ ''سورۃ القدر'' میں فرمایا گیا: ''**انا انزلنٰه فی لیلة القدر. وما ادرٰک مالیلة القدر. لیلة القدر خیر من الف شهر**''. (سورۃ القدر: 3.1) (ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا ہے۔ شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے)۔

یہ تینوں آیات قرآن کریم کے نازل ہونے کی ابتدا اور تاریخ کو بیان کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ قرآن کریم ماہِ رمضان میں نازل ہوا۔ قرآن رمضان کی بھی بابرکت راتوں میں نازل ہوا اور وہ بابرکت رات ''لیلۃ القدر'' ہے۔ مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ قرآن کریم لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر شب قدر میں نازل ہوا اور وہاں سے نبی پاک پر جبرئیل امین کے ذریعہ اسی رات میں نازل ہوا۔ چنانچہ رمضان کو قرآن سے گہری مناسبت اور اٹوٹ رشتہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

''**الصیام والقرآن یشفعان للعبد**''. (مسند احمد ۲/۱۷۲) (روزہ اور قرآن دونوں قیامت کے دن مومن بندہ کی سفارش کریں گے)۔

روزہ اللہ کی بندگی ہے اور قرآن کی تلاوت اللہ سے شرف ہم کلامی ہے، جو مومن اللہ کی بندگی اور اس سے ہم کلامی کا شرف حاصل کر رہا ہو، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی سفارش

ضرور ہونی چاہیے۔ روزہ کہے گا: اے اللہ یہ بندہ تیری خاطر بھوک و پیاس کی شدت برداشت کرتا تھا تو اسے بخش دے اور قرآن کہے گا: اے اللہ! یہ بندہ تیری خاطر میری تلاوت میں مشغول رہتا تھا تو اسے بخش دے۔

رمضان صرف نزول قرآن کا مہینہ نہیں ہے، بلکہ اس کی حفاظت واشاعت کا بھی مہینہ ہے۔ رمضان کے مہینہ میں ہر سال جبرئیل رسول اللہؐ کے پاس تشریف لاتے اور قرآن کریم کا دورہ کرتے، جس سال رسول پاکؐ کا وصال ہوا اس سال تو جبریل امین نے دومرتبہ قرآن پاک کا دورہ کیا۔ اسی سے رسول پاکؐ نے سمجھ لیا کہ اب اللہ تعالیٰ ان کو اٹھالے گا۔ **(بخاری، فضائل القرآن، باب کان جبرئیل یعرض القرآن علی النبی)**

رمضان المبارک میں رسول پاک اور جبرئیل امین کا مذاکرہ امت مسلمہ کے لیے تراویح کی نماز میں قرآن پاک کو سننے اور سنانے کی روایت بن گئی اور آج تک رمضان المبارک میں دنیا کی کروڑوں مساجد میں قرآن پاک کا سننا اور سنانا دراصل اسی سنت کی یاد تازہ کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کسی بھی کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری نہیں لی، چنانچہ پچھلی آسمانی کتابوں میں تحریف اور بتدیلی کردی گئی، مگر قرآن پاک کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ نے خود لی ہے۔ ارشاد ہے: "**انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون**" **(سورۃ الحجر: ۹)** (رہا یہ ذکر تو اس کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں)۔ **(الحجر: ۹)**

قرآن کی حفاظت کا ایک بڑا ذریعہ رمضان المبارک کو بتایا ہے جن میں ہر طرف قرآن کی تلاوت کا ماحول ہوتا ہے۔

دنیا میں کسی کتاب کو یاد کرنے والے اتنی بڑی تعداد میں نہیں پائے جاتے جتنی تعداد میں قرآن پاک کے حفاظ پائے جاتے ہیں اور یہ حفاظت صحت کے ساتھ زیر، زبر، پیش تک

کی حفاظت کے ساتھ قرآن کریم کو سناتے ہیں۔ اگر ان سے کوئی بھول چوک ہوجائے تو فوراً دوسرا حافظ اسے لقمہ دے دیتا ہے اور وہ نیکی سمجھ کے قبول کرلیتا ہے۔ یہ قرآن کریم کی حفاظت کا من جانب اللہ ایک انتظام ہے۔ تراویح اور تہجد میں قرآن پڑھنے اور سننے کے علاوہ خوش نصیب مسلمان کوشش کرتا ہے کہ وہ خود بھی رمضان میں ایک سے زیادہ مرتبہ قرآن پاک کی تلاوت کرے۔ یہ تو کلام اللہ ہے جو جتنی مرتبہ اسے پڑھے گا نئی لذت و حلاوت پائے گا، اس لیے تلاوت قرآن کا شغل سال بھر رہنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو "نسخ" کہا ہے، یعنی تمام انسانوں کے لیے یہ ہدایت نامہ ہے۔ انسان اگر فکری اور عملی گمراہی سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے، دل ودماغ کی تاریکی کو مٹانا چاہتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ قرآن کو اپنالے۔ قرآن اس کے لیے عبادت ہے، نور بھی ہے، دستور بھی ہے، منزل بھی ہے اور مقصد بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (لوگو! تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس دلیل روشن آگئی ہے اور ہم نے تمہاری طرف ایسی روشنی بھیج دی ہے جو تمھیں صاف صاف راستہ دکھانے والی ہے)۔

دنیا کے کائنات کو سمجھنے کیلئے قرآن گائیڈ بک ہے:

جس طرح ہر مشین کے ساتھ ایک گائیڈ بک کمپنی کی طرف سے دی جاتی ہے۔ کار، کمپیوٹر، پریشر کوکر، ٹیلی فون، موبائل وغیرہ جو چیز بھی آپ خریدیں، اس کے ساتھ آپ کو ایک کتاب دی جاتی ہے۔ اس سے آپ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مشین کو کس طرح استعمال کیا جائے اور خرابی سے کس طرح اس کی حفاظت کی جائے۔ اسی طرح اللہ رب العزت نے یہ عظیم کائنات بنا کر انسانوں کے حوالہ کردی ہے۔ اس کائنات میں کس طرح رہنا ہے، کس طرح اس سے فائدہ اٹھانا ہے اور کس طرح اس کو تباہی سے بچانا ہے، ان سب سے ہدایات کے لیے اس نے اپنی کتاب قرآن کریم عطا کردی ہے۔ قرآن کریم سے ہدایت اسی وقت

حاصل ہوسکتی ہے، جبکہ تلاوت کرنے کے ساتھ اسے سمجھنے کی کوشش کی جائے، اس میں غور و فکر کیا جائے اور اس کی تعلیمات پر عمل کیا جائے، دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جسے سمجھ کر نہ پڑھا جاتا ہو، یہ صرف اللہ کی کتاب کا معاملہ ہے کہ بہت سے لوگ اسے سمجھ کر نہیں پڑھتے اور عربی زبان نہ جاننے کا بہانہ بناتے ہیں۔ جب ہمارے پاس کسی کا خط آتا ہے تو اسے پڑھتے اور سمجھتے ہیں۔ اگر وہ کسی دوسری زبان میں ہو تو اس زبان کے جاننے والے سے رجوع کرتے ہیں اور خط کا مفہوم جاننے کی کوشش کرتے ہیں، مگر اللہ کا یہ فرمانِ مبارک اور نامہ گرامی قرآن کریم اسے نہ تو ہم خود سمجھتے ہیں اور نہ ان علما سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جو اس کی زبان جانتے ہیں۔ یہ بڑی بدنصیبی کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے متعلق کہا ہے: ''افلا یتدبرون القراٰن ام علی قلوب اقفالها''. (سورہ محمد: 24)
(کیا وہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے، کیا ان کے دلوں پر تالے لگ گئے ہیں)۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کو سمجھنا عوام کا کام نہیں، بلکہ علما کا کام ہے۔ یہ شیطانی وسوسہ ہے جو اللہ کی کتاب سے دور کرنے کا ذریعہ ہے۔ علمائے کرام نے قرآن پاک کا اردو میں اور دنیا کی ہر زندہ زبان میں ترجمہ کر دیا ہے۔ یہ ترجمہ عوام ہی کے لیے کیا گیا ہے، تاکہ لوگ اسے سمجھ سکیں۔ اگر قرآن کا سمجھنا صرف علما کا کام ہوتا تو وہ لوگ اس کا ترجمہ کیوں کرتے۔ حضرات صحابہ کرامؓ کا معمول یہ تھا کہ وہ قرآن کی آیات پر غور وفکر کرتے، اسے سمجھتے پھر آگے پڑھتے، چنانچہ ابوعبدالرحمٰن السلمی روایت کرتے ہیں: (ہم سے ان لوگوں نے بیان کیا جو قرآن اہتمام سے پڑھا کرتے تھے جیسے حضرت عثمان بن عفانؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرات صحابہ جب نبیؐ سے دس آیات پڑھ لیتے تو ان سے آگے نہ پڑھتے، یہاں تک کہ وہ ان آیات میں علم وعمل کی تمام باتیں نہ جان لیتے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم نے قرآن اور عمل دونوں ایک ساتھ سیکھا ہے اور اسی لیے وہ ایک سورت کو یاد کرنے میں بڑا وقت صرف کر دیتے)۔

مجموعه القاسم: جلد اول — قرآن کریم

قرآن صرف علم کی نہیں عمل کی کتاب ہے:

قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کے ساتھ اس کی تعلیمات پر عمل کرنا ضروری ہے۔ قرآن میں ایمان واسلام کی جو بنیادی تعلیمات ہیں، حلال وحرام کے جو احکام ہیں، عبادات، معاشرت، معیشت، حکومت، حقوق وفرائض، امن وانصاف اور جہاد وقتال، جنت وجہنم کے استحقاق کی جو آیات ہیں اور انسانی خیالات اور رویوں کی اصلاح کے لیے جو فرامین ہیں اگر ان پر عمل نہ کیا جائے تو قرآن کے نازل ہونے کا مقصد پورا نہیں ہوسکتا۔ قرآن صرف علم کی کتاب نہیں، بلکہ عمل کی کتاب بھی ہے۔ مسلمان جب تک اپنی عملی زندگی اور اپنے سماج کو قرآن کی تعلیم کے مطابق نہیں ڈھالیں گے وہ قرآن کا حق ادا نہ کرسکیں گے۔ قرآن میدان عمل بھی ہے۔ اسی میزان کے مطابق انسان کا عمل قیامت کے دن تولا جائے گا۔

قرآن کو پوری انسانیت تک پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے:

قرآن پاک پر عمل کرنے کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اسے غیرمسلموں تک پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ قرآن انسانوں کی ہدایت کے لیے آیا ہے تو انسانوں کی بڑی آبادی تک اسے پہنچانا ہم مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ غیرمسلمانوں سے خیرخواہی کا تقاضا بھی ہے کہ ان کی فلاح اور نجات کی راہ سے ان کو باخبر کیا جائے تاکہ ہدایت کا راستہ ان کے لیے کھلے اور وہ اللہ کے حضور یہ نہ کہہ سکیں کہ تیری ہدایت سے ہمیں آگاہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔

اگر ہم مسلمان قرآن کی تلاوت کا اہتمام کریں گے، اس کو سمجھیں گے، اس پر عمل کریں گے اور اس کی دعوت غیرمسلموں تک پہنچائیں گے تو دنیا میں بھی ہم سرخرو ہوں گے اور قیامت میں بھی قرآن ہمارا سفارشی ہوگا، ورنہ قرآن بھی ہمارے خلاف حجت بن جائے

گا اور رسول پاک بھی یہ شکوہ فرمائیں گے: ''وقال الرسول یرب ان قومی اتخذوا ھٰذاالقرآن مھجورا'' (اور رسول کہے گا کہ اے میرے رب، میری قوم کے لوگوں نے اس قرآن کو نشانۂ تضحیک بنالیا تھا)۔ (الفرقان: ۳۰)

ہماری ذلت وپستی اور بدحالی کی بڑی وجہ یہی ہے کہ قرآن پاک سے ہمارا رشتہ کمزور ہوگیا ہے۔ مسلمانوں کو قرآن پاک سے مضبوط رشتہ قائم کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن پڑھنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆

فضلائے مدارسِ عربیہ میں قرآن فہمی کا ذوق
احتساب و جائزہ

● ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ

عنوان پر ایک نظر:

☆ فضلاء: اس لفظ کا مادّہ (ف ض ل) ہے، لغت میں اس کے متعدد استعمالات و معانی وارد ہیں، انھیں میں سے ایک ''فضلاء'' ہے۔ فَضَل جب نَصَر کے باب سے ہو تو اس کے معنی ہیں: ''غلبَہ فی الفضل''. یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ''فضلَ فلانٌ علی غیرہ'' یعنی ''غلب بالفضل علیھم''. یہ مادّہ سمع اور کرم کے باب سے بھی آتا ہے، یعنی فَضِل اور فضل بمعنی: ''کان ذا فضل''، یا ''ذا فضیلة''. باب افعال سے ایک استعمال ہے: ''أفضل علیہ فی الحسب: صار أفضل منہ. تفاضل الرجلان''. بمعنی: ''ادعی کل منھما الفضلَ علی صاحبہ''.

''الفاضِل'' جس کی ایک جمع فضلاء ہے، اسم فاعل ہے، بمعنی ذوالفضل اور ذوالفضیلۃ۔ الفاضِلة بمعنی: ''الدرجة الرفیعة فی الفضل''، یہ لفظ ھبة اور نعمة کے معنی میں بھی آتا ہے۔ ''أفضل'' ''مِفضال'' اور ''مُفضّل'' وغیرہ استعمالات بھی آئے ہیں، فضل وخوبی والے کے معنی میں۔ (المنجد فی اللغة، ص۵۸۶)

☆ ذوق: اس لفظ پر آئندہ قدرے مطول گفتگو ہوگی۔

☆ احتساب: عربی لفظ ہے بمعنی: حساب، جانچ پڑتال، آزمائش۔

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

☆ جائزہ: صلہ، انعام، جانچ پڑتال، مقابلہ، حاضری، گنتی، درستی کا نشان، پڑتال کی علامت (.....) (فیروز اللغات، ص۴۴۹)

ذوق: ذوق پر میری گزارش بعض قدیم اور بعض جدید مآخذ پر مشتمل ہے، لیکن اس میں کسی طرح کی عمیق و نادر تحقیق نہیں ہے، کیونکہ اس کا وقت نہ مل سکا۔ البتہ اس سلسلہ کی دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی علاقہ (اکرہرا، سدھارتھ نگر، یوپی) کے ایک نامور فرزند محترم عبدالنور ندوی رحمہ اللہ کے ماجستیر کے رسالہ تک میری رسائی ہوگئی، جسے مرحوم نے جامعۃ الازہر کی عربی زبان کی فیکلٹی میں پیش کیا تھا۔ رسالہ کا عنوان تھا: **الذوق الأدبی، حقیقته، وسائل تنميته ودوره فی النقد.** بنیادی طور پر رسالہ کی بحث ادبی وتنقیدی پہلو سے ہے، لیکن زیر نظر مضمون میں وہ لغوی و اصطلاحی تشریح کے لحاظ سے مفید ہے۔

☆ مرحوم عبدالنور رحمہ اللہ کے رسالہ میں ذوق سے متعلق مفید مطلب معلومات بعد میں آئیں گی۔ پہلے میں شیخ محمد اعلی تھانوی کی کشاف اصطلاحات الفنون سے ذوق کی تعریف نقل کرنا چاہتا ہوں۔ موصوف لکھتے ہیں: ''**(ذوق) بالفتح وسكون الواو: مصدرُ ذاق يذوق. وعند الحكماء: هو قوة منبثة، أی منتشرة فی العصب المفروش علی جرم اللسان، تدرک بها الطعوم بواسطة الرطوبة اللعابية**''. اس کا حاصل یہ ہے کہ کسی چیز کو چکھنا اور اس کا مزہ معلوم کرنا۔

موصوف نے مطول کے حاشیہ سے چلپی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''**الذوق قوة ادراكية لها اختصاص بادراک لطائف الكلام ومحاسنه الخفية**''. اس تعریف میں ذوق کے اصطلاحی مفہوم کی وضاحت ہے۔ حکماء کے علاوہ ادباء اور نقاد بھی مذکورہ تعریف کو معتبر مانتے ہیں اور اسی کے مطابق وہ ذوق کے عناصر اور اس کے اثرات سے بحث کرتے

ہیں۔ (**كشاف اصطلاحات الفنون، ۲/۵۱۴**)

فلاسفہ بھی ذوق کے لفظ و معنی سے بحث کرتے ہوئے مذکورہ تعریف کو ذکر کرتے ہیں۔ (**الميبذی مع حاشيه محمد عين القضاة، ص۲۷۹**)

☆ ذوق پر جیسا کہ میں نے عرض کیا مولانا عبدالنور ندوی رحمہ اللہ کی تحقیق طویل ہے، اس کا جو حصہ ذوق کی لغوی و اصطلاحی تشریح سے متعلق ہے، اسے میں باختصار ذکر کر رہا ہوں:

عربی زبان کی لغات کے حوالہ سے موصوف نے لکھا ہے کہ ان لغات میں ذوق کے متعدد معانی و استعمالات نقل کیے گئے ہیں اور لکھا ہے کہ ان معانی میں ''احساس وتمیز'' کا معنی بطور قدر مشترک موجود ہے۔

پھر ابن فارس اور ابن منظور کے حوالہ سے ذوق کا وہ مفہوم ذکر کیا ہے جسے ہم ''چکھنے اور لذت حاصل کرنے'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

دوسری بات یہ ذکر کی ہے کہ ذوق جس طرح اجسام کے لیے استعمال ہوتا ہے، اسی طرح معانی کے لیے بھی مستعمل ہے۔ قرآن کریم میں عذاب کے لیے اس لفظ کا استعمال اسی اعتبار سے ہے۔ ملاحظہ ہو سورہ دخان، حشر اور تغابن۔ (**الذوق الادبی، ص3-4**)

شعر وادب میں بلاغت و جمال کے ادراک کے لیے ذوق کا استعمال اسی معنوی اعتبار سے ہوتا ہے۔ جمہرۃ اور اساس البلاغۃ کے حوالہ سے موصوف نے لکھا ہے کہ ''**هو حسن الذوق فی الشعر**'' کے معنی یہ ہیں کہ **مطبوع علی احساس الجمال فی الشعر والتلذذ به وادراک مستواه.** (ص5) یعنی انسان کو طبعی وفطری طور پر شعری جمال کا احساس ہے، اس سے لذت یاب ہوتا ہے اور اس کے معیار کا ادراک رکھتا ہے۔

موصوف نے ابن خلدون کے حوالہ سے ''ذوق فنی'' کو ملکہ بلاغیہ سے تعبیر کیا ہے یا اسے ایسی قوت ادراکیہ بتایا ہے جو کلام کی لطافت اور اس کے پوشیدہ محاسن کا ادراک

کر سکے، لہٰذا اس ادراک کو زبان میں ملکہ بلاغت حاصل کرنے تک محدود نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ مقالات الحافظ (ص۹۰) میں وارد ہے۔

محترم عبدالنور رحمہ اللہ نے لغوی و اصطلاحی تشریح کے بعد لفظ ذوق کے استعمال میں جو تدریجی تغیر ہوا ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

اولاً یہ لفظ شعر میں موسیقی کے احساس اور وزن کی معرفت کے لیے استعمال ہوا، پھر اس کے استعمال میں وسعت و ترقی ہوئی اور اس جمال کے ادراک کے لیے اس کا استعمال ہونے لگا جو موسیقی، تعبیر یا افکار میں ہوتا ہے۔

موصوف نے خلاصہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ذوق کے لفظ کی تعریف یا معنی کی تعیین میں نقاد نے تین طریقے اختیار کیے ہیں۔

(۱) بعض نے ''طبیعت'' سے اس کی تعریف پر اکتفا کیا ہے۔ (۲) بعض نے اسے معرفت کی ایسی قسم میں داخل مانا ہے جس کی تعیین ممکن نہیں۔ (۳) بعض نے اسے اہل بیان کی تنقیدی اصطلاح مانتے ہوئے اس کی تعریف کی یوں کوشش کی ہے:

(الف) موہوب فطری قوت جس کا اکتساب ممکن نہیں، لیکن عربوں کے کلام کے مطالعہ سے اس کی ترقی اور جلا ممکن ہے۔

(ب) ایک وجدانی قوت جس سے صاحب ذوق شخص وزن کی سلامتی یا فساد، الفاظ و تعبیر کا حسن اختیار، صدق شعور، اسلوب کا جمال اور عمدگی و خرابی کے اسباب کا ادراک کر سکے۔ (الذوق الادبی، ص۱۵-۱۶)

موصوف نے ذوق سے متعلق مذکورہ مبحث میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ ذوق کے مادہ کے مختلف صیغے قرآن کریم میں تقریباً ۶۳ مقامات پر آئے ہیں۔

اردو لغت والے اس لفظ کے درج ذیل معنی ذکر کرتے ہیں: مزہ، لطف، شوق اور خوشی۔

اب ایک نظر علامہ ابن قیم الجوزیہ کے بیان پر جو انھوں نے ذوق کی تشریح میں پیش کیا ہے، میں نے اسے موصوف کی کتاب ''مدارج السالکین'' کی اس تہذیب سے لیا ہے جسے عبدالمنعم صالح نے تیار کیا ہے۔ (ص۵۳۹) وبعدھا)

علامہ ابن قیم الجوزیہ کی اس کتاب کا موضوع ہمارے اس سمینار کے مرکزی موضوع سے اور جس عنوان پر یہ خاکسار خامہ فرسائی کر رہا ہے، اس سے جس طرح ہم آہنگ ہے، اسے واضح کرنے کی شاید ضرورت نہیں۔

علامہ ابن القیم ذوق کی تعریف میں فرماتے ہیں:

''**الذوق مباشرة الحاسة الظاهرة والباطنة للملائم والمنافر**''. یعنی مناسب و نامناسب چیز کے لیے ظاہری و باطنی حاسہ کا استعمال اور یہ چیز صرف منھ کے حاسہ (ذائقہ) کے ساتھ خاص نہیں، اس کی مثال (**وذوقوا عذاب الحريق** ۳:۱۸۱) سے پیش کی ہے۔

ذوق کے مفہوم کو مزید واضح کرنے اور اس کی جامعیت کو بتانے کے لیے علامہ موصوف نے ایک اور آیت پیش کی ہے: ''**فأذاقها الله لباس الجوع والخوف بما كانوا يصنعون**''. (۱۶:۱۱۲) موصوف کا تاثر ملاحظہ فرمائیے:

''**فتأمل كيف جمع بين الذوق واللباس، ليدل على مباشرة المذوق واحاطته وشموله، فأفاد الأخبار عن اذاقته: أنه واقع مباشر غير منتظر، فان الخوف قد يتوقع ولا يباشر. وأفاد الاخبار عن لباسه: أنه محيط شامل كاللباس للبدن**''.

یعنی ذوق و لباس کو ایک جگہ استعمال کر کے مذوق، یعنی چکھی یا چکھائی گئی چیز کے اتصال، احاطہ اور شمول کو بتانا مقصود ہے۔ ''أذاقها'' کی خبر سے یہ بتایا کہ ''شیء مذوق'' واقع ہو چکی ہے، ملی ہوئی ہے اور اس کے انتظار کی بات نہیں ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت اس

لیے ہے کہ خوف کبھی کبھی توقع کے بعد بھی لاحق ومباشر نہیں ہوتا اور لباس کے لفظ کو لاکر یہ بتایا ہے کہ شیء مذوق ان لوگوں کو اس طرح محیط اور شامل ہے جیسے لباس بدن کے لیے۔

موصوف نے حدیث نبوی کی روشنی میں بھی ذوق کی معنویت و وسعت کو واضح کیا ہے، فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ایمان واحسان کی حقیقت کے ادراک اور قلب کے لیے اس کے حصول واتصال کو کبھی ذوق سے، کبھی طعام وشراب سے اور کبھی حلاوت کے وجود سے تعبیر فرمایا ہے، مثلاً:

"ذاق طعم الایمان، ثلاث من کن فیه وجد حلاو ة الایمان، من کان الله ورسوله أحب الیه مما سواهما..." الخ.

ذوق کے معنوی اور غیر محسوس پہلو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ابن القیم فرماتے ہیں:

"وهـذا الـذوق هو الذی استدل به هرقل علی صحة النبوة حیث قال لأبـی سفیان: فهل یرتد أحد منهم سَخطة لدینه؟ فقال: لا، قال: وکذلک الایمان اذا خالطت حلاوته بشاشة القلوب".

یعنی ہرقل نے ذوق ہی سے نبوت کی صحت پر استدلال کیا تھا، یعنی مومنوں کے اندر پیدا ہونے والے ایمانی ذوق سے جس کی فرحت وبشاشت دلوں تک پہنچ جاتی ہے، ہرقل نے معلوم کیا کہ یہ نبوت ورسالت کی دعوت ہے، بادشاہی وسرداری کا کوئی دعویٰ نہیں ہے۔

موصوف نے مزید فرمایا: ایمان کا بھی مزہ ہوتا ہے جس سے ذوق ووجدان کا تعلق ہوتا ہے اور دل سے شکوک وشبہات اسی وقت دور ہوتے ہیں جب بندہ اس حالت کو پہنچ جاتا ہے۔ (ص ۵۴۰)

☆ ذوق کے مفہوم کو سمجھنے میں مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ کی یہ تحریر معاون ہوگی:

"کسی زبان کے ادب وبلاغت کا ذوق ایک نعمت خداداد ہے، تاہم اس کے استوار

ہونے میں اس زبان کے علوم صرف ونحو اور معانی و بلاغت سے بڑی مدد ملتی ہے۔"
(فہم قرآن، ص ۳۷)

عنوان میں "فضلائے مدارس عربیہ" کی جو ترکیب وارد ہے، اس سے یہ وہم ہوسکتا ہے کہ مدارس سے فراغت کے بعد مذکورہ ذوق فارغین حضرات میں پیدا ہوجاتا ہے یا پیدا ہوجانا چاہیے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ ان حضرات کے اندر ذوق کی بنیاد تو پیدا ہوجاتی ہے، لیکن وہ ذوق موجود نہیں ہوتا، اس کے لیے مزید ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔

مولانا اکبرآبادی لکھتے ہیں: "بہرحال فہم قرآن کے لیے صرف عربی دانی کافی نہیں، بلکہ عربیت کا ذوق صحیح درکار ہے اور خوب اچھی طرح یاد رکھئے کہ یہ ذوق محض مقامات حریری، دیوان متنبّی اور دیوان حماسہ یا ایم اے عربی کورس پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہوسکتا، اس کے لیے ایک مدت دراز درکار ہے۔ ذوق سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کو عربی کلام پڑھتے وقت وہی لذت وسرور حاصل ہو جو اس کو خود اپنی زبان کا اچھا شعر سن کر حاصل ہوتا ہے، وہ عربی کے تمام محاورات اور ان کے مواقع استعمال سے پورا واقف ہو۔" الخ (فہم قرآن، ص ۳۱)

مزید وضاحت فرماتے ہیں: "دنیا کا کوئی علم وفن ایسا نہیں ہے جس میں کمال اور مجتہدانہ نظر پیدا کرنے کے لیے عام فطانت وذکاوت کے علاوہ اس علم کے ساتھ ایک فطری لگاؤ ضروری نہ ہو، علی گڑھ سے ہزاروں نے بی اے اور ایم اے کا امتحان پاس کیا، لیکن محمد علی مرحوم کی طرح انگریزی کے بہترین ادیب کتنے پیدا ہوئے؟" (ایضاً، ص ۴۰)

بعض دیگر اقتباسات بھی مناسب نظر آتے ہیں:

"لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عربیت سے مراد عربی زبان کی صرف اتنی استعداد نہیں ہے کہ کوئی شخص عربی سے اردو میں یا کسی اور زبان میں ترجمہ کرسکے، صرف اتنی استعداد سے ایک شخص قرآن کی اجمالی مراد تو سمجھ سکتا ہے، لیکن جب تک اس کا ذوق عربیت پختہ نہیں ہوگا اور امام شافعی کے بقول جب تک اس میں کسی عربی عبارت کو عربی کے ہی انداز فہم وتعبیر

کے مطابق سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوگی، وہ قرآن مجید کے بلیغ اسلوب اور اس کے مخصوص انداز تعبیر سے واقف نہیں ہو سکے گا اور اس بنا پر قرآنی مفہوم و مطلب کے بہت سے گوشے اور پہلو ایسے ہوں گے جو اس کے عقل و فہم کی گرفت میں نہ آسکیں گے۔'' (ایضاً، ص ۲۹)

مزید لکھتے ہیں: ''اس طرح کا ذوق عربیت سالہا سال کی عرق ریزی، محنت و کاوش، عمیق و وسیع مطالعہ اور بہترین دماغی و ذہنی صلاحیتوں کے کارآمد بنانے کے بعد ہی حاصل ہوسکتا ہے اور چونکہ قرآن مجید بلاغت کے مرتبہ قصویٰ پر حاوی ہے، اس لیے کوئی شخص بجز ان بزرگان کرام کے جن کو خود نبی کریم ﷺ نے اپنی مشکوٰۃ نبوت سے منور کیا ہو، دعویٰ کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ کسی آیت کا مطلب وہی ہے جو اس نے سمجھا ہے۔'' (ایضاً، ص ۳۴)

مفسر کے لیے ضروری علوم:

یہ مبحث عام اہل علم کے یہاں معروف ہے، البتہ اس ضمن کی بعض تفریعات سے کبھی کبھی اغماض ہو جاتا ہے اور اس سے خرابی پیدا ہوتی ہے۔ میں ان علوم کی طرف اختصار سے اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ علما نے ان علوم کو جو حیثیت دی ہے، اسے یہ جملہ واضح کرتا ہے:

أدوات تعصم المفسر من الوقوع فی الخطأ، وتحميه من القول على الله بدون علم.

یعنی یہ علوم مفسر کو غلطی میں پڑنے سے محفوظ رکھتے ہیں اور کسی بات کو اللہ تعالیٰ کی طرف بغیر علم منسوب کرنے سے بچاتے ہیں۔ علوم یہ ہیں:

۱- علم لغت: اس سے مفرد الفاظ اور ان کے معانی کی تشریح میں مدد ملتی ہے۔

۲- علم نحو: اگر نحوی ترکیب کا علم نہ ہو تو جملہ کے معنی میں بہت زیادہ اختلاف ہوسکتا ہے، جو مفسر کے لیے مہلک ثابت ہوگا۔

۳- علم صرف: اس کے ذریعہ صیغے اور ان کے اوزان معلوم ہوتے ہیں اور اس سے

تفسیر میں بڑی مدد ملتی ہے۔

۴- اشتقاق: جب مشتق منہ کا علم ہوتا ہے تو معنی کو متعین کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اگر اصل کی تعیین میں غلطی ہو جائے تو معنی کچھ کا کچھ ہو جائے۔

۵، ۶، ۷- علوم بلاغت یعنی معانی، بیان اور بدیع: مفسر کے لیے ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور ذوق سے ان کا براہ راست تعلق ہے۔

۸- علم قرأت: مختلف احتمالات کی صورت میں بعض معنی کی ترجیح میں اس سے مدد ملتی ہے، نیز زبان کی وسعت و بلاغت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۹- علم اصول الدین: اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، رسالت، آخرت اور جزا و سزا سے متعلق امور کی تفسیر میں اس سے مدد ملتی ہے۔

۱۰- علم اصول فقہ: مسائل کے استنباط میں اس سے مدد ملتی ہے اور مفسر غلطی سے محفوظ رہتا ہے۔

۱۱- علم قصص: سابقہ نبیوں اور ان کی اقوام کے حالات کی توضیح میں یہ علم معاون ہے۔

۱۲- علم اسباب نزول: نزول کا سبب معلوم ہو تو آیت کے مفہوم و مراد کی تعیین آسان ہو جاتی ہے۔

۱۳- علم ناسخ و منسوخ: احکام کے باب میں اس کی اہمیت واضح ہے۔

۱۴- علم حدیث: بہت سی آیات کے مراد کی تعیین میں اس کی اہمیت واضح ہے۔ مزید بحث مستقل عنوان کے تحت آئے گی۔

۱۵- علم الموھبۃ: سیوطی نے ''البرہان فی علوم القرآن'' کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وحی کے معانی کی سمجھ اور اس کے اسرار کا ظہور اسی وقت ممکن ہے جب دل بدعت، تکبر، نفسانی خواہشات، دنیا کی محبت، گناہ پر اصرار اور ضعف ایمان وغیرہ سے پاک ہو۔ ان گناہوں کی حیثیت رکاوٹ اور حجاب جیسی ہے، ان کے موجود ہوتے ہوئے صحیح علم حاصل نہیں ہوسکتا۔

(التفسیر والمفسرون ۱/۲۶۵وبعدھا)

تفسیر کے مصادر و مآخذ:

تفسیر بالرائے کو جائز و مقبول بنانے کیلئے علما نے درج ذیل مآخذ کی نشان دہی کی ہے:

اوّلاً: قرآن کریم، قرآن کی بلاغت کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ اس نے موقع و مقام کی رعایت کرتے ہوئے ایک ہی بات کو دو جگہ دو طرح سے بیان کیا ہے۔ کہیں ایجاز ہے، کہیں تطویل، کہیں اجمال ہے کہیں تفصیل، لہٰذا مفسر کے لیے ضروری ہے کہ ایک موضوع کی تمام آیتوں کو ایک جگہ جمع کر کے مجموعی طور پر غور کرے، پھر کوئی نتیجہ اخذ کرے۔ ''**القرآن یفسّر بعضه بعضا**'' کا یہی مفہوم ہے۔ جو لوگ قرآن کے اعلیٰ مقام اور اس کی بے مثال بلاغت کو نہیں سمجھتے انھیں قرآن کے اس اسلوب میں تکرار نظر آتی ہے۔

ثانیاً: حدیث شریف، اس پہلو پر توجہ ضروری ہے، اس کا کچھ بیان آگے آئے گا۔ اصحاب فن جانتے ہیں کہ جس حدیث کے ذریعہ قرآن کی تفسیر کی بات کی جاتی ہے وہ صحیح حدیث ہے، ضعیف و موضوع روایت موضوع سے اصولاً خارج ہے، مگر تفسیر کے باب میں کچھ لوگ اسی بہانہ حدیث سے دامن چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔

علما نے اس بحث میں یہ صراحت بھی کی ہے کہ جس آیت کی صحیح تفسیر موجود ہو، وہاں انسان کو اپنی رائے سے کچھ کہنے کی اجازت نہیں۔ صحیح حدیث کو نظر انداز کر کے اپنی رائے سے تفسیر کرنے والا آدمی خطا کار ہے، کیونکہ نبی ﷺ نے بتائید الٰہی اور بامر الٰہی قرآن کی تفسیر کی ہے۔ یہ مسئلہ امت کے لیے اختیاری نہیں کہ چاہے تو مانے اور چاہے تو نہ مانے۔ رہا قرآن کریم کی آیات اور اس کی بلاغت پر غور و فکر تو اس کی راہ متعینہ ضوابط کی رعایت کرتے ہوئے ہمیشہ کھلی ہوئی ہے۔

ثالثاً: صحابہ کرام کے اقوال، اس میں بھی صحت سند کا لحاظ ضروری ہے۔ صحابی کی بسند

صحیح مروی تفسیر پر بھی انسان کو اپنی رائے کے مقدم کرنے کا اختیار نہیں، کیونکہ انھوں نے نبی ﷺ سے براہ راست تربیت پائی ہے۔ آپ کے ارشادات کو سنا اور نزول قرآن کے ماحول کا مشاہدہ کیا ہے، امت کے علما نے صحابہ کی تعدیل کی ہے، لہٰذا کسی انحراف یا بدظنی سے متاثر ہو کر صحابہ کرام کے سلسلے میں کوئی غلط رائے قائم نہیں کرنا چاہیے۔

رابعاً: زبان کی پابندی اور لحاظ، کیونکہ قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا ہے جسے ''عربی مبین'' کہا گیا ہے۔ یہ قریش کی زبان تھی۔ دوسری زبانیں اور لہجات اسی کے تابع ہو گئے تھے، پھر اکثر مٹ گئے تھے، لہٰذا مفسر کو زبان کی مخالفت کر کے تفسیر نہ کرنا چاہیے، ایسا کرنا سخت قسم کی نادانی ہوگی۔

خامساً: کلام کا تقاضا، تفسیر میں مقتضائے کلام اور مقاصد شریعت کی رعایت بھی ضروری ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے لیے ''**اللھم فقھه فی الدین وعلّمه التاویل**'' والی دعائے نبوی سے یہی مراد ہے۔ (**التفسیر والمفسرون ۱/۲۷۵**)

کچھ امور ایسے ہیں جن سے اجتناب مفسر کے لیے ضروری ہے، جن میں سے یہ اہم ہے کہ تفسیر میں اپنی خواہش اور میلان کو داخل نہ کرے، کسی غلط مذہب یا خیال کی تائید کو اپنا مطمح نظر نہ بنائے، کسی مسلک و رائے کے لیے قرآنی آیت کو تابع نہ بنائے کہ مسلک اصل قرار پائے اور قرآن اس کا پابند نظر آئے۔

مصادر تفسیر کے ذیل میں حدیث نبوی کا ذکر آیا ہے۔ یہ مسئلہ قدیم دور سے اہمیت کا حامل ہے، اسی لیے علمائے اسلام نے قرون مشہود لہا بالخیر سے اس پر توجہ مرکوز کی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن کثیر سے لے کر آج تک علما کی یہ کوشش رہی کہ قرآن کریم کی تفسیر میں حدیث شریف کی جو اہمیت ہے اسے اجاگر کیا جائے اور عملی طور پر ایسی تفسیریں تیار کر دی جائیں جن سے امت کو رہنمائی حاصل ہو اور تفسیر میں حدیث کی اہمیت سے ان کو واقفیت ہو جائے۔

یہ باب طویل ہے، کسی مقالہ سے اس کا تعارف ممکن نہیں، پھر بھی بعض حوالوں سے میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ حدیث نبوی سے اور خیرالقرون میں ائمہ دین کے مناہج و اقوال سے قرآن کریم کی جو تفسیر کی جائے اس کا درجہ اس تفسیر سے یقیناً برتر ہے جس میں مذکورہ دونوں امور سے بے نیازی برتی گئی ہو۔

امام ابن تیمیہ نے اس سلسلے میں بڑی وضاحت کے ساتھ اپنی بات پیش کی ہے، فرماتے ہیں:

"وأيضا فلم يبق مسألة فى الدين إلا وقد تكلم فيها السلف، فلابد أن يكون لهم قول يخالف ذلك القول أو يوافقه، وقد بسطنا فى غير هذا الموضع أن الصواب فى أقوالهم أكثر وأحسن، وأن خطأهم أخف من خطأ المتأخرين وأن المتأخرين أكثر خطأ وأفحش، وهذا فى جميع علوم الدين، ولهذا أمثلة كثيرة يضيق هذا الموضع عن استقصائها، والله سبحانه أعلم". (مجموع الفتاوىٰ، ۱۳/۲۷)

ایک مقام پر فرماتے ہیں:

"ولهذا كان معرفة أقوالهم فى العلم والدين وأعمالهم خيرا وأنفع من معرفة أقوال المتأخرين وأعمالهم فى جميع علوم الدين وأعماله، كالتفسير وأصول الدين وفروعه والزهد والعبادة والأخلاق والجهاد وغير ذلك، فانهم أفضل ممن بعدهم، كما دل عليه الكتاب والسنة، فالاقتداء بهم خير من الاقتداء بمن بعدهم، ومعرفة إجماعهم ونزاعهم فى العلم والدين خير وأنفع من معرفة مايذكر من إجماع غيرهم ونزاعهم".
(مجموع الفتاوىٰ، ۱۳/۲۴)

ابوعبدالرحمٰن سلمی کی کتاب "حقائق التفسیر" کی مشتملات کی اقسام سہ گانہ کا ذکر کرنے

کے بعد امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

وقد تبيّن بذلك أن من فسّر القرآن أو الحديث، وتأوله على غير التفسير المعروف عن الصحابة والتابعين، فهو مفتر على الله، ملحد فى آيات الله، محرّف للكلم عن مواضعه، وهذا فتح لباب الزندقة والإلحاد، وهو معلوم البطلان با لإضطرار من دين ا لإسلام. (مجموع الفتاوى، ۱۳/۲۴۳)

یقیناً اس عبارت میں ابن تیمیہ کا اسلوب سخت ہے، لیکن دینی علوم میں منہج سلف (صحابہ وتابعین) سے انحراف کے نتیجہ میں جو مفاسد پیدا ہوئے ہیں اور جس طرح اب تک فکری وعملی بدعتوں کا سیلاب رواں دواں ہے اور اس سے عالمی سطح پر امت کو جو نقصانات لاحق ہوئے ہیں، ان پر نظر کی جائے گی تو ابن تیمیہ کے اسلوب کی شدت کم محسوس ہوگی۔ دفاع عن الرسول ﷺ والصحابۃ رضی اللہ عنہم کے باب میں ان کی مثبت تحریر پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ ان واضح اور مدلل بیانات کے بعد ان کے لہجے کی شدت بجا، بلکہ ضروری ہے۔ موصوف نے آج سے صدیوں پہلے یہ واضح فرمادیا تھا کہ دین کو ہم تک پہنچانے والے وہی صحابہ ہیں جن کی تربیت نبی ﷺ کے ہاتھوں پر ہوئی تھی، ان کی عدالت مبرہن اور توثیق فرض ہے، جو لوگ اس منہج سے انحراف کریں گے ان کا ایمان مقبول ومعتبر نہ ہوگا۔

امام ابن تیمیہ نے ایک مقام پر نسخ کی بحث کے دوران تفسیر قرآن میں سنت کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے، فرماتے ہیں:

"ولم يكن السلف يقبلون معارضة الآية إلا بآية أخرى تفسرها وتنسخها، أو بسنة رسول الله ﷺ تفسرها، فان سنة رسول الله ﷺ تبيّن القرآن، وتدل عليه وتعبّر عنه وكانوا يسمون ما عارض الآية ناسخاً لها، فالنسخ عندهم اسم عام لكل مايرفع دلالة الآية على معنى باطل، و إن

كان ذلك المعنى لم يرد بها، وإن كان لايدل عليه ظاهر الآية، بل قد لا يفهم منها، وقد فهمه منها قوم فيسمون ما رفع ذلك الإبهام وا لإفهام نسخا، (و) هذه التسمية لا تؤخذ عن كل واحد منهم". (مجموع الفتاوى، ۲۹/۱۳)

أحسن طرق التفسیر:

شیخ الاسلام کے سامنے ایک سوال اس بات پر مشتمل رکھا گیا تھا کہ تفسیر کا سب سے اچھا طریقہ کیا ہے؟ موصوف نے اس کا یہ جواب دیا:

"إن أصح الطرق في ذلك أن يفسر القرآن بالقرآن، فما أجمل في مكان، فإنه قد فسّر في موضع آخر، وما اختصر من مكان فقد بسط في موضع آخر.

فان أعياك ذلك فعليك بالسنة، فإنها شارحة للقرآن وموضحة له، بل قد قال الامام أبو عبد الله محمد بن ادريس الشافعي: كل ما حكم به رسول الله ﷺ فهو مما فهمه من القرآن، قال الله تعالىٰ: ﴿إنا انزلنا اليك الكتاب بالحق لتحكم بين الناس بما أراك الله ولا تكن للخائنين خصيما﴾.

وقال تعالىٰ: ﴿وأنزلنا إليك الذكر لتبين للناس ما نزل اليهم ولعلّهم يتفكرون﴾. وقال تعالىٰ: ﴿وما أنزلنا عليك الكتاب إلا لتبين لهم الذى اختلفوا فيه وهدى ورحمة لقوم يؤمنون﴾. ولهذا قال رسول الله ﷺ: 'ألا انى أوتيت القرآن ومثله معه' يعنى السنة". (مجموع الفتاوى ۳۶۳/۱۳)

سعودی عرب میں تدریس قرآن کریم کے مقاصد پر ایک نظر:

یہ مقالہ مدارس عربیہ کے فضلاء کے اندر قرآن فہمی کے ذوق سے متعلق ہے، لہٰذا اس میں بیرون ہند کے مدارس سے متعلق گفتگو کا کوئی خاص جواز نہیں، لیکن مضمون تدریس اور مقصد تدریس کی یکسانیت کی وجہ سے مجھے سعودی عرب میں ثانوی مرحلہ تک کی تعلیم میں قرآن کی تدریس کے مقاصد پر روشنی ڈالنے کی ہمت ہو رہی ہے۔ اس تدریس کے منہج میں ایک قابل توجہ بات یہ ہے کہ ابتدائی مرحلہ سے ثانوی تک اور اسی طرح اس کے بعد بھی نصاب کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ ہر مرحلہ میں طالب علم کو قرآن کریم کی اس طرح کی تعلیم سے سابقہ رہے جو اس کے اندر قرآن کو سمجھنے اور اس کے اندر موجود اعجاز و بلاغت کے ادراک کا ذوق اپنے اندر پیدا کرنے میں مدد دے۔

عرب دنیا کے نصاب تعلیم کا آپ کو اندازہ ہے، ان کے یہاں تعلیم میں ازدواجیت کا مسئلہ نہیں کہ دو متوازی نظام تعلیم (دینی و دنیوی) کے بیچ لوگ متحیر ہوں، ایک ہی نظام تعلیم کے تحت جو چاہے دین پڑھے اور جو چاہے علوم تجریبیہ وطبعیہ کی تعلیم حاصل کرے۔ اس نظام تعلیم کے بہت سے فوائد ہیں، لیکن حکومت کے بغیر اسے قائم کرنا ممکن نہیں، مگر مشاہدہ بتاتا ہے کہ دنیا کے متمدن ترین ملکوں میں بھی عوام کے بعض طبقات دوگونہ تعلیم کے انتظام و سرپرستی کے لیے مجبور ہیں۔

اب آیئے اس مقصد کی جانب جس کے لیے مذکورہ تمہید پیش کی گئی ہے۔ سعودی عرب سے ۱۴۰۸ھ میں ایک کتاب بعنوان "كيف ندرس القرآن لأبنائنا" شائع ہوئی ہے، اس کے مصنف ڈاکٹر سراج محمد وزان ہیں۔

اس کتاب کی پانچویں فصل میں سعودی عرب میں مختلف تعلیمی مرحلوں میں تدریس قرآن کے مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پوری بحث میرے موضوع سے متعلق نہیں، لہٰذا

ضروری امور پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

۱- ابتدائی مرحلہ کے منہج میں خصوصیت کے ساتھ قرآن کی تدریس کا کوئی مقصد متعین نہیں، البتہ عمومی مقاصد میں ایسی چیزیں موجود ہیں جو طالب علم کو محاسن اخلاق سے آراستہ کرتی ہیں۔

مرحلۂ متوسطہ میں تدریس قرآن کے لیے جو مقاصد متعین کیے گئے ہیں ان کا تعلق زبان ونطق کی اصلاح، رسم خط سے واقفیت، دینی شعور کی تربیت اور قرآن کریم کے ساتھ طلبہ کے دائمی تعلق سے ہے کہ وہ اسے پڑھیں، یاد کریں اور سمجھیں۔

ثانوی مرحلہ میں قرآن کے لیے الگ سے کوئی مقصد متعین نہیں، بلکہ دینی علوم کے کل تیس مقاصد مذکور ہیں جن میں سے بعض کا تعلق قرآن سے زیادہ اور بعض کا کم ہے۔ بعض اہداف کا متن پیش ہے:

۱. " ایجاد الأساس الفکری السلیم المتین لدراسة العلوم والمعارف بأنواعها کافة علی أساس الاسلام وجعلها منبثقة عن مبادئه الخادمة لهدایته".

۲. " اتخاذ القرآن اماماً وحکما والتخلق به سیرة وسلوکا، والاطمئنان لصدق وعد الله بحفظه وتذوق إعجازه وبلاغته والاستظهار فی الدعوة موضحا برهانه وقوة حجته".

۳. " تکوین عقلیة منهجیة لدی الطالب فی الحکم علی الناس والتصرفات وفق أحکام الإسلام، وفی معرفة أحکام الإسلام مستضیئا بنور الشرع فی مصدریه الأساسیین: کتاب الله وسنة نبیه ﷺ ورد الأمور المتنازع فیها الیهما".

۴. " تکوین القدرة لدی الطالب علی الدفاع عن دین الله والدعوة

إلیه بالحجة والبرهان والاعتقاد بوجوب إعداد العدة واتخاذ القوة لتمکین الدعوة وتأمین طریقها إلی الناس جمیعا فی الأرض".

مصنف نے اہداف کے بعد ان پہلوؤں کا تجزیہ کیا ہے جن کی ان اہداف میں رعایت ہے۔ ان پہلوؤں میں روحانی، عبودی، عقلی، اخلاقی، نفسی، اجتماعی اور تذوقی پہلو ہیں۔ تذوقی پہلو میں ہدف نمبر دوم کی جانب اشارہ ہے، یعنی قرآن کریم کو امام وحکم مانا جائے، سیرت وسلوک میں اس کی تعلیم پر عمل کیا جائے، اللہ تعالیٰ نے اس کے حفظ کا جو وعدہ کیا ہے اس پر اطمینان رکھا جائے اور اس کے اعجاز وبلاغت کا ذائقہ حاصل کیا جائے۔

پانچویں فصل کے اختتام پر مصنف نے ان صلاحیتوں اور مہارتوں کا ذکر کیا ہے جو قرآن کی ایسی تدریس کے لیے ضروری ہیں جو متعینہ مقاصد کے حصول کو آسان بنائیں۔ یہ بحث اس لیے اہم ہے کہ معیاری تدریس کے بغیر معیاری مقاصد حاصل نہ ہوسکیں گے اور ہم جس قرآن فہمی کی توقع رکھتے ہیں وہ پوری نہ ہوگی۔ مصنف نے اس مقام پر کل سترہ مہارتیں ذکر کی ہیں، میں اپنی ترتیب سے صرف بعض کی جانب اشارہ کروں گا۔

۱- طلبہ قرآن کریم کے جتنے حصے کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، اس پر کس حد تک عمل پیرا ہوتے ہیں، اسے جاننے کی صلاحیت کا استاد میں موجود ہونا ضروری ہے۔

۲- استاد میں یہ جاننے کی قدرت کہ قرآن کریم میں جو اصول واحکام طلبہ پڑھتے ہیں انھیں کس حد تک سمجھ لیتے ہیں۔

۳- طلبہ کے نفوس میں دینی شعور کی تربیت پر قدرت۔

۴- کتاب اللہ کی تلاوت، حفظ اور معانی کی فہم کے لحاظ سے طلبہ کی تدریب پر قدرت۔

۵- قرآن کریم کے مطالعہ کے لیے مناسب فکری بنیاد فراہم کرنے کی صلاحیت۔

۶- ایسے مواقع فراہم کرنے کی صلاحیت جن سے اندازہ ہوسکے کہ طلبہ کو کتاب اللہ سے استدلال کی کس حد تک قدرت ہے۔

۷- طلبہ کی ایسی تدریب پر قدرت کہ وہ دین اسلام اور دیگر ادیان وملل کے مابین تقابل کرسکیں۔

۸- ایسے تعلیمی مواقع فراہم کرنے کی صلاحیت جن سے استاد کو اندازہ ہوسکے کہ طلبہ کس حد تک اللہ کے احکام کی پابندی کے لیے آمادہ ہیں۔

۹- طلبہ کی ایسی تدریب پر قدرت کہ اللہ کے دین کا دفاع کس طرح کیا جائے۔

میں نے مصنف کے الفاظ میں (ترجمہ کرکے) یہ امور اس لیے نقل کیے ہیں، تاکہ ہم اندازہ لگاسکیں کہ قرآن فہمی کے معاملہ میں ذمہ داری دوطرفہ ہے۔ کچھ امور یقیناً طلبہ کی ذمے داری کے دائرہ میں آتے ہیں، لیکن خاصے مسائل علماء ومدرسین سے متعلق ہیں۔ اس کے بعد نصاب تعلیم، طریقۂ تدریس اور معاون کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ ہے اور ان سب پر مزید یہ کہ طلبہ کے لیے ایسا عمدہ ماحول فراہم کیا جائے جس میں وہ کتاب اللہ کو سنت رسول اللہ ﷺ اور منہج سلف کے مطابق صحیح طور پر سمجھ سکیں اور اسلام مخالف افکار ورجحانات سے ان کو محفوظ رکھا جاسکے۔

جدید دور میں قرآن فہمی کے بعض نمونے:

عنوان میں فضلائے مدارس عربیہ کی قرآن فہمی کی بات ہے، میں نے اسے کچھ عام کرکے ''جدید دور'' کردیا ہے، چونکہ مدارس کی سرگرمیوں اور دائرۂ عمل کا زیادہ تر حصہ اسی دور میں واقع ہے، اس لیے مذکورہ تعمیم سے ان شاء اللہ کوئی خرابی نہ ہوگی۔

جدید دور کی ایک کوشش: تفسیر بہ انداز علوم قرآن:

اردو زبان میں قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر کا جو کام ہوا ہے اس کی مقدار خاصی ہے۔ تراجم کے ساتھ عام طور پر حواشی ہیں اور تفسیریں مختصر، متوسط اور ضخیم ہر طرح کی ہیں۔ قرآن

کریم کی بعض سورتوں یا اجزا کے ترجمے اور تفسیریں بھی موجود ہیں اور ان میں سے جو مطبوعہ ہیں ان سے قارئین مستفید بھی ہورہے ہیں۔

ہندوستانی علما کے کام میں مجھے ایک سلسلہ ایسا نظر آیا جو علوم قرآن کے پہلو سے کتاب الٰہی کے مطالعہ کے ضمن میں آتا ہے، اس میں معروف طریقہ پر قرآنی آیات کا ترجمہ اور تفسیر پیش نہیں کی گئی ہے، بلکہ قرآن میں وارد کسی متعین موضوع سے بحث کی گئی ہے اور قرآن کی جن آیتوں میں وہ موضوع یا اصطلاح آئی ہے ان کی شرح وتوضیح کی گئی ہے، مثلاً: **علم الامر من القرآن، علم النداء من القرآن، علم التمنی من القرآن، علم الترجی من القرآن، علم وجوہ مخاطبات القرآن، علم الداء من القرآن.**

اس سلسلہ کو ''سلسلۂ علوم قرآن متعلقہ فصاحت وبلاغت'' کا ذیلی عنوان دیا گیا ہے اور اس کے مصنف ابوالبرکات محمد عبیداللہ صاحب مولوی فاضل (ت ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۸م) ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن الفریوائی نے لکھا ہے کہ علم تفسیر میں ان کی عمدہ تالیفات ہیں۔ **علم الدعاء من القرآن** اس سلسلہ کی چوتھی کڑی ہے اور اس کی ضخامت ۱۷۰ صفحے ہیں۔ سن طباعت ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ ہے اور مطبع کا نام اختر دکن ہے۔ ذیل میں اسی رسالہ سے متعلق بعض امور کا ذکر کیا جاتا ہے، تاکہ اس خدمت کی نوعیت کا اندازہ ہوسکے۔

مصنف نے دعا سے متعلق پہلے ضروری مباحث پر روشنی ڈالی ہے، پھر سورۂ فاتحہ سے سورہ الناس تک جتنی دعائیں آئی ہیں ان کا ترجمہ کیا ہے اور اکثر مقامات پر امام رازی یا کسی اور مفسر کے حوالے سے بلاغی نکات یا بعض دوسرے علمی فوائد ذکر کیے ہیں۔ دعا سے متعلق یا کسی قرآنی آیت سے متعلق اگر کوئی شبہ وارد ہوتا ہے تو اس کا جواب بھی دیا ہے۔ بعض شبہات کے متعدد جوابات مذکور ہیں۔ مصنف نے حدیث شریف سے بھی استفادہ کیا ہے، لیکن احادیث کی تعداد کم ہے۔ ضرورت دعا کے ضمن میں چار شبہات پھر ان کے جوابات ذکر کیے ہیں۔

آیت کریمہ: ''**ادعونی أستجب لکم** اور**أجیب دعوة الداع اذا دعان**''. (**سورہ بقرہ. آیت نمبر. ۱۸۶**) سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر دعا قبول کرتا ہے، لیکن دیکھا جاتا ہے کہ داعی دعا مانگتا ہے اور اس کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ مصنف نے اس اشکال کے کل پانچ جواب دیے ہیں۔

دعا کے شروط:

مصنف نے وضاحت کی ہے کہ دعا کے شروط وآداب کو انھوں نے قرآن سے اخذ کیا ہے اور جو شروط وآداب قرآن سے نہیں ملے وہاں پر انھوں نے احادیث سے آداب مستنبط کیے ہیں۔ شروط کی تعداد سات مذکور ہیں۔ اس کے بعد آداب دعا کا بیان ہے، ان کی تعداد ۱۶ ہے، ۱۷ نمبر سے ۲۴ تک امور کو ''قبولیت دعا'' کے عنوان کے تحت ذکر کیا ہے۔ یہ امور بھی آداب میں داخل ہیں۔ جن اوقات میں، جن مقامات پر اور جن لوگوں کی دعا قبول ہوتی ہے اس کا بھی ذکر ہے۔

☆ دعا کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کے بعد مصنف نے ''قرآن مجید کی دعائیں'' کا عنوان ثبت کیا ہے اور سورہ فاتحہ میں طلب ہدایت کی دعا کو سورہ کی بقیہ آیات کے ساتھ ذکر کیا ہے، پھر تفسیر، شبہ اور اس کا جواب اور بعض بلاغی نکات کا ذکر ہے۔ آگے بھی بلاغی پہلو پر توجہ دی گئی ہے۔

☆ ''**واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت و اسمٰعیل ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم**. (**سورہ بقرہ: آیت نمبر. ۱۲۷**) بلاغت کے پہلو سے گفتگو کرتے ہوئے مصنف کہتے ہیں کہ ''**یرفع**'' میں یہ بلاغت ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جو امر پہلے گزر چکا ہوتا ہے اس کو بصیغہ مضارع اس غرض سے بیان کرتے ہیں کہ اس صورت ماضیہ کی تصویر سامنے بخوبی کھینچ جائے، یعنی اے محمد (ﷺ) تم دیکھو تو معلوم ہوگا

کہ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام اب گھر کو بنا رہے ہیں اور پایے رکھنے کے لیے گارے لا رہے ہیں۔ اصل تو یہاں قواعد البیت کہنا چاہیے تھا، لیکن ایسا نہ کہہ کر پہلے ''قواعد'' میں ابہام کیا اور پھر اس کے بعد ''من البیت'' سے بیان کیا، تاکہ شان اور عظمت خانہ کعبہ کی معلوم ہو، کیونکہ ابہام کے بعد بیان کسی امر کا اس کی عظمت اور شان کو ظاہر کرتا ہے۔

☆ آیت کریمہ: ''**وتب علینا**'' کی مراد مصنف نے یہ لکھی ہے کہ ہم کو موت کے وقت دین پر ثابت قدم رکھ، پھر ''حل مسئلہ توبہ انبیاء'' کے عنوان سے ''انبیاء سے گناہوں کے صدور'' کے مسئلہ پر بحث کی ہے اور متعدد جوابات کے ذریعہ ''دعاء توبہ'' کی توجیہ کی ہے، جس توجیہ کو عمدہ قرار دیا ہے، اس میں لکھتے ہیں کہ یہاں اگرچہ توبہ کا لفظ کہا گیا ہے، لیکن یہاں پر انتہا درجہ کا ''**تحرز عن المعصیة**'' مراد رکھا گیا ہے، یعنی اپنے کو گناہوں سے شدت کے ساتھ بچانا، کیونکہ جو شخص شدت کے ساتھ گناہوں سے بچے پھر توبہ کرے اور پھر اپنی صورت مثل پشیماں اور قصوروار کے ظاہر کرے تو وہ دوسرے کے لیے زیادہ تر باعث ہوگا ترک گناہ پر، یعنی اے اللہ! باوجود ہم گناہوں سے بچے رہنے کے بھی پھر ایسے پشیمان اور قصوروار ہیں کہ ہماری حالت مثل گنہگاروں کی ہے جو کہ توبہ کرتے ہیں۔'' (**علم الدعاء من القرآن، ص۴۰**)

علوم قرآن کے موضوع پر مصنف کی درج ذیل کتب کا مجھے علم ہوسکا ہے:

علم الترجی من القرآن (۴۰ صفحات)، **علم وجوہ مخاطبات القرآن** (۵۲ صفحات)، **علم النداء من القرآن** (۱۴ صفحات)، **علم التمنی من القرآن** (۳۲ صفحات)، **علم الأمر من القرآن** (۳۲ صفحات)۔

جدید دور کا دوسرا کام:

اس مقام پر میں ششماہی مجلّہ ''علوم القرآن'' کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں جسے علی گڑھ

سے مدرسۃ الاصلاح کے فارغین اَسّی (۸۰) کی دہائی سے نکال رہے ہیں، اس کے ابتدائی شمارے مجھے نہ مل سکے، اس لیے رسالہ کے آغاز اور مقاصد اجرا وغیرہ پر فی الحال کچھ عرض نہ کرسکوں گا، البتہ اس کے بعض عناوین کا ذکر اس مقصد سے کرنا چاہتا ہوں کہ مدارس عربیہ کے فارغین کے ذوق قرآن فہمی اور خدمت قرآن سے متعلق ایک اندازہ ہوجائے۔ یہاں مقالہ نگاروں کے نام اور رسالہ کے سنین نہ ذکر کرکے صرف مقالات کے عناوین پیش کروں گا، کیونکہ قرآن فہمی کے اندازہ کے لیے یہی اصل ہے:

۱-عذابِ الٰہی کی مختلف شکلیں: قرآن کی روشنی میں۔
۲-بنگالی تراجم وتفاسیر قرآن (کتابیاتی مطالعہ)
۳-اردو میں قرآنی مطبوعات (کتابیات)
۴-اسوۂ ابراہیمی قرآن کی روشنی میں۔
۵-تفسیری لٹریچر میں معاشی افکار۔
۶-قرآنی مضامین کا اشاریہ۔
۷-جامعہ اُمّ القریٰ میں قرآنیات پر تحقیقی مقالے۔
۸-مصری جامعات میں قرآنیات پر تحقیقی مقالے (۱۹۲۲ء-۱۹۷۴ء)
۹-سعودی عرب میں قرآنیات پر شائع شدہ عربی کتب (عربی مضمون کا ترجمہ)
۱۰-المشوّق الی علوم القرآن کا اصل مصنف (عربی مضمون کا ترجمہ)

تفسیر قرآن اور سنت:

قرآن کی تفسیر کے باب میں تمام معتبر مفسرین سنت کی اہمیت کے قائل ہیں۔ اصولی طور پر انھوں نے یہ بحث کی ہے کہ تفسیر کے سلسلہ میں پہلے قرآن سے مدد لی جائے گی، پھر سنت رسول ﷺ کو دیکھا جائے گا۔ ان دونوں ذرائع کے بعد دیگر علوم سے مدد

لی جائے گی۔

افسوس ہے کہ ائمہ تفسیر کی مذکورہ تصریح کے بعد کچھ لوگ اس بات کے قائل نظر آتے ہیں کہ وہ حدیث نبوی کی مدد کے بغیر قرآن کا صحیح مطلب سمجھ سکتے ہیں، لیکن یہ سوچ صحیح نہیں، کیونکہ صحابہ کے سامنے قرآن کریم نازل ہوا۔ وہ ہر آیت کے شان نزول سے واقف تھے اور صحبت رسول ﷺ کی برکت کے سبب وہ آیات قرآنی کا صحیح مطلب بعد کے لوگوں سے بہتر طور پر سمجھتے تھے، مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ''سورۃ النحل'' کی آیت میں رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم فرمایا کہ مشکل آیتوں کا مطلب صحابہ کو سمجھا دیں، تاکہ صحابہ اس مطلب کو سمجھ کر تابعین کو سمجھا دیں اور پھر سلسلہ بہ سلسلہ یہ قاعدہ امت میں جاری رہے۔ (احسن التفاسیر، ۳۶، مؤلفہ مولانا احمد حسن دہلوی، متوفی ۱۳۳۸ھ)

مولانا نے فہم قرآن کے باب میں حدیث کی اہمیت کو ایک مثال سے واضح کیا ہے، لکھتے ہیں:

''اصل یہ ہے کہ اگر قرآن کو سمجھنے کی کوشش میں سنت سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے تو قرآن مبہم اوامر ونواہی اور قصص کا ایک مجموعہ ہوکر رہ جائے گا اور اسلام کے مکمل ومفصل دستور اساسی ہونے کی حیثیت بڑی حد تک باطل ہوجائے گی۔ مثلاً ''أقیموا الصلاۃ'' کے معنی ومصداق کی تحقیق میں اگر سنت سے مدد نہ لی جائے تو اس حکم کی تعمیل میں عجیب قسم کا انتشار نظر آئے گا۔ صلاۃ کے لغوی معنی دعا یا عبادت گاہ ہیں، پس کوئی صاحب تو اس حکم کی تعمیل محض دعا سے کریں گے اور اس کے لیے بھی کوئی خاص شکل اور کوئی خاص وقت نہیں ہوگا۔'' (ایضاً، ص ۸۴)

برصغیر کے منکرین سنت فہم قرآن کے لیے احادیث کے علم کو شرط قرار نہیں دیتے، ان کے رویہ پر حیرت ونفرت کا اظہار کرنے کے بعد مولانا احمد حسن لکھتے ہیں:

''ان کی رائے میں احادیث ناقابل اعتبار واستناد ہیں اور اس بنا پر ان میں یہ

صلاحیت ہی نہیں کہ تشریع احکام یا تفسیر قرآن میں ان سے مدد لی جاسکے، اس وجہ سے ضرورت ہے کہ اس خاص مسئلہ پر کسی قدر وضاحت کے ساتھ کلام کیا جائے۔

سنت سے احتجاج کا انکار ہمارے دور نا مسعود کی ہی خصوصیت نہیں، بلکہ اس سے قبل بھی کچھ لوگ تھے جو سنت کو قابل احتجاج تسلیم نہیں کرتے تھے، چنانچہ علامہ ابن حزم اندلسی نے اپنی کتاب ”احکام الاحکام“ (۱/۱۰۲) میں فتنۂ انکار حدیث کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی اور فتنہ نہیں ہوسکتا کہ آدمی قرآن مجید کو کتاب الٰہی مانے اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا بھی قائل ہو، لیکن اس کے باوجود وہ احادیث واخبار کی حجیت سے انکار کرے۔“ (ص۴۷)

کتابت حدیث کا مسئلہ:

سنت رسول ﷺ پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ حدیث شریف کی کتابت بہت تاخیر سے عمل میں آئی، اس لیے اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا اور احادیث عصر صحابہ میں نہیں لکھی گئی تھیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے منع فرما دیا۔

علما نے منع کتابت حدیث پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس نقطہ کو بھی منقح کیا ہے کہ کیا اعتماد اور مرجعیت کے لیے کسی چیز کا تحریری شکل میں ہونا ضروری ہے؟

مجھے فی الحال ان دونوں باتوں پر کچھ عرض نہیں کرنا ہے، البتہ کتابت حدیث کے متعلق ایک بات اس لیے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ”احسن التفاسیر“ کے پاکستانی ایڈیشن میں ص ۱۸ پر محترم حافظ عبدالرحمٰن گوہڑوی کا ایک حاشیہ نظر سے گزرا جسے انھوں نے مؤلف مولانا احمد حسن دہلوی رحمہ اللہ کے مقدمہ میں اس مقام پر ثبت کیا ہے جہاں کتب حدیث کی تدوین وتالیف کا موضوع زیر بحث آیا ہے، موصوف لکھتے ہیں:

”یعنی بعد میں آنے والے ادوار کے طرز کی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، ورنہ چھوٹی چھوٹی

یا متوسط کاپیوں کی شکل میں تابعین، بلکہ متعدد صحابہ کے پاس یادداشتی مجموعے موجود تھے۔ ان ہی مکتوبہ مجموعوں سے محفوظ یادداشتوں سے مقابلہ کے بعد موجودہ کتب صحاح مدوّن کی گئیں۔ اس صراحت سے وہ غلط فہمی دور ہو جانی چاہیے جو خودغرض لوگوں نے پھیلا رکھی ہے کہ حدیثیں ڈیڑھ سو سال کے بعد مدون ہوئیں، حقیقت میں یہ مغالطہ تاریخی واقعات کے سراسر خلاف ہے۔“

ایک مرتبہ علی گڑھ کی ایک مجلس میں بشکل اعتراض میرے سامنے بھی یہ بات آئی تھی کہ حدیث کی کتابت صحابہ کے بعد وجود میں آئی اور صحابہ کے پاس احادیث پر مشتمل نوشتے موجود نہ تھے۔

جواب کا تو مجھے ڈھنگ نہیں، لیکن اس وقت میں نے یہ عرض کیا تھا کہ ”السنة قبل التدوين“، ”دراسات فی الحدیث النبوی“، ”مناهل القرآن“، ”حجیت حدیث“ وغیرہ کتب کے مطالعہ کے بعد اگر کوئی خلش باقی رہ جائے تو اس وقت علما سے رجوع کرنا چاہیے، اس سے پہلے نہیں۔ پھر آج کی مجلس میں بھی یہ بات دہرانا چاہتا ہوں کہ مذہبی علوم سے متعلق بھی تحقیق وتدقیق کا کام بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ حدیث نبوی کے مجموعے بہت بڑی تعداد میں سامنے آچکے ہیں۔ حدیث کے موضوع پر عمدہ قسم کی تحقیقات سامنے آچکی ہیں۔ ابوہریرہؓ جیسے موضوع پر موضوعی انداز میں کام ہو چکا ہے، اس لیے معترضین کو اپنا رویہ بدل دینا چاہیے اور حدیث شریف جس تقدیس واحترام کی مستحق ہے اس کو اسے دینے میں تامل نہ کرنا چاہیے، حدیث کی تعظیم واحترام بنص قرآنی ہمارا فریضہ اور مسلمان کی فوز وفلاح کا سبب ہے۔

☆☆☆

قرآن کریم اور اس کی تفاسیر

● مولانا محمد اسلام قاسمی

قرآن کریم اللہ تبارک وتعالیٰ کا کلام ہے اور یہ وہ آسمانی کتاب ہے جو خاتم النبیین و الرسل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل کی گئی، یہ کتاب ایک منشور الٰہی ہے، بنی نوع انسان کے لیے دستور حیات، جس کی تعلیمات خالق کائنات کی جانب سے ہیں، اس لیے مکمل طور پر فطرت انسانی اور عقل سلیم کے عین مطابق ہے، جسکا مقصد دنیا میں انسانوں کی ہدایت اور ان کی رہنمائی ہے، جس کے ذریعہ دنیا میں کامیاب اور پرامن زندگی ہو اور پوری انسانیت کے لیے سعادت وفلاح حاصل ہو۔ نیز آخرت میں کامرانی حاصل کرنے کا یہی ذریعہ ہے۔ یہ کسی مخصوص قوم اور طبقے کے لیے نہیں، یا کسی خاص زمانے تک محدود نہیں، قیامت تک کے لیے راہ ہدایت اور کائنات میں بسنے والے انسانوں کے لیے رشد وکامیابی، یہ دین اسلام کا مکمل نظام، اس میں شریعت کے جملہ احکام، نہ کسی تبدیلی اور نہ حذف و اضافے کی گنجائش، اس مجموعۂ کلامِ الٰہی میں تمام تفصیلات پوشیدہ ہیں، کچھ امور اجمالی ہیں تو کچھ تفصیلی، ایجاز واطناب کے درمیان یہ کلام اپنے الفاظ ومعانی میں بیحد جامع، مگر بہت سے اجزاء میں تفصیل اور تشریح کی بھی حاجت۔

جہاں ایک طرف اس کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ نے لی اور فرمایا: ''**انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحافظون**''. (**سورہ الحجر: آیت نمبر. ۹**) (ہم نے یہ نصیحت نامہ نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) تو دوسری طرف یہ بھی

ارشاد باری ہوا: ''**ثم ان علینا بیانه**''. (**سورہ قیمہ: آیت نمبر. ۱۹**) (پھر اس کی تشریح بھی ہمارے ذمہ ہے) دوسری جگہ فرمایا گیا: ''**کتاب احکمت آیاته ثم فصلت من لدن حکیم خبیر**''. (**سورہ ھود: آیت نمبر. ۱**) (یہ ایسی مکمل کتاب ہے جس کی آیات محکم ہیں، پھر حکمت اور خبر رکھنے والے کی طرف سے اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔)

تو قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ نے اپنے ذمے لی اور اس کی حفاظت کے بے انتہا محفوظ طریقے بنا دیئے، حفظ قرآن کریم اور قرآن فہمی کے لیے مختلف علوم کا وجود میں آنا اس کی علامت ہیں، اسی طرح اس کی وضاحت اور تشریح بھی اللہ نے خود قرآن میں بہت سی جگہوں پر فرمادی، یہی شرح و بیان تفسیر ہے، اس کے ساتھ ہی اس کی وضاحت اور تفسیر کی ذمے داری حامل قرآن خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد بھی کردی اور فرمایا کہ قرآن کی تشریح بھی وہی کریں گے۔

''**وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیهم**''. (اور اس طرح کی بے شمار دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر صرف کتاب نازل نہیں کی گئی، بلکہ حکم ہوا کہ قرآن لوگوں کو سنائیں اور ان کی تفسیر کریں اور ان کا تزکیہ)۔

قرآن کریم کے آیات ومعانی کی شرح وتوضیح کی یہی ابتدا تفسیر کا آغاز ہے۔ تفسیر کا مطلب ہے قرآن کریم کے مفہوم کو کھول کر بیان کرنا اور چونکہ تفسیر قرآنی مفاہیم کی تشریح ہوتی ہے اس لیے اسے علم تفسیر سے تعبیر کرتے ہیں، چنانچہ ابتدا میں تفسیر کا اطلاق قرآن کی تشریح پر ہوتا تھا، جیسا کہ علامہ زرکشیؒ نے اپنی کتاب ''البرہان'' میں اس کی مختصر تعریف کی ہے۔ ''وہ علم جس سے قرآن کریم کا فہم حاصل ہو اور اس کے معانی کی وضاحت اور اس کے احکام اور حکمتوں کا استنباط کیا جاسکے۔'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس علم کی مدوّن صورت نہیں تھی، بعد میں یہ ایک مستقل علم اور فن ہوگیا اور اس کی شاخیں ہوگئیں، یہ علم

بھی انتہائی وسیع ہوگیا اور یہ باضابطہ طور پر ''علم تفسیر'' ہوگیا، جس کے تحت الفاظ قرآن کی ادائیگی، الفاظ قرآنی کے مفہوم، الفاظ کے انفرادی احکام اور الفاظ کے ترکیبی احکام اور اس کے معانی شامل ہوتے۔

تفسیر قرآن کی ابتدا اور اس کے مآخذ پر نظر ڈالیں تو ہمیں اس کے چھ مآخذ ملتے ہیں:

۱۔خود قرآن کریم

۲۔احادیث نبویہ

۳۔صحابہ کرامؓ کے اقوال

۴۔اقوال تابعین

۵۔لغات عرب

۶۔عقل سلیم۔

مختصر طور پر ان کا جائزہ اس طرح لیا جاسکتا ہے: قرآن کے بعض آیات کی تشریح خود قرآن کریم سے حاصل ہوجاتی ہے۔ایک جگہ ایک واقعہ یا حکم مبہم یا مجمل انداز میں موجود ہے تو اس کی تشریح دوسری آیات میں اس طرح ہے کہ وہ ابہام اور اجمال ختم ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد قرآن کی تفسیر کا بڑا حصہ وہ ہے جو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی صورت میں ملتا ہے۔عہد رسالت میں قرآن کریم کے اولین شارح وترجمان خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے،قرآن کا جو حصہ نازل ہوتا اس کی ترجمانی خود فرماتے،صحابۂ کرامؓ کی ایک مخصوص جماعت تھی جنھوں نے براہ راست آپ سے قرآن کی تعلیم حاصل کی،مگر آنحضور کی زندگی میں صحابۂ کرامؓ تفسیر کی جسارت نہیں کرتے تھے، ان حضرات کی تعداد بہت تھی، جنھوں نے قرآن اور اس کے اسرار ورموز سے آگاہی کے لیے خود کو وقف کردیا تھا،اس ضمن میں دس صحابۂ کرام کو خاص طور پر شہرت حاصل ہوئی:

۱۔ابوبکر صدیق ۲۔عمر فاروق ۳۔عثمان غنی ۴۔علی بن ابی طالب ۵۔عبداللہ بن

مسعود ۶۔عبداللہ بن عباس ۷۔ابی بن کعب ۸۔زید بن ثابت ۹۔ابوموسیٰ اشعری ۱۰۔عبداللہ بن زبیر رضوان اللہ علیہم اجمعین، ان کے علاوہ مندرجہ ذیل صحابہؓ سے بھی تفسیری اقوال منقول ہیں: ابوہریرہ، انس بن مالک، عبداللہ بن عمر، جابر بن عبداللہ، اور ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم۔مگر جیسا کہ روایتوں سے ثابت ہے صحابہ میں سے ''ترجمان القرآن'' کا لقب عبداللہ بن عباسؓ کو حاصل تھا، اللہ کے نبی نے ان کے لیے خصوصی طور پر دعا بھی فرمائی تھی: ''اے اللہ! ان کو دین کا فہم اور تفسیر قرآن کا علم عطا کر''

صحابہ کرامؓ کے بعد ایک بڑی تعداد مفسرین کی جماعت تابعین کی ہے، جنھوں نے صحابۂ عظام سے قرآنی مطالب ومفاہیم میں اخذ واستفادہ کیا، خاص طور پر مکہ مکرمہ میں سب سے زیادہ تفسیر داں موجود تھے، یہ سب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے تلامذہ تھے، مثلاً: مجاہد، عطاء بن ابی رباح، عکرمہ مولی ابن عباس، سعید بن جبیر اور طاؤس وغیرہم، مفسرین کی دوسری بڑی جماعت مدینہ میں تھی، جیسے زید بن اسلم، ان کے فرزند عبدالرحمٰن بن زید اور حضرت مالک بن انس وغیرہم، اسی طرح کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے تلامذہ کی بڑی تعداد تفسیر قرآن سے وابستہ تھی، جیسے حسن بصری اور مسروق وغیرہما۔

پھر تابعین کرام سے ان کے شاگردوں نے علوم قرآن کا فیض حاصل کیا، یہ تبع تابعین کی مقتدر جماعت تھی، انھوں نے اپنے پیش رو صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ کے تفسیری اقوال جمع کئے اور مرتب کئے، اسطرح کتب تفسیر کی ابتدا ہوئی، اس ضمن میں مندرجہ ذیل حضرات کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں:

۱۔سفیان بن عیینہ ۲۔وکیع بن الجراح ۳۔شعبہ بن حجاج ۴۔یزید بن ہارون ۵۔عبد بن حمید، گویا یہ حضرات ابن جریر طبری مفسر قرآن کے پیش رو ہیں، طبری اور بعد کے تمام مفسرین انھیں حضرات کی مساعی جمیلہ کے مرہون منت ہیں۔

عہد نبوی اور عصر صحابہ کی تفسیر میں مندرجہ ذیل خصوصیات نمایاں ہیں:

۱۔اس دور میں قرآن مجید کی پوری تفسیر نہیں لکھی گئی۔

۲۔قرآن کریم کی ان ہی آیات کی تفسیر بیان کی گئی جن میں کچھ ابہام واجمال پایا جاتا تھا اور سمجھنے میں دشواری پیش آتی۔

۳۔قرآن کے معانی ومفاہیم کے سلسلے میں صحابۂ کرامؓ میں بہت کم اختلاف ہوتا تھا۔

۴۔قرآن کے اجمالی معنی کی وضاحت پر اکتفا کیا جاتا تھا اور تفصیلات کم بیان کی جاتیں۔

۵۔عہد صحابہ میں تفسیر کی کوئی باضابطہ منظّم شکل نہیں تھی۔

اور تبع تابعین کا دور جو دوسری صدی ہجری کے اخیر تک کا دور ہے، باضابطہ تفسیری کتابوں کی تدوین شروع ہو چکی تھی، مگر یہ تفسیریں اب موجود نہیں ہیں، بعد کے آنے والے مفسرین نے ان کو اپنی کتابوں میں ان کے حوالے سے جمع کر دی ہیں۔

اسی زمانے میں علم حدیث کی کتابیں مدون ہونے لگی تھیں اور تیسری صدی ہجری میں کتب حدیث کا بہت بڑا ذخیرہ منظر عام پر آچکا تھا، صحاح حدیث کی کتابیں اسی دور کی ہیں، حدیث کی ان کتابوں میں محدثین کرام نے تفسیر پر مشتمل احادیث کو اپنی تصنیفات میں ''کتاب التفسیر'' کے عنوان سے جمع کر دیا تھا۔اس کے بعد سے ہی مکمل قرآن کریم کی تفسیر لکھی جانے لگیں، اس میں سب سے پہلا نام ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) کا آتا ہے۔ ان کی کتاب ''**جامع البیان فی تفسیر القرآن**'' سب سے ممتاز اور نمایاں اور معتمد و مقبول ہے، انھوں نے اس تفسیر میں اس وقت دستیاب اقوال صحابہ و تابعین کو یکجا کر دیا ہے۔اس لحاظ سے یہ تفسیر بالماثور ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی آیت کی تفسیر میں صحابہ، تابعین اور ان کے اتباع کے اقوال نقل کر دیئے جائیں۔

اس کے بعد جو تفسیری سلسلہ شروع ہوا وہ آج تک جاری ہے، مگر ان میں بہت سی اقسام ہوگئیں اور بہت سی تفسیروں میں اسرائیلی روایات بھی شامل ہوگئیں، گرچہ بعض

مفسرین ومحققین نے وضاحت کر دی کہ یہ روایت راجح ہے یا مرجوح ہے، اور بعض حضرات نے بغیر تفصیل اور صراحت کے ان روایتوں کو یکجا کر دیا۔

اس لیے تفسیری کتب کے مطالعہ یا استفادہ کے وقت اس بات کا لحاظ بہت ضروری ہے کہ آیا اس میں ایسی تفسیر بالرائی تو نہیں جو مذموم ہے اور جس کے بارے میں ارشاد نبوی ہے: ''**من تکلم فی القرآن برأیه فأصاب فقد أخطأ**''. (یعنی جو شخص قرآن کریم کے بارے میں اپنی رائے سے کچھ گفتگو کرے تو اگر وہ صحیح بات بھی کرے تو اس نے غلطی کی)۔اس کا مطلب جمہور علماء کے یہاں یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر میں جو اصول اجماعی طور پر مسلّم اور طے شدہ ہیں ان کو نظر انداز کر کے جو تفسیر محض رائے کی بنیاد پر کی جائیگی وہ ناجائز ہوگی۔اسی وجہ سے وہ تفسیریں قطعی رد ہو جائیں گی جو ایسی اسرائیلی روایات پر مبنی ہوں جن کی تصدیق قرآن وحدیث سے نہیں ہوتی اور جو واقعات کے خلاف ہوں اور اسی طرح فرق باطلہ یا گمراہ افراد یا تفسیر کا شعور نہ رکھنے والے یا عربی زبان پر قدرت نہ رکھنے والے افراد کریں، جو اجماع امت کے بیان کردہ انداز سے الگ ہو۔اس میں فرقہ باطنیہ، معتزلہ یا بعض صوفیاء کی تفسیریں بھی شامل ہیں۔

تفسیر بالروایہ کی چند مثالیں:

۱۔اب ہم مختصر طور پر ان تفاسیر کا ذکر کریں گے جو امت میں مستند اور مقبول ہیں۔ سب سے پہلا نام ابن جریر طبریؒ کی تفسیر کا آتا ہے، یہ تفسیر بالروایہ کی عمدہ مثال ہے، جس میں اقوال صحابہ و تابعین مع اسانید مذکور ہیں، بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دی گئی ہے اور آیات سے بہت سے احکام بھی مستنبط کئے گئے ہیں۔

۲۔''**تفسیر ابن کثیر**'': یہ حافظ عماد الدین ابوالفداء اسماعیل بن خطیب الشافعی (۷۴۷ھ) کی تصنیف ہے اور چار جلدوں پر مشتمل ہے، یہ تفسیر ایک طرح سے تفسیر ابن جریر

کا خلاصہ ہے، مگر اس کی امتیازی خوبی یہ ہے کہ مصنف چونکہ مفسر ہونے کے ساتھ ساتھ جلیل القدر محدث بھی ہیں، اس لیے بیشتر ضعیف اور موضوع روایات کو خارج کر دیا ہے جو ابن جریر یا متقدمین کی دوسری کتابوں میں رائج تھیں، اگر ضعیف روایات لاتے ہیں تو ان کی اسانید کی کمزوریوں پر متنبہ بھی کر دیتے ہیں۔

۳. "**الدر المنثور للسیوطی**": علامہ سیوطیؒ نے تفسیر بالروایہ کے طور پر یہ بیش قیمت تفسیر مرتب کی ہے، اور انھوں نے بھی صحیح روایات پر اعتماد کیا ہے۔

۴. "**تفسیر کبیر امام رازی**": اس تفسیر کا اصل نام "مفاتیح الغیب" ہے، اس کے مصنف امام فخر الدین محمد بن عمر رازی (متوفی ۶۰۶ھ) ہیں، جس طرح تفسیر ابن کثیر نہایت جامع اور بے نظیر تصنیف ہے، اسی طرح علوم درایت کے لحاظ سے یہ تفسیر منفرد اور ممتاز ہے، اس تفسیر میں طوالت ہے اور بہت سے مباحث موجود ہیں، اس میں امام رازی نے ہر آیت کی تفسیر، ترکیب نحوی اور شان نزول سے متعلق سلف کے اقوال کو مرتب انداز میں پیش کیا ہے، آیت سے متعلق فقہی احکام بھی مدلل انداز میں مذکور ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس تفسیر میں باطل فرقوں اور عقل پرستوں کی تحریف وتاویل کے ذکر کے بعد ان کی تردید بھی موجود ہے۔ اس میں ربط آیات کا بیان بھی ہے اور اسلامی احکام کے اسرار وحکم پر کلام بھی۔

۵. "**تفسیر ابی السعود**": اس تفسیر کا نام "**ارشاد العقل السلیم إلی مزایا القرآن الکریم**" ہے، قاضی ابوالسعود محمد بن محمد العمادی الحنفی (م ۹۵۱ھ) کی یہ تفسیر علمی گہرائی، دقت نظر اور تدبر قرآنی کا شاہکار ہے، ان کا اسلوب وانداز روشن اور ان کا ذوقِ بلاغت بہت نفیس اور بلند ہے۔

۶. "**تفسیر بیضاوی**": اصل نام "**انوار التنزیل و اسرار التاویل**" ہے، قاضی بیضاوی اہل سنت کے طریقے پر دلائل و براہین پیش کرتے ہیں، اس میں لغت کے قواعد وضوابط بھی ہیں، مگر سورتوں کی فضیلت پر منقول احادیث ضعیف ہیں۔

۷. "**تفسیر القرطبی**": اس کا پورا نام "**الجامع لأحکام القرآن**" ہے، اندلس کے معروف محقق وعالم علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر القرطبی (م ۶۷۱ھ) کی تصنیف ہے، اس میں اصلاً قرآن کریم سے فقہی احکام ومسائل کا استنباط ہے، مگر اس کے ضمن میں آیتوں کی تشریح، مشکل الفاظ کی تحقیق، اعراب وبلاغت اور متعلقہ روایات کو تفسیر میں خوب جمع کیا گیا ہے۔

۸. "**تفسیر روح المعانی**": اس تفسیر کا پورا نام "**روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم و السبع المثانی**" ہے بغداد کے مشہور حنفی عالم علامہ محمود آلوسی (م ۱۲۷۰ھ) کی یہ تصنیف تیس جلدوں پر مشتمل ہے اور یہ چونکہ آخری دور کی تصنیف ہے، اس لیے انھوں نے سابقہ تفاسیر کے اہم مباحث اس میں جمع کر دیے ہیں، روایات حدیث میں بھی بہت محتاط ہیں۔ بلاشبہ تمام سابقہ تفاسیر کا یہ خلاصہ ہے۔

مذکورۃ الصدر تمام تفاسیر عربی زبان میں ہیں اور موجودہ دور میں عربی زبان ہی میں اور بھی تفاسیر ہیں جن میں بعض مستند ہیں اور بعض میں جدت طرازی بھی ہے، خاص طور پر علامہ طنطاوی کی تفسیر "**الجواھر فی تفسیر القرآن**" کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں تفسیر کے سوا سب کچھ ہے۔ مصر ہی کے ایک عالم علامہ سید محمد رشید رضا کی تفسیر "المنار" ایک خاص طرز وانداز کی حامل ہے، اس میں آثار سلف کو پیش کر کے ان کو دور حاضر کے مقتضیات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، گرچہ اس میں ضعیف اقوال بھی آ گئے ہیں، اس کے علاوہ سید قطب شہید کی تفسیر ظلال القرآن بھی ہے، جس میں قرآنی مبادی ومقاصد کا اظہار ہے اور قرآنی تعبیر وتصویر کا بیان بھی۔

☆☆

ہدایت ربانی اور قرآن مجید

● مولانا انیس الرحمان قاسمی

انسانیت کی ہدایت ورہنمائی کے لئے اللہ جل شانہ نے قرآن کریم نازل کیا، یہ ایسی لازوال کتاب ہے جو علوم ومعانی کا سمندر ہے، اس پر جس قدر غور کیا جائے نئی نئی تحقیقات سامنے آتی ہیں۔ اللہ تعالی نے فرمایا ہے:

"إن هـذاالـقـرا ن يهدى للتى هى أقوم ويبشر المؤمنين الذين يعملون الصلحت ان لهم اجرا كبيرا". (سورۃ بنی اسرائیل:9)

بلاشبہ یہ قرآن ایسے طریقہ کی ہدایت دیتا ہے جو بالکل سیدھا ہے اور ان ایمان والوں کو جو نیک کام کرتے ہیں یہ خوشخبری دیتا ہے کہ ان کو بڑا بھاری ثواب ملے گا۔

قرآن کریم کی جامعیت:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی اس خوبی کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس کتاب عظیم میں تم سے پہلی امتوں کے واقعات ہیں اور اس میں بیان کردیا گیا ہے کہ تمہارے بعد کیا پیش آنے والا ہے، یہ دوٹوک اور ٹھوس حقائق پر مبنی کلام کا مجموعہ ہے:

"كتـاب الـلـه فيه نبأ ما قبلكم وخبر ما بعدكم". (ترمذی باب ماجاء فی فضل القرآن)

(اللہ کی اس کتاب میں پہلی امتوں کے واقعات اور آئندہ پیش آمدہ خبریں ہیں)۔

یہ حکمت ودانائی سے پر ہے، جو کوئی اسے پڑھتا ہے اسے صحیح علم حاصل ہوتا ہے اور ہدایت نصیب ہوتی ہے۔ اسے پڑھنے سے نہ دل اکتا تا ہے، نہ زبان تھکتی ہے۔ اسے جو شخص جتنی بار مطالعہ کرے گا اور سمجھ کر تلاوت کرے گا، وہ ہر بار ایک نئی وجدانی کیفیت سے سرفراز ہوگا۔

اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کے بارے میں فرمایا ہے:

"ولا يـخـلق عن كثرة الردولا تنقضى عجائبه". (ترمذی باب ماجاء فی فضل القرآن)

(بار بار دہرانے سے پرانا نہیں ہوتا ہے اور نہ اس کے عجائبات ختم ہوتے ہیں)۔

بلاغت قرآنی:

قرآن کریم حسن معنی کے ساتھ فصاحت وبلاغت کا بھی شاہکار ہے۔ کم سے کم الفاظ میں علوم کے سمندر کو سمیٹنا قرآن کریم ہی کا اعجاز ہے اور حقیقت یہی ہے کہ یہ ہر اعتبار سے لاریب فیہ ہے۔ اس کے اعجاز کا مشہور عام پہلو یہ ہے کہ وہ اپنی نظیر آپ ہے، اس جیسا فصیح وبلیغ عبرت ونصیحت سے بھرپور اور حکمت ودانائی سے پر کلام پیش کرنے سے یہ دنیا پہلے بھی عاجز رہی ہے اور آئندہ بھی عاجز رہے گی، اللہ جل شانہ نے فرمایا ہے:

"قـل لـئـن اجتـمـعـت الانـس والجن على أن ياتو ابمثل هذاا لقرآن لاياتو ن بمثله ولو كان بعضهم لبعض ظهيرا". (سورۃ بنی اسرائیل:۸۸)

(آپ فرمادیجئے کہ اگر تمام انسان اور جنات سب اس بات کے لئے جمع ہوجائیں کہ ایسا قرآن بنالاویں تب بھی ایسا نہ لاسکیں گے۔ اگرچہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جاویں)۔

اللہ جل شانہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر کسی سے یہ بھی نہ ہوسکے تو قرآن جیسی دس

سورتیں تیار کر کے لائے اور اگر اس پر بھی قادر نہ ہو تو کم از کم ایک سورہ ہی اس طرح کی وضع کر کے دکھلائے۔

"وإن كنتم في ريب مما نزلنا على عبدنا فأتو بسور ة من مثله وادعوا شهداء كم من دون الله ان كنتم صادقين". (سورۃ البقرہ ۲۳)

(اور اگر تم کچھ خلجان میں ہو اس کتاب کی نسبت جو ہم نے نازل فرمائی ہے اپنے بندہ پر تو پھر تم بنا لاؤ ایک محدود ٹکڑا، جو اس کا ہم پلا ہو اور بلا لو اپنے ان حمایتوں کو جو خدا سے الگ (تجویز کر رکھے ہیں) اگر تم سچے ہو)۔

اس طرح قرآن نے کفار و مشرکین کو چیلنج کیا کہ اگر تم کو اس کی صداقت پر ذرا سا بھی شبہ ہے تو اس جیسا دوسرا قرآن لاؤ، اگر ایسا نہیں کر سکتے تو دس سورتیں لے آؤ، اگر یہ بھی نہیں کر سکتے تو ایک سورت ہی بنا کر دکھلاؤ، اور قرآن کریم نے یہ بھی پیشن گوئی کر دی کہ تم قیامت تک ایک آیت بھی وضع نہیں کر سکتے۔

قرآن کریم جب نازل ہو رہا تھا اس کے اولین مخاطب وہ عرب تھے جن کی مادری زبان عربی تھی، اسی میں یہ کلام نازل ہوا، وہ کلام کی خوبی اور اس کے حسن کو ایک نظر میں سمجھ لیتے تھے، یہی وجہ ہے کہ کفار عرب بالخصوص قریش نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سماجی بائیکاٹ کیا تکلیفیں دیں، آپ کو قتل کرنے کی سازشیں کیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور ایمان والوں کے خلاف جنگ کی، مگر انہیں ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اس جیسا کلام لائیں۔

ابوالولید عتبہ بن ربیعہ جو بڑے سردار اور عربی زبان وادب کے ماہر تھے زندگی بھر ایمان نہیں لائے، مگر قرآن سننے کے بعد کہا:

میں نے ایسی بات سنی ہے جو بخدا زندگی میں پہلے نہیں سنی، بخدا نہ تو یہ شعر ہے اور نہ جادو کے بول ہیں اور نہ کسی کاہن کی آواز ہے۔ اے اہل قریش! میری بات نہ مانو اور خود تجربہ کر لو اور ہمارے اور اس شخص کے درمیان میں جو بات ہوئی ہے اس کو نظر انداز کر دو، خود

سن کر یا پڑھ کر فیصلہ کرو، کیونکہ میں جو سن کر آ رہا ہوں وہ ایک بہت بڑی انقلابی خبر ہے، جو عرب ارادہ کر رہے ہیں وہ پا گئے تو کوئی دوسرا شخص یہ کام اپنے سر اٹھائے گا اور اگر وہ عربوں پر غالب آئے تو تمہارا ملک اس کا ملک ہو جائے گا اور تمہاری عزت اس کی عزت ہو جائے گی اور تم لوگوں میں سب سے زیادہ خوش حال ہو جائیں گے۔ لوگوں نے کہا، اے ابوالولید! تم پر اس شخص نے اپنی زبان سے جادو کر دیا ہے، عتبہ نے کہا کہ جو میری رائے تھی وہ میں نے کہہ دی، اب تم جانو تمہارا کام جانے۔

قرآن کا ایک اعجازی پہلو یہ ہے کہ اسے جو سنتا ہے گرویدہ ہو جاتا ہے اور کسی فنی موشگافی کا منتظر نہیں ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کے بارے میں فرمایا ہے:

"وانه لتنزيل رب العالمين نزل به الروح الامين، على قلبك لتكون من المنذرين بلسان عربي مبين". (سورۃ الشعراء: ۱۹۲-۱۹۵)

(اور یہ قرآن رب العالمین کا بھیجا ہوا ہے اس کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے، آپ کے قلب پر، صاف عربی زبان میں، تاکہ آپ منجملہ ڈرانے والوں کے ہو جائیں)۔

قرآن فہمی:

اس لیے قرآن کو سمجھنے کے لیے عربی زبان سے واقف ہونا ضروری ہے۔ ایسے لوگوں پر قرآن کے معانی واضح نہیں ہوتے جو علوم عربیہ سے واقف نہ ہوں، مگر قرآن کو اللہ نے پڑھنا بھی آسان کیا ہے اور سمجھنا بھی، خاص طور پر عربی زبان بولنے والوں کے علاوہ وہ لوگ جو فارسی یا اردو بولتے یا سمجھتے ہیں، ان کے لیے بھی تھوڑی سی کوشش سے قرآن آسان ہو جاتا ہے کیونکہ ان دونوں زبان میں قرآن کے ایک تہائی الفاظ شامل ہیں، جن کو وہ پہلے سے سمجھتے ہیں۔ جو شخص قرآن کا علم حاصل کر لیتا ہے حقیقت میں قرآن کے بحر علم میں غوطہ لگاتا ہے، جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے۔ خود صحابہ کرام اگرچہ وہ عربی زبان کے واقف کار تھے،

مگر قرآن کے الفاظ کے سیکھنے کے ساتھ اس کے معانی کو حاصل کرنے کی جدوجہد کرتے اور عمل کی پوری کوشش کرتے۔ ابوعبدالرحمٰن سلمیؒ کہتے ہیں:

(ہم سے ان لوگوں نے بیان کیا جو قرآن اہتمام سے پڑھا کرتے تھے جیسے، حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبداللہ بن مسعود۔ حضرات صحابہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیات پڑھ لیتے تو ان سے آگے نہ بڑھتے یہاں تک کہ وہ ان آیات میں علم وعمل کی تمام باتیں نہ لیتے، ان کا کہنا تھا کہ ہم نے قرآن اور عمل دونوں ایک ساتھ سیکھا اور اسی لیے وہ ایک سورہ کو یاد کرنے میں بڑا وقت صرف کرتے)۔ (مسند احمد: ۴۱۰/۵)

انسانی افکار کا ہدایت ربانی کے تابع ہونا

قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کے ساتھ اس پر عمل کرنا ضروری ہے، دنیا میں جب تک قرآن کے علم کو عام نہیں کیا جائے گا اور انسانوں کے افکار وخیالات ربانی ہدایات کے تابع نہیں ہوں گے، سماج میں امن وانصاف قائم نہیں ہوسکتا اور نہ انسان کی اخروی زندگی درست ہوسکتی ہے۔ اس لیے قرآن کی ہدایت کو نہ صرف مسلمان سمجھیں اور عمل کریں بلکہ سارے انسانوں تک اسے پہنچائیں۔ اگر مسلمان تلاوت کا اہتمام کریں اور عمل کے ساتھ اسے عام انسانوں تک پہنچائیں تو یہ قرآن کی صحیح خدمت ہوگی، ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن اللہ سے کہیں گے کہ لوگوں نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا، ارشاد الٰہی ہے:

”وقال الرسول یاربإن قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا“. (سورة الفرقان: ۳۰)

(اور رسول کہے گا کہ اے میرے رب میری قوم کے لوگوں نے اس قرآن کو بالکل نظرانداز کر رکھا تھا)۔

تلاوت قرآن:

اس لیے ہمیں چاہئے کہ قرآن کو پوری قوت کے ساتھ پکڑیں، آداب ظاہری وباطنی کے ساتھ اس کی تلاوت کریں، قرآن کو یاد کریں اور روزانہ اس کی تلاوت کا اہتمام کریں، جو شخص قرآن کو پڑھے گا، قرآن اس کے لیے سفارش کرے گا اور صاحب قرآن سے قیامت کے روز کہا جائے گا:

قرآن شریف پڑھتا جا اور بہشت کے درجوں پر چڑھتا جا اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، جیسا کہ تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتا تھا بس تیرا رتبہ وہی ہے جہاں آخری آیت پر پہنچے۔
(ترمذی باب ما جاء فی من قرأ حرفا من القرآن ماله من الاجر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے:

جس شخص نے قرآن پڑھا، پھر اس کو حفظ کیا اور اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام جانا، حق تعالیٰ شانہ اس کو جنت میں داخل فرمائیں گے اور اس کے خاندان کے ایسے دس آدمیوں کے بارے میں اس کی شفاعت قبول فرمائیں گے، جن کے لیے جہنم واجب ہوچکی ہے۔ **(ترمذی باب ما جاء فی فضل قاری القرآن)**

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی جو شخص ترتیل کے ساتھ تلاوت کرتا ہے، اس کے لیے اس دنیا میں بھی بشارت ہے اور آخرت میں بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

”من قرأ حرفا من کتاب الله فله به حسنة والحسنة بعشر امثالها لا أقول الم حرف، الف حرف، ولام حرف، ومیم حرف“. (ترمذی باب ماجاء فی من قرأ حرفا من القرآن ماله من الاجر)

جو شخص ایک حرف کتاب اللہ کا پڑھے اس کے لیے اس حرف کے عوض ایک نیکی ہے اور ایک نیکی کا اجر دس نیکی کے برابر ملتا ہے، میں نہیں کہتا ہوں کہ الم ایک حرف ہے، بلکہ

الف ایک حرف، لام ایک حرف اور میم ایک حرف ہے۔

اولاد کی تعلیم میں سب سے پہلے ضروری ہے کہ ان کو قرآن کی تعلیم دی جائے، کیونکہ قرآن کی تعلیم سے بہتر کوئی اور تعلیم نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"خیرکم من تعلم القرآن وعلمه". (ترمذی باب ما جاء فی تعلیم القرآن)

تم میں بہتر یا افضل وہ شخص ہے جو قرآن کو سیکھے اور اس کو سکھلائے۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

جو شخص قرآن پڑھے اور اس پر عمل کرے، اس کے والدین کو قیامت کے دن ایک تاج پہنایا جائے گا، جس کی روشنی آفتاب کی روشنی سے بھی زیادہ ہوگی، اگر وہ آفتاب تمہارے گھروں میں ہو، پس کیا گمان ہے تمہارا اس شخص کے بارے میں جو خود اس پر عمل کرتا ہو۔ (ابوداؤد)

اس لیے ہر شخص کو چاہئے کہ وہ خود قرآن سیکھے، اپنی اولاد کو سکھائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"ان الذی لیس فی جوفه شیئ من القراٰن کالبیت الخرب". (ترمذی باب ما جاء فی من قرأ حرفا من القرآن ماله من الاجر)

جس شخص کے قلب میں قرآن شریف کا کوئی حصہ بھی محفوظ نہ ہو وہ ویران گھر کی طرح ہے۔ مکاتب و مدارس جہاں قرآن کی تعلیم دی جاتی ہے اس کی بڑی فضیلتیں آئی ہیں ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

کوئی قوم اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہو کر تلاوت کلام پاک اور اس کا دور نہیں کرتی، مگر ان پر سکینہ نازل ہوتا ہے اور رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے، ملائکہ رحمت ان کو گھیر لیتے ہیں اور حق تعالیٰ شانہ ان کا ذکر ملائکہ کی مجلس میں فرماتے ہیں۔ **(مسلم فضل**

الاجتماع علی تلاوة القرآن وعلی الذکر)

اس لیے اس سے بڑی کوئی نیکی نہیں کہ اللہ کے کلام کی تلاوت کی جائے، اس کو سمجھ کر عمل کیا جائے اور اس کی ہدایتوں کو عام کیا جائے گھروں اور مساجد میں قرآن کو تجوید کے ساتھ سکھانے، بلکہ تفسیر بیان کرنے کا برابر اہتمام کرنا چاہیے، ایسا نہیں کرنے سے قرآن کی تعلیم کو سیکھنے اور عام کرنے میں کوتاہی سمجھی جائے گی اور اللہ کے نزدیک قرآن چھوڑنے پر پکڑ ہو سکتی ہے۔

قرآن وسابقہ کتابوں پر ایمان:

قرآن کی تلاوت اور اس کا فہم اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اس کے منجانب اللہ ہونے پر پختہ یقین نہ ہو، اور کتاب اللہ (قرآن کریم) پر ایمان لانے کا مقصد ان تمام صداقتوں اور حکموں کو جان و دل سے قبول کرنا ہے جو اس کتاب میں مذکور ہیں۔ قرآن پر ایمان لانے کا معنی یہ بھی ہے کہ جو کچھ قرآن میں عملی و علمی، عقائد و عبادات اور احکام مذکور ہیں ان کو مانا جائے۔ اس کے ساتھ دوسری آسمانی کتابوں کی سچائی کو بھی تسلیم کیا جائے، جس کی قرآن تاکید کرتا ہے۔ بلاشبہ کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک قرآن مجید کے ساتھ دوسرے نبی اور رسولوں کے صحیفوں اور کتابوں کو بھی من جانب اللہ تسلیم نہ کرے۔ اللہ جل شانہ فرماتے ہیں:

"وما انزل من قبلک". (سورة البقره: ۴)

(اور جو ایمان لائے اس پر جو تجھ سے پہلے اترا)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"أمن الرسول بماانزل إلیه من ربه والمؤمنون کل اٰمن بالله وملئکته وکتبه". (سورة البقره: ۲۸۵)

(رسول ایمان لایا اس پر جو خدا کی طرف سے اس پر اترا اور اہل ایمان بھی، ہر ایک خدا پر، اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر ایمان لایا)۔

اللہ رب العزت نے دیگر آسمانی کتابوں پر یقین رکھنے کو ایمان اور اس کے انکار کرنے کو کفر قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

"یایھاالذین آمنوا آمنوا باللہ ورسولہ والکتب الذی نزل علی رسولہ والکتب الذی انزل من قبل ومن یکفر باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الآخر فقد ضل ضلٰلا بعیدا". (سورۃ النساء:۱۳۶)

(اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے ہو، ایمان لاؤ خدا پر، اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جس نے خدا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اس کے رسولوں اور آخرت کے دن کا انکار کیا، وہ نہایت سخت گمراہ ہوا)۔

قرآن کریم میں چار آسمانی کتابوں کا تذکرہ خصوصیت سے کیا گیا ہے۔ (۱) توراۃ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا (۲) زبور جو حضرت داؤد علیہ السلام کو دیا گیا (۳) انجیل جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا (۴) صحف ابراہیم علیہ السلام، ان چاروں کتابوں پر ایمان لانا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے، اس کے علاوہ دیگر رسولوں کو بھی چھوٹے چھوٹے صحیفے دیئے گئے جن کا تذکرہ قرآن کریم نے سورۃ آل عمران میں اجمالی طور پر کیا ہے، ان پر بھی ایمان لانا اور اس میں جو بھی ہدایات ربانی تھیں ان کو ماننا ایمان کا حصہ ہے اور یہی وہ عقیدہ ہے جس پر ایمان رکھنے میں مسلمان ممتاز ہیں، اس لیے کہ وہ تمام آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں، جب کہ دیگر مذاہب کے لوگ صرف اپنے مذہب کی ایک کتاب کو مانتے ہیں اور دوسری کتاب کا انکار کرتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

"شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا والذی أوحینا الیک وما وصینا

بہ إبراھیم وموسی وعیسی أن اقیموا الدین ولاتفرقوا فیہ". (الشوریٰ: ۱۳)

اس نے دین میں تمہارے لیے وہی راہ مقرر کی جو نوح سے کہی تھی اور ہم نے تیرے پاس جو حکم بھیجا اور جو کہہ دیا ہم نے ابراہیم سے اور موسیٰ سے اور عیسیٰ سے یہ کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

ایک دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے:

"یا أھل الکتٰب تعالوا إلی کلمۃ سواء بیننا وبینکم ألا نعبد الااللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ، فان تولوا فقولوا شھدوا بانا مسلمون". (سورۃ آل عمران: 64)

اے کتاب والو! آؤ ہم تم ایک بات پر جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں ہے متفق ہو جائیں، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور نہ کسی کو اس کا شریک بنائیں اور نہ آپس میں ایک ایک کو خدا کو چھوڑ کر رب بنائیں، اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو کہہ دے کہ تم گواہ رہو کہ ہم حکم الٰہی کے تابع ہیں۔

غرض کہ قرآن نے اسی دین کی دعوت دی، جو تمام مذاہب میں یکساں تھا۔ اس لیے یہ ماننا ضروری ہے کہ وحی کے آغاز سے آخر تک ایک ہی پیغام تھا جو آتا رہا، ایک ہی دین تھا جو سکھایا جاتا رہا، تمام کتابوں کے احکام ایک ہی تھے جو لوگوں کی ہدایت کے لیے دیے گئے۔ یہی قرآن آخری دفعہ پوری حفاظت کے وعدہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور قیامت تک محفوظ اور باقی رہے گی۔ اس لیے تمام کتابوں پر ایمان رکھنا ضروری ہے اور یہی دین اسلام کا حکم ہے۔ البتہ آسمانی کتابوں میں اصلی حالت میں اب صرف قرآن محفوظ ہے، اس لیے اسی کو پڑھا یا جائے گا اور اسی کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ اللہ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

☆☆☆

قرآن اللہ کا ازلی، ابدی اور غیر فانی پیغام

● مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی

اللہ تعالیٰ خالق کائنات ہے۔ عرش و کرسی، لوح و قلم، جنت و دوزخ، حور و ملائک، زمین و آسمان، جن و انس، حیوانات و نباتات و جمادات غرض کہ ہر ذی روح اور غیر ذی روح کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے، یعنی ہر چیز مخلوق ہے اور اس کے خالق اللہ تعالیٰ ہیں۔ ہر مخلوق کو ایک روز فنا ہو جانا ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات غیر فانی ازلی اور ابدی ہے۔ ہمیشہ سے موجود ہیں اور ہمیشہ موجود رہیں گی۔

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی دوسری صفات کی طرح ایک صفت یہ بھی ہے اور سب صفاتِ الٰہی ذاتِ الٰہی کی طرح غیر فانی اور ابدی ہیں، اس لیے کلام اللہ بھی غیر فانی ازلی اور ابدی ہے، ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔ یہ مخلوق نہیں ہے، قرآن کو مخلوق سمجھنا سخت گناہ ہے۔

مشیت الٰہی کو جب منظور ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ازلی اور ابدی کلام کو لوح محفوظ میں حروف و الفاظ کا جامہ پہنا دیا۔ بندوں کی ہدایت و رہبری کے لیے پیغمبر اوّل سیدنا آدم علیہ السلام سے حضرات انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ شروع فرمایا۔ اپنے خاص خاص برگزیدہ بندوں کو پیغمبری کا تاج پہنا کر ہر ملک اور ہر قوم میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی اور رسول بھیجتے رہے۔ بالآخر آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے حضرات انبیاء علیہم السلام کے اس سلسلہ کو خاتم النبیین رحمت عالم سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کر کے نبوت کا دروازہ بند

کر دیا۔ رمضان کی شب قدر میں اپنے ازلی کلام، یعنی قرآن پاک کو لوح محفوظ سے آسمانِ دنیا پر اتار دیا اور اپنی مشیت و حکمت کے مطابق اسی کلام کو تھوڑا تھوڑا تیئس سال کی مدت میں اپنے مقرب و امین فرشتہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل فرمایا۔

ایک دفعہ کی وحی میں قرآن کی جتنی آیتیں اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی حضرت جبرئیل علیہ السلام آنحضرت کے سامنے تلاوت فرماتے تھے تو شروع شروع میں اس خیال سے کہ کہیں کوئی لفظ ذہنِ شریف سے نکل نہ جائے، وحی کی آیتوں کو آنحضرتؐ خود بھی جلدی جلدی دہرانے لگے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا:

"لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ . إن علینا جمعہ و قرانہ . فاذا قرانہ فاتبع قرانہ ثم ان علینا بیانہ" ۔ (سورۃ القیامۃ: رکوع۔۱: آیت نمبر: 16 تا 19) (اے نبی! آپ اس کو یعنی قرآن پاک کو جلدی جلدی لینے کے لیے اپنی زبان نہ ہلایا کیجئے (آپ کے سینے میں) اس کا جمع کر دینا اور اس کا (پورے کے پورے قرآن کا) پڑھوا دینا تو ہمارے ذمہ ہے۔ جب ہم اسے (بواسطہ جبرئیل) پڑھنے لگیں تو آپ (ہمہ تن) اس کے تابع ہو جایا کیجئے۔ (یعنی اس پر توجہ رکھئے اور اس کو دہرانے کی فکر نہ کیجئے) پھر اس قرآن کا (آپ کو یاد کرا کے) بیان کرا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے)۔

گویا پورے قرآن کو بلا کمی بیشی کے اور صحیح صحیح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دینا اور آپؐ کی زبانِ مبارک سے پورا قرآن سنوا دینا اور اس کے معنی سمجھا دینا دونوں کام اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لیے، چنانچہ ان آیات کے نازل ہونے کے بعد نزولِ وحی کے دوران میں آیتوں کو دہرانا آنحضرت نے ترک فرما دیا تھا۔ ایک دفعہ کی وحی میں حضرت جبرئیل امین علیہ السلام جتنا قرآن آنحضرت ﷺ کے قلب مبارک تک پہنچاتے تھے آپ نہایت توجہ سے سماعت فرماتے اور اس کے بعد وعدۂ الٰہی کے مطابق آپ وحی الٰہی کی کل

آیتوں کی تلاوت فرمادیتے تھے۔ وحی الٰہی سے آپ کو یہ بھی بتادیا جاتا تھا کہ کون سی آیت قرآن میں کس جگہ پر رہے گی۔ صحابی رسول کاتب وحی زید بن ثابتؓ اور بعض دوسرے صحابۂ کرام آنحضرت ﷺ کی ہدایت کے مطابق اسی جگہ پر ترتیب سے وحی کی آیتوں کو لکھتے جاتے تھے۔ ۲۳ سال تک وحی کا سلسلہ جاری رہا اور قرآن مکمل ہوگیا۔ سال میں ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اللہ کا کلام آنحضرتؐ سے سن لیا کرتے تھے۔ آپ کی حیاتِ پاک کے آخری سال میں دومرتبہ آپ سے قرآن سن لیا۔ اسی زمانہ میں حضرت زیدؓ نے بھی پورا قرآن حفظ کر کے آنحضرتؐ کو سنادیا تھا۔ صحابۂ کرام کی جماعت میں بہت سے دوسرے حضرات نے بھی پورا قرآن حفظ کرلیا تھا۔

خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کے زمانہ میں ایک دفعہ ستر صحابی جو حافظ قرآن تھے، شہید ہوگئے۔ اس وقت تک پورا قرآن کتابی شکل میں ایک جگہ موجود نہیں تھا، بلکہ تھوڑا تھوڑا جابجا آنحضرتؐ کا لکھایا ہوا الگ الگ تھا۔ ستر حافظ قرآن صحابیوں کی شہادت سے قرآن کو ایک جگہ جمع کردینے کی فکر حضرت عمر فاروقؓ کو پیدا ہوئی، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے حضرت صدیق اکبرؓ نے ایک جگہ پورا قرآن لکھ دینے کا کام کاتب وحی حضرت زیدؓ کے سپرد کردیا اور حضرت زیدؓ نے نہایت احتیاط اور جانفشانی کے ساتھ پورا قرآن ایک ہی جگہ پر اسی ترتیب کے ساتھ ویسے ہی لکھ دیا جیسے آنحضرت ﷺ نے اپنی حیاتِ پاک میں لکھایا تھا۔ حضرت زید بن ثابتؓ نے کلام اللہ کو اس طور پر یکجا کر کے حضرت صدیق اکبرؓ کے حوالہ کردیا۔ مکمل قرآن کا یہ پہلا قلمی نسخہ تھا۔ اس وقت بھی بہت بڑی تعداد میں اسلام کے فدائی اور قرآن کے عاشق اصحابِ رسولؐ موجود تھے جنھیں پورا قرآن حفظ تھا۔

پھر اسلام کے تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنیؓ کی خلافت کے زمانہ میں عراق اور شام کے مسلمانوں میں قرآن کی تلاوت میں بعض لفظوں اور حرکتوں پر اختلاف ہونے لگا جس سے سخت اندیشہ تھا کہ آنے والے زمانہ میں حضرت زیدؓ کے لکھے ہوئے پہلے قلمی نسخہ کے

خلاف کچھ مسلمان جابجا قرآن کی تلاوت کرنے لگیں گے، اس لیے کلام اللہ کو اپنی اصلی حالت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کردینے کی غرض سے حضرت زیدؓ کا لکھا ہوا قلمی نسخہ منگا کر حضرت عثمان غنیؓ نے کاتب وحی حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت سعید بن العاصؓ سے اس قلمی نسخہ کے مطابق کئی اور نقلیں تیار کرنے کو کہا۔ ان حضراتِ صحابہؓ نے پوری احتیاط کے ساتھ آدھی درجن سے زیادہ نقلیں اسی قلمی نسخہ سے تیار کردیں۔ حضرت عثمان غنیؓ نے ان کا ایک ایک نسخہ ملک شام، یمن، بحرین، بصرہ اور کوفہ وغیرہ اس وقت کے مرکزی شہروں میں بھیج دیا اور ایک نسخہ مدینہ منورہ میں رکھ لیا۔ یہی نسخے حضرت عثمان غنیؓ اور چوتھے خلیفہ حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں رائج رہے اور اس وقت کی اسلامی دنیا کے سب مسلمان جن میں ہزاروں صحابہ کرام شامل تھے، ان نسخوں کے مطابق قرآن پڑھتے اور پڑھاتے رہے۔ تیس پاروں کی ایک ایک آیت ساری عمر ان سب حضرات کے دلوں پر نقش اور زبان پر جاری رہی۔ قرآن کے حافظ حضرات جو سب کے سب جاں نثارانِ اسلام اور عاشقان قرآن تھے، اس زمانہ کے سب اسلامی ملکوں میں پھیلے ہوئے تھے اور حضرت عثمان غنی کی تیار کرائی ہوئی نقلوں کے مطابق اپنی اولاد اور شاگردوں کو قرآن پڑھاتے رہے۔ اس زمانہ کے حافظ قرآن حضرات عمر بھر اور بکثرت تلاوت کرنے کے علاوہ رمضان شریف کی نماز تراویح میں وہی قرآن ہر سال سناتے بھی رہے۔ اس طرح قرآن کا وہ پہلا اور مستند نسخہ جس کو خلیفہ اوّل حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانہ میں کاتب وحی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے لکھا تھا اور جس کی نقلیں خلیفہ سوم حضرت عثمان غنیؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں حضرت زیدؓ وغیرہ اصحاب رسول سے لکھوائی تھیں ایک نسل سے دوسری نسل کو، یعنی باپ سے بیٹے کو اور استاد سے شاگردوں کو اور اولاد در اولاد اور شاگرد در شاگرد اپنی اصلی حالت میں پہنچتا رہا۔ روزمرہ کی تلاوت کے علاوہ ہر سال رمضان کی تراویح میں شہر در شہر اور گاؤں در گاؤں قرآن کے حافظ وہی قرآن پڑھتے اور سناتے چلے آئے،

یہاں تک کہ اللہ کا وہ پاک کلام جس کو اللہ کے سچے امانت دار فرشتہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اللہ کے سب سے افضل بندہ اور آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ علی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر اتارا تھا اپنی اصلی حالت میں اسی ترتیب کے ساتھ جو اللہ کے سچے فرشتہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آنحضرت کو بتادی تھی ہمارے آپ کے گھروں میں اور حافظوں اور ناظرہ پڑھنے والوں کی زبان پر آج بھی محفوظ ہے۔

إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون. (الحجر)

''ہم نے قرآن کو نازل کیا اور ہم اس کے محافظ ونگہبان ہیں۔''

اللہ کا ہر قول اور ہر وعدہ سچا ہے۔ یہ وعدہ بھی سچا ہو کر رہا، کلام الٰہی آج تک محفوظ ہے اور ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

☆☆

قرآن اور امن عالم

● مولانا وحید الدین خاں

امن کی تعریف، عدم جنگ (Absence of War) سے کی جاتی ہے، مگر یہ امن کی منفی تعریف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امن ایک مثبت قدر کا نام ہے۔ ہر قسم کی تعمیری سرگرمی کے لیے ضروری ہے کہ سماج میں امن کی حالت قائم ہو۔ امن کے بغیر کسی صحت مند سماج کا قیام ممکن نہیں۔

امن کا تصور دنیا میں ہمیشہ پایا جاتا رہا ہے۔ اس شعبۂ مطالعہ کے لیے ایک مخصوص اصطلاح بھی وضع کی گئی ہے، جس کو پیسفزم (Pacifism) کہا جاتا ہے۔ پیسفزم کے موضوع پر کثیر تعداد میں کتابیں لکھی گئی ہیں، حتیٰ کہ اس موضوع پر ایک مستقل انسائیکلوپیڈیا چھپی ہے، جس کا نام An Encyclopaedia of Pacifism (1937) ہے۔

تاہم قدیم زمانے میں امن کا تصور یہ تھا کہ وہ ایک ایسی حالت ہے جس کو کوئی حکومت اپنی طاقت کے زور پر قائم کرتی ہے، چنانچہ رومن امپائر کے عہد میں پیکس رومانا (Pax Romana) کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ رومی اقتدار کے تحت قائم کیا ہوا امن۔ موجودہ زمانے میں جب امریکا کو سپر پاور کی حیثیت حاصل ہوئی تو پیکس امریکانا (Pax Americana) کا لفظ بولا جانے لگا، یعنی امریکا کے صنعتی دبدبے کے تحت قائم کیا جانے والا امن۔ امن کے معاملے میں اسلام نے جو فارمولا دیا ہے اس کو اسی طرح پیکس اسلامیکا (Pax Islamica) کہا جاسکتا ہے۔

مہاتما گاندھی کو اس باب میں ایک خصوصی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ انھوں نے ہتھیار کے استعمال کے بغیر انڈیا کو سیاسی آزادی دلائی، چنانچہ اس موضوع کو لے کر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً Mahatma Gandhi's Ideas, by C.F. Andrews. مگر اس Gandhi's Notions of Satyagraha, by Hannah Arendt. معاملے میں مہاتما گاندھی کا کارنامہ ایک ادھوری نوعیت کا کارنامہ ہے۔ انھوں نے انگریزوں کے خلاف آزادی کی جدوجہد میں ہتھیار کا استعمال نہیں کیا، مگر انھوں نے دوسرا کام یہ کیا کہ عوامی مظاہروں اور سول نافرمانی (Civil Disobedience) جیسے انتہا پسندانہ طریقوں کو اپنے مقصد کے لیے بھرپور طور پر استعمال کیا۔ اس طریق کار کا منفی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان سے انگریزوں کا سیاسی اقتدار تو ختم ہوا، لیکن اسی کے ساتھ ملک میں نراج کا دور دورہ ہوگیا۔ قانون شکنی کا مزاج عام ہوگیا۔ اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم کی روایات ٹوٹ گئیں، وغیرہ۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں جو آزاد ہندوستان بنا، وہ ایک ایسا ملک تھا جو امریکی پروفیسر گال بریتھ کے الفاظ میں حقیقی جمہوریت سے زیادہ ایک فنکشننگ انارکی (Functioning Anarchy) کے ہم معنی تھا۔

قیام امن کا صحیح مفہوم:

اصل یہ ہے کہ امن کے قیام کے لیے سب سے پہلے امن کا ایک قابل عمل فارمولا درکار ہے۔ ایک ایسا فارمولا جو لوگوں کی آزادی کو منسوخ کیے بغیر زیر عمل لایا جاسکے، جو موجود روایات کو توڑے بغیر امن کی حالت قائم کرے، جس کے ذریعے سماج میں کوئی نیا بگاڑ لائے بغیر امن کا حصول ممکن ہوسکے۔ امن کے لیے اس قسم کا فارمولا پہلی بار قرآن کریم میں پیش کیا گیا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو زیر عمل لاکر اس کا ایک باقاعدہ نمونہ تاریخ میں قائم کردیا۔

پیکس رومانا اور پیکس امریکانا کو اگر سیاسی امن کہا جائے تو قرآن کے اصولِ امن کو اصلاحی امن کا نام دینا درست ہوگا۔ قرآن کا امن فارمولا اس بات کو ممکن بناتا ہے کہ جبر اور بگاڑ جیسی کوئی خرابی پیدا کیے بغیر امن کی حالت قائم کی جاسکے، یعنی وہ حالت جس میں ہر قسم کی تعمیری سرگرمیاں قابل عمل ہوجائیں۔ قرآن کے اس امن فارمولے کو بتانے کے لیے میں نے اپنی کتاب اسلام ری ڈسکورڈ (Islam Rediscovered) میں ایک اصطلاح استعمال کی ہے۔ یہ اصطلاح پازیٹیو اسٹیٹس کوازم (Positive Statusquoism) ہے، یعنی حالت موجودہ سے ٹکراؤ نہ کرنا اور اس کے ہوتے ہوئے عین اسی وقت جو امکانات (Opportunities) پائے جارہے ہیں ان کو اپنے حق میں استعمال کرنا۔ یہ ایک کامیاب فارمولا ہے جس کو قرآن میں "ان مع العسر یسرا" کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی مسائل کے ساتھ ہمیشہ مواقع بھی موجود رہتے ہیں، اس لیے مسائل کو نظر انداز کرو اور مواقع کو استعمال کرو۔ Ignore the Problems, Avail the Opportunities۔

حقیقی پرامن سماج صرف نبیؐ نے قائم فرمایا:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم انسانی تاریخ کے پہلے شخص ہیں جنھوں نے حقیقی معنوں میں امن کا سماج قائم کیا۔ اس سماج کے قیام میں پوری طرح مذکورہ قرآنی فارمولے کو استعمال کیا گیا تھا۔ پیغمبر اسلام کی زندگی گویا کہ امن کے اس قرآنی فارمولے کی ایک عملی تفسیر ہے۔ آپ کی زندگی کے مطالعے سے ہم جان سکتے ہیں کہ یہ قرآنی فارمولا کس طرح زیر عمل لایا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قدیم مکہ میں ۶۱۰ عیسوی میں اپنی دعوتِ توحید کا آغاز کیا۔ اس وقت مکہ میں آپ کے لیے ایک سنگین مسئلہ تھا۔ آپ کا مشن یہ تھا کہ آپ کعبہ کو دوبارہ توحید کے عالمی مرکز کی حیثیت سے بحال کریں، مگر عملی صورتِ حال

یہ تھی کہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ اگر آپؐ ایسا کرتے کہ ''بت شکنی'' سے اپنے کام کا آغاز کرتے تو اس کا انجام یہ ہوتا کہ آپ کی بت شکنی عملاً امن شکنی کے ہم معنی بن جاتی۔ اس قسم کی کوشش کے نتیجے میں جو چیز ظہور میں آتی وہ سماجی فساد ہوتا نہ کہ سماجی امن۔ آپ نے قرآنی حکمت کے مطابق اس معاملے میں ڈی لنکنگ پالیسی (De-Linking Policy) اختیار کی، یعنی بت کی موجودگی کے مسئلے کو بروقت نظر انداز کرنا اور بتوں کے باوجود آپ کے لیے وہاں کام کے جو مواقع موجود تھے ان کو استعمال کرنا۔

کعبہ کے تین سو ساٹھ بت دراصل مختلف عرب قبائل میں پوجے جانے والے بت تھے، چنانچہ ان قبائل کے افراد اپنے بتوں کی زیارت کے لیے برابر وہاں آتے رہتے تھے۔ اسی طرح خود اہل مکہ کے لیے بھی کعبہ ایک مرکز اجتماع بنا ہوا تھا، جہاں وہ روزانہ اکٹھا ہوتے اور اپنے رواج کے مطابق وہاں اپنے مذہبی مراسم ادا کرتے۔ اس طرح کعبہ فطری طور پر ایک مقام اجتماع بن گیا۔

کعبہ میں رکھے ہوئے بت بظاہر پیغمبر اسلام کے لیے ایک مسئلہ تھے، لیکن کعبہ کے صحن میں لوگوں کے اجتماع نے اس مقام کو گویا کہ عربوں کی نیشنل اسمبلی کا درجہ دے دیا تھا۔ آپ نے کعبہ کے اس دوگونہ پہلو کو سمجھا اور بصیرتِ قرآنی سے کام لیتے ہوئے یہ کیا کہ آپ نے بتوں کی موجودگی کو وقتی طور پر نظر انداز کیا اور انسانوں کی موجودگی کو اپنی دعوت کے لیے مقامِ خطاب کے طور پر استعمال کیا۔ چنانچہ آپ پرامن طور پر وہاں جاتے اور لوگوں کو قرآن کے حصے پڑھ کر سناتے۔ اس طرح قرآن کا پیغام کسی ٹکراؤ کے بغیر خاموشی کے ساتھ عرب قبائل میں پہنچنے لگا۔

پیغمبر اسلام ﷺ تیرہ سال تک پرامن پیغام رسانی کا یہ مشن چلاتے رہے۔ قریش نے دیکھا کہ لوگ آپ کے کلام سے متاثر ہو کر آپ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں، اس لیے وہ آپ کے مخالف ہو گئے۔ یہ مخالفت اتنی زیادہ بڑھی کہ انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ سب مل کر آپ کو قتل کر ڈالیں اور اس طرح آپ کے موحدانہ مشن کو ختم کر دیں۔ یہ ایک سنگین صورت تھی۔

آپ نے پیشگی طور پر اس کا اندازہ کر لیا اور مکہ میں قیام کے زمانے ہی میں اپنے دو ساتھیوں کو مکہ سے تین سو میل دور واقع شہر مدینہ بھیج دیا۔ یہ لوگ وہاں جا کر توحید کی پرامن تبلیغ کرنے لگے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ لوگوں کو قرآن پڑھ کر سناتے، اس لیے ان کو مقری کہا جانے لگا، یعنی پڑھ کر سنانے والا۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدینہ کے لوگ تیزی سے اسلام قبول کرنے لگے، یہاں تک کہ مدینہ کے ہر گھر میں اسلام داخل ہو گیا۔

اس تجربے سے اندازہ ہوا کہ مدینہ کے حالات مکہ کے حالات سے مختلف ہیں، چنانچہ پیغمبر اسلام نے فیصلہ کیا کہ وہ مکہ والوں سے متشددانہ ٹکراؤ کی نوبت نہ آنے دیں۔ اس کے بعد آپ یکطرفہ فیصلے کے تحت مکہ کو چھوڑ کر مدینہ چلے گئے۔ اس واقعہ کو اسلام کی تاریخ میں ہجرت کہا جاتا ہے۔ ہجرت کا مطلب ہے: تشدد کے مقام کو چھوڑ کر ایسی جگہ چلے جانا جہاں پرامن طور پر کام کرنے کے مواقع پائے جاتے ہوں۔

پیغمبر اسلام نے پرامن عمل کا یہی طریقہ اپنی پوری زندگی میں اختیار کیا۔ ہجرت کے بعد قریش نے آپ کے خلاف جنگی کارروائی شروع کی تو آپ ہر قیمت پر اس سے اعراض کرتے رہے۔ چند بار صرف اس وقت محدود طور پر دفاعی جنگ کی نوبت آئی جب کہ فریق مخالف کے جارحانہ اقدام نے آپ کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہیں چھوڑا تھا۔ آخر میں آپ نے خود اپنی طرف سے مخالف قبیلہ قریش سے امن کی بات چیت شروع کی۔ وہ لوگ ضد پر اتر آئے تو آپ نے ان کی شرطوں کو یک طرفہ طور پر منظور کرتے ہوئے ان سے نا جنگ معاہدہ (No War Pact) کر لیا۔ اس معاہدہ کا خلاصہ یہ تھا کہ دونوں فریق اپنے اپنے دائرے میں امن پر قائم رہیں گے اور وہ دوسرے کے خلاف کوئی متشددانہ کارروائی نہیں کریں گے۔ اس معاملہ کی تفصیل راقم الحروف کی کتاب ''امن عالم'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔

امن کے لیے قرآنی فارمولا یہ ہے: مسائل کو نظر انداز کر کے مواقع کو استعمال کرنا اور اس طرح کوئی نیا مسئلہ پیدا کیے بغیر اپنی مطلوب منزل کی طرف اپنا پرامن سفر جاری رکھنا۔

قرآن کریم پر مستشرقین کے اعتراضات

● ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

مغرب کے جن محققین نے مشرقی علوم، بالفاظ دیگر اسلامیات کے مطالعہ وتحقیق کو اپنی موضوع بنایا ہے اور ان میں خامہ فرسائی کی ہے اور علمی خدمات انجام دی ہیں انھیں مستشرقین (Orientalists) اور ان کی مہم جوئی کو استشراق (Orientalism) کہا جاتا ہے۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ استشراق کی تحریک اصلاً عیسائیوں اور یہودیوں کی جانب سے صلیبی جنگوں کے بعد اسلام اور مسلمان کے خلاف برپا کی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مستشرقین میں سے معدودے چند کو چھوڑ کر سب کے سب عیسائی یا یہودی ہیں۔ صلیبی جنگوں میں پے در پے ہزیمتیں اٹھانے کے بعد اہل کلیسا نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک دوسرا محاذ کھول دیا اور صدیوں تک ایسی کتابیں تصنیف کی جاتی رہیں، جن میں اسلام کو اوہام و خرافات کا مجموعہ، بت پرستی کی دعوت دینے والا، خوں ریز وخون آشام اور فرسودہ (Out of Date) مذہب اور مسلمانوں کو بے غیرت وجاہل اور وحشی قوم کہا جاتا تھا۔ استشراق کی تحریک مختلف مراحل سے گزری ہے۔ علمی تحقیقات کے مواد، اسلوب، انداز پیشکش اور طرز ادا میں بہت کچھ تبدیلیاں آئی ہیں۔ معروضیت اور غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا جانے لگا ہے، لیکن اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مستشرقین کی بنیادی فکر میں جس کا اوپر تذکرہ کیا گیا، کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مستشرقین نے اسلامیات کے میدان میں بعض پہلوؤں سے اہم خدمات

انجام دی ہیں۔ انھوں نے یورپ کی لائبریریوں میں محفوظ اسلامی مصادر ومراجع پر عربی کتابوں کے قلمی نسخوں کو دریافت کیا ہے، ان کی فہرست سازی کی ہے، انھیں ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔ کئی زبانوں میں انسائیکلو پیڈیا آف اسلام مرتب کیا ہے۔ حدیث کی امہات الکتب کا انڈیکس تیار کیا ہے اور بعض ایسی خدمات انجام دی ہیں جن سے خود مسلمان قاصر رہے، لیکن یہی مستشرقین اسلام اور پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے بارے میں اپنی تحریروں میں زہر اگلنے سے نہیں چوکتے۔ جو مستشرقین استشراق کے اس عمومی رنگ سے آزاد رہ سکے ہیں اور ان کی تحقیقات معروضیت اور حقیقت پسندی پر مبنی ہیں ان کی تعداد انتہائی مختصر ہے۔

مستشرقین نے قرآن، سیرت نبویؐ، فقہ وکلام، صحابہ، تابعین، محدثین، فقہاء، صوفیاء اور ائمہ ومجتہدین کی سوانح، فن جرح وتعدیل، اسماء الرجال، حجیت حدیث، تدوین حدیث، فقہ اسلامی کا ارتقاء اور اس کے مآخذ، غرض اسلامیات کے تمام موضوعات سے تعرض کیا ہے اور ان میں شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں قرآن کریم سے متعلق ان کے خیالات کا عمومی جائزہ لیا جارہا ہے۔

مستشرقین عام طور پر قرآن کریم کو الہامی کتاب تسلیم نہیں کرتے، وہ اس کا اس حیثیت سے جائزہ لیتے ہیں کہ اسے پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تصنیف کیا ہے، چنانچہ وہ بڑی باریکی سے یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نعوذ باللہ قرآن کریم تصنیف کرنے کے لیے کن مآخذ سے استفادہ کیا ہے۔ مستشرق ٹسڈل (Tisdal) نے مآخذ القرآن کے نام سے ایک کتاب ہی لکھ دی ہے۔ اس کے مطابق آدم کی تخلیق، فرشتوں کے سجدہ کرنے اور ابلیس کے انکار کا مارسیون (Marcion) کی کتاب سے لیا گیا ہے۔ آسمانوں اور زمین کے سات طبقات ہونے کا تصور ہندو روایات سے ماخوذ ہے۔ حوروں کا خیال ایرانی روایات سے لیا گیا ہے۔ عرش، لوح محفوظ اور میزان وغیرہ کا تصور مصری خرافیات سے اخذ کیا گیا ہے۔ نماز کا طریقہ صابی قوم سے لیا

گیا ہے۔ دیگر عبادات کے طریقے یہودی روایات سے مستفاد ہیں۔ بعض قرآنی تعبیرات مشہور جاہلی شاعر امرؤالقیس کے اشعار میں پائی جاتی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ محمد (ﷺ) نے اس سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مستشرق بلاشیر (Blachere) کہتا ہے کہ قرآن کے بیان کردہ واقعات اور یہودی و مسیحی روایات میں بہت زیادہ مشابہت پائی جاتی ہے۔ وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ محمد (ﷺ) اور عیسائی راہبوں کے درمیان مکہ میں تعلقات استوار تھے۔ مستشرق فلیپ ایرلنگی دعویٰ کرتا ہے کہ مکہ میں محمد (ﷺ) کی اکثر یہودیوں سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ (بے چارے کو نہیں معلوم کہ یہودی مکہ میں نہیں، بلکہ مدینہ کے اطراف میں رہتے تھے) مستشرق کلیمن ہورٹ (Clement Haurt) انکشاف کرتا ہے کہ قرآن کی بعض آیات جاہلی شاعر امید بن ابی الصلت کے اشعار سے ماخوذ ہیں۔ بعض مستشرقین دعویٰ کرتے ہیں کہ محمد (ﷺ) نبوت کا اعلان کرنے سے قبل برسوں ایک بڑے مسیحی عالم ورقہ بن نوفل کے پڑوس میں رہے ہیں، جن سے انھوں نے بھرپور استفادہ کیا تھا۔ یہ دعوے اور انکشافات بے سروپیر کے تخیلات سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس انداز تحقیق پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ بدطینت لوگ علم کے نام پر جو تحقیقات کرتے ہیں اس میں پہلے اپنی جگہ یہ طے کر لیتے ہیں کہ قرآن کو بہرحال منزل من اللہ تو نہیں ماننا ہے۔ اب کہیں نہ کہیں سے اس امر کا ثبوت بہم پہنچانا ضروری ہے کہ جو کچھ محمد ﷺ نے اس میں پیش کیا ہے، یہ فلاں فلاں مقامات سے چرائے ہوئے مضامین اور معلومات ہیں۔ اس طرز تحقیق میں یہ لوگ اس قدر بے شرمی کے ساتھ کھینچ تان کر زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں کہ بے اختیار گھن آنے لگتی ہے اور آدمی کو مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ اگر اسی کا نام علمی تحقیق ہے تو لعنت ہے اس پر اور اس تحقیق پر۔'' (سیرت سرور عالم، 477/1)

اللہ تعالیٰ نے ہر دور اور ہر علاقے میں انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے اپنے کچھ

برگزیدہ بندوں کو بھیجا ہے اور ان پر اپنی طرف سے وحی نازل کی ہے۔ سب سے آخر میں اس کی طرف سے جو وحی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی وہ قرآن کی شکل میں محفوظ ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں فطرت سلیم بھی ودیعت فرمائی ہے۔ اس بنا پر عین ممکن ہے کہ قرآنی بیانات کی جو مماثلتیں دیگر کتابوں میں پائی جاتی ہیں وہ وحی الٰہی کے بقایا جات یا فطرت کے اشارے ہوں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن کریم کو ہمیشہ اللہ کا کلام کہا جس کی آپ کی طرف وحی کی جاتی ہے اور اپنے کلام کو اس سے الگ رکھا۔ آج بھی قرآن کریم اور احادیث نبویؐ کا مطالعہ کرنے والا دونوں کے درمیان بین فرق بخوبی محسوس کر سکتا ہے۔ اگر قرآن اور حدیث دونوں کا سرچشمہ ایک تھا تو ان کے اسلوب اور انداز بیان میں اتنا فرق کیوں ہے؟ کیا کسی شخص کے لیے، خواہ وہ کتنا ہی عبقری کیوں نہ ہو، یہ ممکن ہے کہ وہ ایک خاص اسلوب میں گفتگو کرنے کے بعد اسے اللہ کا کلام قرار دے، پھر اسلوب بدل کر دوسری گفتگو کرے اور اسے اپنا کلام قرار دے۔ اگر قرآن آپ ہی کی تصنیف تھی تو اسے اپنی طرف منسوب کرنے میں کیا رکاوٹ تھی؟۔

یہاں قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے دلائل بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔ عصر حاضر کی سائنسی تحقیقات نے ان دلائل میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ جن حضرات نے انسان اور مظاہر کائنات کے بارے میں قرآنی بیانات کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ قرآن کا مصنف کوئی انسان ہو اور وہ بھی ساتویں صدی عیسوی کا، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس موقع پر ڈاکٹر موریس بوکائی کے نتیجہ بحث کا حوالہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اپنی مشہور زمانہ کتاب ''قرآن، بائبل اور سائنس'' میں لکھتے ہیں:

''قرآن نے جن سائنسی پہلوؤں پر خصوصی بحث کی ہے وہ میرے لئے بطور خاص حیرت انگیز ہیں، کیونکہ قرآن کے یہ بیانات پوری طرح جدید سائنسی نظریات کے مطابق

ہیں۔ میں نے کسی قسم کا پیشگی فیصلہ صادر کیے بغیر قرآن کی ایک ایک آیت کا تنقیدی نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ یہ حقیقت میرے لیے بطور خاص چونکا دینے والی تھی کہ قرآن نے بظاہر کائنات کے بارے میں ایسے دقیق اشارے کیے ہیں جن کی تائید کائنات کے بارے میں جدید سائنسی تصورات سے ہوتی ہے۔ توریت میں ہم کو نمایاں طور پر سائنسی غلطیاں ملتی ہیں، مگر قرآن میں اس قسم کی کوئی غلطی نہیں ملتی۔ اس لیے میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ قرآن کا مصنف اگر کوئی انسان ہوتا تو ساتویں صدی مسیحی میں وہ ایسی باتیں کیسے لکھ سکتا تھا جو دور جدید کی سائنسی تحقیقات کی رو سے بالکل درست ہیں۔ ہمارے سامنے اس وقت بلاشبہ قرآن کا وہی ابتدائی نسخہ موجود ہے۔ یہ بات ممکن ہی نہیں ہے کہ نزول قرآن کے زمانے میں کسی انسان کی معلومات ہزار سال بعد ہماری علمی سطح سے زیادہ وسیع اور جدید تر ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ مختلف موضوعات پر قرآنی اشارے حیرت انگیز حد تک سائنسی پہلو رکھتے ہیں۔''

مستشرقین دوسرا اعتراض قرآن کے جمع وتدوین کے سلسلے میں کرتے ہیں۔ وہ قرآن کو غیر محفوظ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ مکمل قرآن عہد نبویؐ میں تحریری شکل میں موجود نہیں تھا۔ لوگ حافظہ پر اعتماد کرتے تھے۔ قرآن کی ترتیب وتدوین بہت بعد میں ہوئی ہے، اس لیے عین ممکن ہے کہ قرآن کا کچھ حصہ اس میں شامل ہونے سے رہ گیا ہو اور کچھ چیزوں کا اضافہ اس میں لوگوں نے اپنی طرف سے دانستہ یا غیر دانستہ طور پر کر دیا ہو۔ مثال کے طور پر مستشرق بلاشیر اپنی کتاب ''مقدمہ قرآن'' میں کہتا ہے کہ پہلی بار نزول وحی کے وقت محمد اس قدر دہشت زدہ ہو گئے تھے کہ ممکن نہ تھا کہ وحی کے الفاظ آپ کو یاد رہے ہوں، آپ نے انھیں لکھ لیا ہو اور محفوظ رکھا ہو۔ وہ مزید کہتا ہے کہ کتابت وتحریر کے وسائل پر اس زمانے میں یہودیوں کا قبضہ تھا جن کے ساتھ مسلمانوں کی کشمکش جاری تھی۔ اس بنا پر عہد نبویؐ میں پورے قرآن کی کتابت ممکن نہ تھی، اس لیے عین ممکن ہے کہ بعد میں جب

قرآن کو ضبط تحریر میں لایا گیا تو اس میں کچھ دوسری چیزیں بھی شامل ہو گئی ہوں اور بعد کے لوگوں نے انھیں قرآن کا حصہ مان لیا ہو۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح محض تخیلات کی بنیاد پر اور امکانات کے سہارے عہد نبویؐ میں تدوین قرآن کا انکار کیا جا رہا ہے، جبکہ تاریخی شواہد سے ثابت ہے کہ اللہ کے رسولؐ آیات قرآن کے نزول کے بعد انھیں لکھوا لیا کرتے تھے۔ خلفائے راشدین (حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ) حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابی بن کعبؓ اور متعدد دیگر صحابہ کتابت وحی کا کام انجام دیتے تھے، لکھنے کے لیے چمڑے کی کھالوں، کھجور کی ٹہنیوں، چوڑی ہڈیوں، پتوں اور کاغذ کو استعمال کیا جاتا تھا۔ لکھواتے وقت اللہ کے رسولؐ یہ بھی بتا دیا کرتے تھے کہ ترتیب میں کس آیت کو کہاں پر رکھا جائے۔ اس طرح آپ کی وفات کے وقت قرآن ہزاروں صحابہ کے سینوں میں محفوظ تھا، اس کے علاوہ وہ تحریری شکل میں بھی موجود تھا۔ یہ تمام تفصیلات کتب احادیث میں پائی جاتی ہیں۔

مستشرقین کی ایک کوشش یہ بھی رہی ہے کہ آج کل قرآن کا جو متن پایا جاتا ہے اس میں وہ اختلاف اور اضطرابات کی نشان دہی کریں، تاکہ قرآن میں تحریف کا اثبات کیا جا سکے۔ مثال کے طور پر مستشرق گولڈ زیہر (Gold Ziher) اپنی کتاب ''اسلامی تفسیر کے مکاتب فکر'' میں بڑی جسارت کے ساتھ دعویٰ کرتا ہے کہ ''متن قرآن میں جتنے اضطرابات پائے جاتے ہیں اتنے کسی بھی مذہبی گروہ کے نزدیک تسلیم شدہ مذہبی صحیفہ میں نہیں پائے جاتے۔'' وہ کہتا ہے کہ ''چونکہ قرآن کا کوئی ایک متفقہ متن نہیں ہے، اس لیے اس کی تعبیر وتشریح میں اختلافات ہوئے ہیں۔ ان اختلافات کے نمونے ابتدائی کتب تفسیر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔'' مستشرق آرتھر جیفری (Arther Jeffry) نے ابوداؤد کی ''کتاب المصاحف'' کو ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔ اس کے مقدمہ میں اس نے تفصیل سے اختلافِ قرأت کے موضوع پر بحث کی ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ مختلف مصاحف میں

بعض آیات قرآن کے الفاظ میں فرق پایا جاتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں اختلافات قرأت کا مسئلہ اس نوعیت کا نہیں ہے جس طرح سے یہ مستشرقین پیش کرتے ہیں۔ بعض آیات قرآنی میں ایک سے زائد قرأتیں منقول ہیں ان کی روایت آنحضرتؐ سے ثابت ہے۔ آج پورے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے پاس جو قرآن موجود ہے وہ ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح اللہ کے رسول کریمؐ پر نازل ہوا تھا۔ دوسری طرف یہودیوں اور عیسائیوں کی مذہبی کتابوں کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی اصل زبانوں میں محفوظ نہیں ہیں۔ جو کچھ ہے وہ ترجمے ہیں اور وہ بھی ایک سے زائد بار ضائع ہو چکے ہیں اور انھیں یادداشتوں کی بنیاد پر از سر نو مرتب کیا گیا ہے۔ ان کتابوں کے مختلف نسخوں میں ہزاروں اختلافات ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف زمانوں میں ان میں لفظی تحریفات کی جاتی رہی ہیں۔ اس سلسلے میں خود مغربی اسکالروں کے اعتراضات موجود ہیں۔

مستشرقین نے قرآن کریم کے بعض اسالیب، ترکیبوں، نظم کلام اور فصاحت و بلاغت کو بھی اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے مطابق کہیں کہیں قرآن کی زبان اور اسلوب اعلیٰ معیار سے فروتر ہے اور کہیں کہیں نحو وصرف (قواعد زبان) کی غلطیاں نظر آتی ہیں۔ ان کے یہ اعتراضات پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ قرآن نے اپنے زمانۂ نزول میں چیلنج کیا کہ وہ اللہ کا کلام ہے۔ اگر کسی کو اس معاملے میں شک ہو اور وہ اسے انسانی کاوش سمجھتا ہو تو اس جیسی چند آیتیں بنا کر پیش کرے۔ قرآن مسلسل یہ چیلنج پیش کرتا رہا، مگر کسی کو اسے قبول کرنے اور اس کا معارضہ کرنے کی ہمت نہ ہوسکی۔ اس زمانے کے اہل عرب زبان وادب کے شہ سوار اور فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ مرتبے پر تھے۔ انھوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف الزامات عائد کئے مگر کسی کو اس کی زبان، اسلوب اور فصاحت و بلاغت پر حرف گیری کی جرأت نہ ہوسکی۔

قرآن کریم پر جو اعتراضات مستشرقین نے کیے ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ اس کی عظمت و تقدس لوگوں کے دلوں سے ختم کر دیں اور اسے الہامی کتاب کے بجائے انسانی کاوش بنا کر پیش کریں جو زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ تحریف اور تبدیلی کا شکار ہوتی رہی ہے، لیکن وہ نہ اب تک اپنی کوشش میں کامیاب ہو سکے ہیں نہ آئندہ کامیاب ہوں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی حفاظت کا خود ہی ذمہ لیا ہے۔

☆☆

قرآن کریم کی انقلاب آفریں تاثیر

● مولانا شاہد عادل قاسمی

قرآن کریم ایک ایسی انقلابی کتاب ہے جس نے اپنی انقلابی تاثیر سے ہزاروں، لاکھوں ان دلوں کی کایا پلٹ دی جو برسہا برس سے دینی معرفت، اسلامی احسان وسلوک، عدل ومساوات، طور وطریقے، رہن وسہن، اخلاق واطوار، تہذیب وتمدن اور صحیح سوچ وفکر سے کافی دور ضلالت وجہالت، فسق وفجور، ظلم وزیادتی، جبر واستبداد اور فخر وتکبر کے عمیق غار میں ڈوبے ہوئے تھے۔ قرآن مجید کی حیرت انگیز انقلابی تاثیر نے ان زنگ آلود دلوں کی صفائی اور ستھرائی اس طرح کردی کہ پھر کوئی دوسری میل کچیل اور گندگی ان کے قریب تک نہ پھٹک سکی۔ قرآن کی حیرت انگیز انقلابی تاثیر کو ہمیشہ آزمایا اور دیکھا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے کہ ”**لو انزلنا ھٰذا القرآن علی جبل لرأیتہ خاشعاً متصدعاً من خشیتہ اللہ**“ (اگر ہم ان کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اللہ کے خوف سے پہاڑ کو پاش پاش اور جھکا ہوا دیکھتے)۔ سے صاف صاف معلوم ہو رہا ہے کہ قرآن کتنی مؤثر کن کتاب ہے۔ قرآن کریم کی انقلابی تاثیر نے بڑے سے بڑے سورما اور شجاعت وبہادری کے دعوے داروں کو اپنا غلام بنایا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عقبہؓ، حضرت عثمانؓ ابن مظعون، حضرت جبیر ابن عطعمؓ اور حضرت طفیل دوسی کے علاوہ ہزاروں اصحاب قرآن کی انقلاب آفریں تاثیر کے اسیر ہوئے۔ حضرت جبیر ابن مطعم کے بارے میں مروی ہے کہ آپ ایک نیک، صالح اور پاک طینت انسان تھے۔ سلیم الطبع اور نرم خو کے ساتھ ساتھ ظلم وستم اور استبداد وتشدد کے

خلاف ہمیشہ آواز بلند رکھتے تھے، مگر ان تمام صفتوں اور خوبیوں کے باوجود جہالت، تعصب اور نسلی وذاتی اپنائیت کی وجہ سے دین حق کو قبول کرنے سے قاصر تھے، مگر چونکہ قرآن ایک انقلابی ہمہ گیر کتاب ہے، جس کی تاثیر یقینی اور لازمی ہے۔ اس کے مضامین ایک مستقل حلقہ اثر پیدا کرتے ہیں اور ایسا ہی حضرت جبیر ابن معطم کے ساتھ ہوا۔ بتایا جاتا ہے کہ جنگ بدر میں ان کے کچھ لوگ قیدی ہوگئے اور ان لوگوں کو چھڑانے کے لیے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ منورہ آئے تو اس وقت آپ عصر کی نماز میں مشغول تھے اور سورہ طور کی آیت تلاوت فرمارہے تھے۔ (قسم ہے پہاڑ کی اور اس کتاب کی جو لکھی ہوئی ہے کھلے کاغذ میں اور قسم ہے بیت معمور کی اور اونچی چھت کی اور پانی سے لبریز سمندر کی کہ بے شک آپ کے پروردگار کا عذاب ضرور آکر رہے گا، کوئی بھی اسے ٹال نہیں سکتا“۔ یہ سنتے ہی جبیر ابن مطعم پر کپکپی طاری ہوگئی اور سارا بدن لرزہ براندام ہوگیا۔ جبیر ابن مطعم آیت کی بوجھ اور چیلنج کو برداشت نہیں کرپا رہے تھے۔ ”انَّ عــــذاب ربک“ الخ، کی تلاوت نبی کریمؐ کی زبانی ہورہی ہے اور جبیر ابن مطعمؓ غور سے سن رہے ہیں اور اندر ہی اندر تھرتھرا رہے ہیں کہ کہیں عذاب ربانی اور قہر خداوندی اسی وقت نازل نہ ہوجائے۔ ادھر قرآن کریم کی تاثیر کا حال دیکھئے کہ جبیر ابن مطعمؓ کو رسالت مآبؐ کی باتوں کو ماننے اور دین حق کی حقانیت کو قبول کرنے پر مجبور کردیتی ہے اور جبیر ابن مطعمؓ دولت اسلام سے مالا مال ہوجاتے ہیں اور دین اسلام میں شامل ہوجاتے ہیں۔

اسی طرح حضرت عتبہؓ کا حال دیکھئے کہ کس طرح نبی کریمؐ کو اپنی فصاحت لسانی کے زعم میں زیر کرنے آئے تھے، مگر قرآن کی مقناطیسیت اور اثرات نے کس طرح ان کو اپنا اسیر بنالیا، جبکہ قریش میں عتبہ فصاحت وبلاغت کے امام تصور کیے جاتے تھے، جن کا ساحرانہ گفتگو مشہور تھا اور مخاطب کو منٹوں میں موہ لیتا تھا۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ سرداران قریش کی ایک میٹنگ منعقد ہوئی، جس میں ابوجہل، ابولہب، عتبہ جیسے لوگ موجود تھے۔ مجلس میں

تجارت وزراعت کی باتیں مقصود نہیں تھیں، بلکہ بحث اور موضوع سخن آپ کی ذات اقدس تھی، سبھی کے چہرے پر اداسی اور پژمردگی چھائی ہوئی تھی، روزمرہ کی طرح آج بالکل کوئی فرحاں وشاداں نہیں تھا، سبھوں کی فکر صرف یہی تھی کہ محمدؐ اپنے آبا واجداد کی مخالفت سے کیسے باز آئے گا؟ کیسے وہ نئے دین اور اپنے مشن کو بند کرے گا؟ ہم نے سارے حربے اور طریقے اپنا لیے، ظلم وزیادتی کے سارے طریقے استعمال کر لئے مگر ہمیں ناکامی کے علاوہ کچھ نہیں ملا اور وہ آئے دن ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ جو ایک مرتبہ ان کا ہو جاتا ہے سدا ان کا ہی ہو جاتا ہے۔ آخر کون سا لائحۂ عمل تیار کیا جائے جس سے وہ باز آ جائیں۔ سربراہان قریش نے ایک تجویز ترتیب دی کہ انسان دولت وشہرت اور عورت کی لالچ میں بہت جلد پھنس جاتا ہے کیوں نہ محمد کو بھی دولت وشہرت، عزت وحکومت اور عورت کی لالچ دی جائے اوران سے کہا جائے کہ آپ کو کیا چاہیے؟ آپ جو چاہیں گے وہ مل کر رہے گا، لیکن نئے دین کی اشاعت وترویج سے آپ باز آ جایئے۔ سبھوں نے اس ترکیب کو سراہا اور کہا کہ یہ بہتر اور اچھا حربہ ہے، اس کو ضرور استعمال کیا جائے، اس سے محمد اپنے مشن سے ہٹ سکتے ہیں۔ بغاوت ومخالفت کے بجائے آبا واجداد کے دین ودھرم پر واپس آ سکتے ہیں، کیونکہ دولت، حکومت وسلطنت کی خواہش ہر کسی کو ہوا کرتی ہے اور یہ چیزیں آسانی سے ملتی بھی نہیں ہیں، مشورہ طے ہو گیا۔ عتبہ جوش اور خوشی میں کہا کہ میں اس کام کو انجام دوں گا، میں محمدؐ کے پاس جاؤں گا، اپنی ساحرانہ گفتگو سے ان کو مسحور کروں گا اور آبا واجداد کے دین پر واپس لاؤں گا، عتبہ کی اس پیش قدمی پر سارا مجمع جھوم اٹھا اور کہا کہ شاباش! تم سے بہتر اس کام کو کون انجام دے سکتا ہے؟ ہمیں امید اور یقین کامل ہے کہ تم اس کام کو بحسن وخوبی انجام دو گے، چنانچہ عتبہ خوش وخرم ہزاروں امید لئے آپ کے پاس پہنچا اور آپ سے سوال کر بیٹھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ ابھی آپ نے جواب بھی نہیں دیا تھا کہ خود بول پڑا کہ کیا آپ مکہ کی ریاست چاہتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں۔ کیا آپ دولت کی ڈھیر چاہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا:

نہیں۔ عتبہ یہ سن کر سٹپٹا گیا اور کہنے لگا: اے محمدؐ ہمیں آپ سے کافی ہمدردی ہے، اگر آپ یہ سب کچھ نہیں چاہتے ہیں تو آپ پر جنات کا اثر ہو گیا ہے، ہم اس کا علاج کرائیں گے اور مکمل اخراجات ہم برداشت کریں گے، آپؐ ان کی باتوں کو حوصلہ اور عزم کے ساتھ سنتے رہے، پھر آپؐ نے فرمایا: اے عتبہ! تم نے اپنی باتیں کہہ لیں اور ہم نے سن لیں۔ اگر اجازت ہو تو میں بھی ایک بات کہوں۔ عتبہ نے کہا کہ ضرور کہیے، آپ نے میٹھی زبان سے سورۂ حٰم کی تلاوت شروع فرما دی۔ تلاوت قرآن کی حلاوت پھر آپؐ کی زبان مبارک سے، کیا سماں ہوا ہو گا، زبان وقلم قاصر ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ عتبہ زمین پر ہاتھ لٹکائے تلاوت کو غور سے سننے لگا اور آپؐ سورۂ فصلت کی آیت تلاوت فرمانے لگے۔ ''**حم. تنزیل من الرحمٰن الرحیم. کتٰب فصلت آیته قرآناً عربیاً لقوم یعلمون. بشیرو نذیراً فاَعرض اکثرهم فهم لا یسمعون. وقالوقلوبنا فی اکنة مما تدعونا الیه و فی آذٰننا و قرومن بیننا و بینک حجاب فاعمل اننا عٰملون. قل انما انا بشر مثلکم یوحٰی الی انما الٰهکم الٰه واحد فاستقیموا الیه و استغفروه**''. (سوره حم: آیت. ۱ تا ۶). (ترجمہ) (یہ کلام رحمٰن ورحیم کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں کھول کر بیان کر دی گئی ہیں)۔

یعنی فصیح قرآن جو نافع ہے دانش مند لوگوں کے لیے انھیں بشارت دینے والا اور ڈرانے والا، لیکن ان میں اکثر نے روگردانی کی سو وہ سنتے ہی نہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر پردہ پڑا ہے، اس بات سے جس کی آپ دعوت دیتے ہیں اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ ہے۔ ہمارے اور آپ کے درمیان ایک پردہ ہے سو آپ اپنا کام کریں اور ہم اپنا کئے جائیں۔ آپ کہہ دیجئے میں بھی تم جیسا بشر ہوں، البتہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ بس تمہارا خدا ایک ہی ہے، اس کی طرف سیدھے ہاتھ باندھے رہو اور اسی سے مانگو۔ آپؐ تلاوت کرتے رہے اور عتبہ دونوں ہاتھ زمین پر لٹکائے غور سے سنتا رہا۔ اتنے میں آیت سجدہ آئی

اورآپؐ سجدہ میں پڑ گئے۔ عتبہ غور سے دیکھتے رہے، جب سید المرسلینؐ نے سجدہ سے سر اٹھایا تو آپؐ نے فرمایا: تم نے عتبہ اور میرا جواب سن لیا، اب تم جانو اور تمہارا کام۔ عتبہ حضور کی دنیا میں فاتح بن کر لوٹنے کے ارادے سے آئے تھے، مگر حقیقت میں مفتوح ہوکر جا رہے تھے۔ منھ لٹکائے، نگاہیں نیچی کئے ہوئے اور ایک شکست خوردہ انسان کی طرح واپس ہورہے ہیں۔ سربراہان قریش دیکھتے ہی کہنے لگے: خدا کی قسم! عتبہ کا چہرہ بدلا ہوا ہے، جو صورت لے کر گیا تھا وہ صورت نہیں ہے۔ ان لوگوں نے عتبہ سے پوچھا: کیا بات ہوئی؟ محمد کی طرف سے کیا جواب لے کرآئے؟ عتبہ نے کہا: خدا کی قسم محمدؐ سے آج جو کلام میں نے سنا اس سے پہلے اس طرح کا کلام کبھی نہیں سنا تھا، بخدا نہ تو یہ شعر ہے اور نہ ہی سحر و کہانی۔ اے سرداران قریش! میری بات مانو تو ان کے حال پر ان کو چھوڑ دو، مجھے مکمل اعتماد ہے کہ یہ کلام اپنا رنگ لاکر ہی رہے گا۔ فرض کرو اگر عرب غالب آگئے تو اپنے بھائی کے خلاف ہاتھ اٹھانے سے تم باز آجاؤ گے اور دوسرے اس سے نبٹ لیں گے، لیکن اگر وہ غالب آگیا تو اس کی بادشاہی تمہاری بادشاہی ہوگی، اس کی عزت تمہاری عزت ہوگی۔ عتبہ کی ان سیدھی اور سادہ باتوں پر عمل کرنے کے بجائے انھوں نے عتبہ کا مذاق اڑایا اور کہا کہ لو عتبہ پر بھی محمدؐ کا جادو چل گیا، غرض کہ قرآن کی انقلابی تاثیر نے عتبہ کو متاثر کرلیا اور عتبہ کو متاثر کرنا محض اس کی ہی ہار نہیں ہوئی، بلکہ سرداران قریش کی ہار تھی اور کوئی معمولی ہار نہیں بلکہ زبردست جھٹکا تھا۔ یقیناً قرآن میں ایسی مقناطیسی کیفیت ہے جو قلوب کو کھینچتی ہے، وہ نغمہ ہے جو روح کو سرشار کردیتا ہے، وہ راگ ہے جو اندر کی تاریکیوں کو منور کردیتا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ بہادر، بیباک، جوشیلہ، طاقت ور، دل و جسم کے اعتبار سے نہایت مضبوط آدمی قرآنی تاثیر کے سامنے سر تسلیم خم کردیتے ہیں، جبکہ حیات صحابہ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ عمر بن خطاب قریش کا نوجوان جوشیلا اور سبھوں سے ممتاز اور منفرد تھا، جس کی شجاعت و بہادری، زورآوری، شہسواری اور تیراندازی کے ڈنکے پورے مکہ میں بجتے

تھے، جو قریش کی مجلس میں اپنا فیصلہ سناتے تھے، جن کی زندگی کا مشن ضرور بالضرور حضورؐ کا سر قلم کرنا تھا اور قریش سے عہد و معاہدہ لے چکا تھا کہ محمدؐ کا سر کاٹ کر تمہارے سامنے رکھ دوں گا اور اسی ناپاک ارادے سے عمر بن خطاب نکلتے ہیں راستے میں بہن و بہنوئی کی حالت معلوم ہوتی ہے۔ غصہ سے لال پیلے بہن کے گھر پہنچے ہیں۔ دونوں کو مار مار کر لہولہان کردیتے ہیں۔ مار کر تھک گئے، مگر دونوں کی سرشت میں اسلام ایسا رچ بس چکا تھا کہ کسی طرح بھی توحید و رسالت کا خمار دل سے نہیں نکال سکے۔ عاجز آکر عمر بن خطاب نے حیرانگی سے کہا: اگر باز نہیں آتے تو وہ کلام سناؤ جو پڑھ رہے تھے۔ حضرت سعیدؓ نے سورۂ طٰہٰ کی تلاوت شروع فرمادی۔ ”**طٰہٰ . ماانزلنا علیک القراٰن لتشقیٰ (۲) الاتذکرۃ لمن یخشی. تنزیلا ممن خلق الارض والسمٰوات العلیٰ. الرحمٰن علی العرش الستویٰ. لہ مافی السمٰوات وما فی الارض وما بینھما و ما تحت الثریٰ. وان تجھر بالقول فانہ یعلم السرواخفی. اللہ لاالٰہ الا ھو لہ الاسماء الحسنیٰ**“. (سورہ طٰہٰ: آیت۔ ۱ تا ۸) (ترجمہ: ہم نے آپؐ پر قرآن اس لیے نہیں اتارا کہ آپ تکلیف اٹھائیں، یہ تو نصیحت ہے اس کے لیے جو ڈرتا ہے، نازل اس کی طرف سے ہوا ہے جس نے پیدا کیا زمین اور بلند آسمان کو، وہ خدائے رحمٰن عرش پر قائم ہے، اس کی ملکیت ہے جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہے اور ان دونوں کے درمیان میں ہے اور جو کچھ بھی زمین کے نیچے ہے، اور اگر تو پکار کر بات کہے تو وہ چپکے سے کہی ہوئی بات اور اس سے زیادہ چھپی ہوئی کو جانتا ہے، وہ اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اچھے اچھے نام اسی کے لئے ہیں)۔ اتنا ہی سننا تھا کہ حالت بدلنے لگی، پکے پھل کی طرح گود میں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے اور بچوں کی طرح رونے بلکنے لگے۔ غرض یہ کہ قرآن کی تاثیر نے پتھر دل کو موم بنادیا، سامری شقاوت کو دور کیا اور کفر کی بھٹی اتنی سرد ہوئی کہ قلب نور ایمانی سے منور ہوگیا اور سیدھے آستانۂ نبوت پر جاکر حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔ قرآن نے اپنی معجزانہ تاثیر سے عمر

بن خطاب جیسے بہادر اور جرأت کے کوہ گراں کو زیر کر دیا۔ حقیقت ہے کہ صحابہ کی جماعت کو قرآن عظیم ہی نے اپنی طرف کھینچا تھا، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ قرآن کریم کی کشش میں قرآن پیش کرنے والے کی بھی کشش قدرتی طور پر شامل تھی، کیونکہ ان کا کردار بھی تو آئینہ دار قرآن تھا۔ ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ قرآن اپنے اندر کس بلا کی تاثیر رکھتا ہے اور اس کو سنانے والا کس پائے کا انسان ہے، کس قدر عالی مرتبت اور مؤثر شخصیت ہے۔ عالی مرتبت کی شخصیت کا شہرہ سن کر ہی طفیل دوسی مکہ آیا تھا، وہ نئے دین کا تماشہ دیکھنے آیا تھا۔ روایت ہے کہ طفیل دوسی اپنے قبیلے کا سربراہ تھا اور شعروادب کا امام بھی، وہ دین اسلام کو دیکھنے کے لئے مکہ آیا تو اہل مکہ ان سے چمٹ گئے اور کہنے لگے: تم ہمارے شہر میں آئے ہو، تم ہمارے مہمان ہو اس لیے ہم تمہیں آگاہ کرتے ہیں کہ یہاں محمد نامی ایک شخص جو بڑا ساحر اور جادوگر ہے ان کے قریب مت جانا۔ انھوں نے ہمارا شیرازہ بکھیر دیا ہے۔ باپ کو بیٹے سے ماں کو بیٹی سے الگ کر رکھا ہے، ہر کسی کو اپنی جادوگری میں پھنسالیتا ہے، ہمیں خوف ہے کہ تم اور تمہاری قوم اس کے جھانسے میں نہ آجائے، اس لیے اس سے نہ ملنا، نہ ہی اس کے قریب جانا۔ چنانچہ طفیل دوسی قریش کی باتوں میں آگئے اور کانوں میں روئی ٹھونسے پھرتے تھے کہ کہیں مبادا محمد کی آواز کانوں میں پڑ جائے، لیکن یہ سچ ہے کہ

تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ

خدا کا کرنا یوں ہوا کہ ایک دن طفیل دوسی حرم شریف میں چلا گیا اور دیکھا کہ وہاں محمدؐ نماز پڑھ رہے ہیں اور قرآن کی تلاوت فرما رہے ہیں۔ قرآن کی آواز جوں ہی طفیل دوسی کے کانوں میں پڑی وہ وہیں کھڑے رہ گئے، دیر تک سنتے رہے۔ قرآن کے الفاظ کیا تھے بجلیاں تھیں جنھوں نے دل کے خرمن کو بھسم کر کے رکھ دیا اور آپؐ جب نماز پڑھ کر جانے لگے تو ساتھ ہو لئے اور آپ کی قیام گاہ تک آپؐ کے ساتھ گئے اور ہمیشہ ہمیش کے لیے دامن رسالت مآبؐ سے وابستہ ہو گئے اور بعد میں فرمایا: میں نے جو کلام آج سنا، ایسا کلام

آج تک نہیں سنا۔

اسی طرح حضرت عثمان ابن مظعون کا حال دیکھئے کہ کس طرح ان پر قرآن کا اثر ہوا ہے۔ عدل وانصاف، احسان واعانت اور امر ونہی پر مشتمل سورۂ آل عمران کی آیت کی تلاوت سنتے ہی قرآن کے گرویدہ ہو گئے اور قرآن کی انقلابی تاثیر میں مکمل طور پر شامل ہو گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ حسین اور صالح معاشرے کو جنم دینے کے لیے عدل وانصاف، احسان وقرابت داری اور ظلم وتشدد کی ممانعت اساسی اور بنیادی قدریں ہیں۔ خلاصہ یہی ہے کہ قرآن کی انقلابی تاثیر نے اپنے ماننے والے کو اس قدر مؤثر پیرائے اور حیرت انگیز انداز میں سمجھایا ہے کہ حضرت عثمانؓ ابن مظعون جیسے انسان بھی اس کی اثر انگیزی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور آج کے دور میں بھی ایسے واقعات آئے دن وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں کہ بڑے بڑے سائنس داں اور دنیاوی تعلیم یافتہ غیر مسلم افراد بھی قرآنی تعلیمات پر ایمان لا رہے ہیں اور اپنی زندگی میں ایک نیا انقلاب پیدا کر رہے ہیں۔ سوچنے سمجھنے والا دل ودماغ آج بھی اس کا اثر قبول کر رہا ہے، لیکن صد افسوس امت مسلمہ پر، جن کو نعمت ملی، مگر قدر نہ کی اور ناقدری کی اور کر رہے ہیں۔ موجودہ دور میں مسلمان کا تعلق قرآن سے افسوس کے قابل ہے۔ طاقتوں میں سجانا، تعویذ بنا کر بانہوں اور سینے پر لٹکانا، حریر وریشم اور رنگ برنگ کے جزدانوں میں رکھنا، ہاتھوں میں لے کر قسمیں کھانا، جلسوں میں لوگوں کو جمع کرنے کے لیے پڑھنا قرآن کا مقدر بن چکا ہے، جبکہ مسلمان کی زندگی کو قرآن کے بغیر ناقص اور ادھورا بتایا ہے۔ اللہ رب العزت ہمیں قرآنی حقوق پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

☆☆

قرآن کریم اور تخلیقات عالم

ایک مطالعہ

● پروفیسر شفیق احمد خان ندوی

قرآن کریم کتاب ہدایت ہے۔ تقویٰ پر مبنی صاف ستھری زندگی کے ذریعہ ازلی و ابدی کامیابی کی راہ دکھانا اس کا مقصود ہے۔ اس کے باوجود چونکہ وہ علیم وخبیر رب کائنات کا کلام ہے، اس لیے اس میں کون ومکان کے حقائق سے ٹکرانے والی کوئی بھی بات نہیں۔ اخروی صداقتوں کی وضاحت کرتے ہوئے کلام الٰہی میں بہت سے سائنسی اشارات بھی ضرور موجود ہیں۔ سائنسی تحقیقات بھی انھیں کی تائید وتصدیق کرتی ہیں، بطور نمونہ چند مثالیں قابل ذکر ہیں۔ قرآن کریم نے فرمایا: ''أولم یر الذین کفروا ان السموات والارض کانتا رتقا ففتقنٰھما''. (الانبیاء:30) (کیا منکرین نے غور نہیں کیا کہ آسمانوں اور زمین کو ایک دوسرے سے منسلک رکھا گیا تھا، بعد میں ان کو ہم نے الگ الگ کیا)۔ مفسرین کا خیال ہے کہ آسمان کو بارش کے ذریعہ اور زمین کو نباتات کے ذریعہ الگ کیا گیا۔ اسی آیت میں آگے فرمان الٰہی ہے کہ ہم نے پانی سے ہر جاندار کو بنایا، کیا یہ بات ان کو ہم پر ایمان لانے کے لیے کافی نہیں؟ ''وجعلنا من الماء کل شیء حی أفلا یؤمنون''. (سورۃ الانبیاء: آیت. ۳۰) سائنس نے اس آیت قرآن کی مسلسل تصدیق کی، کون نہیں جانتا کہ پانی ہی زندگی کی ماں ہے اور زمین کا تین چوتھائی حصہ پانی سے عبارت ہے۔ طبقات الارض (جیولوجی) کے ماہرین کہتے ہیں کہ زمین بھی پہلے سورج کا

ایک حصہ تھی، جو بعد میں الگ ہوئی۔

قرآن نے کہا کہ سورج چاند ستارے اور خود زمین ایک دوسرے کے گرد مخصوص انداز پر اپنے محور اور مدار پر گردش کر رہے ہیں اور گویا اپنی اپنی سطح پر تیر رہے ہیں اور ایک دوسرے سے ٹکراتے نہیں۔

''وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّھَا ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ. وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ کَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ. لَا الشَّمْسُ یَنْبَغِیْ لَھَا أَن تُدْرِکَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّھَارَ وَکُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَسْبَحُوْنَ''. (یٰسین: ۳۸-۴۰)

قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اس طرح پیدا کیا کہ دن اور رات دونوں گیند جیسی گولائی کی شکل میں ایک دوسرے پر لپیٹتے رہتے ہیں۔

''خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ یُکَوِّرُ اللَّیْلَ عَلَی النَّھَارِ وَیُکَوِّرُ النَّھَارَ عَلَی اللَّیْلِ''. (الزمر: ۵)

یہ وہ آیت ہے جو زمین کے گول ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ سورۂ نازعات میں ''والارض بعد ذلک دحاھا'' (سورہ نازیات: آیت۔۳۰) کی تفسیر کرتے ہوئے امام فخر الدین رازیؒ نے بہت پہلے لکھ دیا تھا کہ زمین گیند کی طرح گول تھی، بعد میں اللہ نے اس کو اسباب زندگی سے آراستہ کر کے کچھ اس طرح قابل رہائش بنایا کہ اس کی گولائی محسوس نہیں ہوتی۔ ''دحا یدحو دحوا'' (حسب ضرورت ہموار کرنے) کا لغوی مفہوم عام بسط یبسط بسطاً (بچھانے) کے مفہوم سے اسی بنا پر مختلف ہے۔ (سورۂ سبا، آیت 3) میں ہے کہ اللہ سے کوئی بھی چیز چھپی نہیں، چاہے وہ زمین اور آسمانوں کے اندر کوئی ذرہ (Atom) ہو یا ایٹم سے بھی کچھ چھوٹی یا بڑی چیز ہی کیوں نہ ہو۔

''لا یعرف عنه مثقال ذره فی السموات ولا فی الارض ولا اصغر من

ذلک ولا اکبر الا فی کتاب مبین". (سورہ سبا: آیت۔۳) اس آیت نے ایٹم سے کمتر اور چھوٹی چیز ہونے کی طرف اشارہ کیا جو بعد میں ثابت ہوا کہ ایٹم کے ناقابل تقسیم ہونے کا نظریہ غلط تھا۔ اب تو ذرہ ایٹم کے بھی پروٹون الکٹرون نیوٹرون کی شکل میں چھوٹے سے چھوٹے اجزا مسلمہ حقائق کے طور پر تسلیم کیے جارہے ہیں جن کی طرف قرآن نے پہلے ہی اشارہ کردیا تھا۔

کلام الٰہی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص ہدایت سے سرفراز ہوتا ہے اس کو شرح صدر (یعنی سکون واطمینان) حاصل ہوتا ہے اور گمراہی میں رہنے والے شخص کے سینے میں ایسی گھٹن پیدا ہوجاتی ہے جیسی اس شخص کے سینے میں سانس لیتے وقت گھٹن محسوس ہوتی ہے جو آسمان میں بمشکل تمام چڑھ رہا ہو۔

"**فَمَن يُرِدِ اللّٰهُ أَن يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلإِسْلاَمِ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقاً حَرَجاً كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِيْ السَّمَاء**". (**سورۃ الانعام:۱۲۵**)

اب یہ بتائیے کہ پندرہ سو سال پہلے صاحب وحی الٰہی کو کس نے بتادیا کہ جدید سائنس کے مطابق آکسیجن کی کمی کے باعث آسمان کے حدود میں گھٹن پیدا ہوتی ہے۔ کیا یہ کلام الٰہی کی صداقت پر شہادت نہیں؟

قرآن کریم میں آیا ہے کہ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو تمام دنیاؤں کا پالنہار ہے۔ (**الحمد لله رب العالمين**) اس کا مطلب ہے کہ عالم صرف ایک ہی نہیں، بلکہ بہت سے عالم اور دنیا ہیں۔ ایک دوسری جگہ فرمایا: اللہ کی تعریف وستائش اور عبادت میں ساتوں آسمان اور زمین اور ان کے اندر کے سارے جاندار مصروف ہیں: "**تسبح له السمٰوٰت السبع والارض ومن فيهن**". (**سورۃ الاسراء: آیت نمبر: 44**) اس کا مطلب کیا یہ نہیں ہے کہ اس زمین کے علاوہ آسمانوں میں بھی دیگر جانداروں پر مبنی دنیائیں موجود ہیں۔ سائنس دانوں نے اب چودہ سو برس بعد کچھ پیش رفت اور ابتدائی انکشافات کرنے

شروع کیے ہیں۔ قرآن نے چرند پرند اور دیگر حیوانات کے الگ الگ نظام ہائے زندگی کی طرف بھی اشارات کیے ہیں اور چیونٹی، شہد کی مکھی اور مکڑی کے انتظام و انصرام اور فہم و فراست پر متعدد مقامات پر روشنی ڈالی ہے۔ سورۂ انعام آیت 38/6 میں کہا گیا ہے کہ ان جانداروں کے اپنے الگ الگ نظام ہائے زندگی ہیں اور وہ تمہاری ہی طرح کی امتیں ہیں۔ "**وما من دابة في الارض ولا طائر يطير بجناحيه إلا امم امثالكم**" (یہ وہ حقائق تھے جن کی طرف قرآن نے بہت پہلے اشارے کردیے تھے اور اب بایولوجی اور زولوجی کے ماہرین حیوانات کی خلقت اور حکمت پر کتابیں لکھے جارہے ہیں۔

قرآن کریم نے پہلے ہی کہا تھا کہ آسمان وزمین کی تخلیق اور رات ودن کے تغیر وتبدل اور خود انسانوں اور حیوانوں کے اپنے وجود میں خالق کائنات تک پہنچنے کے دلائل ہیں۔ آیات انفس وآفاق پر جو بھی جتنا زیادہ غور کرے گا اتنا ہی بڑا خداشناس ہوگا۔

فرمان الٰہی ہے:

"**ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف اللیل والنهار لآیات لأولی الالباب**". (**سورہ آل عمران: آیت ۱۹۰**)

دوسری جگہ ہے: "**وفی انفسکم أفلا تبصرون**". (**سورہ فاطر: آیت.۲۸**)

تیسری جگہ ہے کہ اللہ سے زیادہ ڈرنے والے سائنٹسٹ ہی ہوتے ہیں: "**انما یخشی الله من عباده العلماء**". (**سورہ فاطر: آیت نمبر: 28**).

پیڑ پودوں اور پھل پھول کے نظام میں اللہ نے ازدواجی تعلقات کی موجودگی کا اشارہ دیا اور ان پر غور کرنے کی تلقین کی: "**أولم يروا الى الارض كم انبتنا فيها من كل زوج كريم. ان في ذلك لآية وماكان اكثرهم مؤمنين**". (**الشعراء:۸**)

بعد میں پودوں کے فرٹیلائزیشن کے نظام کو انسان نے واضح کیا جو وہ خود کرنہیں سکتا تھا، کیا ان تمام باتوں میں وجود کی گواہی نہیں؟

تخلیق انسانی اوراس کے مراحل کے سلسلے میں ارشادالٰہی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری ماؤں کے پیٹ میں تین تین تاریکیوں کے اندرایک کے بعدایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔ان تین تاریکیوں سے مرادشکم مادر، رحم مادراور وہ جھلی یا پردہ ہے جس کے اندر بچہ سیال مادہ میں نشوونما پاتا ہے۔

"یخلقکم فی بطون امھٰتکم خلقا من بعد خلق فی ظلمٰت ثلاث".

(الزمر:6)

اللہ تعالیٰ رحم مادر میں جنین کومختلف اطوار سے گزارتا ہے، پہلے نطفہ، پھر علقہ، پھر مضغہ، پھر ہڈیوں کا ڈھانچہ جس کے اوپر گوشت کا لباس ہوتا ہے۔ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعدانسان کامل تیار ہوتا ہے۔قرآن کریم نے اس حقیقت کو بہت تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا،صرف یہی نہیں، بلکہ ہر ہر مرحلے کوایک خاص نام واصطلاح سے یوں فرمایا:

"مالکم لا ترجون للہ وقاراء وقد خلقکم اطوارا". (نوح: 13-14).

(تم کوکیا ہوگیا کہ تم اللہ کے لیے کسی وقار و برتری کونہیں مانتے، حالانکہ تم کواس نے مختلف مراحل میں پیدا کیا ہے)۔

سورۂ مومنون میں اللہ تعالیٰ ارشادفرماتا ہے:

"وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِيْنٍ o ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ o ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَاماً فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْماً ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقاً آخَرَ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ".

(مومنون: ۱۲-۱۴)

''ہم نے انسان کومٹی کے ست سے بنایا، پھراسے ایک مضبوط جگہ نطفہ میں تبدیل

کردیا، پھراس نطفہ کوعلقہ (خون کے تھکے) کی شکل دی، پھراس علقہ کومضغہ (لوتھڑا) بنایا، پھراس مضغے کوعظام (ہڈیوں) میں تبدیل کردیا، پھران عظام پر گوشت چڑھایا، پھراسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا۔ بڑا ہی بابرکت ہے اللہ سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔''

قرآن کریم میں مذکورہ تخلیق انسانی کے ان مراحل کوسننے کے بعد بڑے بڑے اطبااور سائنس داں دین حق کی صداقت کے معترف ہوئے بغیر نہ رہےاورقبولیت اسلام سے بھی مشرف ہوئے۔

☆☆

'الغرانیق العلیٰ'۔ حقیقت یا افسانہ

(مستشرقین کے اعتراضات کا جائزہ)

● ڈاکٹر مفتی محمد شمیم اختر قاسمی

کفار مکہ اپنے معروف بتوں (لات، مناۃ، عزیٰ) کی عبادت کرنے کے ساتھ ساتھ خانہ کعبہ کا طواف کرتے تو ان کے نام کا بطور تلبیہ ورد کرتے تھے، تاکہ تقرب الی اللہ حاصل ہو، جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد ہی یہی تھا کہ اللہ کے بندوں کو شرک وضلالت اور فسق وفجور سے نکال کر صراط مستقیم پر کھڑا کریں اور ان کا رشتہ وحدہ لاشریک سے مستحکم ومضبوط کریں۔ کفار مکہ کے عقائد واعمال کے مفاسد اور معبودان باطل کی حد درجہ اہمیت کے پس منظر میں حضورؐ کے مکی دور کا جائزہ لیتے ہیں تو بعض کم زور روایتوں کی روشنی میں ایک ناقابل تسلیم واقعہ 'الغرانیق العلیٰ' سامنے آتا ہے، جس پر اعتماد کرلیا جائے تو حضور کی بعثت اور کار نبوت بے معنی ہوکر رہ جاتا ہے اور اسلام کی مضبوط ومستحکم بنیاد یک لخت مسمار ومنہدم ہوجاتی ہے۔ درج ذیل سطور میں اسی واقعہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اس واقعہ کی ناقابل تسلیم روایت:

قدیم محدثین، مفسرین اور سیرت نگاروں میں ابن جریر طبری، ابن سعد، موسیٰ بن عقبہ، ابن اسحاق، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، بزار، مردویہ اور طبرانی وغیرہ نے اس واقعہ کو جس انداز میں بیان کیا ہے، اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ سے ایک موقع پر لغزش ہوئی تھی۔ ان

کے مطابق چونکہ حضورؐ کی خواہش تھی کہ کوئی ایسی صورت بن جائے جس سے مخالفین کی مخالفت ختم ہوجائے اور وہ لوگ دین میں داخل ہوجائیں۔ چنانچہ اسی تمنا میں تھے کہ ایک دن ''سورہ نجم'' کی تلاوت کے دوران شیطان نے آپ کی زبان مبارک سے ''تلک الغرانیق العلیٰ'' الفاظ نکلوادیئے۔ تاریخ طبری میں اس واقعہ کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے:

''محمد بن کعب القرظی سے مروی ہے کہ جب رسولؐ نے دیکھا کہ ان کی قوم نے ان سے اعراض کیا ہے اور صرف اس حکم کی وجہ سے جو اللہ نے دیا تھا آپ کی قوم آپ سے علیٰحدہ ہوگئی ہے۔ آپ کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسا حکم نازل فرماتا جس سے آپ کے اور ان کے تعلقات پھر قائم ہوجاتے۔ آپ اپنی قوم سے محبت اور ان کی فلاح کے خیال سے یہ چاہتے تھے کہ ان کے معاملے میں آپ نے جو شدت برتی ہے، اس میں نرمی کردیں۔ یہ خیال آپ کے دل میں آیا اور آپ نے اس کی آرزو اور تمنا کی۔ اللہ عزوجل نے یہ سورۃ نازل فرمائی ''والنجم إذاهوا'' الخ۔ جب آپ اللہ کے قول'' افرأيتم الات والعزى ومناة الثالثة أخرى'' پر آئے تو شیطان نے آپ کی اس خواہش کی وجہ سے جو آپ چاہتے تھے کہ اپنی قوم کو خوش کریں آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری کردیئے'' تلك الغرانيق العلىٰ و إن شفاعتهن لترتجى''. یہ الفاظ سن کر قریش بہت خوش ہوئے کہ محمدؐ نے ان تعریفی الفاظ میں ہمارے معبودوں کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے خوشی میں نعرہ لگایا..... جب اس سورہ میں سجدہ کا مقام آیا اور سورۃ ختم ہوگئی تو رسولؐ نے سجدہ کیا اور تمام مسلمانوں نے اپنے نبی کی اتباع، حکم اور وحی کی تصدیق میں آپ کے ساتھ سجدہ کیا اور چونکہ مشرکین نے رسولؐ کی زبان سے اپنے معبودوں کی تعریف سنی تھی۔ اس لیے مشرکین، قریش اور دوسرے لوگوں نے بھی سجدہ کیا۔ اس طرح ساری مسجد میں جس قدر مومن یا کافر تھے سب سجدہ میں گر گئے۔ دوسرے دن جبرئیل حضورؐ کے پاس تشریف لائے اور اس سورۃ کو پڑھنے کے لیے کہا۔ جبرئیل نے سورۃ سننے کے بعد کہا کہ یہ دونوں کلمے

تو میں نے نہیں سکھائے۔ اس پر رسولؐ نے کہا کہ جو اللہ نے مجھ سے کہلوایا اس کے علاوہ میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی متذکرہ آیت نازل فرمائی جس میں آپ کی لغزش پر تنبیہ کی گئی۔''

واقعہ غرانیق سے مستشرقین کی دلچسپی:

اس طرح کی روایت کو دلیل بنا کر مستشرقین نے اس واقعہ میں بڑی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے مطابق نبیؐ جب چاہتے دین میں تحریف کر دیتے اور جیسے چاہتے قرآنی آیات کو اپنے منشا کے مطابق ڈھال کر لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے تھے۔ جیسا کہ 'سر ولیم میور' کے حوالے سے 'کلائن' لکھتا ہے: ''کسی آیت کی تنسیخ کا ایک نہایت اہم واقعہ 'وہ دیویاں معزز ہیں اور ان کی شفاعت مقبول ہے' والی آیت کی تنسیخ ہے، جسے کچھ عرصہ تک محمدؐ قرآن کے جزو کے طور پر تلاوت کرتے رہے ہیں۔''

سر ولیم کے بقول مذکورہ الحاقی جملے من جانب اللہ تھے، جس کی ایک عرصے تک حضورؐ تلاوت کرتے رہے، مگر انہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہ ملی تو بعد میں انہیں منسوخ کر دیا گیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ناسخ آیت کون سی ہے، ایک معمہ بنا ہوا ہے۔

'منٹگمری واٹ' اسی واہیات کو قدرے تفصیل سے اس طرح بیان کرتا ہے: ''اس سلسلے میں ہمیں شیطانی آیت کی داستان کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ اس قصہ کو بنیادی طور پر درست ہونا چاہئے، کیونکہ کوئی بھی مسلمان اسے محمدؐ کے بارے میں گھڑنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا اور بلاشبہ اس کی تصدیق قرآن میں موجود ہے۔ قصہ یہ ہے کہ غالباً ۶۱۵ء یعنی ہجرت سے سات سال پہلے ان کے پاس وحی آئی کہ یہ بڑی پہنچ والیاں ہیں اور ان سے شفاعت کی امید ہے۔ محمدؐ نے فوراً اس وحی کو لوگوں تک پہنچا دیا اور ان کی عبادت کی اجازت نے مکہ کے باسیوں کو محمدؐ کے ساتھ عبادت میں شریک ہونے پر مائل کر دیا۔ بعد میں بہر حال محمدؐ کو یہ

احساس ہوا کہ یہ آیات درست نہیں ہو سکتیں اور پھر ان پر صحیح تسلسل میں نازل ہوئیں۔''

'واٹ' بھی اس واقعہ کے متعلق شک میں مبتلا ہے۔ اس کے مطابق اس سلسلے میں وحی تو نازل ہوئی اور حضورؐ نے پڑھ کر لوگوں کو سنایا بھی، مگر محمدؐ کو بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ تو غلط ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اسے خارج از قرآن کر دیا۔ پھر وہ یہ بھی لکھتا ہے: ''محمدؐ مکہ کے سرکردہ لوگوں کے ساتھ کسی مصالحت کی کوشش کر رہے تھے، ان کا مدخولہ الفاظ کی غلطی کا احساس دراصل اس بات کا احساس تھا کہ مصالحت ناممکن تھی۔''

گویا کہ ان کے نزدیک حضورؐ اپنے مطلوبہ مقاصد (وہ کیا ہے اسے بھی نہیں معلوم) میں ناکام ہوئے، تب ہی ان بتوں کی مخالفت کی، ورنہ صورت حال دوسری ہوتی۔

'گریونے باؤم' واقعہ غرانیق کے متعلق لکھتا ہے: ''کہا جاتا ہے کہ انہوں (محمدؐ) نے تین عظیم دیویوں کو اللہ کی بیٹیاں مان لیا تھا۔ یہ لات (جس کی تعظیم طائف میں کی جاتی تھی) عزی (جس کی عبادت مکے کے قریب واقع ہکلہ میں کی جاتی تھی) اور منات (جس کا مندر قدید میں تھا، جو مکے اور مدینے کے درمیان واقع ہے) تھیں، اب وہ اس موقف سے پھر گئے اور انہوں نے مومنوں کے اور ان لوگوں کے درمیان جو اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے، واضح امتیاز قائم کیا۔''

'لین پول' لکھتا ہے: ''سارا مجمع اس مصالحت سے خوش ہو کر خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔ سارے شہر نے اس مشترک مذہب کو قبول کر لیا، لیکن صحرا کا یہ رویا دیکھنے ولا، ایسا فرد نہ تھا کہ کسی جھوٹ بات پر توقف کرتا۔ مکے کا سارا شہر بھی اس کی نذر کر دیا جاتا تو وہ اپنی اندرونی صداقت کو جھٹلاتے رہنے پر راضی نہ ہوتا۔ اس نے برسر عام اقرار کیا کہ اس سے لغزش ہو گئی تھی، اسے شیطان نے ورغلایا تھا، اس نے کھلم کھلا اپنے الفاظ واپس لیے اور کہا کہ جہاں تک ان مورتیوں کا تعلق ہے وہ محض نام ہیں، جنہیں ان کے آباؤ اجداد نے وضع کر لیا ہے۔''

مصالحت کس بات پر ہوئی ؟:

کفار مکہ سے حضورؐ نے مصالحت کس بات پر کی، کیا اسلام میں کفریہ اوامر کو داخل کر دیا گیا تھا؟ کفر اور اسلام کا اجتماع تو کسی بھی صورت میں ہو ہی نہیں سکتا۔ نبیؐ کی بعثت کفر کو مٹانے اور اسلام کو تمام ادیان پر غالب کرنے کے لیے ہوئی تھی۔ جس کی تائید قرآن کریم کی درج ذیل آیت سے ہوتی ہے:

"هُوَ الَّذِیْ أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهُ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُون". سورہ: الصف: ۹)

(وہی ہے جس نے اپنے رسولوں کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے، تا کہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے، خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار گزرے۔)

اگر حضورؐ کی مصالحت صرف اس بات پر ہوئی تھی کہ انہوں نے بتوں کی اہمیت کو تسلیم کر لیا تھا تو اس سے اسلام کو کیا فائدہ پہنچنے والا تھا۔ وہ لوگ تو صرف تھوڑی دیر کے لیے سجدہ ریز ہوئے تھے نہ کہ برسر عام حضورؐ کی نبوت و رسالت کا اقرار کیا تھا، جبکہ اس سے قبل سرداران قریش بڑی بڑی پیش کش کر چکے تھے جو بظاہر اس مصالحت سے زیادہ مفید اور اثر انداز تھی۔ روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، اسود بن عبدالمطلب اور امیہ بن خلف وغیرہ نے آپ سے یہ بھی کہا تھا کہ آپ ہمارے بتوں کی مذمت سے باز آجائیں اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو ہمارے اور آپ کے درمیان فیصلہ کی ایک یہ صورت ہے کہ ایک سال آپ ہمارے بتوں کی پرستش کریں اور ایک سال ہم آپ کے خدا کی عبادت اور بندگی کریں گے، جس پر اللہ نے سورہ کافرون نازل کی اور اس کے ذریعہ آپ کو لغو مصالحت کرنے سے منع کیا گیا:

"قُلْ یَا أَیُّهَا الْكَافِرُونَ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدتُّمْ وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ لَكُمْ دِینُكُمْ وَلِیَ دِیْنِ. (الکافرون: ۱-۶)

(کہہ دو کہ اے کافرو! میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو، نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جن کی عبادت میں کرتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔)

ابن جریر طبری نے یہ بھی لکھا ہے کہ سورہ کافرون کے علاوہ اس موقع سے سورہ زمر کی آیات ۶۴-۶۶ بھی نازل ہوئیں۔ اس میں نبیؐ کو اپنے قول و عمل پر ثابت قدم رہنے کا حکم دیا گیا ہے اور کافروں سے کہا گیا کہ تم کفر و شرک سے باز نہ آؤ گے تو تمہیں برے انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔

ہجرت حبشہ کب ہوئی ؟:

اس واقعہ کا تعلق ہجرت حبشہ اولیٰ سے بھی جوڑا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جب حضورؐ کی اس مصالحت کی خبر حبشہ کے مہاجرین کو ہوئی تو وہ اپنے وطن لوٹ کر آ گئے۔ مکہ کے قریب پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ یہاں کی حالت تو پہلے سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہو چکی ہے۔ اس لیے مراجعت کرنے والوں میں سے کچھ لوگ واپس حبشہ لوٹ گئے، جبکہ آثار و قرائن سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ "سورہ نجم" کا نزول اس سے قبل ہو چکا تھا۔ نیز اگر وطن واپسی کا واقعہ پیش آیا تو اس کا سبب بھی کچھ دوسرا ہی تھا، نہ کہ مذکورہ بے بنیاد واقعہ۔

مشہور روایت کے مطابق پہلی ہجرت حبشہ ۵ نبوی ماہ رمضان میں ہوئی۔ مہاجرین یہاں اطمینان سے مراسم دین ادا کر رہے تھے۔ یکا یک انہیں خبر ملی کہ کفار مکہ اسلام لے آئے ہیں، اس لیے مہاجرین خبر کی تصدیق کیے بغیر اپنے وطن لوٹ آئے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک مصالحت جو تھوڑی دیر کے لیے ہوئی اور پھر اس کی تردید اسی وقت ہو جانے کے بعد حبشہ میں یہ خبر پہنچی کہ سارا مکہ مسلمان ہو گیا اور وہ لوگ واقعہ کی چھان بین کیے بغیر اپنے وطن لوٹ آئے۔

صحیح بات یہ ہے کہ مہاجرین حبشہ کو یہ خبر ملی ہوگی کہ اسلام کے ایک بڑے دشمن جن کی طاقت کے سامنے کفار مکہ بھی سہم جاتے تھے، حضرت عمر فاروقؓ مشرف بہ اسلام ہوگئے ہیں اور ان کے اسلام قبول کرنے سے مکہ کی صورت حال بدل گئی ہے۔ خوف و ہراس اور ایذا رسانی کے بادل چھٹ گئے ہیں۔ اب مسلمان اعلانیہ اپنے دین پر عمل کرتے اور خانہ کعبہ میں عبادت کرتے ہیں۔ معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت عمر فاروق کے قبول اسلام کے واقعہ کی تاریخ میں مختلف اقوال ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے ۵ نبوی میں اسلام قبول کیا تھا۔ جو ہجرت حبشہ کا سال ہے۔ ابن ہشام نے اپنی سیرت میں حضرت عمر فاروقؓ کے قبول اسلام کے واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمر نے ایک شخص کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ جا کر پورے مکہ میں مشہور کر دے کہ عمر نے محمد کا دین اختیار کر لیا ہے اور مسلمان ہو گیا ہے۔ چنانچہ آناً فاناً میں حضرت عمر کے قبول اسلام کی خبر پورے مکہ میں پھیل گئی۔ یہ خبر صرف مکہ تک ہی محدود نہ رہی ہوگی، بلکہ دور تک پہنچی ہوگی۔

سورہ نجم کب نازل ہوئی؟:

یہ درست ہے کہ نبیؐ نے 'سورۃ النجم' کی تلاوت کفار کے مجمع عام میں کی تھی، اس سورۃ کی ہیبت لوگوں پر اس قدر طاری ہوئی کہ اپنے ہوش کھو بیٹھے اور اسی عالم میں وہ لوگ نبیؐ کے ساتھ سجدہ ریز ہوگئے، جو بعید از قیاس نہیں۔ کیونکہ ایسا واقعہ کئی مرتبہ پیش آچکا تھا کہ جب قرآن کی تلاوت حضورؐ کرتے تو عتاب الٰہی کے نزول کے خوف سے وہ لوگ اللہ کے رسول سے درخواست کرتے کہ اب بس کیجئے۔ صحیح حدیث سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اس وقت بتوں کی الوہیت کے تسلیم کیے جانے کا کوئی واقعہ ہی پیش نہ آیا تھا۔ امام بخاری نے جو تفصیلات اس واقعہ کے متعلق بیان کی ہے، اس میں بس اتنی بات ہے کہ جب ''سورہ نجم'' نازل ہوئی تو لوگوں کے مجمع میں آپؐ نے اس کی تلاوت کی اور آخر میں سجدہ کیا تو آپ کے ساتھ

سارے مسلمان، مشرکین اور جن وانس سجدہ ریز ہوگئے۔ کتب سیرت میں ان لوگوں کے نام کی صراحت ملتی ہے، جنہوں نے اس وقت سجدہ کیا تھا یا سجدہ کی ہیئت بنائی تھی۔

تحقیق طلب امر یہ ہے کہ یہ سورۃ کب نازل ہوئی، ہجرت حبشہ کے وقت یا اس سے پہلے یا اس کے بعد۔ ابن سعد اور ابن جریر طبری وغیرہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ ہجرت حبشہ کے بعد نازل ہوئی۔ اس کی تائید میں سورہ بنی اسرائیل اور ''سورہ حج'' کی مختلف آیات کو پیش کیا جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان کا تعلق اس سے ہے کہ نہیں۔ اس کے زمانہ نزول کے تعین سے بتوں کی اہمیت کو تسلیم کیے جانے کا واقعہ بے اصل ہو جاتا ہے اور اس طرح معترضین کی باتیں بے وزن ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ جدید تحقیقات کی روشنی میں اس سورہ کے زمانہ نزول کا صحیح تعین کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی لکھتے ہیں:

''ولیم میور اور نولدیکی نے اس کا نزول مکی دور کے چوتھے حصے کے اواخر میں قیاس کیا ہے۔ (علامہ عنایت اللہ مشرقی نے تکملہ، جلد اول، ص: ۶۷ پر نولدیکی کے حوالے سے سورۃ النجم کی ترتیب نزولی اٹھائیسویں اور وقت نزول یکم سنہ نبی سے چار سنہ نبوی کے درمیان بیان کیا ہے) ان کے نزدیک یہ دور ۶ سے ۱۰ نبوی کا ہے۔ علمائے ازہر کے مطابق یہ سورۃ ترتیب نزولی کے اعتبار سے تیئیسویں ہے۔ (القرآن: مکتبہ الجمہوریہ العربیہ، ۱۹۷۲) جب کہ سورہ مریم چوالیسویں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ دربار حبشہ میں حضرت جعفر بن ابی طالب نے ''سورہ مریم'' کی آیت تلاوت فرمائی تھی، لہٰذا یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہجرت حبشہ تک چوالیس سورتیں نازل ہو چکی تھیں اور تیئیسویں ''سورۃ النجم'' ہجرت حبشہ سے کئی برس پہلے اتر چکی تھی۔ چھ سال میں چوالیس سورتوں کا اوسط سات سورتیں سالانہ بنتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سورۃ النجم نبوت کے تیسرے یا چوتھے سال اتری ہوگی۔ اب یہ بات قرین قیاس نہیں کہ وہ سورہ جو تیسرے یا چھوتھے سال نازل ہوئی ہو، دسویں سال تک اس کی تلاوت نہ کی گئی ہو، یا اس میں دسویں سال ترمیم کی ضرورت محسوس کی گئی ہو، قرآن اس

لیے اترتا تھا کہ اسے لوگوں کو سنایا جائے، لہٰذا حضورؐ نے اس سورۃ کی تلاوت اس کے نزول کے بعد بلا تاخیر کی ہوگی۔ اس اعتبار سے اس کی تلاوت ۴ نبوی میں ہی قرین قیاس ہے۔ یہی وہ دور ہے جب آپ نے اعلانیہ تبلیغ توحید فرمائی اور توحید کے معنی ہی بت پرستی اور شرک سے اجتناب کے ہیں۔ اسلام کی ابتدا ہی کلمہ توحید سے ہوئی ہے۔ اس کلمہ کا جزو اول ہی 'لا اِلٰہَ' ہے جس کا مفہوم اور مقصود ہی بتوں اور ذوات خلق غیر اللہ کی نفی ہے۔ اس تنزیہہ کے بعد ذات اللہ کا اقرار ہے، لہٰذا تبلیغ کی ابتدا ہی غیر اللہ کی الوہیت سے انکار ہے۔''

اگر بالفرض یہ سورۃ ہجرت حبشہ کے زمانہ ہی میں نازل ہوئی تو اس من گھڑت واقعہ کا امکان نہیں جو حضورؐ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ کفار و مشرکین نے سجدہ کیا تھا، اس کے فوراً بعد اس کی تردید کرنے لگے۔ ان کے ایسا کرنے سے اسلام پر کیا فرق پڑ جاتا۔ فرق تو اس وقت پڑتا کہ وہ اللہ پر ایمان لے آتے اور نبیؐ کی رسالت کو تسلیم کر لیتے اور اس پر قائم رہتے۔

کیا سورہ بنی اسرائیل اور سورہ حج کی آیتوں سے واقعہ کی تائید ہوتی ہے؟:

معاندین اسلام اس واقعہ کے وقوع اور اس کے ثبوت کے لیے کہتے ہیں کہ حضور سے لغزش تو ضرور ہوئی تھی۔ مگر اللہ تبارک وتعالیٰ نے دوسری آیتوں کے ذریعہ اس کی تلافی کر دی۔ اس لیے بتوں کی اہمیت کو تسلیم کی جانے والی آیات کو قرآن سے خارج کر دیا گیا۔ ان لوگوں نے سورۃ بنی اسرائیل اور سورہ حج کی بعض آیتوں کو اسی واقعہ سے جوڑا ہے۔ ''سورۂ بنی اسرائیل'' میں فرمایا گیا ہے:

''وَإِن كَادُواْ لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِيٓ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ وَإِذاً لَّاتَّخَذُوكَ خَلِيلاً ، وَلَوْلاَ أَن ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدتَّ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئاً قَلِيلا ، إِذاً لَّأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيَاتِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لاَ تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرا.'' (بنی اسرائیل ۷۳-۷۵)

(اے نبیؐ ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر نہ چھوڑی کہ تمہیں فتنے میں ڈال کر اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے، تاکہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑو۔ اگر تم ایسا کرتے تو وہ ضرور تمہیں اپنا دوست بنا لیتے اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے۔ لیکن اگر تم ایسا کرتے تو ہم تمہیں دنیا میں بھی دوہرے عذاب کا مزہ چکھاتے اور آخرت میں بھی دوہرے عذاب کا۔ پھر ہمارے مقابلے میں تم کوئی مددگار نہ پاتے۔)

اس تنبیہ یا عتاب پر حضورؐ بہت رنجیدہ اور مغموم ہوئے۔ کچھ دنوں بعد اسی رنجیدگی کو زائل کرنے کے لیے سابقہ پیغمبروں کے حوالے سے مندرجہ ذیل آیت نازل فرمائی:

''وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِيٓ أُمْنِيَّتِهِ فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ اٰيَاتِهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِّلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ، وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ.'' (الحج:۵۲-۵۳)

(اور اے نبیؐ تم سے پہلے ہم نے نہ کوئی رسول ایسا بھیجا ہے نہ نبی۔ (جس کے ساتھ یہ معاملہ نہ پیش آیا ہو کہ) جب اس نے تمنا کی، شیطان اس کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا۔ اس طرح جو کچھ بھی شیطان خل اندازیاں کرتا ہے، اللہ ان کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے، اللہ علیم اور حکیم ہے۔ (وہ اس لیے ایسا ہونے دیتا ہے) تاکہ شیطان کی ڈالی ہوئی خرابی کو فتنہ بنا دے، ان لوگوں کے لیے جن کے دلوں کو (نفاق کا) روگ لگا ہوا ہے اور جن کے دل کھوٹے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ظالم لوگ عناد میں بہت دور نکل گئے ہیں۔)

مذکورہ آیتیں کب نازل ہوئیں؟:

دونوں سورتوں کی آیتوں کا زمانہ اور سبب نزول بھی مختلف ہے۔ سورۃ النجم کی آیات

سے اس کا تعلق نہیں۔ سورہ بنی اسرائیل کی مذکورہ آیتیں معراج کے بعد ۱۱ یا ۱۲ نبوی میں نازل ہوئیں۔ گویا کہ عتاب کا عمل لغزش کے پانچ چھ سال بعد ہوا۔ غلطی آج سرزد ہو اور اس پر نکیر یا عتاب چھ سال بعد کیا جائے، یہ مضحکہ خیز بات ہے۔ ان آیتوں کا سبب نزول بھی دوسرا ہے۔ یہ اس وقت نازل ہوئیں جب کفار مکہ حضورؐ سے کہتے تھے کہ اگر واقعی آپ ہماری طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں تو پھر اپنی مجلس سے ان غریب اور شکستہ حال لوگوں کو ہٹا دیجئے جن کے ساتھ بیٹھنا ہمارے لیے توہین ہے، تو پھر ہم بھی آپ کے دوست ہو جائیں گے۔ اس پر اللہ کے رسولؐ کے دل میں ان کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو گیا۔ اسی پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں حضورؐ کو کہا گیا کہ ان کی باتوں میں فتنہ ہے اور ان کی دوستی بھی فتنہ ہے، آپ کو ان کی بات نہیں ماننی چاہیے۔ پھر ارشاد ہوا کہ اگر ہماری طرف سے آپ کی تربیت اور ثابت قدم رکھنے کا اہتمام نہ ہوتا تو کچھ بعید نہ تھا کہ آپ ان کے میلان کے تھوڑے سے قریب ہو جاتے۔

سورہ حج کی مذکورہ آیتیں بھی غرانیق کے کئی سال بعد نازل ہوئیں، یہ سورہ اگرچہ مکی اور مدنی دونوں ہے، مگر زیر بحث آیات مدینہ میں نازل ہوئیں، یعنی ۱ھ میں۔ جمہور مفسرین کا قول ہے کہ یہ سورت آیات مکیہ اور مدینہ سے مخلوط ہے۔ قرطبی نے اس کو اصح قرار دیا ہے، نیز فرمایا کہ اس سورت کے عجائب میں سے یہ بات ہے کہ اس کی آیات کا نزول بعض کا رات میں، بعض کا دن میں، بعض کا سفر میں اور بعض کا حضر میں، بعض کا مکہ میں اور بعض کا مدینہ میں ہوا ہے، بعض کا جنگ و جہاد کے وقت اور بعض کا صلح و امن کی حالت میں ہوا ہے اور اس میں بعض آیات ناسخ ہیں اور بعض منسوخ، بعض محکم ہیں اور بعض متشابہ۔

غرانیق سے موید سورہ حج کی مذکورہ آیات کا تعلق بھی بے بنیاد ہے۔ پھر ''سورہ نجم'' میں حضورؐ سے جو لغزش ہوئی اس کی اصلاح کے لیے یہ آیتیں اسی وقت نازل ہوتیں نہ کہ عتاب والی آیات نازل ہونے کے بعد، چنانچہ اس آیت کو اس کی تائید میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

''اس میں تین آیتوں کی جو شان نزول بیان کی جا رہی ہے آیا قرآن کی ترتیب بھی اس کو قبول کرتی ہے؟ قصے میں بیان کیا جا رہا ہے کہ آمیزش سورہ نجم میں کی گئی تھی، جو ۵ بعثت میں نازل ہوئی تھی۔ اس آمیزش پر سورہ بنی اسرائیل والی آیات میں عتاب فرمایا گیا اور پھر اس کی تنسیخ اور واقعہ کی توجیہہ سورہ حج کی آیت میں کی گئی۔ اب لامحالہ دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت پیش آئی ہوگی یا تو عتاب اور تنسیخ والی آیتیں بھی اسی زمانے میں نازل ہوئی ہوں جب کہ آمیزش کا واقعہ پیش آیا۔ پھر عتاب والی سورۃ بنی اسرائیل کے ساتھ اور تنسیخ والی آیت سورہ حج کے ساتھ نازل ہوئی ہو۔ اگر پہلی صورت ہے تو یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ یہ دونوں آیتیں سورہ نجم میں نہ شامل کی گئی، بلکہ عتاب والی آیت مزید دو ڈھائی سال تک پڑی رہی اور سورہ حج کے نزول تک اسے کہیں نہ چسپاں کیا گیا۔ کیا قرآن کی ترتیب اسی طرح ہوئی ہے کہ ایک موقع کی نازل شدہ آیتیں الگ الگ بکھری پڑی رہتی تھیں اور برسوں کے بعد کسی کو کسی دوسری سورۃ میں ٹانک دیا جاتا تھا؟ لیکن اگر دوسری صورت ہے کہ عتاب والی آیت واقعہ کے ۶ سال بعد اور تنسیخ والی آیت آٹھ نو سال بعد نازل ہوئی تو علاوہ اس کے بے تکے پن کے جس کا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں، یہ سوال پیدا ہوتا کہ سورۃ بنی اسرائیل اور سورہ حج میں ان کے نزول کا موقع کیا ہے۔''

کفار و مشرکین کی غلطی کا ایک پہلو:

دین کی تبلیغ کے لیے ہی حضورؐ کفار و مشرکین کے بڑے بڑے سرداروں سے ملتے اور ان کی محفلوں میں پہنچتے اور انہیں اللہ کا کلام سناتے، دوزخ کے عذاب سے ڈراتے اور جنت کی عیش سے بھری زندگی کی سیر کراتے۔ اس وقت بالعموم یہ لوگ یا تو آپؐ کی باتوں کو سنتے نہیں، یا پھر شور و غل کرنے لگتے، تاکہ اس شور میں حضورؐ کی آواز دب کر رہ جائے اور دوسروں کے گوش گزار نہ ہو سکے۔ ان کی اس حرکت کا ذکر قرآن نے بھی واضح انداز میں کیا ہے:

"لَاتَسۡمَعُوا لِهٰذَا الۡقُرۡآنِ وَالۡغَوۡا فِیۡهِ لَعَلَّکُمۡ تَغۡلِبُوۡنَ" (حم السجدہ: ۲۶)

(اس قرآن کو نہ سنو اور شوروغل کرو، تاکہ تم ان پر غالب ہو جاؤ۔)

اس کے علاوہ کفار و مشرکین کا یہ عمل بھی کتب سیرت میں مذکور ہے کہ یہ لوگ رات کی تنہائی میں اور خفیہ طریقے سے قرآن کو سنتے تھے، اس وقت جبکہ حضورؐ اس کی تلاوت فرمارہے ہوتے۔

ان دونوں باتوں کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ مجمع عام میں حضورؐ دین کی دعوت پیش کرنے کے لیے حاضر ہوئے، اپنی گفتگو کے دوران سورۂ نجم کی تلاوت شروع کی (بعض روایت کے مطابق حرم شریف میں یہ عمل صادر ہوا، کفار و مشرکین جب خانہ کعبہ کا طواف کرتے تو مذکورہ الحاقی جملے کا طواف کے دوران ورد کرتے تھے۔ گویا کہ ایک عادت سی بنی ہوئی تھی) ابتدا سے ہی ان پر قرآن کی ہیبت طاری ہوگئی تھی، کچھ لوگوں نے شوروغل کرنے کی کوشش کی ہوگی اور کسی نے سنجیدگی سے اس کلام کو سنا ہوگا۔ اسی مجمع میں منچلے لوگ بھی ہوں گے۔ انہوں نے جب مقدس دیویوں کا ذکر سنا تو خوشی سے جھوم اٹھے اور پیچھے سے ہانک لگادی: "تلک الغرانیق العلی، و إن شفاعتهن لترتجی"، مگر اس جملے کا مجمع پر کوئی خاص اثر نہ ہوا ہوگا، کیونکہ سارے لوگ تو کلام الٰہی کو سننے میں لگے ہوئے تھے اور اس کی تاثیر سے مسحور تھے، البتہ جو لوگ منچلے ہانک لگانے والوں کے قریب ہوں گے، انہوں نے اس الحاقی جملے کو سنا، مگر کوئی اہمیت نہ دی، یہاں تک کہ سورۃ کے اختتام پر نبیؐ نے سجدہ کیا تو سارے لوگ سجدہ ریز ہوگئے۔ بعد میں مجمع میں موجود لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا یا پھر دوسرے لوگوں نے عار دلایا کہ یہ تم نے کیا کیا، تو پھر اس کی مختلف توجیہہ کی ہوگی، اس لیے اب یہ افواہ پھیلائی گئی اور اپنی غلطی کی تلافی کے لیے کہا ہوگا کہ رسول خدا نے ہمارے بتوں کی اہمیت کو تسلیم کرلیا ہے، اس لیے ہم لوگ ان کے ساتھ ہوگئے۔ اس میں خارجی شیطان کا عمل دخل بھی نہیں نظر آتا۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ خود باری تعالیٰ نے اپنی حکمت سے مجمع

کو حضورؐ کی باتوں سے متاثر کردیا ہو۔ عام گفتگو تو تھی نہیں کلام الٰہی کی تلاوت تھی۔

علامہ زرقانی لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے کہا کہ جب آنحضرتؐ اس آیت "ومنوة الثالثة الأخرى" پر پہنچے تو مشرکوں کو ڈر پیدا ہوا کہ اب ان کے معبودوں کی کچھ برائی کا بیان ہوگا۔ اس بنا پر انہوں نے جھٹ سے آں حضرتؐ کی تلاوت میں یہ فقرے ملا کر پڑھ دیئے، جیسا کہ ان کی عادت تھی کہ کہتے کہ قرآن پر کان نہ لگاؤ اور اس میں گڑبڑ مچادو۔

"غرانیق العلیٰ" یہ یہودیوں کی گھڑی ہوئی کہانی ہے

شیخ محمد الغزالی لکھتے ہیں: "بعض غفلت زدہ لوگوں نے سمجھا کہ اسلام اور کفر کے درمیان واقعی صلح ہوگئی اور حضرت محمدؐ نے بتوں کی تعریف اور ان کے مقام کا اعتراف کرلیا تھا۔ حضرت محمدؐ سے یہ بات کیسے ممکن ہوسکتی ہے۔ تاریخ و تفسیر کی بعض کتابوں میں اس گھڑی ہوئی افواہ کا ذکر آیا ہے، جبکہ اتنی بے ہودہ بات ذکر کرنے کے قابل نہیں تھی۔ داستان کے شوقین کچھ اہل قلم اپنی کتابوں میں ہر رطب و یابس کو شامل کر لیتے ہیں۔ اس طرح کی خرافات ہمارے یہاں مختلف کتابوں میں پائی جاتی ہیں اور نہیں معلوم قدیم کتابوں کو کب ان سے پاک کیا جائے گا۔ کیونکہ اس طرح کی چیزیں مسلمانوں کے غفلت کے زمانے میں یہودیوں کی سازش سے داخل کردی گئی ہیں۔ صحیح حدیثوں میں واقعہ آتا ہے کہ نبیؐ نے ایک مجلس میں "سورہ النجم" کی تلاوت فرمائی تو اس میں آگاہیوں کا ذکر شروع ہوا تو دل لرزنے لگے۔ جن کا رعب ان مذاق اڑانے والے متکبر لوگوں پر اس طرح چھا گیا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ سجدے میں گر پڑے۔ پھر جب سر اٹھائے تو انہیں محسوس ہوا کہ ایمان کا جلال و رعب ان پر غالب آ گیا ہے، تب وہ شرمندہ ہوئے اور یہ عذر گھڑنے لگے کہ انہوں نے حضرت محمد کے ساتھ سجدہ اس لیے کیا کہ آپؐ نے ان کے اصنام کا احترام کے ساتھ ذکر کیا تھا۔ وہ اپنے اس فعل کا عذر اسی طرح پیش کرسکتے تھے کہ اپنی گھڑی ہوئی بات کو پھیلائیں اور لوگوں کے دلوں میں یہ وہم پیدا کریں کہ آپ کسی وقت ان کی طرف مائل ہوگئے تھے،

جبکہ حضرت محمدؐ کی صنم پرستی کے خلاف جدو جہد دن بہ دن شدید تر ہوتی جارہی تھی اور اسی طرح صنم پرستوں کی دشمنی بھی۔''

سید امیر علی نے اس واقعہ پر محققانہ بحث کی ہے اور قرآنی آیات کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ اس قسم کا بے ہودہ اور لغو فعل حضورؐ سے صادر ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ نبوت کے جس منصب عظیم پر فائز تھے وہ اس کے منافی ہے۔ پھر واقعہ کا صحیح تناظر میں جائزہ لینے کے بعد وہ لکھتے ہیں: ''ان ہی دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی تعبیر مسلم مورخوں نے ایک طریقہ سے کی ہے اور آں حضرت کے عیسائی سوانح نگاروں نے ایک اور طریقے سے۔ ایک دن آپ پر وحی کی حالت طاری تھی اور آپ چند آیات تلاوت فرما رہے تھے، جواب قرآن کے ترپنویں سورہ نجم کا جزو ہیں۔ جب آپ ان الفاظ تک پہنچے کہ ''کیا تم لوگوں نے لات اور عزی اور وہ جو تیسری دیوی مناۃ ہے، ان کے بارے میں غور کیا ہے؟'' ایک بت پرست نے جو اس موقع پر موجود تھا اور جسے روایات نے اب شیطان میں تبدیل کر دیا ہے، ان دیویوں کی مذمت کی پیش بندی کرنے کے ارادہ سے پکار کر کہا: ''یہ حسین اور سربلند دیویاں ہیں جن سے عنداللہ شفاعت کی امید کی جاسکتی ہے''۔ اس نے یہ کلمات ایسے طور پر کہے کہ گویا یہ وحی کا جزو ہیں۔ قریش یا تو اس چالاکی بھری کامیابی پر خوش ہوئے یا ان الفاظ کو آنحضرتؐ کے الفاظ تصور کر کے یہ سمجھے کہ آنحضرت نے ان کے بتوں کی رعایت کی ہے، چنانچہ انہوں نے فوراً مصلحت کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ جب آنحضور کو حقیقت کا علم ہوا تو آپ نے فوراً اعلان کیا: وہ کچھ بھی نہیں محض چند خالی خولی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے گھڑ لیے ہیں۔ مسلمان مورخین اور راویان حدیث نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے۔''

سورہ نجم کی آیتوں سے واقعہ کی تصدیق ہوتی ہے؟:

غیر اللہ کی اہمیت کو تسلیم کیے جانے کو سورہ نجم سے جوڑا جاتا ہے اور ایک خاص مقام

پر اس الحاقی جملے کو فٹ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، پھر اسے منسوخ بتایا گیا ہے، لیکن ہم اس سورۃ کی الحاقی جملے سے قبل اور بعد والی آیات پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس الحاقی جملے کا پچھلی اور اگلی آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ سلسلہ کلام اس طرح شروع ہوتا ہے:

''وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَى مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَى . وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَى. إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَى ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَى. وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَى. ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّى. فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى فَأَوْحَى إِلَى عَبْدِهِ مَا أَوْحَى. مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَى. أَفَتُمَارُونَهُ عَلَى مَا يَرَى. وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَى عِندَ سِدْرَةِ الْمُنتَهَى، عِندَهَا جَنَّةُ الْمَأْوَى. إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشَى. مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى لَقَدْ رَأَى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَى. أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّى. وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَى. أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنثَى تِلْكَ إِذاً قِسْمَةٌ ضِيزَى، إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاء سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنفُسُ وَلَقَدْ جَاءهُم مِّن رَّبِّهِمُ الْهُدَى أَمْ لِلْإِنسَانِ مَا تَمَنَّى فَلِلَّهِ الْآخِرَةُ وَالْأُولَى.'' (النجم ۱-۲۵)

(قسم ہے تارے کی، جب کہ وہ غروب ہوا، تمہارا رفیق نہ بھٹکا ہے نہ بہکا۔ وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا، یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے، اسے زبردست قوت والے نے تعلیم دی ہے، جو بڑا صاحب حکمت ہے۔ وہ سامنے آ کھڑا ہوا، جبکہ وہ بالائی افق پر تھا، پھر قریب آیا اور اوپر معلق ہو گیا۔ یہاں تک دو کمانوں کے برابر یا اس سے کم فاصلہ رہ گیا۔ تب اس نے اللہ کے بندے کو وحی پہنچائی جو بھی اسے پہنچانی تھی۔ نظر نے جو کچھ دیکھا، دل سے اس میں جھوٹ نہ ملایا۔ اب کیا تم اس چیز پر اس سے جھگڑتے ہو جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے؟ اور ایک مرتبہ پھر اس نے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اس کو اترتے دیکھا، جہاں پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔ اس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا جو چھا رہا

تھا، نگاہ نہ چوندھیائی نہ حد سے متجاوز ہوئی اور اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔ اب ذرا بتاؤ، تم نے کبھی اس لات اور اس عزی اور تیسری ایک دیوی منات کی حقیقت پر کچھ غور کیا ہے۔ کیا بیٹے تمہارے لیے ہیں اور بیٹیاں خدا کیلئے، یہ تو بڑی داھاندلی کی تقسیم ہوئی۔ دراصل یہ کچھ نہیں ہے مگر بس چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ محض وہم وگمان اور خواہش نفس کی پیروی کر رہے ہیں، حالاں کہ ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے کیا انسان جو کچھ چاہے اس کے لیے وہی حق ہے۔ دنیا اور آخرت کا مالک تو اللہ ہی ہے۔)

یہ پورا مضمون صاف بتاتا ہے کہ اس میں نبیؐ کی نبوت کی صداقت کو واضح کیا گیا ہے اور آپ کے اوصاف حمیدہ کو کھول کھول کر بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد کفار ومشرکین کے عقیدہ پر حملہ کیا جارہا ہے کہ تم نے ایک معبود حقیقی کو چھوڑ کر ان معروف دیویوں کو الوہیت کا درجہ دے دیا ہے۔ اگر تم غور وفکر سے کام لیتے تو ایسا نہ ہوتا۔ پھر ستم ظریفی یہ ہے کہ تم نے بیٹوں کو اپنے لیے خاص کرلیا ہے اور بیٹیاں خدا کے حصے میں کردیں۔ تقسیم میں توازن ہونا چاہیے۔ دراصل ان بتوں کی نہ تو کوئی اہمیت ہے اور نہ اصلیت، ہاں، مگر یہ گم راہی ہے جسے تمہارے آباؤ اجداد نے اتنی اہمیت دے رکھی ہے اور اسی روش پر تم قائم ہو۔ یہ محض وہم وگمان کی باتیں ہیں اور خواہش نفس کی پیروی ہے۔

سورۃ کا اختتام بھی دل دہلا دینے والا ہے۔

سورہ کے درمیان میں متعدد باتیں عقائد واعمال کی درستی کے تعلق سے بیان ہوئی ہیں اور سرکشی کی صورت میں اس کا انجام کیا ہوگا اس کو بھی کھول کر بیان کردیا گیا ہے۔ سورہ کا اختتام بھی اس طرح ہوتا ہے کہ اس کو سنتے ہی لوگوں کے دل دہل جائیں:

”وَأَنَّهُ أَهْلَكَ عَاداً الْأُولَى. وَثَمُودَ فَمَا أَبْقَى. وَقَوْمَ نُوحٍ مِّن قَبْلُ إِنَّهُمْ

كَانُوا هُمْ أَظْلَمَ وَأَطْغَى. وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوَى. فَغَشَّاهَا مَا غَشَّى. فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكَ تَتَمَارَى. هَذَا نَذِيرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْأُولَى. أَزِفَتِ الْآزِفَةُ. لَيْسَ لَهَا مِن دُونِ اللَّهِ كَاشِفَةٌ. أَفَمِنْ هَذَا الْحَدِيثِ تَعْجَبُونَ. وَتَضْحَكُونَ وَلَا تَبْكُونَ. وَأَنتُمْ سَامِدُونَ. فَاسْجُدُوا لِلَّهِ وَاعْبُدُوا.“ (النجم:۵۰-۶۲)

(اور یہ اسی نے عاد اولیٰ کو ہلاک کیا اور ثمود کو ایسا مٹایا کہ ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑا ہو اور ان سے پہلے قوم نوح کو تباہ کیا، کیونکہ وہ تھے ہی سخت ظالم وسرکش لوگ اور اوندھی گرنے والی بستیوں کو اٹھا پھینکا۔ پھر چھادیا ان پر وہ کچھ (تم جانتے ہی ہو کہ) کیا چھادیا۔ پس اے انسان اپنے رب کی کن کن نعمتوں میں شک کرے گا۔ یہ ایک تنبیہ ہے پہلی آئی ہوئی تنبیہات میں سے۔ آنے والی گھڑی قریب آلگی ہے، اللہ کے سوا کوئی اس ہٹانے والا نہیں۔ اب کیا یہی وہ باتیں ہیں جن پر تم اظہار تعجب کرتے ہو، ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو اور گا بجا کر انہیں ٹالتے ہو۔ جھک جاؤ اللہ کے آگے اور بندگی بجالاؤ۔)

غور کیا جاسکتا ہے کہ پورا مجمع اس سورت کو رسول خدا کی زبانی مترنم اور خوب صورت آواز میں سن رہا تھا اور کلام الٰہی کی ہیبت اس پر طاری تھی، انہیں یہ تک خبر نہیں کہ کیا کہا جارہا ہے اور انجام کیا ہوگا۔ جب رسول اللہ سجدہ کرتے ہیں تو سارے لوگ سجدہ ریز ہوجاتے ہیں۔ اب انہیں احساس ہوا کہ ہم سے کتنی بڑی غلطی سرزد ہوگئی۔ اس لیے اس سے پیچھا چھڑانے کی مختلف توجیہات کیں، جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔

اضافی جملے بے جوڑ ہیں:

سورہ نجم کی آیت ۱-۲۵ کا پورا مضمون بتارہا ہے کہ اس میں خاص طور پر ان لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے جو نبیؐ کی نبوت سے انکار کرتے تھے۔ اس انکار اور الزام کی وجہ سے کفار ومشرکین کا جو دردناک انجام ہوگا اس پر وعید سنائی گئی ہے۔ یہ سلسلہ کلام ایسا نہیں کہ

اس کے درمیان میں غیراللہ کی اہمیت کو بھی بیان کر دیا جائے۔الحاقی جملے سے قبل اوراس کے بعدوالی آیت کو جوڑ کر دیکھئے تو پوری سورہ بے وزن ہوجاتی ہے:

"أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّى. وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَى . "تلک الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترتجی" أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنثَى تِلْكَ إِذاً قِسْمَةٌ ضِيزَى."

(اب ذرا بتاؤ،تم نے کبھی اس لات اوراس عزی اورتیسری ایک دیوی منات کی حقیقت پر کچھ غور بھی کیا ہے۔"یہ مقدس دیویاں ہیں جن کی شفاعت متوقع ہے۔" کیا بیٹے تمہارے لیے ہیں اور بیٹیاں خدا کے لیے یہ تو بڑی دھاندلی کی تقسیم ہوئی۔)

ایک ہی سانس میں ان دیویوں کے بھرم کو چاک کیا جارہا ہے اوردوسرے سانس میں اس کی اہمیت تسلیم کرلی جاتی ہے،اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ بے وقوفوں تم نے جو تقسیم کی ہے وہ کوئی منصفانہ تقسیم نہیں ہے۔یہ تو بڑی بے انصافی اوردھاندھلی کی بات ہے۔جس چیز کو تم اپنے لیے حقیراور ننگ وعار سمجھتے ہواسے اللہ کی جانب منسوب کرتے ہواور جس چیز سے تمہیں فائدہ حاصل ہونے والا ہے اسے اپنی طرف منسوب کرتے ہو۔

جن لوگوں نے اس الحاقی جملے کواس سورہ کے درمیان میں ٹانکنے کی جرات کی ہے،وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکے اوران کی بددیانتی سورہ کے سلسلہ کلام سے واضح ہوتی ہے۔ چنانچہ جب انہیں اپنے عمل پر ندامت ہوئی یالوگوں نے انہیں عار دلایا تو اس کی غلط تعبیر و تشریح کی۔ظاہر ہے کہ جولوگ نبی پر ہمیشہ جھوٹ گھڑتے اورآپ کے خلاف ہمیشہ دسیسہ کاری اورافترا پردازی کرتے رہتے تھے وہ اپنا دامن بچانے کے لیے اس طرح کا جھوٹ کیوں نہ گھڑتے۔

قرآن کا اعجاز یہ بھی ہے کہ اس میں خارج ازقرآن الفاظ کی آمیزش نہیں ہوسکتی۔اگر قرآن کی یہ خصوصیت نہ ہوتی تو اب تک اس میں نہ معلوم کتنی تحریف کردی گئی ہوتی۔کفار

مکہ نے قرآن کے اس دعویٰ پر کہ تم اس کا مثل تیار کر کے پیش کرو تو انہوں نے چند چھوٹی سورتیں تحریر کیں،مگر وہ قرآنی اعجاز اورنظم کے سامنے بالکل بھونڈی کوشش قرار پائی۔لبید بن ربیعہ عظیم انشا پرداز تھا،اس نے بھی کلام الٰہی کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔تو پھر یہ دجل و فریب قرآن میں کیسے جگہ پاسکتا تھا،جس کی تنسیخ کی نوبت آئی۔

واقعہ صحیح ہوتا تو تفصیلات میں تضاد کیوں ہوتا؟:

نعوذ باللہ حضورؐ سے دیویوں کی الوہیت کے تسلیم کرنے کی لغزش ہوئی تو اس کی تنسیخ اسی وقت کی جاتی۔قرآن میں بہت سے احکام ایسے ہیں جن پر مسلمانوں کے لئے عمل کرنا لازم اورضروری ہے۔مگر جب اللہ نے چاہا اوراس حکم کی افادیت ختم ہوگئی تو اس کی جگہ دوسرا حکم نازل کردیا۔کون سی آیت ناسخ ہے اورکون سی منسوخ۔اس پر مفسرین نے بڑی طویل بحث کی ہے اوران کا تعین بھی کیا ہے،مگراس واقعہ کے متعلق ایسی کوئی صراحت نہیں ملتی۔اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے یہ من گھڑنت قصہ رونما ہی نہیں ہوا۔حدیث کے مستند مجموعوں میں بھی اس کا تذکرہ نہ آنا واقعہ کے لغو ہونے پر دلالت کرتا ہے۔جن لوگوں نے اس واقعہ کو صحیح قرار دیا ہے، ان کے الفاظ پر غور کیا جائے تو واقعہ میں حددرجہ نقص نظر آتا ہے۔محمد حسین ہیکل نے اس واقعہ کے متعلق پانچ لفظی تضاد کا ذکر کیا ہے۔یہ تضاد قصہ کی اصلیت کو مجروح کرتا ہے اور بے بنیاد بنا دیتا ہے۔اسی طرح مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ واقعہ کی تضاد بیانی کے متعلق لکھتے ہیں:

"قصے کی تفصیلات میں چھوٹے چھوٹے اختلافات کو چھوڑ کر دو بہت بڑے اختلافات ہیں۔ایک یہ کہ بتوں کی تعریف میں جو کلمات نبیؐ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں۔وہ قریب قریب ہر روایت میں دوسری روایت سے مختلف ہیں۔ہم نے ان کا استقصا کرنے کی کوشش کی تو ۱۵ عبارتیں الگ الگ الفاظ میں پائیں۔دوسرا بڑا اختلاف

یہ ہے کہ کسی روایت کی رو سے یہ الفاظ دوران وحی میں شیطان نے آپ پر القا کر دیئے اور آپ سمجھے کہ یہ بھی جبرئیل لائے ہیں۔ کسی روایت میں ہے کہ یہ الفاظ اپنی اس خواہش کے زیر اثر سہواً آپ کی زبان سے نکل گئے۔ کسی میں ہے کہ اس وقت آپ کو اونگھ آ گئی تھی اور اس حالت میں یہ الفاظ نکلے۔ کسی کا بیان ہے کہ آپ نے قصداً کہے مگر استفہام انکاری کے طور پر کہے۔ کسی کا قول ہے کہ شیطان نے آپ کی آواز میں ملا کر یہ الفاظ کہہ دئے اور سمجھا یہ گیا کہ آپ نے کہے ہیں اور کسی کے نزدیک کہنے والا مشرکین میں سے کوئی شخص تھا۔''

اس واقعہ کے ناقابل تسلیم ہونے کے مزید دلائل:

اس واقعہ کو جن لوگوں نے ایک حقیقت کے طور پر بیان کیا ہے اس کی سند پر غور کریں تو اس میں کوئی بھی روایت سنداً مضبوط نہیں ہے اور نہ کسی صحابی سے کسی معتبر سند سے اس کا پتا چلتا ہے علامہ زرقانی نے ''شرح المواہب اللدنیہ'' میں ان راویوں پر تفصیل سے کلام کیا ہے اور جنہوں نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ جہاں جہاں کم زوری پائی گئی ہے اس کی بھی نشان دہی کی ہے۔ علامہ ناصر الدین البانی نے اپنی کتاب ''نصب المجانیق فی قصۃ الغرانیق'' میں ان تمام روایتوں کا استقصا کیا ہے اور تمام طرق میں کوئی نہ کوئی ایسی کم زوری ثابت کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ بے بنیاد ہے۔ پھر وہ لکھتے ہیں:

''یہ ماننے میں کوئی مانع نہیں ہے کہ یہ افسانہ بعد میں گھڑا گیا ہو۔ یہی زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس لیے کہ اس کی روایت کسی صحابی سے کسی معتبر سند سے نہیں ہے۔ اس کے تمام طرق مرسل ہیں۔ پتا نہیں عہد نبوت کے کسی شخص نے اس کی روایت کی ہے۔ حدیثی نقطہ نظر سے اس قصہ کے بے بنیاد ہونے پر میں نے اپنی کتاب 'نصب المجانیق لنسف قصۃ الغرانیق' میں تفصیل سے بحث کی ہے۔''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ متذکرہ لوگوں نے واقعہ کی چھان بین کیے بغیر کیسے اسے

حضورؐ سے منسوب کر کے بیان کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں مولانا مودودی لکھتے ہیں:

''اول تو قرآن کا زور کلام اور انتہائی پر تاثیر انداز بیان، پھر نبیؐ کی زبان سے اس کا ایک ملہمانہ شان کے ساتھ ادا ہونا، اس کو سن کر اگر پورے مجمع پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی ہو اور آپ کے ساتھ سارا مجمع سجدے میں گر گیا ہو تو کچھ بعید نہیں ہے۔ یہی تو وہ چیز تھی جس پر قریش کے لوگ کہا کرتے تھے کہ یہ شخص جادوگر ہے، البتہ معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں قریش کے لوگ اپنے اس وقتی تاثر پر کچھ پشیمان سے ہوئے ہوں گے اور ان میں سے کسی نے یا بعض لوگوں نے اپنے اس فعل کی یہ توجیہہ کی ہوگی کہ صاحب ہمارے کانوں نے محمد کی زبان سے اپنے معبودوں کی تعریف میں کچھ کلمات سنے تھے، اس لیے ہم بھی ان کے ساتھ سجدے میں گر گئے۔ دوسری طرف یہی واقعہ مہاجرین حبشہ تک اس شکل میں پہنچا کہ نبیؐ اور قریش کے درمیان صلح ہوگئی ہے۔ کیونکہ دیکھنے والے نے آپ کو اور مشرکین و مومنین سب کو ایک ساتھ سجدہ کرتے دیکھا تھا۔ یہ افواہ ایسی گرم ہوئی کہ مہاجرین میں سے تقریباً ۳۳ آدمی مکے واپس آ گئے۔ ایک صدی کے اندر یہ تینوں باتیں، یعنی قریش کا سجدہ، اس سجدے کی توجیہ اور مہاجرین حبشہ کی واپسی مل جل کر ایک قصے کی شکل اختیار کر گئیں اور بعض ثقہ لوگ تک اس کی روایت میں مبتلا ہوگئے۔ انسان آخر انسان ہے، بڑے سے بڑے نیک اور ذی فہم آدمی سے بھی بسا اوقات لغزش ہو جاتی ہے اور اس کی لغزش عام لوگوں کی لغزش سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ عقیدت میں بے جا غلو رکھنے والے ان بزرگوں کی صحیح باتوں کے ساتھ ان کی غلط باتوں کو بھی آنکھیں بند کر کے ہضم کر جاتے ہیں اور بدطینت لوگ چھانٹ چھانٹ کر ان کی غلطیاں جمع کرتے ہیں اور انہیں اس بات کے لیے دلیل بناتے ہیں کہ یہ سب کچھ جو ان کے ذریعہ سے ہمیں پہنچا ہے، نذر آتش کر دینے کے لائق ہے۔''

جن سندوں سے یہ قصہ نقل ہوا ہے وہ محمد بن قیس، محمد بن کعب قرظی، عروہ بن زبیر، ابوصالح، ابوالعالیہ، سعید بن جبیر، ضحاک، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث، قتادہ، مجاہد،

سدی، ابن شہاب زہری اور ابن عباس پر جا کر ختم ہو جاتی۔ ان تمام راویوں میں ابن عباس کے علاوہ کوئی صحابی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قصے کی تفصیلات میں لفظی اختلافات پیدا ہو گئے ہیں، جبکہ کبار محدثین و مفسرین نے واقعہ کو غلط اور من گھڑنت قرار دیا ہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ جتنی سندوں سے یہ روایت ہوا ہے سب مرسل اور منقطع ہیں، کسی صحیح سند سے اس کا ثبوت نہیں ملتا، بیہقی کے مطابق از روئے نقل بھی یہ قصہ ثابت نہیں۔ ابن خزیمہ نے کہا کہ یہ زنادقہ کا گھڑا ہوا ہے۔ قاضی عیاض کے مطابق اس قصے کی کمزوری اس سے ثابت ہوتی ہے کہ صحاح میں اس کا ذکر نہیں ہے اور نہ یہ کسی صحیح متصل بے عیب سند کے ساتھ ثقہ راویوں سے منقول ہوا ہے۔ امام زہری، قاضی ابوبکر اور علامہ آلوسی نے اس واقعہ پر تفصیلی بحث کی ہے اور اس کا رد کیا ہے۔ علامہ نووی فرماتے ہیں کہ عقلاً اور نقلاً کسی بھی لحاظ سے یہ روایت ثابت نہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدیم مفسرین، محدثین اور مورخین کے صحیح نقطہ نظر پیش کرنے کے بعد نتیجہ کے طور پر یہ بھی لکھتے ہیں: ''بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ ہوسکتا ہے کہ زبان حق ترجمان صاحب ''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوىٰ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْی يُوحىٰ''. (وہ اپنی خواہش سے کلام نہیں فرماتے، بلکہ وہی کلام فرماتے ہیں جو وحی کی جاتی ہے۔) سے بتوں کی تعریف ہو جائے اور یہ ناممکن ہے کہ حضور قرآن میں ایسی چیز کا قصداً یا سہواً اضافہ فرمائیں جو قرآن میں سے نہ ہو، خصوصاً ایسی چیز کا اضافہ جو توحید کے سلسلے میں اپنی لائی ہوئی چیز کے منافی و برخلاف ہو۔''

☆☆

قرآن کریم کا تصور عدل اور معاشرتی امن وامان

● پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی

بلاشبہ قرآن کریم تمام انسانوں کے لیے عظیم ترین ہدایت نامہ اور پوری انسانیت کے لیے پیغام رحمت ہے۔ یہ کتاب عظیم و عزیز انسان کو اپنے خالق و مالک سے تعلق مضبوط کرنے اور لوگوں میں باہمی تعلقات کو استوار کرنے اور خوشگوار بنانے کا بہترین طریقہ سکھاتی ہے، تاکہ انفرادی و اجتماعی زندگی میں انھیں امن وامان نصیب ہو اور سکون و اطمینان کے ساتھ اس مقصد کے حصول میں مصروف ہیں جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں زندگی بخشی ہے۔ قرآن کریم نے خود اپنی جو صفات بیان کی ہیں ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ یہ سارے انسانوں کے لیے ہدایت کا ذریعہ ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بجا فرمایا ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی کلام نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ یہ اللہ رب العزت کا کلام ہے۔ اس سے بہتر اور کوئی نصیحت نہیں ہوسکتی کہ یہ احکم الحاکمین کے مواعظ ہیں۔ (فتح الرحمٰن بترجمۃ القرآن، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ورق 3ب)

قرآن کریم کی ہدایت و تعلیمات کو اگر دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ اللہ کے حقوق اور اس کے بندوں کے حقوق سے تعلق رکھتی ہیں، بالفاظ دیگر یہ کتاب یا تو اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ ایک انسان کا رب سے کس نوع کا تعلق ہونا چاہیے اور اسے کیسے مضبوط کرنا چاہیے یا اس باب میں رہنمائی دیتی ہے کہ ایک انسان کا اپنے جیسے دوسرے انسانوں سے کس طرح کا برتاؤ ہونا چاہئے۔ قرآن کریم سے یہ نکتہ بھی

ابھر کر سامنے آتا ہے کہ جو شخص اپنے خالق و مالک کو اچھی طرح پہچان لے گا اور اس سے اپنے تعلق کو استوار کر لے گا اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اللہ کے بندوں کے ساتھ زیادتی و ناانصافی کرے اور ان کے حقوق کو پامال کرے، اس لیے کہ اسے یقین ہے کہ ایسا کرنا اپنے مالک حقیقی کو ناراض کرنا ہے، جسے وہ کسی حالت میں پسند نہیں کرے گا۔

درحقیقت قرآن کی نگاہ میں عدل و انصاف معاشرتی زندگی کی بنیاد ہے، اس کے بغیر نہ تو سماجی نظام مستحکم ہوسکتا ہے اور نہ سماجی زندگی خوشگوار بن سکتی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جس تاکید کے ساتھ بار بار انصاف برتنے کی ہدایت دی ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ محض اخلاقی تعلیم نہیں بلکہ نہایت ضروری ہدایت ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ''**ان اللّٰہ یأمر بالعدل و الاحسان و ایتای ذی القربیٰ و ینھی عن الفحشاء و المنکر و البغی یعظکم لعلکم تذکرون**''. (النحل:۹۰) (بے شک اللہ انصاف و نیک سلوک کرنے اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی و برائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے)۔

قابل غور بات یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جن باتوں کا حکم دیا ہے ان میں سب سے پہلے عدل و انصاف کا ذکر ہے، اس سے خود اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ درحقیقت اس حکم کی تعمیل بہت سے نیک کام کا وسیلہ بنتی ہے۔ مثلاً دوسروں کے حقوق کی ادائیگی اور ظلم و زیادتی سے لوگوں کی حفاظت۔ انصاف کے اصولوں پر عمل کرنا کوئی معمولی بات نہیں، بلکہ بہت بڑی خوبی ہے جو خوف الٰہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس بات میں انسان بڑی آزمائشوں کا شکار ہوتا ہے۔ بعض اوقات ترغیبات مانع بنتی ہیں تو کبھی خطرات قدم ڈگمگا دیتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خوف ہی ہے جو ان حالات میں انصاف کے قدم کو آگے بڑھاتا ہے۔ فرمان الٰہی ہے: ''**اعدلوا ھو أقرب للتقویٰ**'' (انصاف کرو یہ خدا ترسی سے زیادہ قربت رکھتا ہے)۔

قرآن نے انصاف کی اہمیت اس پہلو سے بھی آشکارا کی ہے کہ یہ ان اعمال میں شامل ہے جو اللہ رب العزت کی پسندیدگی کا باعث بنتے ہیں اور ان کے انجام دینے والوں کو مالک حقیقی کا محبوب بنا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**ان اللہ یحب المقسطین**'' (بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)۔

یہ کتنا بڑا اعزاز و انعام ہے جو ایک شخص کو انصاف کی وجہ سے نصیب ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس وجہ سے کہ یہ عمل اللہ کے بندوں کے تعلقات کو مضبوط کرتا ہے، ان کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑتا ہے اور مخالفت و نفرت کے جذبات کو دوستی و محبت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ قرآن مجید صرف انفرادی زندگی یا پرائیویٹ لائف میں انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تعلیم نہیں دیتا، بلکہ وہ اہل ایمان کو خاص طور سے اس کی تاکید کرتا ہے کہ وہ سماجی زندگی میں بھی بلاخوف و خطر اس کا مظاہرہ کریں، علانیہ حق و انصاف کی گواہی دینے والے بن جائیں، تاکہ ظلم و زیادتی کا خاتمہ ہو، اخوت و محبت کے جذبات پروان چڑھیں اور ان کا کردار دوسروں کے لیے نمونہ بن جائے۔ اللہ تعالیٰ کی صاف صاف ہدایت ہے کہ (اے ایمان والو! انصاف کے علم بردار اور خدا واسطے گواہ بنو، گرچہ تمہارے انصاف و تمہاری گواہی کی زد جو تمہارے اپنے اوپر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں ہی پر کیوں نہ پڑتی ہو۔ (فریق معاملہ) خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔ پس خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ عدل سے باز رہو۔) (النساء:135)

واقعہ یہ ہے کہ انسان اس وقت بڑی آزمائش میں مبتلا ہوتا ہے اور نفس کے بہکاوے کا بری طرح شکار ہوتا ہے جب انصاف کا معاملہ کرنے میں اپنا نقصان نظر آئے یا اپنے گھر والوں اور رشتہ داروں کا۔ یہ سب کے ساتھ مشاہدہ میں آتا رہتا ہے کہ ذاتی و قریبی لوگوں کے فائدہ، مال و دولت کی لالچ اور کسی دولت مند یا صاحب منصب کی رعایت میں بڑی آسانی سے انصاف کے اصولوں کو توڑ دیا جاتا ہے اور پھر اس کے نتیجہ میں آپس میں

اختلاف پیدا ہوتا ہے، نفرت ومخالفت کا ماحول گرم ہوتا ہے اور امن وسکون تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بے لاگ انصاف کی تعلیم دیتا ہے اور اس بات کی خاص تاکید کرتا ہے کہ ذاتی، گھریلو وگواہی مفاد کی پرواہ کیے بغیر اور کسی قسم کے فائدہ کا خیال کیے بغیر سب کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کیا جائے اور اس باب میں امیر وغریب، طاقت ور وکمزور اور اپنے وغیر کسی کی رعایت نہ کی جائے۔ عدل وانصاف کا تصور اس سے بلند اور کیا ہوسکتا ہے کہ جسے قرآن نے پیش کیا ہے کہ مخالفوں ودشمنوں کے ساتھ بھی ان کا پورا پورا حق ادا کیا جائے یا انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کسی کی دشمنی یا مخالفت کو بیچ میں حائل نہ ہونے دیا جائے۔ ارشاد ربانی ہے: ''**ولا یجرمنکم شنأن قوم علی ألا تعدلوا اعدلوا ھو أقرب للتقویٰ**'' (المائدۃ:8) (کسی گروہ کی دشمنی تم کو مشتعل نہ کردے کہ تم (اس کے ساتھ) بے انصافی کرو، انصاف کرو یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے)۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن کے اس مثالی تصور کو اگر لوگ عملی جامہ پہنائیں خواہ وہ کسی مذہب یا فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں تو مخالفت ونفرت محبت و ہمدردی میں بدل جائے گی اور دشمنی دوستی میں تبدیل ہوجائے گی اور ٹوٹے ہوئے رشتے جڑ جائیں گے۔ موجودہ ماحول میں عدل سے متعلق قرآن کی یہ تعلیم جملہ انسانیت کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے اور معاشرتی زندگی کی بہتری کے لیے بڑی کارگر ثابت ہوسکتی ہے۔

کسی بھی معاشرہ و ملک میں انصاف کرنے یا اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کا تعلق عام لوگوں سے ہوتا ہے، لیکن انصاف قائم کرنا یا اس بات کو یقینی بنانا کہ انصاف قائم کرنے والے ادارے اچھی طرح رواں دواں رہیں، کافی حد تک حکومت واہل حکومت سے متعلق ہوتا ہے۔ قرآن کریم انھیں بھی اصول انصاف پر کاربند رہنے کی تلقین کرتا ہے اور یہ ہدایت دیتا ہے کہ بلا کسی امتیاز سب کے ساتھ انصاف کا معاملہ کریں، جیسا کہ اس آیت سے صاف واضح ہوتا ہے: ''**واذا حکمتم بین الناس فاحکموں بالعدل**'' (النساء:58) (اور

جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔)

اس آیت سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کی نظر میں انصاف کے معاملہ میں تمام انسان برابر ہیں۔ ان میں کسی بھی بنیاد پر تفریق جائز نہیں۔ معاشرہ کا ہر فرد انصاف کا مستحق ہے، خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، امیر ہو یا غریب، طاقت ور ہو یا کمزور، حمایتی ہو یا مخالف، رشتہ دار ہو یا اجنبی، درحقیقت قرآن کی رو سے انصاف کے اس اعلیٰ معیار کا مظاہرہ اہل حکومت سے مطلوب ہے۔

قرآن کریم کی رو سے حکمرانوں کے لیے منصفانہ رویہ اختیار کرنا کس قدر ضروری ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قیام عدل کو بعثت انبیاء کے بنیادی مقاصد میں شامل کیا گیا ہے اور سربراہ ریاست کی یہ ذمہ داری قرار دی گئی ہے کہ وہ ظلم و زیادتی کے خاتمہ اور انصاف کے قیام کا اہتمام کرے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ''**لقد ارسلنا بالبینات و انزلنا معھم الکتٰب والمیزان لیقوم الناس بالقسط**''. (ہم نے اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں اور ہدایت کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب ومیزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں)۔ (الحدید:25)

اور دوسری جگہ قرآن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اعلان بھی مذکور ہے: ''اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان انصاف قائم کروں۔'' (الحدید:25)

ان قرآنی نکات کی اہمیت اس پس منظر میں بخوبی سمجھی جاسکتی ہے کہ لوگوں کو انصاف کی راہ پر چلانے اور اصول انصاف کا پیرو بنانے کے لئے ایک جانب دعوت وتبلیغ اور نصیحت وفہمائش ضروری ہے تو دوسری جانب نظام عدل کا قیام، مظلوموں کی دادرسی، مقدمات کے فیصلہ واس کے نفاذ اور ظلم وزیادتی کی روک تھام کے لیے اہل حکومت کی توجہ و نگرانی، حکومت کا عملہ اور قوت نافذہ کا استعمال بھی درکار ہے۔ اس کے بغیر عدل وانصاف کے تقاضوں کی تکمیل اور معاشرہ میں امن وامان کا قیام ممکن نہیں۔

قرآن کے تصور عدل کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ عام معاملات میں منصفانہ رویہ اختیار کرنے کی تعلیم کے ساتھ ان امور میں انصاف برتنے کی خاص تاکید کی گئی ہے جو انصاف دلانے یا نظام عدل کے قیام میں مؤثر کردار رکھتے ہیں، یا باہمی اختلاف کو دور کرنے میں خصوصی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان میں شہادت یا گواہی دینی بھی شامل ہے۔ یہ امر بدیہی ہے کہ اس سے نہ صرف بہت سے سماجی و مالی حقوق کا تحفظ وابستہ ہوتا ہے بلکہ دادرسی، انصاف طلبی اور حقوق کی بازیابی سے متعلق مختلف معاملات کا تصفیہ اسی پر منحصر ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں گواہوں کی صفت عدالت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، بلکہ شہادت کی قبولیت کے لیے اسے ضروری شرط قرار دیا گیا ہے۔ دوسری جانب گواہوں کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ بلاخوف وخطر حق کی گواہی دیں اور اس باب میں کسی خوف یا لالچ کو آڑے نہ آنے دیں اور صرف اللہ کی مرضی کو سامنے رکھیں، اس لیے یہ بڑا نازک اور اہم معاملہ ہے اور ظلم وزیادتی کا ازالہ اور انصاف کا حصول اس سے وابستہ ہے۔ سچ بات کہنے اور جھوٹ سے بچنے کی عام تعلیم (الاحزاب: 70، الحج: 30) کے علاوہ قرآن میں یہ واضح ہدایت بھی ملتی ہے: ''**فاستشهدوا ذوی العدل منکم**'' (اور اپنے میں سے دو عادل شخص کو گواہ کرلو اور اللہ کے لیے ٹھیک ٹھیک گواہی دو)۔

گرچہ اس آیت کا تعلق شریعت کے ایک خاص مسئلہ (طلاق) سے ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی نظر میں ہر معاملہ میں گواہی دیتے وقت حق وصداقت کا مظاہرہ مطلوب ہے جیسا کہ اور بہت سی آیات سے واضح ہوتا ہے۔

یہاں یہ ذکر بھی اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ انسانوں کے علاوہ دستاویز یا ریکارڈ کی صورت میں تحریریں بھی شہادت دیتی ہیں اور خاص کر عدالتوں میں اس شہادت کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے اور بعض اوقات دو فریقوں میں اختلاف کی صورت میں یہی تحریری شہادت فیصلہ کی بنیاد بنتی ہے۔ قرآن میں اس باب میں بھی عدل وانصاف سے کام لینے اور

یہ ملحوظ رکھنے کی ہدایت ملتی ہے کہ اس طرح کی کسی تحریر یا دستاویز کو تیار کرتے وقت پوری دیانت داری کے ساتھ وہی باتیں لکھی جائیں جو آپس میں طے ہوئی ہیں یا جن پر سمجھوتہ ہوا ہے۔ قرض کے معاملہ سے متعلق یہ آیت بہت مشہور ہے: ''**یاایها الذین آمنوا اذا تداینتم بدین الیٰ اجل مسمّی فاکتبوه ولیکتب بینکم کاتب بالعدل.** (**سوره بقره: آیت. ۲۸۲**) (اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک دوسرے سے میعاد مقرر پر قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو اور لکھنے والے کو چاہئے کہ (تمہارے آپس کا معاہدہ) عدل سے لکھے)۔

ظاہر ہے کہ یہ حکم لین دین کے تمام معاملات اور مالی معاہدات کے لیے عام ہے اور اسے محض قرض کے معاملہ کے ساتھ محدود نہیں رکھا جاسکتا۔

یہ بات بخوبی معروف ہے کہ معاشرہ میں امن وامان کا قیام اس بات پر منحصر ہے کہ لوگوں کے سماجی ومعاشی حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کیا جائے اور اگر کسی کی حق تلفی ہوجائے تو اس کی تلافی کے لیے اسے چارہ جوئی یا انصاف طلبی کا حق حاصل ہو۔ اس باب میں بھی قرآن کی ہدایات وتعلیمات بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس کتاب ہدایت میں بار بار اس پر زور دیا گیا ہے کہ لوگ پوری دیانت داری و پابندی کے ساتھ ایک دوسرے کے حقوق ادا کرتے رہیں۔ بلاشبہ انصاف کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ جس کا جو حق ہے اسے پورا پورا ادا کردیا جائے اور دوسروں کے حق پر دست درازی نہ کی جائے۔ قرآن کریم میں جن کے حقوق کی ادائیگی کی بار بار تاکید کی گئی ہے ان میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن کے ساتھ شب وروز زندگی بسر ہوتی ہے یا زیادہ تعلقات ومعاملات رہتے ہیں۔ مثلاً والدین، اقربا، پڑوسی اور ساتھی۔ دوسرے وہ جو سماج کے کمزور طبقہ کے لوگ کہے جاتے ہیں اور جن کے حقوق بڑی آسانی سے پامال کردیے جاتے ہیں یا جن کے ساتھ ناانصافی کے واقعات زیادہ پیش آتے ہیں۔ ان میں بوڑھے والدین، عورتیں، (بالخصوص بیوہ عورتیں)، یتامیٰ، غربا و

مساکین، اہل حاجت، غلام و خادم شامل کیے جاسکتے ہیں۔قرآن مجید میں ان کے حقوق کے تحفظ کی خاص ہدایات ملتی ہیں اوران کے ساتھ ناانصافی پرسخت وعید آئی ہے۔

ان سب سے مقصد یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے حقوق کا احترام کریں، ان کی ادائیگی کے تئیں سنجیدگی و دیانت داری دکھائیں تاکہ عدل و انصاف کے تقاضے پورے ہوتے رہیں اور معاشرہ میں امن وامان کی فضا برقرار رہے، اس لیے کہ کسی کے بالخصوص کمزور طبقہ کے لوگوں کے حقوق کی پامالی کا لازمی نتیجہ بددلی، ناچاقی، دل شکنی و بےاطمینانی ہوتا ہے جن سے بہرصورت تعلقات کشیدہ ہوتے ہیں اورنفرت و عداوت کے جذبات بھڑکتے ہیں۔ والدین (النساء:36، بنی اسرائیل: 24-23) اقرباء (البقرۃ: 125، النساء: 36)، یتامیٰ و ایامیٰ (النساء: 2، 19، النور: 33-32)، مساکین و سائلین (الانعام:141، الروم:38، الذاریات:19) سے متعلق قرآنی آیات کے مطالعہ سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن ان کے حقوق کے تئیں کس درجہ حساس ہے اور کس پرزور انداز میں ان کی نگہداشت وادائیگی کی ہدایت دیتا ہے۔

یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے نہ صرف سماجی حقوق کی پامالی سے آپس میں اختلاف ونزاع پیدا ہوتا ہے اور معاشرہ میں اتحاد واتفاق کی فضا مکدر ہوجاتی ہے۔ معاشی حقوق پر دست درازی بھی اضطراب و بےچینی کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ ایک دوسرے سے نفرت وعداوت کا ماحول گرم کردیتی ہے اور آخرکار باہمی تعلقات کو کشیدہ بنادیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں مالی حقوق کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ بار بار ان کی ادائیگی پرزور دیا گیا ہے، خاص طور سے ناپ تول میں انصاف سے کام لینے، خرید و فروخت میں دیانت داری کے اصول اپنانے اور لین دین کے دیگر معاملات میں سچائی و ایمان داری کا مظاہرہ کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر یہ آیت ملاحظہ ہو: ’’**وافوا الکیل اذا کلتم وزنوا بقسطاس المستقیم ذالک خیر واحسن**

تاویلا‘‘ (بنی اسرائیل:35) (اور بھرپور پیمانہ سے ناپو اور سیدھی ترازو سے تولو، یہی بہتر ہے اورانجام کے لحاظ سے بہت اچھا ہے)۔ ’’**اقیموا الوزن بالقسط ولاتخسروا المیزان**‘‘ (الرحمٰن:9) (اورانصاف کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو اور تول میں کمی نہ کرو)۔

قرآن کی یہ ہدایت (جن کا ماحصل لین دین میں راست روی و دیانت داری یا مالی حق کی پوری پوری ادائیگی ہے) بجاطور پر تمام مالی معاملات پر منطبق کی جاسکتی ہے۔ان پر عمل کے جو بہترین ثمرات سامنے آتے ہیں اوراس کی خلاف ورزی معاشرہ میں جو فتنہ و فساد برپا کرتی ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

اوپر کی تفصیلات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے سماجی ومعاشی حقوق کے تحفظ، عدل وانصاف کے قیام اوراس کے توسط سے معاشرہ میں امن وامان اور باہمی اتحاد واتفاق کی برقراری کو حددرجہ اہمیت دی ہے۔اس پر مزید ہدایت اس امر سے ملتی ہے کہ قرآن نے ان تمام باتوں کو ممنوع قرار دیا ہے جو کسی کی جان، مال وآبرو کو ضائع کرنے یا نقصان پہنچانے کا ذریعہ بنتی ہیں اور نتیجہ کے طور پر معاشرہ کے امن وامان کو متاثر کرتی ہیں یا بالکل غارت کردیتی ہیں۔ ان ممنوعات میں ان چیزوں کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ ناحق کسی کو قتل کرنا (الاعراف:152)، چوری کرنا (المائدۃ:38)، ناجائز طور پر کسی کا مال استعمال کرنا (النساء: 29)، ناپ تول میں کمی کرنا (المطففین:3)، بخل کرنا (بنی اسرائیل:29)، فضول خرچی کرنا (بنی اسرائیل:26)، خیانت کرنا (الانفال:28-27)، زنا کرنا (بنی اسرائیل:32)، زنا کی تہمت لگانا (النور: 33)، مذاق اڑانا (الحجرات: 11)، برے لقب سے یاد کرنا (الحجرات: 11)، غیبت کرنا و بدگمانی کرنا (الحجرات: 12)، چغل خوری کرنا (القلم: 11-10)، عیب جوئی کرنا (الحجرات:12)، کسی کو حقیر سمجھنا (لقمان:18)، اترانا وغرور کرنا (بنی اسرائیل:37، لقمان:18، قصص:76)، یتیم وسائل کو جھڑکنا (الضحیٰ:10-9)، ظلم و زیادتی میں کسی کی مدد کرنا (المائدۃ:2)، اور جھوٹ وگڑھی ہوئی بات کہنا (الحج:30)۔

عدل کو عملی شکل دینے کی ضرورت:

ان ممانعتی احکام پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں جن باتوں سے منع کیا گیا ہے وہ خود لوگوں کے مختلف قسم کے سماجی و معاشی حقوق پر دست درازی اور ان کے ساتھ زیادتی و ناانصافی کی واضح مثالیں ہیں۔ دوسرے یہ لوگوں میں آپس میں شدید اختلاف اور بغض و عداوت کو جنم دیتی ہیں اور اس طرح مزید ظلم و زیادتی اور ناانصافی کے واقعات کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اس لیے قرآن کریم بار بار اس کی تاکید کرتا ہے کہ اللہ کے بندے ایک دوسرے کی جان و مال اور عزت و آبرو کا پورا پورا پاس ولحاظ رکھیں اور ان سے کوئی ایسا عمل صادر نہ ہو جو انھیں مجروح کرے یا بالکل تباہ کردے۔ اس لیے یہ لازمی طور پر ان کی انفرادی و معاشرتی زندگی کے لیے سم قاتل ہوگا اور ان کے چین و سکون کو غارت کر کے ان کی زندگی کو اجیرن بنادے گا۔

مختصر یہ کہ قرآن کریم نے عدل کا بہت وسیع و جامع تصور پیش کیا ہے۔ اس کتاب عظیم و عزیز کی رو سے گفتگو و طرزِ عمل، تعلقات و معاملات، معاشرتی مداہدات و مالی لین دین باہمی نزاعات کا تصفیہ اور مقدمات کا فیصلہ ہر باب میں انصاف کے اصولوں پر عمل مطلوب ہے۔ اسی پر انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کی بہتری منحصر ہے۔ اسی سے باہمی تعلقات خوشگوار و پائیدار ہوں گے۔ اسی سے معاشرتی امن و امان کو بقا و استحکام نصیب ہوگا اور بالآخر ماحول پرسکون و فرحت بخش بن جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ذاتی، ملّی، قومی و بین الاقوامی ہر سطح پر عدل کے باب میں قرآن کی ان روشن ہدایت اور حقوق انسانی سے متعلق اس کی قیمتی تعلیمات کو عملی جامہ پہنانے کی اشد ضرورت ہے۔ انسانیت کی بھلائی اسی میں ہے اور عالمی امن و سکون کے قیام کا واحد ذریعہ یہی ہے۔ اللہ کرے ہمیں اس حقیقت کو سمجھنے و سمجھانے کی توفیق نصیب ہو۔

☆☆

قرآن کریم اللہ کا کلام ہے

(چند دلائل)

● پروفیسر رضاء اللہ خاں

یوں تو اہل ایمان کی نظر میں قرآن حکیم بلا کسی دلیل کے بھی اللہ کا وہ کلام ہے جو قلب محمد الرسول اللہ پر بذریعہ جبریل امین تقریباً ۲۳ ربرس کے عرصہ میں نازل ہوا۔ قرآن چونکہ ''ھدی للناس'' ہے یعنی تمام نوع انسانی کی رہنمائی کے لیے نازل ہوا جس میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی کوئی تفریق نہیں ہے، لہٰذا اگر چند دلائل قرآن کے کلام اللہ یا آسمانی کتاب ہونے سے متعلق یہاں بیان کیے جائیں تو یہ نکات عام انسانوں کے لئے موضوع تفکر و تدبر ہو سکتے ہیں۔ عربی زبان میں'' قرأ'' کے معنی پڑھنے کے ہیں اس اعتبار سے قرآن کے ایک معنی ہوئے پڑھی جانے والی کتاب قرآن اپنے اس نام کے اعتبار سے اسم با مسمّٰی یوں ہے کہ یہ دنیا کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ تقریباً پندرہ سو برس کی طویل مدت کے بعد بھی یہ کتاب ہر قسم کی تحریف سے پاک و صاف ہے۔ اس اعجاز کی وجہ کوئی انسانی کاوش نہیں ہے، بلکہ اللہ کا وہ وعدہ ہے جو اس نے قرآن میں خود فرمایا ہے:

''انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحافظون'' (بلاشبہ قرآن ہم نے نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں)۔

ہم خوب واقف ہیں کہ اللہ نے ابتدائی دور میں اس قرآن کی حفاظت کا انتظام اس طور پر کیا کہ اس قرآن کو حفاظ کے ذریعہ محفوظ کر دیا اور تا قیامت ایسا ہی رہے گا۔ دنیا کی اور

کسی بھی کتاب کو حفظ کرنا ناممکن ہے اور یہ اعجاز صرف قرآن کو حاصل ہے۔ مزید یہ کہ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں یقین کامل کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ کمپیوٹر وسی ڈی کی ایجاد سے قرآن آئندہ بھی کسی بھی قسم کی تحریف سے پاک رہے گا۔ قرآن کے علاوہ کسی بھی کتاب کو یہ درجہ حاصل نہیں کہ اس کو حفظ کیا جائے یا کیا جاسکے۔ بار بار ہزار بار پڑھ کر بھی حتیٰ کہ بغیر سمجھے ہوئے بھی پڑھنے کے باوجود لذت کلام برقرار رہتی ہے۔ اس کلام میں ایک خصوصی ملکوتی غنا پائی جاتی ہے۔ عربی خطاطی کی معراج بھی قرآن کی دین ہے۔

آج سے پندرہ سو سال قبل کا دور ادب کا دور تھا۔ قرآن نے اپنے منکروں کو ایک ادبی چیلنج دیا۔ پہلے کہا: ایسی ایک کتاب تم بھی لے آؤ، پھر کہا کہ ایسی دس سورتیں ہی لے آؤ اور آخر میں کہا: اگر تم کو کوئی شبہ ہمارے نازل کردہ کلام میں ہے جو ہم نے اپنے بندے (محمدؐ) پر نازل کیا ہے تو تم اس کے جیسی ایک ہی سورۃ لے آؤ اور اس کام میں اپنے سارے حمایتیوں کو بھی شامل کرلو، اگر تم سچے ہو۔ اور پھر یہ بھی کہا کہ تم ایسا نہیں کرسکو گے، بلکہ ہرگز ایسا نہ کرسکو گے۔ (البقرۃ: 24-23) قرآن کے اس چیلنج کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ قرآن اگر اللہ کی نازل کردہ کتاب نہیں تو پھر یہ انکشافی مضامین کہاں سے آئے اور کس نے لکھے۔ قرآن پر ایمان نہ لانے والوں نے بھی ہمیشہ اس کو ایک منفرد کتاب تسلیم کیا اور کہا کہ یہ محمدؐ کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ ایسا ان لوگوں نے جان بوجھ کر حسد وتکبر کی بنا پر کہا، چونکہ حضور کا امی ہونا ہی اس بات کی واضح دلیل تھی کہ ایسی فصیح و بلیغ کتاب آپ نہیں لکھ سکتے تھے۔

قرآن کا اسلوب بتاتا ہے کہ حضور خود کلام نہیں کررہے ہیں:

اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ یہ قرآن نعوذ باللہ محمدؐ نے لکھا ہے اور قرآن اور محمدؐ دونوں یہ دعویٰ کریں کہ یہ کتاب اللہ ہے تو منطقی طور پر یہ کتاب اللہ ہی کی تسلیم کی جائے گی۔ قرآن

وحدیث کا مطالعہ کرنے والا شخص جس کو عربی کی مہارت ہو دونوں کلاموں میں واضح فرق سمجھ سکتا ہے۔ حدیث نبی کا فرمان ہے اور قرآن فصاحت وبلاغت کی معراج ہے اور دونوں کا فرق قرآن کے کلام اللہ ہونے کی واضح دلیل ہے۔ قرآن میں اس طرح کے مضامین مثلاً اے نبی! آپ نہیں جانتے تھے ہم نے آپ کو بتلایا، سکھایا یا مثلاً سورۃ الضحیٰ کی آیت 7، 8 میں 'پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ سجھائی'، 'پایا تجھ کو مفلس پھر غنی کردیا' یا سورۃ کوثر کی آیت نمبر ایک ''بیشک ہم نے عطا کیا آپ کو کوثر'' یہ مضامین واضح کرتے ہیں کہ یہ کلام حضورؐ خود نہیں کررہے، بلکہ کوئی اور آپ سے مخاطب ہے۔ اپنی کتاب میں اپنے بارے میں کوئی یہ لکھے کہ وہ نہ جانتا تھا کسی نے اس کو سکھلایا، بعید از قیاس ومنطق ہے۔

قرآن کی عظمت کا ثبوت ہے کہ قرآن اللہ کی نشانیوں کو سمع، بصر اور فواد کی کسوٹی پر ناپ کر اللہ کے وجود کو تسلیم کرنے کی دعوت دیتا ہے، تاکہ اسلامی معاشرہ اوہام سے پاک رہے۔

دنیا میں اب قرآن قابل عمل ہے:

قرآن ہدایت کی کتاب ہے لیکن اس کے مضامین انسانی معاشرے کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں اور سائنس کے ایسے حقائق کی نشان دہی اس میں موجود ہے جو آج سے پندرہ سو سال قبل انسان کے لیے جاننا ناممکن تھا۔ قرآن میں ایسے انکشافات کی ایک لمبی فہرست موجود ہے جن کا احاطہ کرنا اس مضمون میں ممکن نہیں۔ مورس بکائی، کیتھ مورے اور دیگر لوگوں نے ان پر غور وفکر کیا اور آج بھی یوروپ اور امریکہ میں لوگ جو بڑی تعداد میں ایمان لارہے ہیں اور اسلام جو اس وقت سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے اس کی بنیاد قرآن ہے۔ آج جو چند کتابیں مثلاً زبور، توریت اور انجیل آسمانی کتاب ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں، قرآن ان کے کتاب اللہ ہونے کی اور جن انبیاء پر نازل ہوئیں ان کے نبی ہونے کی تصدیق کرتا ہے، لیکن یہ کتابیں تحریف شدہ ہونے کی بنیاد پر آج قابل عمل

نہیں۔قرآن اوّل تو کسی بھی تحریف سے پاک ہے اور دوسرے یہ کہ آسمانی کتابوں کا آخری (Latest) ایڈیشن ہے، لہٰذا یہی نسخہ قابل عمل بھی ہونا چاہیے۔جن چیزوں کے بارے میں قرآن میں کوئی واضح حکم نہیں ہے ان کے بارے میں اس سے پہلے کی کتاب کے احکام ہی نافذ ہوں گے۔مثلاً رجم کی سزا قرآن میں نہیں اور یہ حکم تورات سے نافذ العمل ہے۔یہ ثابت کرتا ہے کہ قرآن آسمانی کتابوں اور نبیوں کی تصدیق کرتا ہے اور از خود بھی آسمانی کتاب ہے۔حضورؐ کے وصال کے بعد سے اب تک تاریخ میں چند افراد نے اپنے طور پر نئے مذاہب اور دین پیش کرنے اور خود ان کا پیشوا ہونے کی ناکام کوششیں کیں اور ان کے یہ دعوے وقتی ثابت ہوئے، لیکن کسی کتاب کے آسمانی کتاب ہونے کا کوئی دعویٰ قرآن کے بعد سے اب تک کسی نے پیش ہی نہیں کیا ہے اور آج ہم پھر غور وفکر کریں تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ رہتی دنیا تک اب کوئی کتاب نہ تو ایسا دعویٰ کرے گی اور نہ ہی ایسا کوئی دعویٰ کسی کو بھی قابل قبول ہوگا۔

اپنی اس تحریر کا اختتام ہم قرآن کی سورہ حٰم السجدہ کی آیت 53 سے کریں گے جس کا ترجمہ ہے: ''ہم دکھلائیں گے ان کو اپنی نشانیاں دنیا میں اور خود ان کی جانوں میں یہاں تک کہ ان پر سچائی کھل جائے۔'' اگر قرآن کے اس دعویٰ کا ہم گہرائی سے مطالعہ کریں تو اپنے آپ میں ایک بہت بڑا اور سچا دعویٰ ہے۔اسلامی فتوحات، روم کی بادشاہت کی مغلوب ہوکر غالب ہونے کی پیشین گوئی جیسے سارے قرآنی دعوے سچے ہوئے۔انسانی تخلیق کے رحم مادر میں مختلف مراحل کی تفصیل ہو، سیاروں کے نظام کی وسعت ہو، پہاڑوں کے لیے نصب کرنے کے لفظ کا استعمال ہو، ہواؤں اور بادلوں کا مسخر ہونا، سورج کو سراج اور چاند کو نور بتانا ہو۔یہ سب ایسی حقیقتیں ہیں جن پر آج تدبر کرنے سے چند سائنسی حقائق کا پندرہ سو برس قبل ذکر کردینا قرآن کے آسمانی کتاب ہونے کی دلیل ہے۔سورہ قیامہ کی اس آیت پر غور کریں: ''**بلی قادرین علی ان نسوی بنانہ**'' (ہاں ہم قادر ہیں ان کی انگلیوں کے

پور تک بنانے پر) کیا اس سے فنگر پرنٹ کا اصول نہیں نکلتا کہ جب یوم الآخر میں اٹھایا جائے گا تو اصل پہچان اس فنگر پرنٹ سے ہی ہوگی۔ایک اور آیت کے ایک حصہ پر غور کریں: ''ہم ان کی کھالوں کو بدل بدل کر آگ سے جلانے کا عمل جاری رکھیں گے۔'' آج میڈیکل سائنس بتاتی ہے اصل تکلیف کھال کی سطح جلنے کی ہوتی ہے، گہرے زخم کے جلن کے مقابلہ میں۔یعنی ''عذاب الحریق'' اس طور پر ہوگا کہ عذاب الیم بھی ہو۔''**وکل فی فلک یسبحون**'' کے آج معنی ہیں کہ ہر چیز اپنے مدار میں تیر رہی ہے۔متحرک ہے، گامزن ہے اور یہ بھی معنی ہے کہ تسبیح کرتی ہے۔سائنس کی ترقی قرآنی آیات کو واضح سے واضح تر کرتی چلی جائے گی اور قرآن کا دعویٰ ہم ان کو اپنی نشانیاں دنیا میں دکھلائیں گے (آفاق میں) اور خود ان کی جانوں میں یہاں تک کہ ان پر واضح ہوجائے حق، بھی مستقبل میں سچا ہوتا چلا جائے گا۔آج قرآن کی جو آیات متشابہات کے زمرہ میں ہیں کل وہ محکم شکل میں انشاءاللہ آجائیں گی اور قرآن کی حقانیت ثابت ہوتی جائے گی، البتہ اس پر ایمان باذن اللہ صرف سلیم العقل اور سلیم الفطرت لوگ ہی لائیں گے۔

☆☆

قرآن کا تصور جہاد

(انسانی حقوق کے دفاع کی کوشش)

● شارق الاسلام

تمام مشکلات کا حل:

اس دنیا میں مختلف قسم کے ادیان و مذاہب اور مختلف قسم کے افکار و خیالات پائے جاتے ہیں۔ اسلام اس لحاظ سے ان تمام میں نمایاں ہے کہ یہ کسی انسان کے ذہن وفکر کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ ہی کسی مخصوص خطہ ارض کے لیے ہے، بلکہ یہ مالک حقیقی کا عطا فرمودہ ضابطہ ہے اور ابتدائے آفرینش سے لے کر قیامت تک پوری دنیائے انسانیت کے لیے ہے۔ آج ہم اکیسویں صدی کی دہلیز پر دستک دے رہے ہیں۔ علوم وفنون کے دائرے وسیع ہو گئے ہیں۔ معیار زندگی میں انقلاب آ گیا ہے۔ انسان سمندروں، خلاؤں اور آسمانوں میں اپنی دنیا بسانے پر قادر ہو گیا ہے، لیکن اس امر میں بھی صداقت ہے کہ انسانی زندگی تباہی کے دہانے پر ہے۔ سفاکیت کا دور دورہ ہو گیا ہے، آدمی آدمی کے لیے بھیڑیا بن گیا ہے۔ لاکھوں انسان پل بھر میں موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے ہیں۔ عدالت میں بے انصافی ہے، معاشرے میں ظلم و بربریت ہے اور حکومت وسلطنت میں خودغرضی و مفاد پرستی کا بول بالا ہے۔ خطرات وخدشات کے بادل ہمہ وقت منڈلا رہے ہیں اور انسان موت وحیات کی کشمکش سے دوچار ہے۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ آج انسان اس نسخۂ شافی سے اعراض کر رہا ہے جو اس کے مرض کا تریاق ہے۔ اللہ کا عطا کردہ دین مکمل نظامِ حیات ہے

اور اسی ضابطہ زندگی کو پامال کیا جا رہا ہے۔ اگر ہم سارے مسائل ومشکلات کا حل احکامِ الٰہی میں ڈھونڈیں تو کامیابی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔

حق دفاع انسانی حق ہے:

دفاع سے مراد ہر اس چیز کی حفاظت کی خاطر جارح کو پیچھے پھینک جانا ہے جس کی حفاظت ضروری ہو، خواہ جانی ہو یا مالی، عقیدے سے متعلق ہو یا آزادی سے، بہرحال قانونی نقطہ نظر سے دفاع ایک حق ہے جو انسانوں کو عطا کیا گیا ہے، تاکہ قانون کو پس پشت ڈال کر تجاوز کرنے والے جارح کے شر سے انسان اپنا دفاع کر سکے۔ شر پسند افراد قانون شکنی کر کے عوام کی جان و مال اور عزت وآبرو سے نہ کھیل سکیں۔ اپنا جائز حق ودفاع ایک ایسا فطری امر ہے جس سے صرف انسان ہی نہیں، بلکہ ذی روح بہرہ مند ہے، کیونکہ ہر ذی روح اپنی بقا کی خاطر مجبور ہے کہ ان تمام مشکلات اور پریشانیوں کا مقابلہ کرے جن سے اس کی زندگی و بقا خطرے میں پڑ سکتی ہے اور ایسے حالات میں اختلاف اور ٹکراؤ قدرتی بات ہے اور اگر کوئی ذی روح اس سے مستثنیٰ ہو تو اس کی تباہی یقینی ہے۔ حق دفاع کا فطری ہونا اس کی عام مقبولیت کا باعث ہے۔ ہر انسان اس کو تسلیم کرتا ہے۔ ہر فرد، ہر معاشرہ، ہر دبستان اور ہر قانون جارح سے مقابلہ جائز قرار دیتا ہے۔ دنیا کا کوئی قانون مسلمہ حقوق سے دفاع کو جرم نہیں سمجھتا۔ مذہب اسلام نے بھی انسانوں کے اس حق کو تسلیم کیا ہے اور اس کے استعمال کو انسانوں کی بقا کا ضامن قرار دیا ہے اور اس کے فطری ہونے کا اعلان کیا ہے:

”**ولو لا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض**“. (**البقرۃ: ۲۵۱**) (اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو بعض سے نہ روکتا تو زمین فساد زدہ ہو جاتی)۔

یہ آیت شریفہ انسانوں کو شر پسندوں کے شر کی سرکوبی کی ہدایت کرتی ہے اور روئے زمین پر انسانوں کے برپا کیے ہوئے فتنہ وفساد کی روک تھام کا حکم دیتی ہے۔ ایک دوسری

جگہ کتاب مبین میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: دفاع دینی مظاہر اور عبادتی مراکز کی بقا اور نتیجتاً بقائے توحید کا باعث ہے۔

جہاد کا حقیقی مفہوم:

لفظ جہاد کے لغوی معنی ہیں طاقت و اختیار کے ساتھ جدوجہد کرنا۔ قرآن پاک میں بھی لفظ جہاد اسی معنی میں کئی بار استعمال ہوا ہے، لیکن اصطلاحی طور پر اس سے مراد اسلام دشمنوں سے جنگ اور راہِ خدا میں جان و مال کو قربان کر دینا ہے اور اگر ہم اس کے حقیقی پس منظر پر نگاہ ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنی انتہائی کوشش صرف کر دینا ہے۔ یہ جنگ کے ہم معنی نہیں۔ جنگ کے لیے تو قتال کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جہاد اس سے وسیع تر مفہوم رکھتا ہے اور اس میں ہر قسم کی جدوجہد شامل ہے۔ یہاں تک کہ جان کی بازی لگانے کی ضرورت ہو تو اس میں بھی دریغ نہ کرے اس کا نام جہاد ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ صرف اللہ کی رضا کے لیے اور اس غرض کے لیے کیا جائے کہ اللہ کا دین اس کی زمین پر قائم ہو اور اللہ کا کلمہ سارے کلموں پر غالب آجائے۔ اور یہ جب ممکن ہوگا جب ہمارے اندر بدی کو خود سے دفاع کرنے کا احساس پیدا ہو اور اگر یہ احساس کسی قوم کا شیوہ بن جائے تو وہ قوم اس کے مقابلے میں عیش و آرام، اپنی دولت و ثروت، اپنی نفسانی لذات اور اپنی جان کی محبت غرض کسی بھی چیز کو عزیز نہ رکھے تو وہ کبھی ذلیل و خوار نہیں رہ سکتی اور اس کی عزت کو کوئی قوت پامال نہیں کر سکتی۔ حق کے آگے سر جھکانا اور باطل کے آگے سر جھکانے کے بجائے موت کو ترجیح دینا شریف قوم کا خاصہ ہوتا ہے اور یہ شرافت کا کم سے کم درجہ ہے۔ اس رمز کو سمجھانے کے لیے اللہ نے بار بار کتابِ مبین میں ان قوموں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے بدی کے خلاف جہاد کرنے میں جان و مال اور لذاتِ نفسانی کا ٹوٹا دیکھ کر اس سے جی چرایا اور بدی کا تسلط قبول کر کے اپنے اوپر ہمیشہ کے لیے خسران و

نامرادی کا داغ لگا لیا، ایسی قوموں کو خدا ظالم قوم کہتا ہے۔

جہاد کے اقسام:

جہاد کی متعدد قسمیں ہیں جو دفاع ہی کی حیثیت رکھتی ہیں اور قرآن پاک میں قتال و جہاد کے عنوان سے بیان ہوئی ہیں۔

(۱) ان دشمنوں کے مقابلے میں اسلام کے عز و وقار اور حیثیت و آبرو کا دفاع جو دین کی بنیادوں کو منہدم کر کے الحاد و مجوسیت اور نصرانیت و یہودیت وغیرہ کی شکل میں کفر و لادینی پھیلانا چاہتے ہیں جیسا کہ اسپین میں رونما ہوا تھا۔

(۲) ان مسلمانوں کا دفاع جو کسی علاقے میں کافروں سے برسرِ پیکار ہوں اور یہ خطرہ ہو کہ کفار اُن پر غلبہ پالیں گے۔ ایسے موقع پر اتحاد و اخوت اسلامی کا تقاضہ ہے کہ مسلمانوں کے دفاع کی خاطر دشمنوں سے جنگ کی جائے۔

(۳) اسلامی علاقوں پر قابض یا مسلمانوں کے عقائد پر مسلط غاصب دشمنوں کی پسپائی اور اخراج کے لیے جہاد، کیونکہ غیروں کے اقتدار سے نجات اور مسلمانوں کی عزت و آزادی کی بحالی تمام مسلمانوں کا فریضہ ہے۔ قرآن پاک نے جو مختلف مقامات پر مقاصد جہاد بیان فرمائے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) دفاع

(۲) دفع فتنہ۔ اس میں دفاع کے ساتھ فتنہ کو ختم کرنا ہی شامل ہے۔

(۳) حکومت الٰہی کا قیام و اثبات اور سرکشوں کی سرکوبی و اصلاح۔

(۴) خدائی نظام کی برقراری اور ممکنہ و آئندہ دشمنوں کے حملے کی پیش بندی۔

(۵) روئے زمین پر فتنہ و فساد کی روک تھام۔

(۶) مراکز عبادت اور دینی مظاہر کا تحفظ۔

(۷) انسدادِ ظلم وحمایت مستضعفین۔

یہ تو کچھ جہاد کے اغراض و مقاصد تھے، اگر ہم مجموعی طور پر جہاد کا مقصد سمجھیں تو یہ انسان کے فطری مسلمہ حقوق کا دفاع ہے اور عام انسانوں کا فطری حق ہے۔ بلاشبہ جہاد کا اوّل مرحلہ نفس امارہ سے شروع ہوتا ہے اور اس لحاظ سے اسے افضلیت حاصل ہے کہ نفس امارہ کو شکست دینے کے بعد جہاد کے وسیع ترین عملی میدان کو سر کرنا نسبتاً آسان ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ اس کی آخری منزل جو جاں فروشی یا جاں نثاری سے عبارت ہے، بلا پس و پیش حاصل کرلی جاتی ہے۔ نفسانی خواہشات کو پامال کرنا، مخصوص اوقات میں امر بالمعروف نہی عن المنکر کرنا اور خلوص وللّٰہیت کے ساتھ انفرادی یا اجتماعی طریقے سے آبادیوں کا نکل کر پیغام حق سنانا بلاشبہ داعی حق کے فرائض و واجبات میں ہیں اور جہاد فی سبیل اللہ کے زمرے میں آتے ہیں، لیکن فتنہ انگیزیوں اور فسادکاریوں کا سدباب کرنے، اللہ کی زمین کو عدل وانصاف اور امن وسکون کا گہوارہ بنانے اور اللہ کے دین کو تمام عالم پر غالب کرنے کے لیے ایک آخری کوشش بھی ہے اور جو قتال فی سبیل اللہ کے نام سے جانی جاتی ہے جو آخری صورت میں اختیار کی جاتی ہے۔ یہ عام قتال یا جنگ کے ہم معنی نہیں ہے۔ اس کا مقصد جوش وانتقام میں خونریزی وخونخواری نہیں، جیسا کہ یورپین مفکرین نے اسلام کے رخ زیبا کو داغدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ آج سارا عالم انسانی ظالموں اور مظلوموں، آقاؤں اور غلاموں میں بٹا ہوا ہے۔ تمام دنیا کی اخلاقی وروحانی زندگی بد سے بدتر ہوتی چلی جارہی ہے۔ ایسے میں امت مسلمہ کا فریضہ ہے کہ اسلامی فریضے کے پیش نظر قومیت، نسل، زبان اور جغرافیائی اختلافات سے صرف نظر کرتے ہوئے وحدت اسلامی کے جھنڈے تلے متحد وہم آہنگ ہوکر اسلام ومسلمین کے ظالم وجابر دشمنوں کا مقابلہ کرنے کو اٹھ کھڑے ہوں اور خود اس بشارت ربانی کی تصدیق کریں:

"يد الله فوق أيديهم".

اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہوجائیں تو پوری دنیا میں اسلامی حکومت قائم (عدل و انصاف کی بالادستی) ہوگی اور خداوند کریم کا یہ وعدہ پورا ہوگا:

"ليظهره على الدين كله ولو كره المشركون". (سورة الصف: ۹)

بصورتِ دیگر ہم مظلوم ومقہور بن کر اس دنیا میں رہیں گے، تو حفیظ میرٹھی کے اس شعر کے مصداق ہوجائیں گے:

میدانِ کارزار میں آئے وہ قوم کیا
جس کا جوان آئینہ خانے میں رہ گیا

☆☆

نباتات قرآنی ''المن''

(ایک تحقیقی جائزہ)

● ڈاکٹر منور حسن کمال

من اور سلویٰ کی تحقیق:

عصر جدید میں دنیا کے تمام علوم کے ساتھ علم نباتات نے بھی بہت ترقی کی ہے اور نباتات کی حقیقتوں کے بہت سے سربستہ حقائق منظر عام پر آچکے ہیں۔اس شاندار ترقی کی اساس اور بنیاد گزار مسلمان ہی تھے، جنھوں نے اس موضوع پر تحقیقات کا آغاز کر کے دنیائے علم کو نئے نئے علوم وفنون سے آشنا کر دیا اور اس میدان میں انھیں آگے بڑھانے والا قرآن عظیم تھا، جس نے اپنی بے شمار آیات کے ذریعہ اس راہ میں ان کی ہمت افزائی کی۔قرآنی ارشادات زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہیں، اس میں تاریخ عالم کے ایسے ایسے واقعات درج ہیں جن کا آج کی سائنس محض گمان ہی کر سکتی ہے۔

قرآن کریم میں گزشتہ نبیوں کی امتوں کے قصوں سے بات کو سمجھانے کی کامیاب کوششیں کی گئی ہیں۔ یہاں بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اتارے گئے من و سلویٰ کا خصوصی تذکرہ پیش ہے۔

من کے لفظی معنی احسان اور انعام کے ہے، لیکن اصطلاح میں اسے ایک قسم کے گوند سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے وادیٔ سینا میں بنی اسرائیل کے گھر اس وقت نازل فرمایا تھا جب حضرت موسیٰ ان کو فرعون سے نجات دلانے کے لیے ساتھ لے کر نکل کھڑے

ہوئے تھے۔ان کی تعداد لاکھوں نفوس پر مشتمل بتائی جاتی ہے۔'' من '' کا ذکر قرآن کریم میں تین مرتبہ آیا ہے۔اس سلسلے میں اکثر مفسرین قرآن کی رائے یہ ہے کہ وہ کوئی غیر طبعی چیز نہ تھی بلکہ پودوں سے حاصل کردہ ایک شئے تھی جو شہد سے زیادہ میٹھی اور لذیذ تھی۔

سب سے پہلے ابوریحان محمد ابن البیرونی، المعروف البیرونی نے اس رائے کا اظہار کیا کہ ''حاج'' نامی پودے سے حاصل کردہ گوند جس کو ترنجبین کہتے ہیں، اصلی من کا مترادف کہا جاسکتا ہے۔ترجبین فارسی لفظ ترانگبین کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔انگبین فارسی میں شہد کو کہتے ہیں۔البیرونی کی تحقیقات کے بعد 1822 میں عظیم سائنس داں برکھارڈ نے (جو بعد میں شیخ برکات کے نام سے مشہور ہوا) لکھا ہے کہ من کی پیداوار کے ذمہ دار کچھ خاص قسم کے کیڑے ہوتے ہیں، جو بعض درختوں کی چھال میں سوراخ کر دیتے ہیں اور ان سے شدید گرمی کے دوران ایک رطوبت نکلتی ہے، جو رات کی برودت میں درختوں پر جم جاتی ہے۔ برکھارڈ کے خیال کی تصدیق 1829 میں مسٹر برگ اور میہم پریش نامی سائنس دانوں کی ایک رپورٹ سے ہوئی۔

قرآن کریم کی تفسیروں میں بھی من سے متعلق بہت دلچسپ تحقیقات سامنے آتی ہیں۔ان کا ایک مختصر جائزہ پیش ہے: نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: **کمبھی** (الکماۃ) المن، کا حصہ ہے۔من درحقیقت جنت سے ہے، اس کا پانی آنکھوں کے لیے شفا ہے۔ابن قیم جوزی لکھتے ہیں: عربی میں '' **الکماۃ** '' کے معنی سانپ کے چھتری کے بھی ہیں اور عرب اکثر اس کو زمین کی چیچک کہا کرتے ہیں۔آگے رقم طراز ہیں کہ مسیحی اور بوعلی سینا نے ''القانون'' میں لکھا ہے کہ '' **الکماۃ** ''کا پانی آنکھ کو جلا بخشتا ہے۔

قرآن کریم میں اس آیت کے ذیل میں مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:'' **و ظللنا علیکم انضمام و انزلنا علیکم المن والسلوی کلو من طیبٰت مارزقنکم وما ظلمونا ولکن کانوا انفسھم یظلمون**'' (**سورہ بقرہ: آیت نمبر.۵۷**)

(اور پھر جب ایسا ہوا تھا کہ صحرائے سینا کی بے آب و گیاہ سرزمین میں دھوپ کی شدت اور غذا کے نہ ملنے سے تم ہلاک ہوجانے والے تھے تو ہم نے تمہارے سروں پر ابر کا سایہ پھیلا دیا اور من اور سلویٰ کی غذا فراہم کردی۔ (تم سے کہا گیا) خدا نے تمہاری غذا کے لیے جو اچھی چیزیں مہیا کردی ہیں، انھیں بہ فراغت کھاؤ اور کسی طرح کی تنگی محسوس نہ کرو (لیکن اس پر بھی تم اپنی بدعملیوں سے باز نہ آئے، غور کرو!) تم نے اپنی ناشکریوں سے ہمارا کیا بگاڑا)۔ (ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن، جلد دوم، ص34)

ابوالکلام آزاد نے اس کے ذیل میں لکھا ہے: (من درخت کا شیرہ ہے جو گوند کی طرح جم جاتا ہے اور خوش ذائقہ و مقوی ہوتا ہے۔ سلویٰ ایک پرند ہے۔ یہ دونوں چیزیں کوہ طور کے اطراف و جوانب میں بکثرت ہوتی ہیں) (ایضاً، ص821)

سید قطب شہید نے بھی اس پر روشنی ڈالی ہے۔ اپنی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' میں لکھا ہے: ''صحرا کا موسم ایسا ہوتا ہے کہ اگر بادل اور بارش نہ ہو تو وہ کھولتے ہوئے جہنم کی مانند ہوتا ہے۔ اس سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہوتے ہیں، لیکن اگر صحرا میں بارش ہوجائے اور مطلع ابر آلود ہو تو اس کا موسم تر و تازہ اور نہایت خوش گوار ہوتا ہے، جس میں جسم و روح دونوں فرحت محسوس کرتے ہیں۔ روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ''من'' کا انتظام فرمایا جو درختوں پر ہوتا تھا اور شہد کی طرح میٹھا ہوتا تھا، نیز اللہ تعالیٰ نے ان کی خوراک کے لیے سلویٰ پرند کی وافر مقدار (تعداد) پیدا کردی، جو ان کے گھروں کے قریب بڑی مقدار (تعداد) میں پائے جاتے تھے۔ ان دو چیزوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے ایسے لذیذ کھانے کا بندوبست کیا جس کی نظیر دنیا میں نہیں تھی۔''
(جلد اوّل، ص105)

علامہ ابومحمد عبدالحق حقانی توریت کے حوالے سے رقم طراز ہیں: ''من'' دھنیہ کے دانوں کی طرح اوس جیسی بڑی شیریں ہوتی تھی، جیسے کہ ترنجبین۔ بنی اسرائیل کے خیموں

کے آس پاس جم جاتی تھی، اس کو اٹھا لیتے اور توے پر روٹیوں کی طرح پکا پکا کر کھاتے تھے، جو کہ بے مشقت ملتی تھی، اس لیے مفت اور بے مشقت چیز کو لوگ من و سلویٰ کہتے ہیں اور شیریں اور لذیذ بھی تھی، اس لیے عمدہ غذا کو بھی من و سلویٰ سے تعبیر کرتے ہیں، مگر بنی اسرائیل لذیذ اور بے محنت چیز کو ہر روز اور مسلسل کھاتے کھاتے گھبرا گئے اور مستی میں پیاز اور ترکاریاں موسیٰ سے مانگنے لگے۔'' (تفسیر حقانی، جلد اوّل، ص206)

اس سلسلہ میں محمد لقمان سلفی ''تیسیر الرحمٰن لبیان القرآن'' میں رقم طراز ہیں: ''من شبنم کی مانند ایک چیز تھی جو آسمان سے اترتی اور درختوں اور پتھروں پر جم جاتی تھی اور مزے میں شہد کی مانند میٹھی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ کماۃ (سانپ کی چھتری) من کی ایک قسم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے اتارا تھا۔ سلویٰ بٹیر کے مشابہ ایک چڑیا تھا۔'' (جلد اول، ص42)

'کتاب مقدس' (عہد نامہ قدیم) میں لکھا ہے: ''شام کو اتنی بٹیریں آتی تھیں کہ ان کی خیمہ گاہ کو ڈھانک لیتی تھیں اور صبح کو خیمہ گاہ کے آس پاس اوس پڑی ہوتی تھی، جب وہ سوکھ گئی، کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول مول گول چیز ایسی ہوتی جیسے ہالے کے دانے ہوتے ہیں، زمین پر پڑی ہے۔ بنی اسرائیل اسے دیکھ کر آپس میں کہنے لگے ''من'' کیوں کہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا ہے۔ ایک نے ان سے کہا یہ وہی روٹی ہے جو خداوند نے کھانے کو تم کو دی ہے۔'' (ص:69)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے تفہیم القرآن میں من کی تشریح اس طرح کی ہے: ''من اور سلویٰ وہ قدرتی غذائیں تھیں جو اس مہاجرت کے زمانے میں ان لوگوں کو چالیس برس تک مسلسل ملتی رہیں۔ من دھنیہ کے بیج جیسی ایک چیز تھی جو اوس کی طرح گرتی اور زمین پر جم جاتی تھی اور سلویٰ بٹیر کی قسم کے پرندے تھے۔ خدا کے فضل سے ان کی اتنی کثرت تھی کہ ایک پوری کی پوری قوم محض اپنی غذاؤں پر زندگی بسر کرتی رہی اور اسے فاقہ کشی کی مصیبت

نہ اٹھانی پڑی، حالانکہ آج کسی نہایت متمدن ملک میں بھی اگر چند لاکھ مہاجر یکا یک اتریں تو ان کی خوراک کا انتظام مشکل ہو جاتا ہے۔'' (جلد اوّل، ص78)

تفسیر ابن کثیر میں حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے لکھا ہے: ''اولوں کی طرح من ان کے گھروں میں اترتا تھے، جو دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا تھا، صبح صادق سے لے کر آفتاب نکلنے تک اترتا رہتا تھا، ہر شخص اپنے گھر بار کے لیے اتنی مقدار میں لے لیتا تھا، جتنا اس دن کافی ہو جائے۔ اگر کوئی زیادہ لے تو بگڑ جاتا تھا۔ جمعہ کا دن دو دن کا لے لیتے تھے، جمعہ اور ہفتہ کا، اس لیے کہ ہفتہ ان کا بڑا دن تھا۔ ربیع بن انسؒ لکھتے ہیں: من شہد جیسی چیز تھی، جس میں پانی ملا کر پیتے تھے۔ شعبی فرماتے ہیں: تمہارا یہ شہد اس من کا ستر واں حصہ ہے۔ غرض یہ ہے کہ ایک چیز تھی جو انھیں بلا تکلیف و تکلف ملتی تھی۔ اگر اسے صرف کھایا جائے تو وہ کھانے کی چیز تھی اور اگر پانی میں ملالی جائے تو پینے کی چیز تھی، اگر دوسری چیزوں کے ساتھ مرکب کر دی جائے تو اور چیز ہو جاتی تھی۔

''سلویٰ'' ایک قسم کا پرند ہے، چڑیا سے کچھ بڑا ہوتا ہے، سرخی مائل رنگ کا۔ جنوبی ہوائیں چلتی تھیں اور ان پرندوں کو وہاں لا کر جمع کر دیتی تھیں۔ بنی اسرائیل اپنی ضرورت کے مطابق انھیں پکڑ لیتے تھے اور ذبح کر کے کھاتے تھے۔ یہ دونوں چیزیں ان پر وادیٔ تیہ میں اترتی تھیں، جہاں انھوں نے اپنے پیغمبر سے کہا تھا کہ اس جنگل میں ہمارے کھانے کا بندوبست کیسے ہوگا۔ تب ان پر من وسلویٰ اتارا گیا۔'' (ص 97-96)

حکیم الامت مولانا اشرف تھانوی نے ''بیان القرآن'' میں لکھا ہے: ''بنی اسرائیل نے دھوپ کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے ایک سفید رقیق ابر کا سایہ کر دیا اور بھوک کا تقاضا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے درختوں پر ترنجبین جو ایک شیریں چیز ہے بہ کثرت پیدا کر دی۔'' مولانا تھانوی نے بیضاوی کے حوالے سے لکھا ہے: ''یہ لوگ اس کو جمع کر لیتے اور بٹیریں ان کے پاس جمع ہو جاتیں اور ان سے بھاگتی نہ تھیں۔ یہ ان کو پکڑ لیتے اور دونوں لطیف چیزوں سے

پیٹ بھر لیتے۔ چونکہ ترنجبین کی کثرت معمول سے زائد تھی اور بٹیروں کا وحشت نہ کرنا یہ بھی معمول کے خلاف ہے، لہٰذا اس حیثیت سے دونوں چیزیں خزانۂ غیب سے قرار دی گئیں۔''

ڈاکٹر محمد اقتدار حسین فاروقی نے اپنی کتاب ''نباتات قرآن: ایک سائنسی جائزہ'' میں لکھا ہے: ''آج تک کی تحقیقات کی بنیاد پر یہ بات کسی حد تک یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ جس من کا تذکرہ قرآن حکیم میں کیا گیا ہے وہ دو قسم کے پودوں سے حاصل ہوتا ہے۔ ایک تو وہ پودا جس کو عربی میں ''الحاج'' یا ''عاقول'' کہتے ہیں۔ یہ خاردار پودا ہوتا ہے اور عرب کے علاقوں میں اونٹ کی اچھی غذا ہے، اس لیے اس کو ''شوک الجمل'' بھی کہتے ہیں۔ فارسی میں اسے خارشتر کہا جاتا ہے۔

یہ چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ عموماً تین فٹ سے زیادہ بلندی نہیں پاتا ہے، اس کی جڑیں زمین میں دس سے چودہ فٹ تک ہوتی ہیں۔ یہ عرب کے علاوہ ایران، افغانستان اور ترکی میں بکثرت پایا جاتا ہے، لیکن من کی پیداوار کے اعتبار سے ایران کا علاقہ خراسان ہی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ یہاں کے پودوں سے حاصل کیا گیا من ترنجبین کہلاتا ہے۔

من وہ عظیم نعمت تھی جو بنی اسرائیل کو اللہ کی طرف سے عطا کی گئی، لیکن وہ اس کو کھاتے کھاتے اُوب گئے اور دوسرا کھانا طلب کرنے لگے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی نشانیوں میں چھپی ہوئی باتوں کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

☆☆

قرأت قرآن کریم کا ایک محقق ومجدد

● ڈاکٹر تابش مہدی

تجوید وقرأت کا فن ایک عظیم اور مقدس فن ہے۔ اس فن کی عظمت اور تقدس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس فن سے واقفیت اور باخبری کے بغیر اللہ تعالیٰ کی آخری اور سب سے بڑی کتاب قرآن مجید کو صحیح اور درست نہیں پڑھا جاسکتا۔ ہم عجمی لوگ اس فن کو سیکھے بغیر تلاوت قرآن مجید کرتے وقت اپنی تمام کوششوں کے باوجود تا اور طا، ثا، س اور صاد، ضاد، ظا، زا اور ذال یا دال میں فرق وامتیاز نہیں کرسکیں گے۔ یہ کوئی معمولی غلطی نہیں ہے۔ یہ ایک حرف کو دوسرے حرف سے بدلنے والی غلطی ہے، اسے اصطلاح تجوید میں لحن جلی کہتے ہیں۔ لحن جلی علما کے نزدیک نماز کو فاسد کردیتی ہے اور کبھی کبھی اس غلطی کا ارتکاب کرنے والا دائرۂ کفر میں داخل ہوجاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ اور ہر دور میں اہل دین طبقے میں اس فن کی اہمیت اور ناگزیری کا احساس کیا گیا۔ مدارس میں مستقل طور پر اس فن کے شعبے قائم کیے گئے۔ بعض ادارے تو فن تجوید وقرأت کے لیے ہی مخصوص ہوکر رہ گئے۔ مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد، مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ اور مدرسہ تجوید الفرقان لکھنؤ کی شناخت ہی تجوید وقرأت ہے۔ پانی پت اور بعض دوسرے خطوں کو بھی ماضی میں اس سلسلے میں شہرت حاصل رہی ہے۔ قاری عبدالرحمٰن مکیؒ اور ان کے تلامذہ قاری ضیاء الدین الٰہ آبادیؒ، قاری حفظ الرحمٰن پرتاب گڑھیؒ، قاری عبدالمعبودؒ، قاری عبدالمالک لکھنویؒ اور قاری عبدالخالق سہارنپوریؒ، قاری عبداللہ سلیم اور قاری احمد ضیاؒ نے اس فن کی ترویج واشاعت میں اپنی عمریں لگادیں۔

ہمارے عہد کے ممتاز ویگانہ روزگار مجدد شیخ القراء قاری، مقری ابوالحسن اعظمی بھی اسی سلسلۃ الذہب کی اہم وتابناک کڑی ہیں جو کم وبیش چار دہائیوں سے تجوید وقرأت کے مبارک و مقدس فن کی بے لوث خدمت میں مصروف ہیں۔ اس فن کی ترویج وتبلیغ اور اس کا سلیقہ مندانہ فروغ اشاعت ہی ان کا وظیفہ حیات ہے۔

شیخ القرأ قاری ابوالحسن اعظمی 1941 میں اپنے آبائی وطن جگدیش پور ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی اور اپنے والد مرحوم کی سرپرستی میں حفظ قرآن مجید کیا۔ عربی، فارسی کی ابتدائی کتابیں سرائے میر کے مدرسہ بیت العلوم میں پڑھیں، اس کے بعد مشرقی اتر پردیش کی مشہور درس گاہ دارالعلوم مئو میں داخلہ لیا۔ وہاں انھیں استاذ القرأ قاری محمد مصطفیٰ سے استفادے کا موقع ملا، چنانچہ عربی درسیات کے ساتھ ساتھ ان سے فن تجوید وقرأت بھی سیکھنا شروع کردیا۔ وہیں روایت حفص کی تکمیل کی اور قرأت سبعہ وعشرہ میں داخلہ لیا، چونکہ اس فن سے انھیں خصوصی اور فطری دلچسپی تھی، ذہانت وفطانت سے بھی اللہ تعالیٰ نے نوازا تھا، اس لیے بہت جلد کامیابی حاصل کرلی اور مختصر سی مدت میں مکمل اجرأ کے ساتھ قرأت سبعہ عشرہ متواترہ کی تکمیل کرلی۔ خانگی حالات مساعد نہ ہونے کے باعث فن وتجوید قرأت کی تکمیل کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ تقریباً بارہ برس تک مدرسہ معروفیہ پورہ معروف اعظم گڑھ مدرسہ کرامتیہ جلال پور، مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور اور مرکز علوم قرآنیہ جون پور میں تجوید وقرأت کے استاذ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اپنی محنت شاقہ اور پرخلوص لگن سے ان اداروں کے تجویدی شعبے کو عروج بخشا اور درجنوں باکمال قرأ پیدا کیے۔ 1975 میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے کر دو سال میں درس نظامی کی تکمیل کی۔ اس کے بعد کچھ دنوں ہندوستان کے مختلف وقیع مدارس میں درس وتدریس کی خدمت انجام دینے کے بعد 1982 میں ذمے داروں کے شدید اصرار پر ایشیا کی عظیم درس گاہ اور اپنی مادر علمی دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہوگئے۔ تقریباً ربع صدی

سے دارالعلوم میں شعبۂ تجوید وقرأت کے سربراہ کی حیثیت سے اس مبارک ومقدس فن کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔اب تک سیکڑوں کی تعداد میں تشنگان فن ان سے فیض حاصل کر کے مستند قاری ومقری کی حیثیت سے ہندوستان اور اس سے باہر سعودی عربیہ، دبئ، شارجہ، ابوظہبی، قطر، انگلین، جنوبی افریقہ، امریکہ اور دوسرے ممالک میں قرآن مجید کی خدمت میں مشغول ومنہمک ہیں۔

قاری ابوالحسن اعظمی قاری ومقری ہیں اور ایک اچھے قاری ومقری ہیں، لیکن یہ کوئی زیادہ اہم بات نہیں ہے۔ ہمیشہ اور ہر دور میں اچھے اور جید قرأ موجود رہے ہیں اور آج بھی آپ کو اسی ملک میں کتنے ہی ایسے قرأ مل جائیں گے، جو اپنے فن اور حسن قرأت کی وجہ سے ممتاز ونمایاں ہیں۔ قاری ابوالحسن کو قراء ہند کی بھیڑ میں ممتاز اور نمایاں کرنے والی جو چیز ہے وہ ان کا اس فن کے ساتھ قلبی، والہانہ، مخلصانہ اور غیر مشروط تعلق ہے۔ قاری صاحب جہاں اور جس ادارے سے متعلق رہے، وہاں انھوں نے صرف شعبۂ تجوید وقرأت سے ہی وابستہ رہنا پسند کیا اور اس شان سے کہ کبھی اداروں کے مقررہ یا لگے بندھے اوقات کو کافی نہیں سمجھا۔ اپنے غیر تعلیمی اوقات کا بڑا حصہ طالبان فن کے لیے وقف کر رکھا۔ میں نے ان سے جون پور کے دوران تدریس بھی ملاقاتیں کی ہیں اور مدرسہ شاہی مرادآباد و مدرسہ اصغریہ دیوبند کے دوران تدریس بھی اور دارالعلوم دیوبند سے وابستگی کے بعد نومسلسل ملاقاتیں رہیں۔ میں جب بھی ان سے ملا ہوں، ہمیشہ انھیں طلبہ کے درمیان گھرا ہوا پایا۔ کبھی کسی کو مشق ترتیل کرا رہے ہیں تو کبھی ساتوں قرأتوں کے فرق وامتیاز کے ساتھ حدراً اجراء قرآن مجید کی سماعت فرما رہے اور کبھی متعلقہ فن کی کسی کتاب کی تفہیم میں مصروف ہیں۔ قاری ابوالحسن اعظمی کی درس گاہ یا رہائشی کمرے میں داخل ہوتے ہی اس بات کا اندازہ کرنا مشکل نہیں رہتا کہ قاری صاحب صرف قاری، مقری یا مجود ہی نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے فن کے داعی ومبلغ بھی ہیں اور فن تجوید قرأت ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ دیواروں

پر سہ رویہ فریموں میں بے شمار خوش نما اور خوش خط کتبے آویزاں ملتے ہیں۔ کسی میں تلاوت قرآن مجید کے آداب واحکام درج ہیں تو کسی میں فن تجوید وقرأت کی اہمیت و فضیلت اور کسی میں اس فن سے متعلق اہم شخصیات کی فہرست ملے گی اور کسی میں تجوید و قرأت کی بعض اہم کتابوں کا تذکرہ۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے کوئی آنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

قاری ابوالحسن اعظمی کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ انھوں نے فن تجوید وقرأت سے اپنی بے پناہ دلچسپی اور اس فن عظیم سے غیر معمولی تعلق وشیفتگی کا مظاہرہ صرف درس وتدریس ہی کے ذریعے نہیں کیا بلکہ انھوں نے قرطاس، قلم کے وسیلے سے بھی اس کی تبلیغ واشاعت کا فریضہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے تجوید وقرأت کے مختلف پہلوؤں کی اپنی تحقیق وجستجو کا موضوع بنا کر علم وفن کی دنیا میں گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ انداز واسلوب کچھ ایسا اختیار کیا ہے کہ عام شائقین فن کے لیے بھی اس کا حصول آسان ہوگیا ہے۔ اب تک ان کے قلم سے کم وبیش پچاس کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن سے محض مصنف کی فہرست تصانیف طویل نہیں ہوتی بلکہ ارباب علم وفن نے انھیں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے اور ان کی روشنی میں علم وفن کی دنیا میں قاری ابوالحسن اعظمی کی علمی وفنی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے انھیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

قاری ابوالحسن اعظمی کا سب سے مبارک اور عظیم کارنامہ قرآن مجید کا وہ نسخہ ہے جن کے حواشی پر قاری صاحب نے اختلافات قرأت کو بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ آغاز میں قرأت عشرہ اور ان کے رواۃ وطرق پر روشنی ڈالی ہے اور قرأت متواترہ کے اصول اور تجوید و وقوف کے ضروری قواعد بھی درج کیے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کا یہی ایک کارنامہ انھیں قراء عصر کی بھیڑ میں ممتاز ونمایاں کرنے کے لیے کافی ہے۔

''علم قرأت اور قراء سبعہ'' قاری ابوالحسن کا ایک ایسا علمی وفنی کارنامہ ہے، جس نے

سب سے پہلے ارباب علم وفن کو ان کی طرف متوجہ کیا۔ اس میں قرأت، اس کی مبادیات، اصول وقواعد اور قراء سبعہ اور قرأت کی مرکزی شخصیات کے کارناموں کا صدی بہ صدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

''قواعد التجوید'' قاری ابوالحسن اعظمی کی ایک ایسی گراں قدر تالیف ہے جو اپنے موضوع کے لحاظ سے منفرد کتاب کہی جاسکتی ہے۔ یہ کتاب ہر عمر اور ہر صلاحیت کے افراد کے لیے مفید ہے۔

''**النفحة العنبريه شرح المقدمة الجزريه**'' قاری ابوالحسن اعظمی کی مایہ ناز کتاب ہے۔ یہ ابن الجزریؒ کے مشہور فنی قصیدہ مقدمۃ الجزریہ کی مفصل اردو شرح ہے۔ اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ موجودہ عہد کے متعدد محققین نے اسے بنیادی سورس کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ''**النفحات القاسميه شرح متن الشاطبيه**'' ابوالقاسم شاطبی اندلسی کے مشہور قصیدے ''شاطبیہ لامیہ'' کی جامع اور عام فہم شرح ہے۔ ''**التحفة الجميله**'' علامہ شاطبیؒ کے قصیدہ عقلیہ کی آسان اور دل پذیر شرح ہے۔ یہ کتاب قرآنی رسم الخط سے متعلق حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔ **التبشير شرح التبشير** کی فن قرأت کی بنیادی کتاب ''التبشیر'' کی عام فہم شرح ہے۔ **الفوائد الدريه، اتحاف البرره بالمتون العشرة، تسهيل البيان فى رسم خط القرآن، تيسير القرأة فى السبع المتوارت، خلاصة الترتيل، روح القرأت اور قرأت شاذه** قاری ابوالحسن اعظمی کی وہ کتابیں ہیں جو فن تجوید وقرأت سے متعلق تحقیق وجستجو کے متوقع ابواب وا کرتی ہیں۔

دربار رسالتؐ کے مستند قراء علم قرأت کی مرکزی شخصیات، اساطین علم قرأت اور حسن المحاضرات فی رجال القرأت میں قاری ابوالحسن اعظمی نے مختلف ادوار کے قرأ، خادمین قرآن اور مجودین کے حالات زندگی اور ان کی خدمات پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

قاری ابوالحسن اعظمی دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ تجوید وقرأت کے سربراہ ہیں۔ یہ وہ مسند ہے جس پر کبھی برصغیر پاک وہند کے جید مجود ومقری اور شیخ العرب والعجم حضرت قاری عبدالرحمٰن مکی رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ رشید شیخ القرأ حضرت قاری ومقری حفظ الرحمٰن پرتاب گڑھیؒ جلوہ افروز رہے ہیں۔ میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ قاری ابوالحسن اعظمی نے اپنی ذہانت، فطانت، محنت اور لگن سے اس مسند کی عظمت وتوقیر میں اضافہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قاری ابوالحسن اعظمی کسی ایک استاذ، معلم، مجود یا فن کار کا نام نہیں بلکہ فن تجوید وقرأت سے متعلق ایک مستقل ادارے اور اکادمی کا نام ہے۔

☆☆

قرآن کریم کا تاریخی اعجاز اور اس کی سحر انگیزیاں

● مولانا سیف الاسلام قاسمی

معجزے کا ظہور حالات اور زمانے کی مناسبت سے ہوتا ہے:

ہر زمانہ اور ہر دور میں ربّ العالمین نے اس دنیائے رنگ و بو میں انسانیت کی کشتی کو پار لگانے، بنی نوع انساں کی پوری جمعیت کو غفلت اور بیہوشی کی نیند سے بیدار کرنے اور کفر وضلالت کے عمیق غار سے نکال کر رشد وہدایت کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے انبیاء ورسل کو مبعوث کیا اور جس زمانہ میں جن چیزوں کا دور دورہ تھا، جو چیزیں بام عروج پر تھیں اسی کے مطابق انبیاء ورسل عظام کو معجزے عطا کئے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور بڑے بڑے ماہر ڈاکٹروں کا دور تھا، تو دم عیسوی میں وہ تاثیر بخشی کہ ایک پھونک میں سیکڑوں ابرص واعمیٰ چنگے ہوجاتے ہیں۔ موت کی گود میں ہونے والے اور قبر کے مردوں کو قم باذن اللہ کہہ کر پکارے تو وہ اٹھ بیٹھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں ساحروں و جادوگروں کی طوطی بولتی تھی۔ چہار دانگ عالم میں ان کی جادوگری کا ڈنکا بجتا تھا۔ ساحرگری کے ذریعہ بڑے بڑے کارنامے انجام دیے جاتے تھے تو ربّ کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بیضا اور عصا موسوی دے کر ساری دنیا کو متحیر وششدر کردیا اور بالآخر مقابلہ میں جادوگروں کو منھ کی کھانی پڑی اور وہ سجدے میں گر پڑے۔

مگر یہ سب ایسے معجزے تھے کہ جو سب مخصوص وقت تک رہ کر انبیاء علیہ السلام ہی کے ساتھ ختم ہوگئے۔ برق کے شرارے تھے جو دم کی دم میں چمکے اور بجھ گئے اور اب تاریخ میں

صرف ان کے نام ہی باقی رہ گئے ہیں، مگر جب شافع محشر، محبوب داور، انبیاء کے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد آیا تو اس وقت عرب میں فصاحت و بلاغت کا زور تھا، بڑے بڑے فصحاء و بلغاء تھے۔ ان کی عورتیں تک غضب کی خطیب اور رگ و پے میں آگ لگا دینے والی شاعرہ تھیں۔ ان کے زور کلام، جودت طبع، جدت فہم، اصابت رائے اور زبان آوری کی انتہا یہ تھی کہ وہ اپنے آگے ساری قوم کو عجم، یعنی گونگا تصور کرتے تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک امی تھے۔ بظاہر تعلیم وتعلّم سے بالکل عاری تھے، کبھی کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا تھا، کسی استاذ یا معلم کی صورت تک نہیں دیکھی تھی، پڑھنے لکھنے کے کوئی وسائل بھی بظاہر فراہم نہیں تھے، بلکہ ایک درّ یتیم کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایسے شخص کی زبان ترجمان وحی سے ایسے کلام لوگوں نے سنے کہ وہ سن کر حیران رہ گئے اور ہزار کوششوں کے باوجود اس کے مثل بھی پیش نہ کرسکے۔ آج اس کلام پر چودہ سو سال سے زائد عرصہ گزر گیا ہے مگر اب تک ساری دنیا مل کر بھی اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز وقاصر رہی اور آئندہ بھی یقیناً ان کے سرنا کامی ونامرادی ہی کا سہرا رہے گا۔ ان کی جدوجہد کبھی بھی بارآور نہیں ہوسکتی ہے۔

قرآن پاک اپنے معائدین ومخاصمین کو بار بار جھنجھوڑ رہا ہے، ان کی غیرت کو بار بار تحدی اور چیلنج کررہا ہے اور اس کے بعد آخری چیلنج کرتے ہوئے قرآن نے صاف کہہ دیا ہے کہ ''فاتوا بآیۃ من مثلہ''۔ اس کا ہم مثل لانے کے لیے بڑے بڑے فصحاء و بلغاء عرب ہمیشہ خامہ فرسائی اور طبع آزمائی کرتے رہے، لیکن انھیں اپنی تمام تر کوششوں میں ہر زاویے سے بے نیل ومرام ہوکر منھ کی کھانی پڑی۔

قرآن کی سحر انگیزی:

تاریخ میں چند مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں کہ قرآن کا ہم مثل لانے کے لیے ناکام سعی

بھی کی گئی، مثلاً لبید ابن ربیعہ جو عربوں میں اپنے فن کلام اور تیزی طبع میں یکتائے روزگار اور وحید عصر تھا۔ اس نے ایک نظم لکھ کر باب کعبہ پر آویزاں کردی۔ جب مسلمانوں کی اس پر نظر پڑی تو ایک مسلمان نے اس کے جواب میں قرآن پاک کی ایک سورۃ کوثر لکھ کر لٹکادی۔ لبید نے دوسرے روز وہاں آکر سورۃ کی ابتدائی آیت جب پڑھی تو اس قدر متاثر ہوا کہ بے اختیار اس کی زبان سے نکلا "لیس هذا من طاقة البشر" اور حق وصداقت سے مغلوب ہوکر فوراً "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پڑھ کر پروانۂ نبوت کے جھرمٹ میں شامل ہوگیا۔ یہ سلسلہ یہیں تک محدود نہیں رہا، بلکہ وہ اتنا زیادہ عظمت قرآن کا قائل ہوگیا کہ حضرت عمرؓ نے جب ان سے اشعار کہنے کی فرمائش کی تو انھوں نے کہا: جب خدا نے مجھے سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران جیسا کلام دے دیا ہے تو اب شعر گوئی مجھے قطعی زیب نہیں دیتی۔ اسی طرح ابن مقفع جو نہایت ذہین وفطین اپنے عہد کا عالم کبیر اور بے مثال و بے نظیر ادیب سمجھا جاتا تھا وہ بھی سارے مشاغل و معاملات سے دست بردار ہوکر اور قطع تعلق کر کے صرف قرآن کا جواب لکھنے بیٹھا، لیکن جب 6 ماہ گزر گئے تو لوگوں نے جا کر جائزہ لیا تو اس کو اس حال میں پایا کہ قلم اس کے ہاتھ میں ہے اور گہرے مطالعے میں غرق ہے اور اس کے سامنے لکھ لکھ کر پھاڑے ہوئے کاغذات کے انبار لگے ہوئے ہیں۔

ضمار نامی ایک شخص رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپؐ نے انھیں قرآن پاک کی چند آیتیں پڑھا کر سنائیں تو وہ سن کر دم بخود اور ہکا بکا رہ گیا اور فی البدیہہ اس کی زبان سے یہ کلمات جاری ہوگئے۔ خدا کی قسم! میں نے کاہنوں و جادوگروں کے منتر اور شاعروں کے قصائد سنے ہیں، مگر تمہارا کلام تو کچھ اور ہی ہے یہ تو سمندر تک سرایت کر جائے گا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ قندیل نبوت کو ہمیشہ کے لیے بجھانے کا ناپاک ارادہ لے کر بارگاہ نبوت میں جارہے تھے، مگر اپنی بہن سے قرآن سن کر اتنے بے خود ہوگئے

کہ حلقہ بگوش اسلام ہوکر ایسے اسلام کے جانباز سپاہی اور جاں باز مجاہد بنے جن کی سیرت سے تاریخ اسلام کے زرّیں اوراق بھرے پڑے ہیں اور لامحالہ عیسائیوں کو کہنا پڑا کہ اگر اسلام کو ایک اور عمر نصیب ہوجاتا تو دنیا کے چپے چپے اور گوشے گوشے میں اسلام کے سوا کسی دوسرے مذہب کا نام ونشان تک نہ ہوتا۔

قرآن ہمارے عیسائی مفکرین ومورخین کی نظر میں:

شہنشاہ نجاشی کے ساتھ جو اعجاز قرآن کا تاریخ ساز واقعہ پیش آیا وہ بھی تاریخ میں انمٹ نقوش بن کر رہ گیا ہے۔ یہ اور اس کی طرح کی بے شمار ہستیاں ہیں جنھوں نے قرآن سے متاثر ہوکر بہ طیب خاطر اسلام کو اپنے گلوئے نازنین میں ڈال کر فخر محسوس کیا اور یہ سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا، ان شاء اللہ۔

یہ تو زمانۂ قدیم کے اعترافات تھے، ہم متاخرین کا جائزہ لیتے ہیں تو اس پرفتن و پرآشوب دور میں بھی مسلم کی تو بات ہی چھوڑئے، غیر مسلم بھی قرآن عظیم کی عظیم خوبیوں، کلام الٰہی اور زندہ وجاوید معجزہ ہونے کا اقرار کیے بغیر نہ رہ سکے۔

مشہور متعصب پادری ریورینڈر جی ایم ایڈویل لکھتا ہے: "قرآن کریم کی تعلیم نے بت پرستی مٹائی، جنات و مادیت کا شرک مٹایا، اللہ کی عبادت قائم کی، بچوں کے قتل کی رسم نیست ونابود کی، امّ الخبائث شراب کو حرام مطلق ٹھہرایا۔ چوری، جوا، زناکاری اور قتل وغیرہ کی ایسی سخت سزائیں متعین کیں کہ کوئی شخص ارتکاب جرم کی جرأت ہی نہ کرسکے۔"

ریورینڈ مکسوتل کنگ اپنے لیکچر میں لکھتا ہے: "قرآن الہامات کا مجموعہ ہے، اس میں اسلام کے قوانین، اصول اور اخلاق کی تعلیم اور روزمرہ کے کاروبار کی نسبت صاف ہدایات ہیں۔ اس لحاظ سے اسلام کو عیسائیت پر فوقیت ہے کہ اس کی مذہبی تعلیم اور قانون علیحدہ چیزیں نہیں ہیں۔"

پروفیسر کارلائل لکھتا ہے:

''میرے نزدیک قرآن میں خلوص اور سچائی کا وصف ہر پہلو سے موجود ہے۔ یہ بالکل سچ اور کھلی حقیقت ہے کہ اگر خوبی پیدا ہوسکتی ہے تو اس سے ہوسکتی ہے۔

نامور مؤرخ ڈاکٹر گبن لکھتا ہے: ''قرآن وحدانیت کا سب سے بڑا گواہ ہے۔ ایک موحد فلسفی اگر کوئی مذہب قبول کرسکتا ہے تو وہ اسلام ہی ہے۔ غرض یہ کہ سارے جہاں میں قرآن کی نظیر نہیں مل سکتی ہے۔''

کرنٹ ہنری دی کاسٹر اپنی کتاب ''الاسلام'' میں لکھتا ہے: ''قرآن کو دیکھ کر عقل حیرت میں آتی ہے کہ اس کا بے عیب اور لاثانی کلام اس شخص کی زبان سے کیوں کرادا ہوا جو محض اُمی تھا۔''

مسٹر مارما ڈیوک پکستھال نومسلم لکھتے ہیں: ''قرآن ہی کے قوانین نے حقوق اللہ اور حقوق العباد پورے طور پر بتلائے ہیں اور اس کو یہودیوں اور عیسائیوں نے بھی مان لیا ہے۔''

ایکس لیورزون فرانسیسی فلاسفر لکھتا ہے: ''قرآن ایک روشن اور پرحکمت کتاب ہے اس میں کچھ شک نہیں۔''

موسیو میڈیو فرانسیسی فاضل لکھتا ہے: ''اسلام کو جو لوگ وحشیانہ مذہب کہتے ہیں، انھوں نے قرآن کی تعلیم کو نہیں دیکھا، جس کے اثر سے عربوں جیسی غیر مہذب اور جاہل ترین قوم کی معیوب عادت کی کایا پلٹ ہوگئی۔''

موسیو کاسٹن کارنے اخبار شگارو میں لکھا ہے: ''زمین سے اگر حکومت قرآن جاتی رہی تو دنیا کا امن وامان کبھی قائم نہیں رہ سکے گا۔''

مسٹر ولیم میور لکھتا ہے: ''قرآن نے فطرت اور کائنات کی دلیلوں سے خدا کو سب کے لیے اعلیٰ ہستی ثابت کیا اور انسانوں کو خدا کی اطاعت اور شکرگزاری پر جھکادیا۔''

ینگ انڈیا میں ہندوستان کے بابائے قوم مہاتما گاندھی لکھتے ہیں: ''مجھے قرآن کو

الہامی کتاب ہونے کا اعتراف کرلینے میں ذرہ برابر بھی شک وشبہ نہیں ہے۔''

(بحوالہ مخزن اخلاق، ص 467)

رشدی اور تسلیمہ نسرین انسانیت کے نام پر کلنگ

یہ سب قرآن پاک کا کھلا اعجاز ہی ہے کہ تمام لوگوں کو الہامی کتاب زندہ وجاوید معجزہ اور برتر ادب ہونے کو بلا قیل وقال تسلیم کرنا پڑا اور اب بساط ارضی کے ہر گوشے میں اس کے جواب میں بکثرت سکوت وخاموشی چھائی ہوئی ہے، جیسے کہ لوگوں کو سانپ ہی سونگھ گیا ہے۔

ان متعدد غیر مسلموں کے قرآن مجید کی خوبیوں، ان کے محاسن اور کلام الٰہی کو بخوشی قبول کرلینے کے بعد تعجب ہے ان حضرات پر جو کبھی قرآن مجید پر بینڈ اور پابندی عائد کرنے کے لیے سنہری اور نرالے خواب دیکھتے ہیں تو کبھی بشکل رشدی معلون، تسلیمہ نسرین، ڈنمارک اخبار کے مدیر کی شکل میں رونما ہوکر قرآن کی تعلیمات پر کیچڑ اچھالنے کی سعی نامسعود مذموم کرکے انسانیت کے نام پر بدنما کلنک لگاتا ہے۔ افسوس ہے ان لوگوں پر جن کی عقل سلیم چھین لی گئی ہے۔ کیا ان کے اندر سے فہم وادراک کا مادہ سلب کرلیا گیا ہے؟ اگر وہ غور کریں گے تو یقیناً ان کو اپنے برے کرتوتوں کا احساس ہوگا۔ حفاظت قرآن تو خدا کا ازلی وعدہ ہے، خواہ طاغوتی طاقتیں کتنی ہی یلغار کریں، بالکل کتوں کی طرح بھونکتے رہیں، اس کی آیت تو کیا زیر وزبر کو بھی ردّوبدل نہیں کرسکتے۔ آج مسلمانوں کے قلوب بھی عظمت قرآن سے خالی ہوتے جارہے ہیں۔ تعلیم قرآن اور تعمیل قرآن دونوں سے بے توجہی اور غفلت عام ہوتی جارہی ہے۔ اگر یہی صورت حال رہی تو خلیفۃ اللہ فی الارض کا سنہرا تاج ہمارے سروں پر قطعی زیب نہیں دے گا بلکہ رفتہ رفتہ ہمارے قلوب بھی بے نور ہوکر بالکل مردہ ہوجائیں گے۔ خدا سے دعا ہے کہ امت مسلمہ کو قرآن کا عاشق صادق اور پیروکار بنائے۔ آمین، ثم آمین۔

☆☆

''قرآن کریم'' کتاب انقلاب

● مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی

قرآن کریم اللہ کی وہ مقدس کتاب ہے جس کا ہر حرف معجزہ ہے اور معانی وحقائق کا ایک جہاں اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے ایک دن فرماتے ہوئے سنا کہ آگاہ ہوجاؤ، ایک بڑا فتنہ آنے کو ہے۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس فتنہ کے شر سے نجات کا ذریعہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: قرآن کریم، اس میں تم سے پہلی امتوں کے واقعات ہیں اور تمہارے بعد کی بھی اطلاعات ہیں (یعنی اعمال واخلاق کے دنیوی واخروی نتائج سے باخبر کردیا گیا ہے) اور تمہارے درمیان جو مسائل پیدا ہوں قرآن میں ان کا حکم وفیصلہ موجود ہے۔ قرآن قول فیصل ہے یاوہ گوئی نہیں ہے، جو جابر وسرکش سرکشی سے قرآن سے منہ موڑے اور اسے چھوڑے گا اللہ اسے توڑ ڈالے گا اور جو قرآن کے بغیر ہدایت کا جویا ہوگا اللہ اسے گمراہ کردے گا۔ قرآن اللہ سے تعلق کا مضبوط وسیلہ (رسّی) ہے اور حکیمانہ نصیحت نامہ ہے، وہی صراط مستقیم ہے، وہی حق مبین ہے، جس کی پیروی سے خیالات کجی سے محفوظ رہتے ہیں اور زبانیں اس کو گڑبڑ (محرف) نہیں کرسکتیں۔ اہل علم کبھی اس کے علم سے سیر نہ ہوں گے۔ قرآن میں تدبر کا عمل اور اس کے حقائق ومعارف کی جستجو کا سلسلہ تاقیامت جاری وساری رہے گا۔ طالبین علم کا ہمیشہ یہ حال رہے گا کہ وہ علم قرآن میں جتنا آگے بڑھیں گے اتنی ہی ان کی طلب ترقی کرے گی اور انھیں یہ احساس رہے گا کہ جو کچھ ہم نے حاصل کیا وہ اس کے

مقابلہ میں کچھ نہیں ہے جو ابھی ہم حاصل نہ کرسکے۔ اسی کی طرف قرآن نے خود اشارہ کیا ہے: اے نبی! آپ فرمادیجئے کہ اگر سمندر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لئے روشنائی بن جائے تو وہ ختم ہوجائے، مگر میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں گی، بلکہ اگر اتنی ہی روشنائی ہم اور لے آئیں تو وہ بھی کفایت نہ کرے۔ اور قرآن کثرت مزاولت سے کبھی پرانا نہیں ہوگا، ہر بار نیا لطف ملے گا، اکتاہٹ کا نام ونشان تک نہ ہوگا اور اس کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے۔ قرآن کی شان یہ ہے کہ جب اسے جنوں نے سنا تو بے اختیار کہہ پڑے کہ ہم نے قرآن سنا جو عجیب ہے، راہ راست کی رہنمائی کرتا ہے، تو ہم اس پر ایمان لے آئے، جس نے قرآن کے مطابق بات کہی اس نے سچی بات کہی اور جس نے قرآن پر عمل کیا وہ مستحق اجر وثواب ہوا اور جس نے قرآن کے موافق فیصلہ کیا اس نے عدل وانصاف کیا اور جس نے قرآن کی طرف دعوت دی اس کو صراط مستقیم کی ہدایت نصیب ہوگئی۔'' (جامع ترمذی)۔

قرآن کریم کا یہ بنیادی امتیاز ہے کہ وہ محض مذہبی ونظریاتی کتاب نہیں ہے، بلکہ وہ اصلاً کتاب دعوت وہدایت ہے اور حکمت ومعرفت کا ایسا منبع ہے جس سے صرف اہل ایمان ہی نہیں، بلکہ عرفان حقیقت کے پیاسے تمام اہل دل بھی سیراب ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ قرآن نے خود یہ دعویٰ جگہ جگہ کیا ہے کہ وہ پوری نوع انسانی کی ہدایت کے لئے آیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک زبردست کتاب ہے، باطل نہ سامنے سے اس پر آسکتا ہے نہ پیچھے سے۔ یہ اس خدا کا نازل کردہ کلام ہے جو دانا بھی ہے اور سزاوار حمد وستودہ صفات بھی۔ قرآن میں تحریف وتبدیلی ناممکن ہے اور اس کے کسی نقطہ تک کو غلط نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ وہ ہر شبہ سے بالاتر ہے۔ اس کتاب میں کوئی شبہ نہیں، یہ خدا ترسوں کے لیے ہدایت ہے۔ ایک مفسر کے بقول ''قرآن بجائے خود ایک عالم ہے، اس عالم قدس کے اندر گزر نہ کسی شک وتردّد کا ہے نہ خلجان واضطراب کا، یہاں تو جو کچھ ہے تسکین واطمینان ہے، علم وایقان ہے، یکسوئی واذعان ہے، ہر دعویٰ مدلل ہے اور ہر حقیقت ثابت شدہ۔ اب اگر

کسی بدنصیب کو اس کے خلاف نظر آتا ہے تو گناہ چشمہ آفتاب کا نہیں، قصور شپرہ چشمی کا ہے۔ (تفسیر ماجدی، اوّل، ص 48)

یہ قرآن ہی کا کرشمہ تھا کہ 23 سال کی مختصر ترین مدت میں جزیرۃ العرب میں ایک عجیب وغریب انقلاب آیا۔ یہ صرف علمی وفکری انقلاب نہ تھا، یہ نظریاتی انقلاب بھی تھا اور عملی بھی، جذباتی انقلاب بھی اور اصلاحی واخلاقی بھی۔

قرآن شفا ہے:

قرآن نے اپنی صفات وخصوصیات کا بیان یوں کیا ہے: ''**یایھاالناس قدجاء تکم موعظة من ربکم وشفاء لما فی الصدور و ھدی و رحمة للمومنین.**'' (**سورہ یونس: آیت. ۵۷**) (اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آگئی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے اور جو اسے قبول کرلیں ان کے لیے رہنمائی اور رحمت ہے)۔ قرآن کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ موعظہ ونصیحت ہے، قرآن ایسی تعلیمات پیش کرتا ہے جو انسان کے دل کو نرم اور اللہ کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ جن سے دنیوی غفلتوں کے پردے چاک ہوتے ہیں۔ قرآن کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ دلوں کی بیماریوں کے لیے شفا کا کام کرتا ہے۔ قرآن کی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ مومنوں کے لیے ہدایت ورہنمائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہی راہ دکھاتا ہے جو بالکل راست ہے جو لوگ اسے مان کر بھلے کام کرنے لگیں انھیں یہ بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بڑا اجر ہے اور جو لوگ آخرت کو نہ مانیں انھیں یہ خبر دیتا ہے کہ ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اس آیت میں واضح فرمادیا گیا ہے کہ قرآن انسانی زندگی کے لیے جو احکام دیتا ہے وہ بے حد راست اور آسان ہیں اور پھر اسی کا یہ کرشمہ سامنے آتا ہے کہ مشکل سے مشکل گھڑیوں اور میں اور خطرناک سے خطرناک حالات میں انسان قرآنی

ہدایت سے منحرف نہیں ہوتا۔ حالات کبھی اسے سیدھی ڈگر سے کج اور بے راہ رو نہیں بنا پاتے، ایسے مومنوں کا قرآن میں یہ وصف بیان ہوا ہے۔ جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر نازل ہوا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوجاتی ہیں۔ سچے اہل ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔

قرآن نعمت ہے:

قرآن کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اہل ایمان کے لیے سراپا رحمت ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا جب قرآن ایسی گراں قدر اور بیش بہا نعمت ہے تو لوگوں کو اس انعام ورحمت پر شاداں وفرحاں ہونا چاہئے۔ یہ نعمت اس دنیا سے بدرجہا بہتر ہے جسے وہ جمع کر رہے ہیں، دولت قرآن کے سامنے ہر دولت ہیچ اور بے مایہ ہے، اسی لیے نبوت کے آغاز کے بعد منصب نبوت کی گراں بار ذمہ داریوں نے جب رسول اللہ کو کاروبار کی طرف توجہ کا موقع نہیں دیا اور کاروبار ٹھپ ہوگیا اور یہی حال صحابہ کرام حضرت صدیق اکبر، عثمان غنی، عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم وغیرہ کا بھی ہوا، دوسری طرف کفار کی طرف سے مسلسل مظالم ہوتے رہے، ایسے عالم میں آپ کی تسلی کے لیے فرمایا گیا: ہم نے آپ کو بار بار دہرائے جانے کے لائق سات آیات یعنی سورۂ فاتحہ دے رکھی ہے اور ہم نے آپ ﷺ کو قرآن عظیم عطا کیا ہے۔ آپ ﷺ اس متاع دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہیں اور نہ ان کے حال پر اپنا دل کڑھائیں۔ یہ خطاب اصل میں آپ کے واسطے سے عام مسلمانوں کو کیا گیا ہے ورنہ آپ کی نگاہوں میں دنیا کی حیثیت پرکاہ اور ذرہ بے مقدار کے برابر بھی نہ تھی۔

قرآن نور اور ہدایت ہے:

قرآن کریم کو نور اور روشنی قرار دیا گیا ہے۔ اہل ایمان کو حکم ہے: ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس روشنی پر جو ہم نے نازل کی ہے، جس طرح روشنی خود نمایاں ہوتی اور گرد و پیش کی تاریکیوں میں مستور و نہاں چیزوں کو نمایاں کر دیتی ہے، ایسے قرآن کی حقانیت بذات خود تاباں ہے اور اس کی تابانی میں انسان اپنے ذرائع علم و عقل کی مدد سے سمجھ میں نہ آنے والے مسائل بآسانی سمجھ سکتا ہے، فکر و عمل کی لاتعداد پر پیچ راہوں کے درمیان حق کی سیدھی راہ قرآن دکھاتا ہے۔ وہی شاہ کلید (Master Key) ہے، تمام مسائل زندگی کا قفل اس سے کھل سکتا ہے۔

قرآن کریم کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ محکم و مفصل ہے، دینی اصول و کلیات اور اخروی و دنیوی نجات و فلاح کے اصول کی طرف رہنمائی میں قرآن بے انتہا واضح اور مفصل ہے اور ہر طرح کے احتمال و غموض سے پاک ہے۔ اللہ نے پوری تفصیل کے ساتھ تمہاری طرف کتاب نازل کر دی ہے۔ ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں مستحکم اور ایک دانا و باخبر ہستی کی طرف سے مفصل ارشاد ہوئی ہیں۔ ہم نے ان لوگوں کے لیے ایک ایسی کتاب نازل کر دی جس میں علم کے ساتھ دین حق کی تمام باتیں الگ الگ کر کے واضح کر دی ہیں اور جو ایمان رکھنے والوں کے لیے ہدایت و رحمت ہے۔

قرآن فرقان ہے:

قرآن کی ایک امتیازی صفت ''فرقان'' ہے، بڑی برکت ہے وہ ذات جس نے یہ فرقان (خیر و شر کے درمیان تمیز کرنے والی کتاب) اپنے بندے پر نازل کیا، تاکہ وہ سارے جہانوں کے لیے خبردار کر دینے والا ہو۔ اسی امتیازی وصف کی بنیاد پر قرآن نے لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی میں پہنچایا، سیدھی راہ پر لگایا، سلامتی کے راستوں کا پتہ بتایا،

بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں سے پاک راستے بتائے اور اسی لیے اسے کہیں ''نور'' کہا گیا ہے، کہیں ''بصائر و ھدیٰ'' اور کہیں ''بینۃ و موعظۃ'' اور ''شفاء و ذکر مبارک''۔

قرآن ہدایت نامہ ہے:

قرآن فی الواقع ہر انسان کے عقائد و اعمال اور اخلاق و کردار کے لیے آئینہ کا کام کرتا ہے۔ ہر شخص کی روشنی میں اپنی حیثیت متعین کر سکتا ہے۔ اس لحاظ سے قرآن کریم ہر انسان کی ذاتی کتاب و ہدایت نامہ ہے جس میں ہر انسان کے ذاتی امراض اور کمزوریوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ایک بلند پایہ مفکر کی زبان میں ''قرآن مجید ایک زندۂ جاوید کتاب ہے جس میں حال و ماضی، قدیم و جدید کی کوئی تقسیم نہیں، اس کا خطاب ہر تمدن اور ہر دور کے لیے یکساں ہے اور اس کی دعوت ہر دم تازہ اور حسب حال ہے، وہ انسانوں کا ایک متکلم مرقع اور انسانی فطرت کا ایک آئینہ مصفا ہے۔'' (مطالعہ قرآن کے اصول و مبادی، ص: 141، از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ)

یہاں یہ پہلو قابل توجہ ہے کہ اسلام کے اصول چونکہ قرآن سے مقتبس ہیں اور انھیں دنیا کے سامنے قرآن نے ہی رکھا، اس لیے اسلام قرآن کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ قرآن میں ہر طرف پھیلے ہوئے علوم و حقائق اور معارف و اسرار بھی قرآنی معجزہ ہیں اور یہ سارے حقائق و معارف وقتی، معاشی، سماجی و سیاسی انسانی تصورات و رجحانات سے بالکل متاثر نہیں ہیں جو قرآنی اعجاز اور ہدایت کا روشن ثبوت ہیں۔ عینی واقعات اور پیشین گوئیاں بھی قرآن کا معجزہ ہیں، جن میں اہل روم کے ایرانیوں پر غلبہ، ناموافق حالات میں تمام تر دشمنان اقدامات کے باوجود اسلام کے غلبہ، مرتدین اور روم و ایران سے جنگ، حفاظت قرآنی اور جمع و اشاعت و تشریح قرآنی، صلح حدیبیہ کی کامیابی اور فتح مکہ، آئندہ فتوحات اور دشمنان دین کی ناکامیوں کی پیشین گوئیاں بطور خاص قابل توجہ ہیں۔

انسان کوانسان بنانے والی کتاب:

قرآن مجید ہی وہ کتاب ہے جوانسان کوانسان بناسکتی ہےاورتاریکیوں سے روشنی میں لاسکتی ہے،اسی لئے اس کو پڑھنے، سمجھنے اس پرعمل کرنے، سیکھنے،غوروفکر کرنے پراجروثواب کا من جانب اللہ وعدہ ہے۔رسول اللہ ﷺ نے واضح فرمادیا ہے: اللہ تعالیٰ اس کتاب مقدس کی وجہ سے بہت سوں کواونچا کرے گا اور بہت سوں کو نیچا گرادے گا۔قرآن اللہ کا کلام اور اس کی حقیقی صفت ہے، یہی اس کی عظمت کے لیے بس ہے۔دنیا اور عالم بالا اور عالم غیب کی ہر چیز غیر اللہ اور مخلوق ہے،مگر قرآن اللہ کی مخلوق اوراللہ سے الگ کوئی اور چیز نہیں، بلکہ اللہ کی حقیقی صفت ہے جواس کے ساتھ قائم ہے،اب جوقوم بھی قرآن کواپنا رہبر تسلیم کرکے اس کی پیروی کرے اور تابعدار ہوجائے گی اورقرآن سے ویسا مضبوط تعلق رکھے گی اور احترام کرے گی،جیسا اس کا حق ہے تو اللہ اسے دنیا وآخرت میں عالی مرتبہ بنادے گا۔

اہل ایمان کے لئے سامان تقویت ہے:

قرآن نے جگہ جگہ بیان کیا ہے کہ قرآنی آیات اہل ایمان کے لیے تو باعث مسرت و تقویت ہوتی ہیں اور بیمار دلوں کے لیے خباثتوں اور غلاظتوں میں اضافہ کا موجب،قرآنی تصریحات ہی کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ تکبروغرور، بیجا مجادلہ ومباحثہ، قیاس آرائیوں، انکارآخرت، دنیا پرستی اورنفس پرستی میں مبتلا افراد قرآنی ہدایت سے محروم رہتے ہیں۔قرآنی ہدایت کے لیے طلب صادق، انابت، غور سے سننا، اتباع وعمل، خوف وخشیت، ایمان بالغیب،فکروتدبر، ریاضت ومجاہدہ، ادب واحترام، ضبط نفس اوراخلاص بنیادی شرطیں ہیں۔

قرآن سیکھنے والا سب سے اچھا انسان:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: کچھ قرآن سناؤ،انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! قرآن کا نزول آپ پر ہوتا ہے اور میں آپ کو

سناؤں؟ آپ نے فرمایا: مجھے دوسروں سے قرآن سننا بہت پسند ہے۔ابن مسعودؓ نے سورۂ نساء کی تلاوت شروع کی اورتھوڑی دیر بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ابن مسعود بس کرو۔ ابن مسعودؓ کا بیان ہے کہ میں نے آپ کو دیکھا کہ آپ کی چشمہ ہائے مبارک سے آنسو رواں تھے،اس سے اس قرآنی شغف وتعلق کا اندازہ ہوسکتا ہے جو آپ ﷺ اور صحابہ کی زندگیوں میں تھا۔حضرت عثمان غنیؓ پر قاتلوں نے جب حملہ کیا تو آپ تلاوت میں مصروف تھے،اسی لیے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ”**خیرکم من تعلم القرآن وعلمه**“ تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن کا علم حاصل کرے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دے)۔

ہماری غفلت شعاری اورقرآن سے دوری نے ہم کو ثریا سے تحت الثریٰ میں پہنچادیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پراتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا جارہا ہے اور پھٹا پڑتا ہے۔یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے اس لیے بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنی حالت پر غور کریں۔مقام استعجاب ہے کہ قرآن کو سمجھنے والا حقیقت حال سے باخبر انسان اتنا بےحس ہے کہ وہ نہ خوف سے لرزتا ہے اور نہ اس میں احساس جواب دہی بیدار ہوتا ہے، بلکہ وہ قرآن سن اور پڑھ کر اس طرح غیر متاثر رہتا ہے کہ جیسے وہ ایک بےجان پتھر ہے جس کا کام سمجھنا ہے ہی نہیں، ایسے بےحس انسانوں کے بارے میں رسول ﷺ نے بارگاہ رب العزت میں فریاد کی تھی: خدایا میری قوم نے قرآن کو پس پشت ڈال دیا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے امت کوآخری بیش بہا نصیحت یہ فرمائی تھی: میں تم میں دو چیزیں چھوڑکر جارہا ہوں، اگر تم انھیں مضبوطی سے تھامے رہوگے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ ایک تو اللہ کی کتاب قرآن ہے، دوسرے اللہ کے رسول کی سنت ہے۔سنت رسول قرآن کی تشریح وتوضیح ہے،اسوۂ رسول قرآن کا عملی پیکر ہے۔

☆☆

قرآن کریم
عظیم ترین سرچشمہ قانون وفلسفہ قانون

● مولانا سید عقیل الغروی

قرآن کی عظمت:

قرآن کریم رب اکبر کا وہ کرم عام ہے جس کی اہمیت وعظمت کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ بیسویں صدی کے عظیم مجتہد اور انقلابی رہنما حضرت امام خمینیؒ کا ایک جملہ ہے کہ یہ قرآن اتنی بڑی نعمت خداوندی ہے کہ اگر کوئی انسان اپنی تمام عمر سجدۂ شکر میں گزار دے تب بھی اس نعمت کا حق شکر ادا نہیں کرسکتا۔

قرآن کریم کی سب سے بڑی عظمت تو یہی ہے کہ وہ ''کلام الٰہی'' ہے، یعنی اگر اس کتاب مجید کی تلاوت کرنے والا ''دلِ آگاہ'' کی ''دولت بیدار'' کا مالک ہو تو یقیناً اس کیف وسرور سے محظوظ ہوگا جس کی ترجمانی اس رباعی میں کی گئی ہے:

قرآں جو نوازش کا چمن ہے تیرا
اک فیض ہے اک لطف گہن ہے تیرا
رکھتا ہے جو مسرور و خود آگاہ مجھے
اے رب سخن لطف سخن ہے تیرا

''کلام الٰہی'' ہونے کے ساتھ ساتھ ''قرآن کریم'' کی ایک بڑی عظمت یہ بھی ہے کہ وہ نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سند نبوت اور ''نشان خاتمیت'' ہے اور یہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ''زندۂ جاوید معجزہ'' ہے جس کا نہ آج تک کوئی جواب لا سکا اور نہ ہی اس میں کوئی تحریف راہ پاسکی۔ عموماً خیال کیا جاتا رہا ہے کہ قرآن مجید کی شان اعجاز صرف اس کی فصاحت و بلاغت سے تعلق رکھتی ہے، لیکن یہ خیال نہایت سطحی ہے۔ قرآن مجید کی شانِ اعجاز کے نہ جانے کتنے پہلو ہیں۔ یہ معجزۂ فصاحت و بلاغت بھی ہے اور معجزۂ علم وخرد بھی۔ یہی وہ دستور حیات ہے جو انسان کو امن و عافیت، استحکام و بقا اور ہدایت ونجات کی جنتیں عطا کرنے والا ہے۔ چنانچہ یہی وہ ''منشور الٰہی'' ہے جو زمین پر ظاہر ہونے والی اس عالم گیر اسلامی یا انسانی حکومت کا ''دستورِ اساسی'' ہوگا جس کے لیے تمام عالم بشریت خصوصاً مسلمانان عالم تمام کتب سماویہ اور حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دی ہوئی خبر کے مطابق اس کی نسل مبارک سے ہونے والے ''امام مہدی'' کا انتظار کر رہے ہیں، جن کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ''وہ زمین کو عدل وانصاف سے پُر کردیں گے۔''

عالم تاریخی سیاق وسباق میں دیکھا جائے تب بھی قرآن مجید نے اپنے وقت نزول سے آج تک انسانی ذہن وفکر کو حیات و کائنات کے سبھی مسائل میں جس قدر روشنی اور رہنمائی عطا کی ہے اس کا مختصر ترین جائزہ بھی متعدد ضخیم مجلدات کا متقاضی ہوگا اور یہ مختصر سا مضمون کسی بھی صورت اس کے فیوض و برکات میں سے کسی ایک امر کا بھی احاطہ نہیں کرسکتا۔ تاہم راقم السطور چند نکات بطور اجمال ذکر کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

قرآن ایک نظام قانون:

قرآن کریم کا ایک عظیم عطیہ، معاشرۂ انسانی کے لیے ایک صحت مند فلسفہ قانون اور ایک مکمل جامع اور ہمہ گیر نظام قانون بھی ہے۔ یہ نہیں کہ انسانی معاشرے میں نزول قرآن

سے پہلے کہیں بھی کوئی دستور وقانون پایا ہی نہیں جاتا تھا، لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ جو کچھ بھی تھا نہایت ناقص تھا اور جامد بھی۔ قرآن حکیم نے انسانی فکر ونظر کو نظام قانون ارتقائی مراحل طے کرنے کے لائق بنایا۔ یوں تو اس حقیقت کا اعتراف متعدد معتبر مورخین ومحققین نے کیا ہے، لیکن جس انداز میں امریکہ کے سپریم کورٹ نے کیا ہے وہ ایک لحاظ سے بہت قابل توجہ ہے۔ امریکہ کے سپریم کورٹ کی عمارت کے ایک خصوصی ہال میں دنیا کی پانچ اہم شخصیتوں کے Sculptures یا سنگی مرقعے بنائے گئے ہیں جن میں حضرت ابراہیم کی سرزمین کے مشہور قانون ساز حمورابی، حضرت موسیٰ اور حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خیالی پیکر بھی نمایاں کیے گئے ہیں اور ان کے نیچے لکھا گیا ہے: Law Givers to the Manking ''نوع انسانی کو قانون عطا کرنے والے۔''

اگرچہ اسلامی نقطہ نظر سے اور مسلم تہذیب کے مسلمہ اقدار کی رو سے انبیاء و اوصیاء علیہم السلام کے مرقعے نہیں بنائے جاتے، تاہم امریکی سپریم کورٹ نے جو Sculptures بنائے ہیں وہ نہایت ہی پرجلال و جمال ہیں اور ان میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے وہ بھی ان کے اپنے نقطہ نظر سے قابل قدر ہے۔ جب مجھے ایک سفر کے دوران یہ عمارت بطور خاص دکھائی گئی اور یہ ''سنگی مرقعے'' دکھائے گئے تو میں نے عرض کیا کہ یہ تو آپ نے تسلیم کر ہی لیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عالم بشریت کو قانون عطا فرمایا۔ اب یہ تسلیم کرنا باقی رہ گیا ہے کہ یہ جو کچھ بھی ''قانون'' آپ نے عطا فرمایا یہ آپ کا بنایا ہوا نہیں تھا، من وعن ''من جانب اللہ'' تھا، جو آپ پر قرآن مجید کی شکل میں نازل ہوا تھا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نبی برحق اور ''خاتم النبیین ﷺ'' ہونے کی حیثیت سے یہ نظام قانون پیش کیا تھا۔ بہرحال مجھے امید ہے کہ دنیا ہزار تعصّبات کے باوجود ایک نہ ایک دن ان حقیقتوں کا اعتراف کرنے پر خود کو مجبور پائے گی۔

قانون سازی کے اصول اور دہشت گردی سے نجات کا راستہ

اس مقام پر ایک اور نکتہ کی جانب توجہ مبذول کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے قبل انبیاء علیہم السلام نے صرف چند ''بنے بنائے قوانین کا مجموعہ'' نہیں پیش کیا بلکہ قرآن مجید کے فیضان سے اور آپ کے ارشادات سے عالم بشریت کو کسی مسئلہ میں پہلے سے کوئی قانون موجود نہ ہونے کی صورت میں تازہ اور مناسب حال قانون بنانے کا فلسفہ اور پورا نظام بھی نصاب ہوا، جسے ہم اسلامی اصول فقہ یا Islamic Jurisprudence کے نام سے جانتے ہیں۔

قرآن اور اسلامی فقہ واصول فقہ سے دنیا نے مختلف مسائل میں کہاں کہاں کس قدر استفادہ کیا ہے، یہ ایک بہت بڑا تحقیقی موضوع ہے، جس پر ایک دو افراد نہیں، بلکہ محققین کی ایک پوری جماعت کے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس مختصر سے مضمون کا اختتام اس یاددہانی پر کرنا بہت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ماضی میں مختلف انداز میں مختلف مواقع پر مختلف مسائل میں دنیا نے قرآن مجید سے استفادہ کیا ہے، اگر اس وقت درپیش دہشت گردی کے مسئلہ پر بھی وہ قرآن مجید سے استفادہ کرے تو یقیناً بہت آسانی کے ساتھ اس لعنت سے چھٹکارا پا سکتی ہے، اس لیے کہ جس امر میں دنیا کے تمام ماہرین قانون اور مفکرین و مدبرین عاجز وحیراں ہیں، یعنی دہشت گردی کی تعریف (Definition) اور اس کی سزا کا تعین، وہ صاف طور پر قرآن مجید میں موجود ہے۔

قرآن کریم نے انسانی معاشرہ کے نظم وضبط کو تباہ و برباد کرنے اور عام انسانوں کو خوف وہراس میں مبتلا کرنے کے لئے اسلحہ اٹھانے کو دہشت گردی قرار دیا ہے اور اس کی سزا یہ تجویز کی ہے کہ اگر کوئی فرد یا کوئی گروہ اس طرح اسلحہ کا استعمال کرتا ہے اور بے گناہ انسانوں کی جان بھی لیتا ہے اور ان کے مال واسباب کو لوٹتا بھی ہے تو اسے سولی پر لٹکانے یا قتل کرنے کی سزا ملنی چاہیے اور اگر صرف قتل کرتا ہے، مال واسباب نہیں لوٹتا تو پھر قتل کے

بدلے میں قتل ہی اس کی سزا ہے اور اگر مال واسباب لوٹتا ہے، مگر قتل نہیں کرتا تو مخالف سمتوں سے اس کے ہاتھ پاؤں قطع کرنے کی سزا دی جانی چاہیے اور اگر صرف خوف و ہراس پھیلا دیتا ہے، لیکن نہ کسی کو قتل کرتا ہے نہ مال لوٹتا ہے تو اسے شہر بدر کر دینے کی سزا ملنی چاہیے۔

یہ اور اس طرح کے اور نہ جانے کتنے مسائل قرآن مجید میں اور اس کی روشنی میں تدوین کیے گئے علوم وفقہ واصول میں حل کیے گئے ہیں جس سے استفادہ بلاشبہ دنیا کے دامن کو مسرتوں سے بھر دینے کی یقینی ضمانت دے سکتا ہے۔

☆☆

ترجمہ معانی قرآن مجید
(مشکلات و مسائل)

● مولانا محمد فاروق خاں

کسی زبان کے متن یا عبارت کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ہر زبان کی اپنی کچھ ذاتی خصوصیات ہوتی ہیں۔ ہر زبان کا اپنا دروبست ہوتا ہے۔ اس کے الفاظ کا اپنا صوتی حسن یا کھنک ہوتی ہے۔ ان کا اپنا روایتی پس منظر ہوتا ہے۔ بعض الفاظ کے معنی میں کبھی کبھی اتنی وسعت اور گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے کہ ان کا متبادل دوسری زبان میں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ ہر زبان کے اپنے محاورے، روزمرہ، ضرب الامثال، انداز بیان اور اسالیب ہوتے ہیں۔ ان ساری چیزوں کے ترجمہ میں پاس ولحاظ رکھنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے اپنے مقدمہ ترجمہ قرآن میں ترجمہ کے اقسام اور ان کے نقائص ومعائب اور قرآن کے ترجمہ کی مشکلات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اہل علم کو اس مقدمہ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

ترجمے کی مشکلات کو دیکھتے ہوئے بعض نے یہ بات کہی ہے کہ ترجمہ درحقیقت دو زبانوں کے درمیان محض ایک طرف کا سمجھوتہ یا مصالحت ہے اور مصالحت میں بالعموم کچھ نہ کچھ نقصان گوارا کرنا ہی پڑتا ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھیں۔ تین جملے ہیں: لڑکا گرا/لڑکا گر گیا/لڑکا گر پڑا۔

ان تینوں جملوں میں جو باریک فرق پایا جاتا ہے ضروری نہیں کہ اس فرق کو دوسری

زبان میں ہم باقی رکھ سکیں، اس لیے کہ یہ لازمی نہیں ہے کہ دوسری زبان میں بھی افعال کے اس طرح کے معاون افعال موجود ہوں، اسی لیے رابرٹ فراسٹ (1900) کو کہنا پڑا ہے کہ ترجمہ ناممکن کو ممکن بنانے کی سعی ہے۔ ترجمہ میں تخلیق کو از سرنو پانا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں ترجمہ کو Recreation یعنی بازتخلیق سے تعبیر کرتے ہیں۔ کامیاب ترجمہ تو وہی ہوگا جس میں کسی اور زبان کے متن کی جگہ دوسری زبان کا متبادل پیش کرسکیں، جس میں مفہوم ومعنی کے ساتھ ساتھ اسلوب اور انداز بیان کے پہلو بھی آ گئے ہوں۔ ترجمے میں اصل متن کے لہجے کی کھنک بھی پائی جائے اور یہ ترجمہ جس زبان میں کیا گیا ہو اس کے مزاج کا پورا لحاظ رکھا گیا ہو۔ کسی ترجمے کی قدر و قیمت کو اسی صورت میں تسلیم کیا جاسکتا ہے جبکہ مفہوم ومعنی کے ساتھ اس میں وہ آب و رنگ، وہ چاشنی، وہ خوشبو اور وہ لطف اور مزہ بھی آجائے جو اصل متن میں پایا جاتا ہو۔ بالفاظ دیگر ترجمے پر اصل تصنیف کا گمان ہو۔ اس میں کسی طرح کا گھٹیاپن اور بے نمکی نہ پائی جائے۔ اصل متن کے اسلوب اور اس کی زبان کی قوت کو ترجمے کی زبان میں منتقل کرنا اہل قلم کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

کسی ادبی شہ پارے اور شعر وسخن کا ترجمہ حد درجہ دشوار ہوتا ہے۔ ترجمہ میں ادبی محاسن، صوتی آہنگ اور نغمگی وغیرہ کو منتقل کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ قرآن کلام الٰہی ہے، اس میں جو ادبی خوبیاں، صوتی جمال، آہنگ، سرور اور بہاؤ پایا جاتا ہے اور اس میں معانی و معارف کی جو وسعت پائی جاتی ہے، ترجمہ کی زبان میں ان سب کو منتقل کرنا انسان کے بس میں نہیں۔ پھر بھی کوشش اس بات کی ہونی چاہئے کہ قرآنی آیات کا ترجمہ سپاٹ اور بے جان نہ ہو، حتی الامکان قرآن کی اصل اسپرٹ اور زور بیان، بے ساختگی اور روح کو بیدار کرنے کی خصوصیات کو ترجمے میں بھی منتقل کرنے کی سعی ہونی چاہئے۔ اس کے لیے ترجمے کی زبان میں جتنی بھی قوت اور صلاحیت ہو اس سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہئے۔

عربی زبان کا اپنا مزاج اور اس کے اپنے اسالیب اور محاورے ہیں۔ ترجمہ میں اگر یہ

چیز ملحوظ نہ رہے تو ترجمہ معائب سے محفوظ نہیں ہوسکتا، جیسا کہ عرض کیا گیا قرآن کلام مؤثر کے ذیل میں آتا ہے۔ اس میں حسن سماعت کے ساتھ ساتھ حسن معنی کی بھی رعایت پائی جاتی ہے۔ پھر اس میں جو زور، وقار اور بہاؤ پایا جاتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، اس لیے کوشش اس بات کی ہونی چاہئے کہ ترجمہ رواں، پروقار اور مؤثر ہو۔

قرآن کے ترجمے میں سب سے پہلے الفاظ قرآن کے صحیح مفہوم ومعنی کی تعیین ضروری ہے۔ اس کے علاوہ عربی زبان خاص طور پر قرآن کے اسلوب سے آشنا ہونا بھی ضروری ہے۔ اس میں اگر تساہلی سے کام لیا گیا تو ترجمہ اغلاط سے پاک نہیں ہوسکتا۔ عربوں کو جس چیز نے مسحور کردیا تھا وہ قرآن کا اسلوب (Pattern) اور آہنگ ہی تھا۔ اس کا مقابلہ کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ قرآن میں جن ادبی صنعتوں کا استعمال ہوا ہے ان سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

قرآن کا ایک خاص اسلوب یہ ہے کہ وہ بسا اوقات کلام کا کچھ حصہ بیان کرتا ہے اور اس کا ایک حصہ حذف کردیتا ہے۔ اس طرح کلام غیر ضروری طوالت سے محفوظ رہتا ہے اور الفاظ کم ہوجانے کی وجہ سے کلام زیادہ پراثر ثابت ہوتا ہے۔ قرآن کتنے ہی ایسے حقائق، معانی اور معارف ہمارے سامنے پیش کرتا ہے الفاظ جن کے متحمل نہیں ہوتے، ایسے مواقع پر قرآن بالعموم حذف کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔

سلسلۂ کلام میں کبھی قرآن درمیان میں اصل موضوع سے ہٹ کر کوئی ضروری بات بیان کرتا ہے۔ ضروری بات بیان کرنے کے بعد اصل کلام کا سلسلہ پھر دوبارہ قائم ہوجاتا ہے۔ قرآن میں غور وفکر کرتے وقت یا اس کا ترجمہ کرتے وقت ایسے معترضہ جملوں سے باخبر رہنا بہت ضروری ہے۔ جہاں تک محذوفات کا تعلق ہے تو ترجمے میں یا تو ایسے مقامات پر نقطے لگادیے جائیں یا پھر قوسین کے اندر محذوفات کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے، تاکہ قاری کو قرآن کے سمجھنے میں دشواری پیش نہ آئے۔

معترضہ جملوں کے آغاز اور آخر میں خط کھینچ کر ان کو نمایاں کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح سلسلہ بیان سے جملہ معترضہ صاف الگ نمایاں رہے گا اور اس سے قرآن کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

ہم نے جو باتیں بیان کی ہیں ان کے لیے چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں:

جملہ معترضہ پر نگاہ نہ ہونے کی وجہ سے کس طرح مفہوم میں گڑبڑی پیدا ہوتی ہے، اس کے لیے یہاں صرف دو مثالیں دی جا رہی ہیں:

(۱) سورۃ التطفیف میں ہے: ”**کلا ان کتٰب الفجار لفی سجین. وما ادراک ما سجین. کتٰب مرقوم**“. (**سورہ التطفیف**: آیت ۷تا ۹) یہاں ”**کتٰب مرقوم**“ درحقیقت ”**کتٰب الفجار**“ کی صفت کے طور پر ارشاد ہوا ہے۔ ”**وما ادراک ما سجین**“ جملہ معترضہ ہے۔ ”**کتب مرقوم**“ اس کا جواب نہیں ہے۔ یہاں ”**سجین**“ کے متعلق یہ نہیں کہا گیا ہے کہ وہ ”**کتب مرقوم**“ ہے، بلکہ ”**کتاب الفجار**“ کے بارے میں یہ وضاحت فرمائی گئی ہے کہ ”**کتاب الفجار**“ مرقوم یا مہرش ہے۔ اسی طرح اس سورۃ میں ”**وما ادراک ماعلیون**“ جملہ معترضہ ہے، یعنی درمیان میں یہ بات فرمائی گئی ہے کہ تم ”**علیون**“ کی عظمت کو نہیں جان سکتے۔ **کتاب مرقوم** کو علیون کی صفت قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ یہ غلط فہمی جملہ معترضہ کی طرف توجہ نہ دینے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

اس کی دوسری مثال ”**سورۃ الجمعة**“ میں دیکھیں۔ سورۃ الجمعہ میں ابتداً رسول اللہ ﷺ کے فرائض بیان کرنے کے بعد یہود کی ذہنیت اور ان کے کردار کی عکاسی کی گئی ہے اور یہ سلسلہ آیت ۸ تک چلا گیا ہے۔ درمیان میں آیت ۹ اور ۱۰ جملہ معترضہ ہے، جس میں مومنین کو خبردار کیا گیا ہے کہ وہ یہود کے نقش قدم پر نہیں چلیں گے۔ انھیں نہ دنیا پرست بننا ہے اور نہ ان کو رہبانیت اختیار کرنی ہے۔ اس کے بعد پھر وہ سلسلہ جو یہود کے کردار کے

متعلق چل رہا تھا اسے اس طرح پورا کیا گیا ہے:

واذا راَو تجارة او لهوان انفضو آاِلیها وتر کوک قائماقل ما عند الله خیر من اللهو و من التجارة والله خیر الرّٰزقین“. (سورہ جمعہ: آیت نمبر۔۱۱)

آیت۔۱۱ کا تعلق درحقیقت آیت ۹-۱۰ سے نہیں بلکہ اس کا اصل ربط آیت ۸ سے ہے۔ جملہ معترضہ کی طرف توجہ نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ مومنین کے بارے میں فرمایا گیا کہ جب وہ تجارت یا کھیل تماشہ دیکھتے ہیں تو اس کی طرف ٹوٹ پڑتے ہیں اور رسول کو کھڑا چھوڑ دیتے ہیں، حالانکہ یہ یہود کا کردار بیان ہوا ہے کہ نبی ﷺ جب یہود کو ان کی بستیوں میں جا کر خطاب فرماتے تھے تو وہ بے دلی کے ساتھ آپ کی باتیں سنتے تھے، لیکن جیسے انھیں کوئی بہانہ ہاتھ آتا بھاگ نکلتے اور نبی ﷺ کھڑے کے کھڑے رہ جاتے۔ صحابہ کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نبی ﷺ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے، وہ بھی کھیل تماشہ تک کے لیے آپ کو تنہا چھوڑ دیں گے۔ رہے منافقین تو وہ تو اس لیے نہیں بھاگیں گے کہ انھیں اپنے نفاق کو چھپانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ آپ کو چھوڑ کر بھاگیں نہیں۔ اس سلسلہ میں شانِ نزول سے متعلق جو روایتیں آئی ہیں ان میں ضعف اور اضطراب پایا جاتا ہے، اس لیے وہ قابلِ لحاظ ہرگز نہیں ہیں۔

قرآن کے ادبی محاسن کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔ اس میں بلاغت کے اصولوں اور صنائع وغیرہ کا جو استعمال ہوا ہے ان میں سے کچھ جانے پہچانے اصول وصنائع ہیں۔ مثلاً ایجاز و اطناب، مشاکلت، لف ونشر، توزیع وحذف اور احتیاک وغیرہ۔ ترجمہ کے وقت ان کی طرف توجہ رہنی چاہئے۔ قرآن کے مطالعہ سے کچھ نئے اصول واسالیب کا بھی سراغ ملتا ہے، ان کو بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثال میں ہم یہاں صنعت احتیاک کو لیتے ہیں۔ اس صنعت کی بہترین اور حسین مثالیں قرآن میں موجود ہیں۔ صنعت احتیاک یہ ہے کہ کلام میں دو مقابل کی چیزوں کا ذکر ان کے احوال کے ساتھ اس طرح کیا جائے کہ ایک

کے لیے جس چیز کا ذکر کیا جائے دوسرے کے بیان میں اس کے مقابل کی چیز ترک کر دیں۔ ''سورۃ الانشقاق'' میں ہے:

" فامّا من أوتی کتبه بیمینه. فسوف یحاسب حساباً یسیراً. وینقلب إلی أهله مسرورا. وأما من اوتی کتبه وراء ظهره. فسوف یدعوا ثبوراً و یصلیٰ سعیرا. إنه کان فی أهله مسرورا". (سوره انشقاق: آیت ۷-۱۳)

یہاں صنعت احتیاک کا استعمال ہوا ہے۔ ایک فریق کو اس کا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، اسے بیان کیا گیا ہے، لیکن دوسرے فریق کو اس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں پکڑائیں گے۔ اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا، بلکہ تقابل کے ذریعہ سے اسے یہاں فرمایا گیا۔ دوسرے فریق کے احوال کے بیان میں ''**وراء ظهره**'' فعل ''اُوتِیَ'' کا مفعول فیہ نہیں ہے، بلکہ یہ کتاب کا حال ہے۔ کہا یہ جا رہا ہے جو نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اسے دنیا کی زندگی میں اس نے پس پشت ڈال رکھا تھا۔ اُس کو اِس کا مطلق خیال نہ تھا کہ ایک دن اس کا سب کیا دھرا سامنے آ کر رہے گا۔ تقابل سے یہاں خود بخود اس کا اظہار ہو رہا ہے کہ مومنین دنیا میں اپنے نامہ اعمال کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہیں، وہ اسے کبھی پس پشت ڈالنے کی غلطی نہیں کرتے۔ دوسرے اور کئی ایک پہلو ہیں جو صنعت احتیاک سے یہاں سامنے لائے گئے ہیں۔ طوالت کے خوف سے ہم ان کا ذکر نہیں کریں گے۔

صنعت احتیاک کی طرف توجہ نہ ہونے کی وجہ سے بالعموم مترجمین سے یہاں یہ غلطی ہوئی کہ انھوں نے ''**وراءَ ظهـــره**'' کا ترجمہ کیا ہے: ''جس کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا'' (مولانا مودودیؒ)۔ ''جس کا اعمال نامہ اس کے پیچھے ہی سے پکڑا دیا جائے گا۔'' (مولانا امین احسن)

عربی روزہ مرہ اور عربی محاوروں کی طرف توجہ نہ دینے سے حیرت انگیز غلطیاں ہوتی

ہیں۔ سورۃ الحج میں ہے: ''**ألم تر أن اللّٰه أنزل من السمآء مآء فتصبح الأرض مخضرة**''. شاہ عبدالقادر صاحبؒ اس کا ترجمہ کرتے ہیں: ''تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے اُتارا آسمان سے پانی، پھر صبح کو زمین ہو جاتی ہے سبز۔'' (آیت ۶۳)

اسی طرح سورۃ المومنون میں آیا ہے: ''**قال عما قلیل لیصبحن ندمین**''. (آیت: ۴۰) اس کا ترجمہ شاہ صاحب کرتے ہیں: ''فرمایا اب تھوڑے دنوں میں صبح کو رہ جاویں گے پچھتاتے۔''

دیکھئے روزمرہ کا خیال نہ رہنے کی وجہ سے ترجمے میں کیسی غلطی ہوگئی۔ قرآن کے ان ٹکڑوں کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا: ''دیکھتے نہیں کہ اللہ ہی ہے جو آسمان سے پانی برساتا ہے تو زمین اس سے سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔'' (امین احسن اصلاحی)

دوسرے ٹکڑے کا ترجمہ ہوگا: ''ارشاد ہوا بہت جلد وہ پشیمان ہو کر رہیں گے۔'' (امین احسن اصلاحی)

''اَصبحَ'' اصل میں ''کان'' کے اخوات میں سے بمعنی صار ہے۔

ترجمہ جس زبان میں کیا جائے اس زبان کے لحاظ سے ترجمہ میں کوئی سقم نہیں ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ میں ذرا سی بے توجہی سے ترجمے میں خرابی رونما ہو جاتی ہے۔ قرآن میں ہے:

''**فاستخف قومه فاطاعوه**''. (الزخرف: ۵۴)

اس کا ترجمہ مولانا مودودی صاحبؒ کرتے ہیں: ''اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انھوں نے اس کی اطاعت کی۔''

قوم اردو میں واحد ہے۔ ترجمہ میں ''انھوں نے'' قوم کے لیے لائے ہیں، حالانکہ ''انھوں نے'' جمع کا صیغہ ہے۔

اسی طرح سورۃ محمد (۴۷) میں ہے: ''**وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثمّ**

لایکونوا أمثالکم". (آیت ۳۸)

اس کا ترجمہ مولانا مودودی صاحبؒ کرتے ہیں: ''اگر تم منھ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔'' یہاں بھی ترجمہ میں زبان اردو کے لحاظ سے سقم پیدا ہو گیا ہے۔ ''قوم'' واحد ہے۔ ''وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔'' جمع کا صیغہ ہے۔ واحد کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کرنا انسب نہ ہوگا۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے یہاں زبان کا لحاظ رکھا ہے۔ ان کا ترجمہ ہے: ''اور اگر تم روگردانی کرو گے تو اللہ تمہاری جگہ دوسرے کو لائے گا، پھر وہ تمہاری طرح نہ ہوں گے۔''

ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ قرآن کے ترجمے پر الفاظ کی تحقیق نہایت ضروری ہے۔ قرآن میں ہے: ''**وما ادراک ماسقر، لا تبقی و لا تذر**'' (المدثر) شاہ عبدالقادرؒ اس کا ترجمہ کرتے ہیں: ''اور تو کیا پوچھا کیسی ہے وہ آگ؟ نہ باقی رکھے نہ چھوڑے۔''

اَبقی علیٰ فلان کے معنی ہیں: **رحمہ و اشفق علیہ**. اس معنی میں لفظ تبقیٰ استعمال ہوا۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے آیت کا صحیح ترجمہ کیا ہے۔ ان کا ترجمہ ہے: ''اور کیا سمجھے کہ دوزخ کیا ہے؟ نہ ترس کھائے گی اور نہ چھوڑے گی۔'' البتہ یہاں ایک سہو مولانا امین اصلاحی صاحب سے ہو گیا ہے۔ موصوف نے دوزخ کو مؤنث استعمال کیا ہے، حالانکہ لفظ دوزخ مذکر ہے۔

قرآنِ حکیم میں روزمرہ کی طرح محاورے (Idioms) کا بھی استعمال ہوا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ محاورے کا اپنا ایک خاص مفہوم ہوتا ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ کرنا صحیح نہیں ہے، بلکہ اس طرح تو ترجمہ ہی غلط ہو جائے گا۔ سورۃ الزخرف (آیت ۵) میں آیا ہے: ''**أفنضرب عنکم الذکر صفحاً ان کنتم مسرفین**". اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا جاتا ہے: ''کیا ہم تمہاری تذکیری سے اس لیے صرف نظر کر لیں کہ تم حد سے تجاوز کرنے والے لوگ ہو؟'' (مولانا امین احسن اصلاحی) مولانا مودودی علیہ الرحمہ اس کا

ترجمہ اس طرح کرتے ہیں: ''اب کیا ہم تم سے بیزار ہو کر یہ درسِ نصیحت تمہارے ہاں بھیجنا چھوڑ دیں، اس لیے کہ تم حد سے گزرے ہوئے لوگ ہو۔'' اس آیت میں ایک محاورہ **ضرب عنہ الذکر صفحاً** کا استعمال ہوا ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے کسی کو بالکل نظرانداز کر دینا۔ اس آیت کا صحیح ترجمہ صرف مارماڈیوک پکتھال کے یہاں ملتا ہے۔ پکتھال کا ترجمہ ہے:

Shall we utterly ignore you because ye are a wanton folk?

''کیا ہم تمہیں اس لیے بالکل ہی نظرانداز کر دیں گے کہ تم ایک حد سے تجاوز کرنے والے لوگ ہو۔''

شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے ترجمہ معانی قرآن کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی ہے اور یہ شہرت بے وجہ نہیں ہے۔ شاہ صاحب کے ترجمے میں بعض ایسی خوبیاں پائی جاتی ہیں جن کی طرف بالعموم لوگ توجہ نہیں دیتے۔ شاہ صاحب کے ترجمے کے مطالعہ سے ترجمے کے بہت سے اصول معلوم ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب نے لفظی یا تشریحی ترجمے کے بجائے بامحاورہ ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ''**وھو السمیع العلیم**". (البقرۃ:۱۳۷) کا ترجمہ کرتے ہیں: (وہی ہے سنتا جانتا)۔ ''**وان اللہ سمیع بصیر**". (الحج:۶۱) کا ترجمہ کیا ہے: ''اور اللہ سنتا ہے دیکھتا۔'' قرآن کے ان ٹکڑوں کا ترجمہ بالعموم لوگ یہ کرتے ہیں: ''اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔'' اور اللہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔'' (مولانا امین احسن اصلاحیؒ)

اردو محاورے کے لحاظ سے شاہ صاحب کے ترجمے کو ترجیح حاصل ہے۔ اس ترجمے میں زور بھی ہے اور اس میں کسی طرح کا اشتباہ بھی نہیں پایا جاتا۔ ''سننے والا، دیکھنے والا، جاننے والا'' میں مفہوم بھی پایا جاتا ہے کہ وہ سننے، دیکھنے اور جاننے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یعنی وہ مستقبل

میں دیکھے، سننے اور جاننے لگا، حالانکہ قرآنی الفاظ کا مفہوم یہ نہیں ہے۔ مفہوم وہی ہے جو شاہ صاحب کے ترجمے سے عیاں ہوتا ہے۔ سورۃ البقرۃ آیت ۲۰۳ میں ''الیہ تحشرون'' آیا ہے۔ شاہ صاحب نے اس کا ترجمہ فرمایا ہے: ''تم اسی کے پاس جمع ہوگے۔'' مولانا امین احسن صاحب اس کا ترجمہ کرتے ہیں: ''تم اس کے حضور میں اکٹھے کیے جاؤ گے۔'' یہاں شاہ صاحبؒ کا ترجمہ ہی انسب ہے۔ اصل مفہوم وہی ہے جو شاہ صاحب نے اختیار کیا ہے۔ اصل عربی میں Passine care یعنی مجہول کا صیغہ تو محض اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ عربی میں وہی فصیح ہے۔ ''لم یلد ولم یولد'' کا ترجمہ ہماری زبان میں یہ ہوگا: ''نہ وہ باپ ہے اور بیٹا۔'' اگر لفظی ترجمہ کرتے ہیں کہ ''نہ جنا اور نہ جنا گیا۔'' تو ساری فصاحت ختم ہو جائے گی۔ عربی میں وہی فصیح انداز ہے جو عربی متن میں اختیار فرمایا گیا ہے، لیکن اردو میں عربی کا انداز اختیار کرنے سے ترجمہ نہایت رکیک ہو کر رہ جاتا ہے۔ قرآن نے تو فصاحت کی رعایت رکھی ہے، ترجمہ میں بھی فصاحت کی رعایت ضروری ہے۔

اردو تراجم میں زبان کے لحاظ سے مولانا مودودیؒ کا ترجمہ لائق تحسین ہے۔ موصوف نے اپنی صلاحیتوں کا بہترین استعمال قرآن کے ترجمے اور اس کی تفسیر میں کیا ہے، لیکن انسان بہرحال انسان ہے، اُس کی کسی کوشش کو آخری نہیں سمجھنا چاہیے۔ قرآن مجید کے ترجمے کے سلسلہ میں جو چند مثالیں پیش کی گئی ہیں ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کے ترجمے کا کام نہایت ذمے داری کا ہے۔ اس کے لیے غیر معمولی صلاحیت اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ مترجم نہایت حساس اور باذوق ہو اور ترجمے کے کام میں وہ کسی قسم کے تساہل کو روا نہ رکھے۔

☆☆

قرآن کریم میں غیر عربی اصل الفاظ
(ایک جائزہ)

● ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی

قرآن کریم میں غیر عربی اصل الفاظ یا 'معرب' کے وجود کا مسئلہ علوم قرآن کے ان معرکۃ الآراء مسائل میں سے ایک ہے جو ہمیشہ موضوع بحث رہا ہے۔ عرب کے علمائے لسانیات کے نزدیک بھی یہ عربی زبان کے اہم موضوعات میں شامل ہے۔ لغوی اعتبار سے لفظ 'معرب' تعریب مصدر سے اسم مفعول ہے اور اصطلاحی معنی میں وہ لفظ ہے جسے غیر عرب نے وضع کیا اور عربوں نے اس کے معنی موضوع لہ میں اسے استعمال کیا ہو۔ یعنی معرب غیر عربی زبان کا وہ لفظ ہے جسے عربی زبان والوں نے مستعار لے لیا ہو، اسے اپنی تحریر، تقریر اور روزمرہ میں استعمال کیا ہو، یہاں تک کہ وہ لفظ عربی لغات و معاجم کا حصہ بن گیا ہو۔ اس طرح معرب اپنی اصل کے اعتبار سے عجمی اور استعمال کے اعتبار سے عربی ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں معرب کا استعمال ہوا ہے یا نہیں؟ یہ علما کے درمیان ایک قدیم اختلافی موضوع ہے جو آج بھی جاری و ساری ہے۔ اس موضوع پر عصر تدوین سے لے کر معاصر علما تک دو خیموں میں بٹے ہوئے ہیں۔ علما کی ایک جماعت قرآن میں معرب کے وجود کا اقرار کرتی ہے تو دوسری شدت سے اس کا انکار کرتی ہے۔

اللہ کی کتاب میں معرب کے وجود یا وقوع کا انکار کرنے والی جماعت کے سرخیل امام شافعی رحمۃ اللہ ہیں۔ انھوں نے اپنے ''الرسالہ'' میں انتہائی پرزور اور مدلل انداز میں قرآن

میں وقوع معرب کی نفی کی ہے، فرماتے ہیں: ''**لیس فی کتاب اللہ شیء إلا بلسان العرب**'' (اللہ کی کتاب میں عربی زبان کے سوا کچھ نہیں ہے)۔ مزید فرماتے ہیں: ''اگر کوئی یہ کہے کہ کیا دلیل ہے اللہ کی کتاب میں صرف عربی زبان ہے اور عربی کے سوا اس میں کسی زبان کی آمیزش نہیں ہے؟ تو اس کی دلیل خود اللہ کی کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''**وما أرسلنا من رسول إلا بلسان قومه.**'' (ابراہیم:4) اور اللہ تعالیٰ نے اس چیز (قرآن کے خالص عربی ہونے) کو اپنی کتاب کی متعدد آیتوں میں بیان کیا ہے۔ امام شافعی ان آیات کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے نہ صرف قرآن کے عربی ہونے کا اثبات کیا ہے، بلکہ صراحت کے ساتھ اس کے غیر عربی ہونے کی بھی نفی کی ہے۔

بلاشبہ ان آیات کے ظاہر کی دلالت امام شافعی کے موقف کی تائید کر رہی ہے۔ ان کے بعد مشہور مفسر ابن جریر طبری نے مانعین کی قیادت سنبھالی، انھوں نے اپنی تفسیر کے مقدمے میں اس موضوع سے متعلق ایک خاص فصل قائم کی ہے، جس میں بڑی شدومد کے ساتھ قرآن میں معرب کے وجود کا انکار کیا ہے اور اپنے موقف کے اثبات پر دلائل و براہین کو جمع کیا ہے۔ ان کے نزدیک وہ تمام الفاظ جنھیں معرب کہا جاتا ہے وہ توافق السنہ کی قبیل سے ہیں، اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ یعنی یہ محض اتفاق ہے کہ بعض زبانوں میں کچھ ایسے الفاظ ملتے ہیں جنھیں عربی الفاظ سے صوری مشابہت ہے۔

امام طبری قرآن میں وجود معرب کا قول کرنے والوں کے تمام دلائل کو ذکر کرنے اور ان کا جواب دینے کے بعد لکھتے ہیں: ''**وقد دللنا علی صحة القول، بمافیه الکفایة، لمن وفق لفهمه علی أن الله – جل ثناء– أنزل جمیع القرآن بلسان العرب دون غیرها.**''

مانعین میں تیسرا بڑا نام ابوعبیدہ معمر بن مثنی کا ہے، انھوں نے قرآن میں معرب کا دعویٰ کرنے والوں کی سخت مذمت کی ہے۔ علما نے ان کا یہ مشہور قول نقل کیا ہے، جو بھی یہ

گمان کرتا ہے کہ قرآن میں عربی کے سوا کوئی اور زبان ہے وہ اللہ کے حضور بڑی جرأت کی بات کرتا ہے۔ ابن الفارس لغوی نے ابوعبیدہ کی مکمل تائید کی ہے۔ معرب پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں: بات تو وہی ہے جو ابوعبیدہ نے کہی ہے، اگرچہ کچھ متقدمین کی رائے ان کے خلاف ہے۔ امام رازی اور باقلانی بھی مانعین کی فہرست میں شامل ہیں۔ معاصر محققین میں احمد شاکر اس نقطہ نظر کے علم بردار ہیں۔ انھوں نے جوالیقی کی کتاب ''**المعرب من کلام الأعجمی**'' کی تحقیق کی ہے اور ان تمام الفاظ کو عربی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، جنھیں صاحب کتاب نے غیر عربی قرار دیا ہے۔ دوسری جماعت، یعنی قرآن کریم میں معرب کے وجود کے قائلین میں سب سے نمایاں نام ابوعبید القاسم بن سلام کا ہے۔ ان کی اور اس جماعت کی دلیل یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ قرآن میں معرب کے وجود کے قائل ہیں اور یہ لوگ تاویل قرآن کو ابوعبیدہ سے زیادہ جانتے ہیں۔ چنانچہ عبداللہ بن عباس، عکرمہ اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم وغیرہ سے قرآن کے متعدد الفاظ کے بارے میں مروی ہے کہ یہ دوسری زبانوں کے الفاظ ہیں، جیسے **سجیل، المشکوٰۃ، الطور، اباریق** اور **استبرق** وغیرہ۔

ابوالمنصور جوالیقی (متوفی 540ھ) نے اس موضوع پر ''**المعرب من کلام الأعجمی**'' نام کی ایک مفصل کتاب لکھی ہے جس میں عربی زبان میں موجود دوسری زبانوں کے الفاظ کو جمع کیا ہے۔ ان میں سے بعض الفاظ قرآن میں بھی وارد ہوئے ہیں۔ صاحب کشاف زمخشری بھی قرآن میں وقوع معرب کے قائل تھے۔

جلال الدین سیوطی (متوفی 911ھ) کا بھی یہی موقف تھا، چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب ''الاتقان فی علوم القرآن'' کی اڑتیسویں فصل کا عنوان ''**ماوقع فی القرآن بغیر لغة العرب**'' رکھا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس موضوع پر دو مستقل کتابیں بھی لکھیں ہیں: پہلی کتاب کا نام ''**المهذب فیما وقع فی القرآن من المعرب**'' ہے۔ اس

کتاب کی طرف سیوطی نے اتقان میں اشارہ بھی کیا ہے۔ دوسری کتاب "المتوکلی" ہے جو انھوں نے خلیفہ متوکل علی اللہ کی فرمائش پر لکھی تھی۔ زمانی اعتبار سے اس کی تالیف مؤخر ہونے کے سبب اتقان میں اس کا ذکر نہیں ہوا ہے۔ مہذب کی ترتیب حروف ہجا کے اعتبار سے ہے اور متوکلی کی لغات کے اعتبار سے ہے۔ متوکلی میں قرآن مجید میں وارد ایک سو چھبیس معرب الفاظ کا ذکر ہے جو گیارہ مختلف زبانوں کے ہیں اور یہ زبانیں: حبشی، فارسی، رومی، ہندوستانی، سریانی، عبرانی، نبطی، قبطی، ترکی، زنجی اور بربری ہیں۔ معاصرین میں یہ موقف رکھنے والوں میں سب سے زیادہ نمایاں نام ڈاکٹر رمضان عبدالتواب کا ہے۔ وہ احمد شاکر پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اگر ہم ان مثالوں کو جمع کرنے لگیں جو قرآن میں وقوع معرب کے موضوع سے متعلق شیخ احمد شاکر کے تعصب بے جا کی نشان دہی کرتی ہیں تو بات بڑی لمبی ہو جائے گی اور ان کے اس تعصب کے لیے کوئی جواز نہیں ہے۔

قرآن کریم میں معرب کے وجود کا انکار کرنے والوں کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ یہ ان کے خلاف ہے جن میں قرآن کے عربی ہونے کی بات کہی گئی ہے، کیونکہ یہ بات تو اس وقت درست ہوتی جبکہ یہ کہا جاتا کہ قرآن نے یہ الفاظ براہ راست غیر عربی زبانوں سے لیے ہیں، لیکن یہ کوئی نہیں کہتا، بلکہ یہ الفاظ نزول قرآن سے بہت پہلے عربی زبان میں استعمال ہو رہے تھے اور عربی زبان کے لسانی تقاضوں کے مطابق ان میں صوتی و معنوی تغیرات بھی آ چکے تھے۔ اس کے بعد قرآن نے انھیں استعمال کیا ہے، لہٰذا ان سے قرآن کی عربیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، خواہ ان الفاظ کی اصل کوئی بھی زبان ہو، چنانچہ خود ابن سلام صحابۂ کرامؓ کے حوالے سے ابن عبیدہ کی تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں: یہ حضرات تفسیر قرآن کو ابوعبیدہ سے زیادہ جانتے تھے، لیکن ان کا موقف الگ تھا اور ابوعبیدہ کا الگ، اور انشاء اللہ دونوں ہی اپنے اپنے موقف میں حق بجانب ہیں۔ وہ اس طور پر کہ یہ الفاظ اپنی اصل کے اعتبار سے غیر عربی زبان کے ہیں تو ان حضرات کی بات اصل کے اعتبار سے ہے، پھر

عربوں نے انھیں اپنی زبان میں شامل کر لیا تو یہ عربی قواعد کی رعایت کے ساتھ استعمال کے سبب عربی الفاظ ہو گئے، لہٰذا اس حال میں یہ عربی ہیں اور اصل کے اعتبار سے عجمی ہیں۔

اور رہا زبانوں کا باہم تاثیر و تاثر کا تبادلہ اور الفاظ کا لین دین تو آج یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ صرف عربی زبان ہی نہیں، بلکہ دنیا کی کوئی باضابطہ زبان نہیں ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ وہ خالص اور غیر مخلوط ہے یا کسی بھی دوسری زبان کے اثر سے پوری طرح محفوظ ہے۔ آج دنیا کی ساری زبانوں کے ماہرین لسانیات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بنی نوع انسان کی مہذب نسلوں میں کوئی ایسی زبان نہیں ہے جو دوسری زبانوں کی آمیزش سے پوری طرح پاک ہو۔ زبانیں اپنے جغرافیائی اور تہذیبی اتصال کے دوران پوری آزادی کے ساتھ الفاظ کا لین دین کرتی ہیں اور اشیا و عادات کے ساتھ ساتھ ان سے متعلق الفاظ بھی جغرافیائی اور لسانی حدود پار کرتے رہتے ہیں۔

دنیا کی کوئی مہذب زبان دوسری زبانوں کے اتصال سے محفوظ نہیں رہ سکتی اور زبانوں کے باہمی ربط و اتصال کا لازمی و حتمی نتیجہ تاثیر و تاثر کا تبادلہ اور الفاظ اور دوسرے لسانی مظاہر کا لین دین ہوتا ہے۔ مختلف زبانوں کے ربط و اتصال کے بنیادی اسباب میں بعض یہ ہیں: دو مختلف زبان قوموں میں ایک کا دوسرے کے ملک میں نوآبادیات قائم کرنا، مختلف زبان بولنے والی قوموں کا ایک دوسرے کے پڑوس میں ہونا، دو مختلف زبان قوموں میں طویل جنگ کا ہونا یا ان میں دینی، تجارتی یا تہذیبی تعلقات کا ہونا۔

عربوں کے پڑوس میں غیر عربی بولنے والی کئی قومیں بھی آباد تھیں اور کئی دور دراز کی قوموں سے ان کے تجارتی تعلقات بھی تھے، لہٰذا ان قوموں کی زبانوں کے الفاظ کا عربی میں داخل ہونا ایک فطری بات ہے اور اگر ان الفاظ میں سے کچھ قرآن میں بھی شامل ہوں تو ایسا عین ممکن ہے؟ لیکن یہ الفاظ اپنی اصل کے اعتبار سے عجمی ہونے کے باوجود اپنے استعمال کے لحاظ سے عربی ہی مانے جائیں گے، لہٰذا قرآن میں معرب کے وجود کا انکار

صرف زبانوں کی سنت وفطرت سے ناواقفیت کے سبب ہے۔ قدما کے لیے تو یہ عذر پیش کیا جاسکتا ہے کہ ان کے سامنے 'لسانیات' کی یہ ترقی یافتہ شکل موجود نہیں تھی، بلکہ اس وقت تک وضع اور توقیف کا قضیہ بھی نہیں حل ہو پایا تھا، لیکن معاصرین کے لیے کوئی عذر نہیں ہے، سوائے اس کے کہ انھوں نے ایک خالص علمی مسئلے کو دینی جذبات سے جوڑ دیا ہے، بقول ڈاکٹر محمد عید: لگتا ہے کہ جن لوگوں نے قرآن میں معرب کے وجود کا انکار کیا ہے ان پر ایک لسانی حقیقت کے اظہار سے زیادہ مذہبی محرک مسلط ہے۔

قرآن کریم کے عربی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ انھیں الفاظ سے مرکب ہے جنھیں اہل زبان بولتے اور سمجھتے تھے۔ وہ الفاظ عربی اصول سے تعلق رکھتے ہوں یا غیر عربی اصول سے، کیا قرآن میں معرب کے وجود سے انکار کرنے والے اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ اس میں انبیاء بنی اسرائیل علیہم السلام کے نام غیر عربی اصل کے ہیں اور اسی طرح کئی دوسرے اعلام ومعارف کا تعلق بھی دوسری زبانوں سے ہے، تو اگر ان سے قرآن کی عربیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا تو کچھ اور عجمی اصل الفاظ کے قرآن میں شامل ہونے سے کیا فرق پڑ سکتا ہے؟ خصوصیت سے اس صورت میں جبکہ وہ الفاظ پہلے سے عربی زبان میں شامل رہے ہوں، اس کے مزاج میں پوری طرح ڈھل چکے ہوں اور عرب ان کے مفہوم ومصداق سے پوری طرح واقف رہے ہوں۔

لیکن قرآن کریم یا عربی زبان میں وقوع معرب کے جواز کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ مجوزین وقائلین کی کتابوں میں جن الفاظ کو عجمی اصل قرار دیا گیا ہے، ان سب کو من وعن معرب مان لیا جائے، اس لیے کہ جس طرح مانعین نے ہر عجمی ومعرب لفظ کے لیے بہ تکلف عربی اصل واشتقاق تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اسی طرح قائلین نے بھی عجمیت کا حکم لگانے میں بڑی عجلت سے کام لیا ہے اور ایسے بہت سے الفاظ کو معرب قرار دے دیا ہے جو حقیقت میں عربی اصل ہیں، اس لیے کہ نہ تو انھیں ان زبانوں کے بارے میں کچھ زیادہ

معلومات تھیں جن سے ان الفاظ کے عربی میں منتقل ہونے کا وہ دعویٰ کرتے تھے اور نہ انھیں لفظ کی اصل وتاریخ سے متعلق علم (ایٹیمولوجی Etymology) کے اصول وقواعد کی خاطر خواہ معرفت تھی، بلکہ اس وقت تو یہ علم باقاعدہ وجود ہی میں نہیں آیا تھا، چنانچہ ان حضرات کی کتابوں میں غلطیوں کے بہت امکانات ہیں، جن میں زیادہ تر تین پہلوؤں سے متعلق ہیں، بلکہ اس کے لیے علم لسانیات کے اصول وقواعد کی رعایت ضروری ہوگی۔ مثلاً اگر دو زبانوں کے درمیان تاریخی طور پر ربط واتصال ثابت نہ ہو تو تاثیر وتاثر کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، خواہ ان کے بعض لفظوں میں کتنی ہی صوری مشابہت کیوں نہ ہو۔

بہت سے سامی اصل الفاظ پہلے فارسی یا پہلوی زبان میں داخل ہو گئے تھے، جب عربی میں ان کا استعمال دیکھا گیا تو انھیں معرب مان لیا گیا، حالانکہ جب وہ سامی اصل کے ہیں تو معرب کیسے ہو سکتے ہیں، کیونکہ عربی خود سامی زبان کی ایک فرع ہے، یہ عین ممکن ہے کہ وہ عربی میں براہ راست اپنی سامی اصل سے منتقل ہوئے ہوں۔ ان حضرات نے ہر اس عربی لفظ کو جو سریانی یا عبرانی میں معروف ہے معرب قرار دے دیا اور اس بات کو نظر انداز کر دیا کہ بہت ممکن ہے کہ وہ لفظ ایک ہی سامی اصل سے نکلا ہوا ہو اور تینوں سامی زبانوں میں مشترک ہو۔ مختصر یہ کہ قرآن کریم میں معرب کا وجود جائز اور ممکن ہے اور عربی میں یقینی اور حتمی ہے، لیکن قرآن ہو یا عربی زبان اس میں معرب کا تعین لسانیات کے جدید علوم کی روشنی میں از سر نو ہونا چاہیے۔

☆☆

حفظ قرآن مجید

(نصاب اور طریقۂ کار)

● مولانا اسعد اعظمی

تاریخی پس منظر:

قرآن کریم اللہ ربّ العزت کی آخری کتاب ہے جو خاتم الانبیاء وسیّد الرسل محمد ﷺ پر نازل کی گئی ہے۔ اگر ہم اس عہد کا جائزہ لیں جس میں اس کتاب کا نزول ہوا اور اس قوم کے احوال و کوائف پر نظر ڈالیں جن پر ابتداءً یہ کتاب اتری تو اندازہ ہوگا کہ اس عظیم المرتبت آسمانی صحیفہ کی حفاظت وصیانت اور اس کا حفظ واستیعاب کیوں کر ممکن ہوا اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ: ''انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون''. (سورة الحجر: ۹) (ہم نے اس قرآن کو نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں)۔ کی تکمیل کن وسائل و ذرائع سے ہوئی۔

نزول قرآن کے وقت عربوں کے اندر تعلیم اور تہذیب وتمدن کا فقدان تھا۔ اہل مکہ و مدینہ میں گنتی کے چند لوگ تھے جو کسی قدر لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اللہ ربّ العزت نے ان کا تذکرہ ''امیین'' کے لقب سے کیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: ''هو الذی بعث فی الأمیین رسولاً منهم''. (سورة الجمعة: ۲) (وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا)۔ اللہ کے رسول ﷺ کا خود فرمان ہے: انا أمة أمیة لا نکتب ولا نحسب... (صحیح بخاری، حدیث نمبر ۱۹۰۸، صحیح مسلم، حدیث نمبر ۲۵۱۱

(موسوعة الکتب الستة، دارالسلام ریاض، ط:۳، ۱۴۲۱ھ) ''ہم اَن پڑھ قوم ہیں، حساب و کتاب نہیں جانتے۔''

نبی اکرم ﷺ بھی اسی معاشرے کے ایک فرد تھے۔ تعلیم وتعلّم سے آپ کا بھی کوئی سابقہ نہیں تھا۔ قرآن نے ان کو ''النبی الأمی'' (سورة الاعراف: ۱۵۷) کے لقب سے ملقب فرمایا ہے۔ اور ایک جگہ یہ فرمایا: ''وکذلک أوحینا الیک روحا من أمرنا ماکنت تدری ما الکتاب ولا الایمان''. (سورة الشوریٰ: ۵۲) (اور ہم نے اسی طرح آپ کی طرف اپنے حکم سے روح کو اتارا ہے، آپ اس سے پہلے یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ کتاب اور ایمان کیا چیز ہے۔) مزید فرمایا: ''وما کنت تتلو من قبله من کتاب ولا تخطه بیمینک''. (سورة العنکبوت: ۴۸) (اس سے پہلے تو آپ کوئی کتاب پڑھتے نہ تھے اور نہ کسی کتاب کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے)۔

یہی وجہ ہے کہ جب آپ کے پاس آسمان سے پہلی وحی آئی اور آپ کو پڑھنے کا حکم دیا گیا تو آپ نے ''ما أنا بقارئ'' (صحیح بخاری، حدیث نمبر ۳، صحیح مسلم، حدیث نمبر ۴۰۳) ''میں تو پڑھا ہوا ہی نہیں ہوں۔'' کہہ کر اپنے عذر کا اظہار فرمایا۔

اور یہ بات معلوم ہے کہ اُمی اور اَن پڑھ افراد واقوام کسی واقعے یا تاریخ کو محفوظ رکھنے کے لئے کلی طور پر اپنی یادداشت اور حافظہ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ تحریر وکتابت سے عدم وابستگی کی بنا پر ان کا سارا دارومدار ذہنی ودماغی قوت پر ہوتا ہے۔ ان کے قلوب واذہان ہی ان کی معلومات کا خزینہ اور علوم معارف کے امین ہوتے ہیں۔ علامہ محمد عبدالعظیم زرقانی لکھتے ہیں: ''اُمی کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اہم امور اور قابل ذکر چیزوں کو محفوظ رکھنے کے سلسلے میں وہ اپنے قوت حافظہ ہی پر بھروسہ کرتا ہے، خصوصاً جب کہ وہ حفظ واستظہار کی قوت سے بہرہ ور ہو۔ یہ قوت اس کے جمع واستحضار کے لئے ممد ومعاون ثابت ہوتی ہے۔ عرب قوم نزول قرآن کے وقت مکمل طور سے عروبت کے خصائص سے بہرہ ور تھی۔ حافظہ کی تیزی اور

ذہنی ارتقااس کے مظاہر تھے۔''حتی کانت قلوبهم أناجيلهم، وعقولهم سجلات أنسابهم وأيامهم، وحوافظهم دواوين أشعارهم ومفاخرهم''.
(مناهل العرفان: ۱/۲۴۰، دار احياء الكتب العربية)

نبی اُمی ﷺ پر جب قرآن کا نزول شروع ہوا تو ابتداءً آپ حضرت جبرئیل سے وحی کے الفاظ سننے کے ساتھ ہی انہیں دہراتے اور جلدی جلدی اپنے حافظے میں محفوظ کرنے کی کوشش کرتے تھے، تا آنکہ اللہ ربّ العزت کی جانب سے یہ اطمینان دلایا گیا کہ وحی کی حفاظت کی ذمہ داری ہماری ہے، آپ نزول وحی کے وقت اسے بغور سنا کریں۔ چنانچہ ''سورۃ قیامۃ'' میں کہا گیا:

''لا تحرک به لسانک لتعجل به. إن علينا جمعه وقراٰنه. فإذا قراٰنه فاتبع قراٰنه. ثم إن علينا بيانه''. (سورة القيامة: ۱۶-۱۹)

(اے نبی!) آپ قرآن کو جلدی (یاد کرنے) کے لئے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔ اس کا جمع کرنا اور (آپ کی زبان سے) پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔ جب ہم اسے پڑھ لیں تو آپ اس کے پڑھنے کی پیروی کریں، پھر اس کا واضح کردینا ہمارے ذمہ ہے۔''

اور ''سورۃ طٰہٰ'' میں یوں تنبیہ کی گئی: ''فتعالى الله الملک الحق، ولا تعجل بالقرآن من قبل أن يقضى اليک وحيه، وقل رب زدني علما''. (سورة طٰه: ۱۱۴)

(پس اللہ عالی شان والا سچا اور حقیقی بادشاہ ہے تو قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کر، اس سے پہلے کہ تیری طرف جو وحی کی جاتی ہے وہ پوری ہو جائے۔ ہاں یہ دعا کر کہ پروردگار میرا علم بڑھا۔)

صحابہ کرام نے نبی اُمی ﷺ سے قرآن سیکھا، اسے اپنے سینوں میں محفوظ کیا اور اس کے اوامر ونواہی کو اپنی عملی زندگی میں جگہ دی۔ صحابہ کرام کی اکثریت نے نبی سے مشافہةً ہی

قرآن سیکھا اور بعد میں آنے والی نسلوں میں سینہ بہ سینہ یہ قرآن منتقل ہوتا گیا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور ان شاء اللہ تا قیامت جاری رہے گا۔

علامہ ابن الجزری نے لکھا ہے کہ: ''ثم إن الاعتماد في نقل القرآن على حفظ القلوب والصدور، لا على خط المصاحف والكتب، وهذه أشرف خصيصة من الله تعالىٰ لهٰذه الأمة....'' (مناهل العرفان: ۱/۲۴۲)

(قرآن کی روایت میں سارا دارومدار سینوں کے حفظ پر ہے نہ کہ صحیفوں اور کتابوں کی تحریر پر اور یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس امت کو دی جانے والی عظیم خصوصیت ہے۔)

ایک حدیث میں کہا گیا ہے:

''وأنزلت عليک كتابا لا يغسله الماء تقرأه نائما ويقظان''. (صحيح مسلم، حديث نمبر ۷۲۰۷)

تلقی اور **مشافهه** یعنی سماع کے ذریعہ قرآن سیکھنا اور اسے اپنے سینے میں محفوظ کر لینا پھر دوسروں کو اسی طرز پر اسے سکھانا اور حفظ کرانا کتب سماویہ میں سے صرف قرآن کریم ہی کا خاصہ ہے اور فرمانِ الٰہی ''انا نحن نزلنا الذكر وانا له لحافظون''. (سورة الحجر: ۹) کا عظیم مظہر ہے۔ دیگر آسمانی کتابوں کی تاریخ اور ان میں ہونے والی تحریف اور قطع و برید سے جو لوگ واقف ہیں انہیں اس حقیقت کو سمجھنے میں ادنیٰ تامل نہ ہوگا۔ علامہ قاضی سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ قرآن کی پیش گوئیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چوتھی پیش گوئی: کہ قرآن مجید حفظ و یاد رکھا جائے گا۔

''بل هو آيات بينات في صدور الذين أوتوا العلم''. (سورة العنكبوت: ۴۹) .

(یہ قرآن تو وہ روشن آیتیں ہیں جو علم والوں کے سینے میں رہتی ہیں۔)

ساری کتاب کو حفظ کر لینا ایک اچھوتا خیال تھا، کیونکہ قرآن مجید سے پیشتر دنیا میں

کوئی کتاب حفظ نہ کی گئی تھی، اس لئے اس خیال کا پیدا ہونا ہی اس کے الہامی ہونے پر دلیل ہے۔اس پیش گوئی کے مطابق ہر ملک، ہر صوبہ، ہر ضلع، ہر شہر میں حفاظ قرآن کی کافی تعداد پائی جاتی ہے، جو اس صحت اور اتقان اور یقین واثق کے ساتھ تلاوت قرآن پاک کرتے ہیں کہ ان کی قرأت سے مطبوعہ کتابت کی صحت کی جاتی ہے، مگر ان حفاظ کو مطبوعہ یا قلمی کتاب سے صحت کرنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی۔اگر کسی حافظ کو اپنے پڑھنے میں کہیں شبہ پڑے گا تو وہ اس کی صحت دوسرے حفاظ ہی سے جا کر کرے گا۔یہ ایسی زبردست پیش گوئی ہے کہ تمام دنیا اس کی نظیر لانے سے عاجز ہے۔حفاظت کا ایسا انتظام بالکل لاثانی ہے اور محض منجانب اللہ تعالیٰ ہے۔'' (رحمۃ للعالمین:۳/۲۶۲-۲۶۳، مکتبہ رحمت، دیوبند)

اس کے بعد قاضی صاحب ایک اور پیش گوئی کا ذکر کرتے ہیں:''پانچویں پیش گوئی: کہ قرآن مجید کو حفظ کر لینا آسان ہوگا۔

ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر. (سورہ قمر: آیت.۱۷)

(ہم نے قرآن کو یاد کرنے کے لئے آسان بنادیا ہے)۔

پیش گوئی چہارم کے تحت میں تحریر کیا گیا ہے کہ ساری کتاب کو حفظ کرنے کا خیال ہی بالکل اچھوتا ہے۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب مسلمانوں نے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں دنیا کی تمام اقوام اور ممالک کے سامنے قرآن مجید کو ازبر سنانا شروع کیا تب دوسروں کو بھی امنگ آنی چاہئے تھی اور دوسروں کو بھی ایسا کرنے کا جوش پیدا ہونا چاہئے تھا کہ وہ بھی اپنے اپنے مذہب کی کتاب کو حفظ کر لیتے، کیونکہ ان کے سامنے یہ نظیر موجود تھی۔

مگر کوئی بھی ایسا نہ نکلا، نہ یہودی نہ عیسائی، نہ پارسی نہ ہندو اور نہ اور جس نے اپنے پسندیدہ مذہب کی پسندیدہ کتاب کو حفظ کر لیا ہو، اس کی وجہ خود قرآن پاک نے بتلادی ہے کہ یہ خصوصیت بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید ہی میں رکھ دی ہے کہ وہ یاد کرنے والوں کو جلد

اور آسانی سے یاد ہو جاتا ہے۔'' (رحمۃ للعالمین:۳/۲۶۲-۲۶۳، مکتبہ رحمت، دیوبند)

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں آیت:''**انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون**'' کی تفسیر کے ضمن میں ایک واقعہ نقل کیا ہے جس کا تذکرہ یہاں فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔علامہ لکھتے ہیں:

''یحییٰ بن اکثم (متوفی ۲۴۲ھ) نے بیان کیا کہ ایک دفعہ خلیفہ مامون کے دربار میں ایک علمی مجلس منعقد ہوئی۔حاضرین میں ایک خوش پوش اور وجیہ یہودی بھی تھا، اس نے بھی اچھی تقریر کی۔مجلس ختم ہونے کے بعد مامون نے اسے بلایا اور پوچھا کہ تم اسرائیلی ہو؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔مامون نے اسے اسلام قبول کر لینے کی دعوت دی اور اسلام قبول کرنے کی صورت میں اس کی حوصلہ افزائی کے لئے کئی چیزوں کا وعدہ بھی کیا۔اس یہودی نے کہا کہ یہ میرے اور میرے آباء واجداد کا دین ہے۔(میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں) پھر واپس چلا گیا۔ایک سال کے بعد وہ مسلمان ہو کر آیا اور فقہ پر اس نے بہترین تقریر کی۔مجلس کے اختتام پر مامون نے اس کو بلایا اور کہا کہ کیا آپ وہی شخص نہیں ہیں جو کل (گزشتہ سال) کی مجلس میں ہمارے ساتھ بیٹھے تھے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

مامون نے اس کے اسلام لانے کا سبب دریافت کیا۔اس نے کچھ اس طرح بیان کیا:

آپ کے یہاں سے واپس جانے کے بعد میں نے ان مذاہب کو آزمانا شروع کیا۔آپ کو معلوم ہے کہ میری تحریر اچھی ہے، شمیں نے توریت کے تین نسخے حذف واضافہ کے ساتھ لکھ کر تیار کئے، پھر انہیں فروخت کرنے کے لئے لے گیا۔وہ تینوں نسخے بک گئے، اس کے بعد میں نے انجیل کے تین نسخے حذف واضافہ کے ساتھ تیار کئے اور وہ بھی فروخت ہو گئے۔آخر میں قرآن کے تین نسخے حذف واضافہ کے ساتھ لکھے اور انہیں کتب فروشوں کے یہاں لے گیا، انھوں نے ان کا بغور جائزہ لیا۔جب انھوں نے ان نسخوں میں کمی بیشی دیکھی تو انہیں پھینک دیا اور نہیں خریدا۔اب مجھے پتہ چل گیا کہ یہ محفوظ کتاب ہے، یہی

میرے اسلام لانے کا سبب بنا۔

یحییٰ بن اکثم کہتے ہیں کہ اس سال حج میں میری ملاقات سفیان بن عیینہ سے ہوئی۔ میں نے اس واقعہ کا ان سے تذکرہ کیا، انھوں نے کہا: اس کی تصدیق تو خود کتاب اللہ میں موجود ہے۔ میں نے پوچھا: وہ کہاں؟ انھوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے توریت وانجیل کے بارے میں فرمایا ہے:... **بما استحفظوا من کتاب اللہ.** (سورۃ المائدۃ:۴۴) ''انہیں اللہ کی کتاب کی حفاظت کا حکم دیا گیا تھا'' چنانچہ ان کتابوں کی حفاظت کا ذمہ انہیں دیا تو وہ ضائع ہوگئیں اور قرآن کے بارے میں فرمایا کہ ''**انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون.**'' (سورۃ الحجر:۹) 'ہم نے اس قرآن کو نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں' اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کی خود حفاظت فرمائی، اس لئے یہ ضیاع سے محفوظ رہی۔'' (تفسیر القرطبی:۱۰/۵-۶، ط:۱۹۶۷م القاہرہ)

حفظ قرآن کا اہتمام عہد حاضر میں:

مسلمانوں نے ہر دور اور ہر مقام میں قرآن کے حفظ وقرأت کا اہتمام کیا ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت آج بھی اپنے نونہالوں کی تعلیم کا آغاز قاعدہ بغدادی، یسرنا القرآن اور قرآن مجید سے کرتی ہے۔ جدید تعلیم گاہیں اور خوشنما نرسری اسکول اگرچہ اس روایت پر اثر انداز ہوئے ہیں، پھر بھی مجموعی اعتبار سے مسلمان قرآن کریم ہی سے اپنے بچوں کی تعلیم کی ابتدا کو ترجیح دیتے ہیں۔

مدارس کی تاریخ اور مسلمانوں کے یہاں مدارس کے اہتمام سے کون ناواقف ہوگا، مسلمان جہاں بھی آباد ہوتے ہیں، شعائر تعبدیہ کی ادائیگی کے لئے مسجد اور بچوں کی تعلیم کے لئے مکتب یا مدرسہ قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آبادی کے پھیلاؤ اور اضافے کے ساتھ دیگر چیزوں کی طرح مدارس کی تعداد میں اضافہ ہونا فطری امر ہے۔ اللہ کے فضل سے

دنیا کے چپے چپے میں پھیلے ہوئے یہ مدارس قرآن مجید کی تعلیم کے ساتھ دیگر علوم شرعیہ و ضروریہ کی تعلیم کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان مدارس میں سے اکثر میں قرآن کریم کی تحفیظ و تجوید کا مستقبل شعبہ ہوتا ہے، جس میں حفاظ وقراء حضرات کی نگرانی میں طلبہ کی ایک بڑی تعداد قرآن حفظ کرتی ہے۔

موجودہ دور میں حفظ قرآن کے مستقل مدارس کا قیام بھی ایک خوش آئند اقدام ہے۔ اس قسم کے مدارس حفظ قرآن کے متخصص مراکز کہے جاسکتے ہیں، جہاں قرآن حفظ کرانے کا عمدہ نظم ہوتا ہے۔ یہ مراکز کارکردگی کے اعتبار سے اپنی اپنی شناخت قائم کئے ہوئے ہیں اور عوام وخواص کی توجہ کا مرکز ہیں۔

سعودی عرب کے تقریباً تمام علاقوں میں شام کو بعد نماز عصر تا عشاء بچوں کو قرآن حفظ کرانے کے لئے مساجد میں تحفیظ القرآن کے حلقے قائم ہیں۔ مدرسوں اور اسکولوں سے واپس آنے اور آرام کرنے کے بعد بچے ان حلقوں میں بیٹھ کر اساتذہ کی نگرانی میں قرآن حفظ کرتے ہیں، اس طرح وہ وقت کے ضیاع اور لہو ولعب سے بھی بچ جاتے ہیں اور قرآن سے اپنے سینے کو منور بھی کر لیتے ہیں۔ اس طرح سالانہ ہزاروں بچے ان حلقوں سے حافظ قرآن بن کر نکلتے ہیں۔ یہ حلقے جیلوں کے اندر بھی قائم کئے گئے ہیں اور بسا اوقات قرآن حفظ کرنے پر قیدیوں کی سزا میں تخفیف بھی کر دی جاتی ہے۔ دیگر ممالک میں بھی اس قسم کے حلقوں کے قیام کا پتہ چلا ہے۔

عصر حاضر میں حفظ قرآن کے اہتمام کا ایک مظہر وہ مقابلے بھی ہیں جو وقتاً فوقتاً ملکی یا بین الاقوامی سطح پر منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ بعض اسلامی ممالک میں حکومت کی جانب سے اس کا اہتمام ہوتا ہے اور عموماً مسلم تنظیمیں اور انجمنیں اس طرح کے مقابلوں کا انعقاد کرتی ہیں۔ ان مقابلوں کے انعقاد نے طلبہ میں ایک نیا جوش وخروش پیدا کر دیا ہے۔ ان مسابقوں کی وجہ سے حفظ کے طلبہ کے حفظ واتقان اور تلاوت وتجوید میں خاطر خواہ بہتری

آئی ہے، ساتھ ہی اس جانب لوگوں کی رغبت بھی بڑھی ہے۔ سعودی حکومت کی جانب سے ہر سال مکہ مکرمہ میں منعقد ہونے والا حفظ کا بین الاقوامی مسابقہ خاص طور سے لوگوں کی توجہ کا مرکز ہوتا ہے۔

بعض عرب واسلامی ممالک میں اسلامی ودعوتی تنظیمیں مدارس واسکول کی لمبی چھٹیوں میں مسلم بچوں کو مفید کاموں میں مشغول رکھنے اور لہو ولعب سے بچانے کے لئے حفظ قرآن کا قلیل المدتی پروگرام وضع کرتی ہیں، جن میں طلبہ قرآن کے مخصوص اجزاء یا سورتیں یا مکمل قرآن حفظ کرتے ہیں۔

دو تین سالوں سے اس نوعیت کا ایک انوکھا پروگرام مکہ مکرمہ میں حرم شریف میں منعقد ہو رہا ہے۔ اس پروگرام کے منتظمین نے اس کی مدت کل دو ماہ (۶۰ دن) رکھی ہے۔ اس میں شریک ہونے والا طالب علم اس مدت میں ہر قسم کی مشغولیتوں سے آزاد مکمل طور سے اپنے اساتذہ ونگراں کے زیر نگرانی اور زیر کفالت رہتا ہے اور مجوزہ نظام الاوقات کی پابندی کرتے ہوئے قرآن حفظ کرتا ہے۔ پہلے سال اس پروگرام میں صرف ۱۴ طلبہ شریک تھے، ان میں سے دبئی کے ایک ۱۶ سالہ طالب علم نے صرف ۲۷ دن میں پورے قرآن کا حفظ کر لیا تھا، بقیہ طلبہ نے ۳۵ سے ۶۰ دن کے درمیان کی مدت میں حفظ قرآن کی تکمیل کی۔ اس کے بعد پروگرام کی مقبولیت بڑھتی گئی اور گزشتہ سال اس پروگرام میں شرکت کے خواہش مند طلبہ کی درخواستوں کی تعداد تین ہزار تھی، جن میں سے صرف (۶۰) افراد کو منتخب ہونا تھا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: مجلّہ الفرقان (کویت)، شمارہ نمبر ۲۹۹، ۲۸/جون ۲۰۰۴ء)

نصاب:

حفظ قرآن کے نصاب پر گفتگو کرتے وقت ضروری ہے کہ ان امور ومسائل پر بھی ایک نظر ڈالی جائے جو نصاب کی کمیت وکیفیت پر اثر انداز ہوتے ہیں، مثلاً: طالب علم کی عمر، صلاحیت، گھریلو ماحول، دارالاقامہ کا ماحول، مدرسہ کا نظام، تعلیم میں تدریج کا اصول وغیرہ۔

۱- عمر

تحفیظ القرآن کے شعبوں یا مدرسوں میں زیر تعلیم طلبہ کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف عمر کے طلبہ حفظ قرآن کے عمل میں مشغول ہیں، عام طور سے اس شعبہ میں داخلہ کے لئے عمر کی ابتدا یا انتہا کی کوئی قید نہیں ہوتی، الا ماشاء اللہ۔ بعض لوگ اپنے بچوں کو ناظرہ قرآن کی تکمیل کے بعد اس شعبہ میں داخل کر دیتے ہیں تو بعض لوگ پرائمری درجات کی تکمیل کے بعد داخل کرتے ہیں۔ اس طرح ان دونوں قسم کے بچوں کی عمر میں ۵ برس کا تفاوت ہو جاتا ہے۔ عالمیت یا فضیلت کی تکمیل کے بعد بھی بعض طلبہ حفظ قرآن کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

بچپن کا زمانہ ہی حفظ کے لئے مناسب اور بہتر مانا جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے:

''**التعليم في الصغر كالنقش على الحجر، والتعليم في الكبر كالنقش على الماء**''. (**التربية الاسلامية وفلاسفتها، محمد عطية الابراشي ص: ۱۱۵، ط: ۱۹۶۹ء، مصر**) (بچپن کی تعلیم پتھر کی لکیر کے مانند ہوتی ہے اور بڑے ہونے کے بعد حاصل کی جانے والی تعلیم پانی پر نقش بنانے کے مترادف ہے)۔

لیکن یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ مہد سے لحد تک تعلیم وتعلّم کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور اس کی ضرورتیں پیش آتی ہیں۔

طالب علم کے حفظ اور آموختہ کے لئے جو مقدار متعین کی جائے اس میں دیگر امور کے ساتھ اس کی عمر کا بھی خیال رکھا جائے، ایسا نہ ہو کہ کوئی ایک نصاب یا متعینہ مقدار چھوٹے بڑے سب پر یکساں طور پر تھوپ دی جائے۔

۲- صلاحیت

طلبہ چھوٹے ہوں یا بڑے صلاحیت اور ذہانت کے اعتبار سے بھی ان میں تفاوت ہوتا ہے۔ نصاب کی تحدید کے وقت اس تفاوت کو نظر انداز کرنا تربیتی اعتبار سے حد درجہ مضر

ہے۔ پروفیسر عطیہ محمد الابراشی لکھتے ہیں: ''جدید علم النفس ایک عرصہ کے تجربات اور بحث و گفتگو کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ہر انسان کی عقل یکساں نہیں ہوتی، بہت سے عقلی امتحانات سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک ہی عمر کے بچوں کی عقل میں تفاوت ہوتا ہے، اگر چہ وہ ایک ہی قوم اور جنس سے کیوں نہ تعلق رکھتے ہوں... ہر مدرس کو یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ کوئی سبق بھی تمام طلبہ کے لئے یکساں مفید نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ ان کی عقلی قوت یکساں نہیں ہے۔ علمائے نفس کا خیال ہے کہ معلّم کو درس دیتے وقت اس فرق کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے، تاکہ وہ اپنے عمل میں کامیاب ہو۔ اس کا فرض ہے کہ تلمیذ کو اتنا ہی بتائے اور سکھائے جو اس کی ذہنی و عقلی استعداد کے مطابق ہو....'' (فلسفہ تعلیم و تربیت، عطیہ محمد الابراشی، ترجمہ رئیس احمد جعفری، ص: ۱۴۹، ط: صفا شریعت کالج، ۲۰۰۴ء)

۳- گھریلو ماحول

دارالاقامہ میں مقیم طلبہ اور اپنے والدین کے ساتھ گھر پر رہنے والے طلبہ کے مابین فرق کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ گھر پر رہنے والے بچوں میں بعض غیر درسی اوقات میں اپنے والد کے کاروبار میں ہاتھ بٹاتے ہیں یا اس قسم کی کچھ دوسری ذمہ داریاں ان کے کندھوں پر ہوتی ہیں، جس کی وجہ سے وہ گھر پر سبق یا آموختہ کے لئے بہت کم وقت نکال پاتے ہیں۔ ایسے طلبہ بھی ہوتے ہیں، جو گھر میں رہتے ہیں مگر ہر قسم کی ذمہ داری سے آزاد ہوتے ہیں، لیکن ان کے گھر کا ماحول پڑھائی لکھائی کے لئے سازگار نہیں ہوتا۔ بہر حال اگر طالب علم کے ساتھ کوئی معقول عذر ہے تو معلّم اس کو ملحوظ رکھے۔

۴- دارالاقامہ کا ماحول

حفظ کے جو طلبہ مدرسہ کے ہاسٹل میں رہتے ہوں اور اسی عمل کے لئے متفرغ ہوں، وہ گھروں میں رہنے والے طلبہ کے مقابل زیادہ وقت پاتے ہیں، لہٰذا ان کے لئے درس و آموختہ کی جو مقدار متعین کی جائے گی وہ دوسروں سے مختلف ہوگی، البتہ دارالاقامہ کے

ماحول پر بھی توجہ دینی ہوگی اور طلبہ کی ضرورت سے زائد آزادی اور گھومنے پھرنے سے محفوظ رکھنے کے لئے نگرانی اور توجہ درکار ہوگی۔

بعض مدارس کے دارالاقاموں میں دیکھا جاتا ہے کہ کسی طرح کی نگرانی یا نظام سے بالکل آزاد ہیں۔ درس کے محدود اوقات کے بعد طلبہ کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا، وہ بلا روک ٹوک مناسب اور نامناسب جگہوں پر جاتے آتے ہیں۔ دوسرے دن صبح میں کلاس میں حاضر ہونے سے پہلے تک انہیں اپنے درس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، اسی قسم کے مدارس میں طلبہ سات سات، آٹھ آٹھ سال تک وقت گزاری کرتے ہیں اور بمشکل حفظ مکمل کر پاتے ہیں۔

تعلیم میں تدریج کا اصول:

تدریس کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بتدریج آگے بڑھا جائے۔ یکبارگی طالب علم پر اتنا بوجھ نہ ڈال دیا جائے کہ وہ گھبرا جائے اور تعلیم سے متنفر ہو جائے یا شروع ہی میں مشکل اور پیچیدہ مسائل اس کے سامنے رکھ دیے جائیں۔ ماہرین تعلیم و تربیت معلّمین کو نصیحت کرتے ہیں کہ:

- ☆ معلوم سے نامعلوم کی طرف چلیں۔
- ☆ آسان سے مشکل کی طرف چلیں۔
- ☆ سادہ سے پیچیدہ کی طرف چلیں۔
- ☆ ٹھوس سے مجرد کی طرف چلیں۔
- ☆ خاص سے عام کی طرف چلیں۔
- ☆ مکمل سے اجزاء کی طرف چلیں۔
- ☆ مستثنیات سے پہلے عام قاعدے سکھائیں۔ الخ

(فن تعلیم و تربیت: افضل حسین، ص ۲۷۸-۲۸۵، ط ۴، ۲۰۰۴ء مرکزی مکتبہ اسلامی)

تدریج کے ان اصولوں پر عمل کرتے ہوئے حفظ کی تعلیم میں بھی طلبہ کو ابتدا میں کم اور آسان سبق دینا چاہئے، پھر دھیرے دھیرے اس میں اضافہ کیا جائے۔ آسان سے مراد یہ ہے کہ اگر شروع میں جزعم کی چھوٹی چھوٹی سورتیں حفظ کرائی جائیں، پھر دھیرے دھیرے بڑی سورتوں کی طرف بڑھایا جائے تو مبتدی طلبہ کو اس سے آسانی ہوتی ہے۔ سلف کی تحریروں میں بھی اس کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "التبیان فی آداب حملة القرآن" میں مصحف کی ترتیب سے قرآن کی تلاوت کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"وأما تعليم الصبيان من آخر المصحف الى أوله فحسن، ليس هذا من هذا الباب، فان ذلک قرأة متفاضلة فی أيام متعددة مع ما فيه من تسهيل الحفظ عليهم". (التبيان فی آداب حملة القرآن، ص ۷۰، ط:ة، ۱۴۰۷ھ، بيروت)

نصاب اور درس وآموختہ کی تعیین کے وقت ان تمام امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اس معاملہ میں معلّم قرآن کو متنبہ رہنا چاہئے۔ طلبہ کے مابین مذکورہ باہمی فرق کا اعتبار کئے بغیر سب کے ساتھ یکساں معاملہ کرنا تدریسی حکمت کے خلاف ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "اگر ایک طبیب تمام بیماروں کا ایک ہی نسخہ لکھے اور ایک ہی دوا سے علاج کرے تو اکثر کی ہلاکت کا باعث ہوگا، بالکل یہی حال تربیت دہندہ کا ہے۔ اگر وہ اپنے زیر تربیت لڑکوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے گا تو انہیں ہلاک کردے گا اور ان کے قلوب پر موت طاری کردے گا۔ تربیت دہندہ کا فرض ہے کہ اپنے زیر تربیت لڑکوں میں سے ہر ایک کے حال، عمر اور مزاج کے مطابق ان کے لئے راستہ تجویز کرے اور ان کے لئے وہی ریاضت تجویز کرے جس کے وہ متحمل ہوسکیں۔" (احیاء علوم الدین: ۳/۷۶، ط:۱، ۲۰۰۰ء، دار صادر بیروت)۔

ان تمام امور کی رعایت کے ساتھ ساتھ حفظ کی تکمیل کے لئے ایک تقریبی مدت کی

تعیین ضروری ہے جو ڈھائی سے تین سال کے آس پاس ہو اور کسی ناگزیر سبب کے بغیر طالب علم کو اس مدت سے تجاوز کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔

طریقۂ کار:

نصاب سے متعلق گفتگو کے بعد طریقۂ کار اور عملی تطبیق کے پہلوؤں پر بھی غور کرلینا چاہئے، تاکہ حفظ کے عمل کو زیادہ منظّم اور تدریس کے اصولوں سے ہم آہنگ بنایا جاسکے۔ واضح رہے کہ عمومی طور پر تعلیم کے عمل میں معلم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ایک کامیاب اور تجربہ کار معلّم جو اخلاص اور محنت ولگن کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتا ہے اس کی تدریس کے عمدہ نتائج سامنے آتے ہیں اور اس کے اثرات کو محسوس کیا جاتا ہے۔

قرآن کی تحفیظ پر مامور معلم کو عام معلّمین کے اندر مطلوبہ صفات سے متصف ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن کی عظمت، جلالت شان اور اس کے تقدس کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "التبیان" میں "آداب معلم القرآن و متعلمه" (ملاحظہ ہو: التبیان، ص:۲۶-۴۰) کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے۔ اسی طرح علامہ آجری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "أخلاق أهل القرآن" میں ایک باب "أخلاق المقرئ اذا جلس يقرأ ويلقن لله عزوجل، ماذا ينبغی له أن يتخلق به." (ملاحظہ ہو: اخلاق اهل القرآن، ص:۱۱۱-۱۳۴، ط:۱، ۱۴۰۶ھ، بیروت) کے عنوان سے قائم کیا ہے اور معلم قرآن کے اندر مطلوبہ صفات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، کاش کہ اس عمل سے وابستہ حضرات ان کتابوں کو اپنے مطالعہ میں رکھتے اور ان کی ہدایات سے استفادہ کرتے۔ اس مختصر مقالے میں ان صفات کی تبیین وتشریح باعث طوالت ہوگی، اس لئے اس حوالے پر اکتفا کرتے ہوئے کچھ اہم اور قابل توجہ امور کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱-ترتیل وتجوید کا اہتمام:

قرآن کو مخارج حروف کی رعایت کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا شرعاً وعرفاً مطلوب ہے۔ قرآن عربی زبان کی کتاب ہے، اس کے حروف کے مخارج وصفات پر ماہرین نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ ان حروف کے نطق وادائیگی میں بے اعتنائی ولاپروائی سے بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، خاص طور سے ہماری اردو اور ہندی زبان میں عربی زبان کے بظاہر متشابہ حروف کو یکساں طور پر ادا کیا جاتا ہے اور بے خبری میں قرآن پڑھتے وقت بھی اس پر دھیان نہیں دیا جاتا۔ مثلاً ھ اور ح میں فرق۔ س، ش، ص، ث کی ادائیگی میں تمیز۔ ذ، ز، ظ، ض کے تلفظ میں امتیاز پر توجہ نہیں دی جاتی۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: راقم کا مضمون بعنوان: چھوٹی سین بڑی سین، مطبوعہ مجلّہ آثار جدید مئو، نومبر ۱۹۹۷ء)

اس لئے ضروری ہے کہ حفظ میں داخلہ لینے والے طالب علم کی سب سے پہلے نطق اور مخارج کی اصلاح کرائی جائے، اس کے لئے اگر کوئی مدت مخصوص کر لی جائے تو بہتر ہے، تاکہ حفظ شروع کرانے میں زیادہ تاخیر نہ ہو۔ اس موضوع کی ابتدائی کتابوں سے بھی مدد لینا چاہئے۔ ابتداءً نطق ومخارج کی اصلاح کے بعد حفظ کا کام شروع کرا دیا جائے، بعدہٗ حفظ کی پوری مدت میں تجوید کی کتابیں پوری تفصیل وتشریح کے ساتھ پڑھائی جاتی رہیں۔

اس بات پر تنبیہ کی ضرورت اس لئے پڑی کہ بسا اوقات ایسے حفاظ سے سابقہ پڑتا ہے جن کی قرأت سن کر بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ ان کی قرأت میں یعلمون تعلمون کے علاوہ کوئی چیز واضح نہیں ہوتی۔ پڑھتے وقت حروف کٹ جاتے ہیں۔ بسا اوقات حذف واضافہ کے بھی وہ مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ سراسر قرآن کے ساتھ کھلواڑ ہے۔

۲-درس کا طریقہ:

طالب علم کو جو سبق دیا جائے پہلے باتجوید اس کا ناظرہ پڑھایا جائے، جس میں ترتیل و

تجوید کی رعایت کے ساتھ اعراب کی صحت، رموز اوقاف اور دیگر ضروری چیزوں کا خیال رکھا جائے۔ اگر ممکن ہو تو ایک سے زائد بار طالب علم سے سبق کے حصے کا ناظرہ پڑھوایا جائے، بالخصوص جبکہ طالب علم سے غلطیوں کا صدور ہو رہا ہو۔

ابتدا میں استاد کو چاہئے کہ طالب علم کو حفظ کا طریقہ بتلائے، مثلاً یہ کہ جس آیت کو یاد کرنا ہے اسے دیکھ کر دو تین بار پڑھے۔ اگر آیت لمبی ہے تو تھوڑا تھوڑا کر کے اسے یاد کرے، پھر ایک حصے کو دوسرے حصے سے ملا کر پڑھے اور یاد کرے، پھر دوسری آیت کا حفظ شروع کرے۔ اسے مکمل یاد کرنے کے بعد دونوں آیتیں ملا کر پڑھے، اسی طرح ملا ملا کر پورا سبق یاد کرے۔ مقررہ حصہ یاد کرنے کے بعد اس کو اس طرح پڑھے گویا اپنے آپ کو سنا رہا ہے، بعد ازاں یاد کردہ حصہ قرآن مجید کو دیکھ کر بھی پڑھے، تاکہ اندازہ ہو جائے کہ کیسا اور کتنا یاد ہے اور کہیں کسی طرح کی کوئی غلطی تو نہیں ہو رہی ہے۔ اس کے بعد استاذ محترم کو پورا سبق سنائے۔

ہر نئے سبق کو پچھلے سبق سے ملا کر پڑھنا بھی ضروری ہے تاکہ دونوں ایک دوسرے سے مربوط ہو جائیں۔

۳-آموختہ کیوں اور کیسے؟:

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''قرآن کی حفاظت کرو، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے، یہ قرآن بندھے ہوئے اونٹ سے کہیں زیادہ تیزی سے بھاگ نکلنے والا ہے۔'' (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۵۰۳۳، صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۷۹۱)

ایک دوسری روایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے آتی ہے جس میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: صاحب قرآن کی مثال بندھے اونٹ کے مالک کی سی ہے جب تک وہ اس کا خیال رکھتا ہے وہ بندھا رہتا ہے اور اسے چھوڑ دے تو بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔'' (صحیح

بخاری، حدیث نمبر:۵۰۳۱، صحیح مسلم، حدیث نمبر:۷۸۹)

یہ اور اس قسم کی دوسری حدیثیں گویا اس بات پر تنبیہ ہیں کہ قرآن کے حفظ کردہ حصے کا بار بار مراجعہ کرتے رہنا ہی اس کی بقا اور حفظ کی ضمانت ہے اور اس سلسلے میں معمولی سی کوتاہی محفوظ حصے کو غیر محفوظ بنا سکتی ہے۔ اس لئے استاذ اپنے طلبہ کو ہمیشہ سبق کے ساتھ ساتھ آموختہ کو بھی دہرانے کی ہدایت کرتا رہے اور اس کے لئے اسے باقاعدہ ایک نظام عمل بنا دینا چاہئے، مثلاً جب ایک ربع یا نصف کا حفظ ہو جائے تو آگے کا سبق لینے سے پہلے اس کا مراجعہ ضروری ہو۔

اسی طرح ایک پارہ یا ایک سورہ مکمل ہونے کے بعد اس کا مراجعہ ضروری ہو۔ ہفتہ بھر میں جتنا حفظ کیا جائے ہفتہ کے آخری دن اس کا مراجعہ ضروری ہو۔ ایسے ہی مہینہ، تین مہینے، چھ مہینے اور سال بھر کا بھی مراجعہ کرایا جائے۔ ہفتہ کے آخری دن ہر طالب علم کے لئے ایک مخصوص مقدار متعین کی جائے جسے وہ دو رکعت نماز میں جہراً پڑھ کر سنائے، پیچھے باقی طلبہ اس کی اقتدا کریں اور باری باری تمام طلبہ اس عمل کو انجام دیں۔ اس سے حفظ شدہ حصے کا مراجعہ بھی ہوگا اور امامت اور قرأت کی بھی تربیت ہوگی، استاذ کی نگرانی اس عمل میں ضروری ہے۔

مذکورہ بالا طریقوں کے علاوہ مراجعہ کا ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ روزانہ سبق کے ساتھ کم از کم ایک پارے کا آموختہ سنانے کا طالب علم کو مکلّف بنایا جائے۔ جب آموختہ سبق تک پہنچ جائے تو پھر ابتدا سے سنانا شروع کرے اور مستقل اس عمل کو جاری رکھے۔

۴- حفظ کے اوقات:

یوں تو ہر مدرسہ میں تدریس کے اوقات متعین ہوتے ہیں جو پانچ سے چھ گھنٹے کے بیچ ہوتے ہیں۔ حفظ کے شعبے بھی عموماً انہی اوقات کے پابند ہوتے ہیں، لیکن حقیقت یہ

ہے کہ یہ شعبہ کچھ زیادہ وقت اور توجہ کا متقاضی ہے۔ صبح سویرے انسان کا ذہن و دماغ تر و تازہ ہوتا ہے اور اس کے جسم میں نشاط اور تازگی ہوتی ہے، اس وقت حفظ کرنا بے حد مفید مانا جاتا ہے۔

''تکان، بیزاری اور صدمے وغیرہ کی حالت میں کچھ حفظ کرانا صحت کے لئے مضر بھی ہوتا ہے اور کافی وقت اور محنت صرف کرنے کے باوجود خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوتی، اس لئے ہمیشہ ایسے وقت یاد کرایا جائے جب دماغ تر و تازہ ہو۔'' (فن تعلیم و تربیت، افضل حسین، ص ۲۵۵)

اس لئے بہتر یہی ہے کہ حفظ کے طلبہ کو فجر کی نماز سے فراغت کے بعد یاد کرنے کے لئے بیٹھا دیا جائے۔ کم از کم دو گھنٹے کے بعد انہیں ناشتہ اور کچھ آرام کا موقع دیا جائے، پھر وہ واپس آئیں اور حفظ میں مشغول ہو جائیں۔ ظہر سے کچھ پہلے تک اس میں لگے رہیں۔ ظہر کے بعد کھانا کھائیں اور آرام کریں۔ عصر کی نماز کے بعد کچھ دیر پڑھیں اور پھر ورزش اور سیر و تفریح کا انہیں موقع دیا جائے۔ بعد نماز مغرب پھر ان کی نشست ہو اور عشاء کے کچھ پہلے انہیں فارغ کیا جائے۔ اس طرح مجموعی طور پر دس تا بارہ گھنٹے حفظ کے طلبہ اپنے سبق و آموختہ سے جڑے رہیں، الحمد للہ جامعہ سلفیہ بنارس میں اس کا اہتمام ہے اور اس شعبے کے اساتذہ اس پر بھرپور توجہ دیتے ہیں۔

۵- شعبۂ حفظ کی درس گاہ:

اس شعبہ کی درس گاہیں نسبتاً کشادہ ہوں تو بہتر ہے، تاکہ طلبہ آرام سے بیٹھیں اور یاد کریں۔ بیٹھنے میں ہر دو طالب علم کے مابین فاصلہ ہونا چاہئے، تاکہ ایک دوسرے کی آواز سے زیادہ خلل نہ ہو۔ یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہئے کہ بعض طلبہ کو بھیڑ بھاڑ میں اور آواز و شور و غل میں یاد کرنے میں سہولت معلوم ہوتی ہے اور بعض کو پرسکون ماحول میسر نہ

ہوتو انہیں یاد کرنا دشوار ہوتا ہے۔ یہاں اس امر کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک استاذ کے زیرنگرانی اتنے ہی طلبہ رکھے جائیں جن کی تعلیم کا وہ حق ادا کر سکے۔طلبہ کی تعداد زیادہ ہونے کی صورت میں ہر طالب علم کو وہ مطلوبہ وقت نہیں دے پائے گا اور تعلیم متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گی۔

۶۔تعطیل کلاں میں بھی سبق:

شعبۂ حفظ کے طلبہ کو لمبی چھٹیوں میں بالکل آزاد چھوڑ دینا بہت ہی مضر ہے،اس لئے استاذ کو چاہئے کہ تعطیل شروع ہونے سے پہلے ہر طالب علم کو اس کی وسعت کے مطابق تعطیل کی مدت کو ملحوظ رکھتے ہوئے سبق کی تحدید کردے، جسے طالب علم چھٹی سے واپس آنے کے بعد استاذ کو سنائے،آموختہ کے مراجعہ کی بھی تاکید رہے اور چھٹی کے بعد اس کا بھی محاسبہ ہو۔

بعض معلّمین کی تو یہ رائے ہے کہ شعبۂ حفظ کے طالب علم کی کوئی چھٹی ہی نہ ہو، جب تک وہ حفظ کی تکمیل نہیں کر لیتا،اسے اسی کام میں لگے رہنا چاہئے،اس لئے کہ چھٹیوں کے بعد عموماً طلبہ میں تکاسلی اور بے رغبتی محسوس کی جاتی ہے اور تعلیمی نشاط کے اعادہ میں کافی وقت لگ جاتا ہے۔

۷-احکام ومسائل کی تعلیم:

حفظ کی تکمیل کے بعد بعض طلبہ دینی تعلیم کے حصول میں لگ جاتے ہیں اور حفاظ کی اچھی خاصی تعداد صرف حفظ ہی پر اکتفا کرتی ہے۔اوّل الذکر گروپ تو تعلیم حاصل کر کے تلاوت وامامت کے احکام ومسائل سے روشناس ہوجاتا ہے،مگر جو طبقہ اس تعلیم سے محروم رہتا ہے،احکام ومسائل کے تعلق سے وہ کافی الجھنوں کا شکار رہتا ہے،اس لئے حفظ کے

ساتھ ساتھ ان مسائل کی کچھ تعلیم بھی طلبہ کو دی جانی چاہئے،جن مسائل سے حفاظ کو عموماً سابقہ پڑتا ہے۔مثلاً سجدۂ تلاوت،سجدۂ سہو،طہارت اور اس قسم کے دیگر مسائل، بالخصوص جو امامت سے متعلق ہوں۔کاش کہ اس قسم کے مسائل پر مشتمل کوئی جامع اور آسان کتاب تحریر ہوتی جو شعبۂ حفظ کے طلبہ کے لئے مقرر کی جاتی۔

احکام ومسائل کی تعلیم کے ساتھ قرآن پڑھنے پڑھانے کے آداب وفضائل کی تفہیم بھی شعبۂ حفظ کے طلبہ کو ہونی چاہئے تاکہ وہ اپنے مقام ومرتبہ کو پہچانیں اور اپنے اعمال و اخلاق کی اصلاح کریں۔ افسوس کہ بے عمل و بداخلاق حفاظ بڑھتے جارہے ہیں اور بسااوقات منبر ومحراب کے تقدس کو بھی پامال کرتے نظر آتے ہیں۔قرآن کے کلمات و حروف سے اپنے سینے کو وہ معمور رکھے ہوتے ہیں،مگر اس کے مفاہیم ومعانی سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ”**ربّ قارئ للقرآن والقرآن یلعنه**“. (حضرت انسؓ سے یہ اثر مروی ہے) یعنی کتنے قرآن پڑھنے والے ایسے ہیں جن کو قرآن خود لعنت کرتا ہے،بایں طور کہ وہ قرآن میں پڑھتا ہے:

ألا لعنة الله على الظالمين. (سورة هود: ۱۸)

فنجعل لعنة الله على الكاذبين. (سورة آل عمران: ۶۱)

جبکہ وہ خود ظالم ہوتا ہے،کاذب ہوتا ہے،گویا اس طرح اس نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی۔

أعاذنا اللّٰه من الخذلان. اللهم اجعل القرآن ربيع قلوبنا و نور صدورنا وجلاء أحزاننا وذهاب همومنا.

☆☆

قرآن کریم اور سائنسی علوم

● ایس ایم شریف قریشی

دور جدید، سائنس وٹیکنالوجی کا دور کہا جاتا ہے۔ ہم یہ بھی سمجھ لیں کہ لفظ سائنس لاطینی زبان کے اس لفظ سے ماخوذ ہے جس کے معنی جاننے کے ہیں، لیکن خصوصیت کے ساتھ اس کا استعمال علم کے ان مختلف شعبوں کے لیے کیا جانے لگا ہے جو مادہ کے گوناگوں پہلوؤں اور کیفیات کے بارے میں ایک منظّم اور مربوط اطلاعات کے حامل ہیں۔ موجودہ سائنس طبعیات، کیمیات، ہیئت، علم الارض، نباتات، حیوانات، نفسیات وغیرہ وغیرہ شعبوں میں تقسیم کی جا چکی ہے۔

قرآن وسائنس کے موضوع پر مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آئی ہے کہ قرآن کریم اور سائنس میں کوئی مخالفت یا باہمی ٹکراؤ نہیں، کیونکہ علم وعقل اور براہین وتجربہ اور واقعات کی بنا پر کوئی نتیجہ دنیا کے سامنے پیش کرنا ہی سائنس ہے۔ قرآن مجید کا وہ کون سا مسئلہ ہے جو علم وعقل، دلائل وبراہین اور تجربات ومشاہدات کے خلاف ہو یا واقعات نے اس کی تصدیق نہ کی ہو۔

گزشتہ صدی کا سانحہ یہ ہے کہ سائنس کے نام سے جو لٹریچر زیور طبع سے آراستہ ہو کر دانش گاہوں میں آیا وہ محض طبعیات، کیمیات، حیاتیات، فلکیات وغیرہ جیسے ٹھوس علوم سے عبارت نہیں ہے، بلکہ اس میں فلسفہ الحاد کی آمیزش بھی موجود ہے۔ قرآن کریم کی تعلیم دراصل اس ملحدانہ فلسفہ سے ٹکراتی ہے جو سائنس میں اس طرح گھل مل گیا ہے کہ لوگ اسے

بھی سائنس کہتے ہیں۔ آج سائنس دانوں کی خاصی تعداد اس ملحدانہ فلسفہ سے پیوست سائنس کے خلاف صف آرا ہے۔ ایک عیسائی محقق عالم الکس لازوان لکھتا ہے کہ ''ہم عیسائیوں نے عیسائیت کو علم وسائنس کے ہم آہنگ وہم نشیں بنانے میں آج تک جتنی کوششیں کی ہیں قرآن میں سب کچھ پہلے سے موجود ہے۔ (لائف آف محمد)

قرآن کریم نے چودہ سو برس پہلے جن حقائق کی طرف اشارہ کیا تو کہنے والوں نے اس کے خلاف بہت کچھ کہا، لیکن وہ آج حقیقت بن کر سامنے آرہی ہیں اور سائنس داں بھی اس کا اعتراف کررہے ہیں، گو کہ قرآن پاک کا طرز بیان سائنس دانوں جیسا نہیں ہے۔ ہاں یہ قرآن مجید ہی ہے کہ جس نے کائنات کے مسخر کرنے اور سورج، چاند ستاروں اور تمام اراضی وسماوی مخلوق کو خدمت گار ہونے کا نظریہ (جو کہ سائنس کی ترقی کی بنیاد ہے) اس وقت دنیا کو دیا تھا جبکہ مشرقی ومغربی دنیا کی بہت سی قومیں سائنس کے عناصر آگ پانی، برق وبجلی وغیرہ یا سورج، چاند اور ستاروں کو ایک مافوق الفطرت طاقت سمجھ کو ان کے آگے سر جھکا کر انھیں اپنا معبود تسلیم کرتی تھیں۔ دوسری طرف مطالعہ فطرت اور کائنات کے سربستہ رازوں کی دریافت کو کفر والحاد قرار دیتی تھیں۔

بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے True Science Agrees with Holy Quran یعنی حقیقی سائنس قرآن سے مطابقت رکھتی ہے اور ان میں آپس میں کوئی تضاد (Contradiction) نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن میں مفصل طور پر علم وفنون کا درس یا نصاب تعلیم نہیں، لیکن اجمالی رنگ میں جہاں تک ضرورت تھی سائنس ودیگر علوم وفنون کی تحصیل پر توجہ دلائی گئی ہے۔ اسلام کے نزدیک سائنسی اور تحقیق کا مقصد خداشناسی اور انسانیت کی خدمت ہے۔ اگر سائنسی تحقیق وایجادات کو مرضی خداوندی کے خلاف استعمال کیا جائے گا تو یہ خوفناک عذاب خداوندی کی شکل بھی اختیار کرسکتا ہے۔

قرآن کریم تمام آسمانی کتب کے مقابلہ میں کتنی ہی استثنائی خوبیوں اور امتیازی

خصوصیت کا مالک ہے۔سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے متعلق جتنے اعتراضات وسوالات قلوب بشریت میں پیدا ہوسکتے ہیں ان سب کا جواب معقول اور علمی ڈھنگ سے خود اس میں (قرآن میں) مل سکتا ہے۔یہ اپنی ماہیت وفلسفہ پر خود روشنی ڈالتا ہے۔

مثلاً قرآن پاک میں ہے: ''اللہ نے تم پر کتاب اتاری اور فہم سلیم دی، حکمت دی اور تمھیں ایسی باتیں سکھائیں جو تمھیں پہلے معلوم نہیں تھیں۔'' یہی وجہ ہے کہ معترض بعض دفعہ اپنی غلطی اور قرآن مجید کی صداقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔مثال کے طور پر بعض حضرات اسلام کے واقعہ تخلیق کائنات کو مغرب کے نظریہ ارتقا کائنات سے متصادم پاتے ہیں۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کو خالق، رب العالمین پروردگار وغیرہ ناموں سے اسی لیے پکارا گیا ہے کہ وہ ان کا بنانے والا اور نظام ربوبیت کو چلانے والا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''**وما کنا عن الحلق غفلین**''. (المومنون:17)(آفرینش کائنات سے ہم غافل نہیں تھے)۔اسلام کا عقیدہ تخلیق یہ ہے: (ترجمہ) ''خدا کا یہ امر کہ وہ جب کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کہتا ہے ہوجا اور وہ ہوجاتی ہے۔'' یعنی خدا ہر چیز کا خالق وقادر مطلق ہے اور کائنات کی ہر شئے اس کی تابع ہے۔آیت مذکورہ میں فیکون کا مطلب یہ نہیں کہ چیز فوراً ہی وجود میں آجاتی ہے، بلکہ سیدھا سا مطلب یہ کہ وجود میں آتی ہے۔قرآن پاک کی بعض آیات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ بعض چیزوں کا وجود بتدریج بھی ہوتا ہے، جیسے قرآن پاک میں ارشاد ہے: ''**اللہ الذی حلق السمٰوٰت والارض فی ستة ایام**'' (**سورہ سجدہ: آیت نمبر ۴**) ''اللہ وہ ذات پاک ہے جس نے کائنات کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔'' چنانچہ اس آیت سے کائنات کے بتدریج وجود میں آنے کا ثبوت ملتا ہے۔معترضین کے ذہن میں یہ شبہ وارد ہوتا ہے کہ اتنی بڑی کائنات جس میں ہماری دنیا بھی

شامل ہے کل چھ دنوں میں کیسے بن گئی، لیکن قرآن پاک میں اس کا تسلی بخش جواب چودہ سو سال سے زیادہ پہلے ہی سے موجود ہے۔

ارشاد خداوندی ہے: ''ایک ایسے دن میں جس کی تمہارے حساب کے مطابق ایک ہزار سال تک ہوتی ہے۔'' یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہ دن اگرچہ علم ریاضی اور موجودہ آفتاب و ماہتاب (القرآن) اور زمین کی حرکت و گردش کے سبب واقع ہونے والے دن نہیں ہیں (کیونکہ اس وقت تک تو دنیا کی تخلیق ہو ہی رہی تھی) بلکہ ان چھ دنوں یعنی چھ ہزار سال سے مراد ایک طویل مدت ہے جس میں کائنات وجود میں آئی۔(عربی ''یوم'' لفظ چوبیس گھنٹہ کے علاوہ مطلق زمانہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔)

علماء ہیئت کے ماہرین کا کہنا ہے کہ آسمان وزمین اور تمام سیاروں کی پیدائش مادہ (Matter) سے ہوئی۔قرآن مجید نے تخلیق کائنات کا ذکر کرتے ہوئے اسی مادہ کو جبکہ وہ کسی قدر کثیف ہوکر سیدیم (Nebula) کی شکل میں نمودار ہوا، دخان سے تعبیر کیا ہے۔''**فارتقب یوم تاتی السمآء بدخان مبین**'' (سورہ دخان: آیت نمبر۔۱۰) (پھر اس نے آسمان پیدا کرنے کا قصد کیا جبکہ وہ (مادہ) دخانی صورت میں تھا)۔

پھر سائنس دانوں کے اس بیان سے کہ ابتدا میں بھی تخلیق کائنات کے وقت سورج و زمین جو کہ ایک ہی مادہ سے پیدا ہوئے ہیں آپس میں جڑے ہوئے تھے، گویا ایک آپس میں جڑے ہوئے تھے، گویا ایک تھے، بالفاظ دیگر زمین سورج سے نکلا ہوا ایک حصہ ہے۔ قرآن کی اس آیت کی تائید ہوتی ہے: ''کیا منکروں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ آسماں اور زمین آپس میں چپکے ہوئے تھے جن کو ہم نے ایک دوسرے سے الگ کردیا۔'' (القرآن) یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ سائنس دانوں کے نزدیک تو آسمان نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔زیادہ سے زیادہ حد نظر کو آسمان کہا جاسکتا ہے، لیکن اصل میں قرآن مجید میں بیان کردہ آسمان سے مراد یہ حد نظر نہیں، بلکہ آسمان سے مراد وہ زبردست بندش ہے جس

میں عالم بالا کسا ہوا ہے، یعنی ستارے اپنے مقام پر ٹھہرے ہوئے ہیں اور سیارے ایک مدار پر گھوم رہے ہیں۔

ارشاد خداوندی ہے: (ترجمہ) ''اور ہر ایک ان میں سے اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔'' (القرآن)

گویا اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ تمام سیارے حرکت میں ہیں (ہماری دنیا بھی ایک سیارہ ہے) قرآن میں حرکت زمین زمین کے بارے میں کس قدر صریح اعلان ہے۔ (ترجمہ) (اللہ نے زمین وآسمان پیدا کئے، رات کو دن میں اور دن کو رات میں تبدیل کیا اور آفتاب وماہتاب کو مسخر کیا۔ یہ تمام متعین میعاد تک محو حرکت رہیں گے)۔ (القرآن)

مندرجہ بالا آیت میں رات اور دن زمین وآفتاب وغیرہ کا ذکر ہے اور یہ بات واضح ہے کہ دن ورات آفتاب کے طلوع وغروب ہونے کی علامتیں ہیں اور رات دن کا ہونا زمین ہی کی گردش پر منحصر ہے اور ان سب کو حرکت وگردش دینے والی اللہ کی ذات ہے۔

سر آئزک نیوٹن نے زمین کی کشش کا نظریہ دنیا کو دیا جس کا مطلب ہے ہر چیز کو زمین اپنی طرف کھینچتی ہے، مگر مغرب کے اس عظیم سائنس داں سے سیکڑوں برس پہلے قرآن مجید اس حقیقت کو اپنے انوکھے انداز میں بیان فرما چکا ہے۔ (ترجمہ) (کیا ہم نے زمین کو زندہ ومردہ ہر چیز کو سمیٹنے والی نہیں بنایا)۔ سائنس بتاتی ہے کہ زمین کی قوت کشش کی طرح دوسرے سیاروں میں بھی قوت کشش ہے، وہ ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ جدید تحقیق سے پتہ لگا ہے کہ اگر اس کرۂ زمین پر پہاڑ نہ ہوتے تو اس کا ثقل کم ہوتا اور اس صورت میں آفتاب کی کشش اس کو ساڑھے نو کروڑ میل کے فاصلہ پر نہ رہنے دیتی، بلکہ زمین اپنے موجودہ مقررہ مقام کو چھوڑ کر آفتاب سے جالگتی۔ قرآن مجید میں اس حقیقت کا ذکر یوں ہے: (اور ہم نے زمین میں میخیں لگا دیں کہ جنبش نہ کرنے پائے)۔ اس بارے میں جو اصول قرآن نے بتایا جدید سائنس اس کی تائید کرتی ہے۔

قرآن کریم میں ہے۔ **''واللہ الذی ارسل الریٰح فتثیر سحابا فسقنہ الیٰ بلد میت فأحیینا بہ الارض بعد موتھا کذالک النشور''**. (سورہ فاطر: ۹) (اللہ وہ ہے جو ہواؤں کو سمندروں کی طرف بھیجتا ہے جہاں سے یہ بخارات آبی کو ہانک لاتی ہے اور اس طرح ہم مردہ بستیوں کو سیراب کیا کرتے ہیں)۔

سائنس کی موجودہ تحقیقات کے مطابق ابتدا میں انسان کی پیدائش پانی اور کیچڑ نما مٹی سے ہوئی، لیکن قرآن کا بہت پہلے اعلان ہے: **''واللہ خلق کل رابہ من ماء''** (اللہ نے تمام جانداروں کو پانی سے پیدا کیا)۔ (النور:45) ایک جگہ یوں ارشاد ہے: **''انا خلقتم من طین للذب''** (ہم نے انھیں لیس دار کیچڑ سے پیدا کیا)۔ (الصافات:11) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

'' و بدأخَلقَ الاِنسان من طین.ثم جعل نسلہ من سللۃ من ماء مھین . ثم سوٰہ ونفخ فیہ من روحہ: (سورہ سجدہ: ۷، ۸، ۹)

(انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا پھر اس کی نسل خلاصے سے (یعنی) حقیر پانی سے پیدا کی پھر اس کو درست کیا اور پھر اس میں (یعنی قالب آدم علیہ السلام میں) اپنی (طرف سے) روح پھونکی)۔

جدید سائنس نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ ہر چیز کا جوڑا ہوتا ہے، یعنی نر ومادہ ہوتے ہیں خواہ نباتات ہوں یا چٹان کے پتھر یا برقی قوت ہو، لیکن قرآن اس حقیقت کو پہلے ہی عام فہم معنوں میں واضح کر چکا ہے۔ ارشاد ہے: ''ہم نے ہر ایک چیز کو جوڑا جوڑا پیدا کیا۔'' قرآن پاک میں آغاز نسل انسانی کے متعلق ارشاد خداوندی ہے: ''تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا۔'' (القرآن)

ماہرین تولید ونفسیات (Sexologist) نے ہزار مشاہدات کے بعد یہ ایمان افروز اعلان کیا ہے کہ جس طرح آغاز میں زندگی مختلف مدارج سے ہوتی ہوئی منزل

انسانیت تک پہنچی تھی اس طرح ایک حیرت انگیز سلسلہ ماں کے پیٹ میں بھی کارفرما ہے، ان مدارج میں سے بعض کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔

"**ولقد خلقنا الانسان من سلسلة من طين. ثم جعلنه نطفة فی قرار مكين. ثم خلقنا النطفه علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظما فكسون العظم لحما ثم ا نشأنه خلقنا آخر**". (المومنون:13-12)(اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا، پھر اس کو ایک مضبوط (اور محفوظ) جگہ میں نطفہ بنا کر رکھا، پھر نطفہ کا لوتھڑا بنایا، پھر لوتھڑے کی بوٹی بنائی اور بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت (پوست) چڑھایا، پھر اس کو نئی صورت میں بنا دیا)۔

اسی طرح سے قرآن حکیم میں ایک اور جگہ ارشاد ہے:"**فانا خلقنكم من تراب ثم من نطفة ثم من علقة ثم من مضغة مخلقة و غير مخلقة لبنين لكم ولنقر فی الارحام مانشاء الیٰ اجل مسمی ثم نخرجكم طفلا**".(سورۃ حج: آیت نمبر. ۵) (ہم نے تم کو (پہلی بار بھی) تو پیدا کیا تھا (یعنی ابتدا میں) مٹی سے پھر اس سے نطفہ بنا کر پھر اس سے خون کا لوتھڑا بنا کر پھر اس سے بوٹی بنا کر جس کی بناوٹ کامل بھی ہوتی ہے اور ناقص بھی تا کہ تم پر (اپنی خالقیت) ظاہر کر دیں اور ہم جس کو چاہتے ہیں ایک میعاد مقررہ تک پیٹ میں ٹھہرائے رکھتے ہیں پھر تم کو بچہ بنا کر نکالتے ہیں)۔

علم کیمیا (Chemistry) کے ماہرین کی یہ تحقیق ہے کہ تمام حیوانات و نباتات ایک ہی طرح کے چند ایک عناصر سے مرکب ہیں۔ سب کے عناصر تخلیق ایک ہیں، صرف اجزا کا تناسب و مقدار مختلف ہے۔ قرآن پاک میں اس اصول کو بہت پہلے بتایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:"ہمارے خزائن میں کسی چیز کی کمی نہیں لیکن اس کا ظہور ایک مقررہ مقدار میں ہوتا ہے۔" دوسری جگہ قرآن حکیم کا اعلان ہے:"اس کے نزدیک ہر ایک چیز کا اندازہ مقرر ہے۔" ایک دوسری جگہ قرآن پاک میں اس کی یہ صفت بیان کی گئی ہے:"وہ سب حساب

کرنے والوں سے بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔" اللہ تعالیٰ ایک جگہ یوں فرماتا ہے: "**فارجع البصر هل ترى من فطور**". (الملک:3)(بار بار دیکھو کیا تمھیں بے انتہا سلسلہ خلق میں کوئی بدنظمی نظر آتی ہے)۔

قرآن عقل و سائنس اور تسخیر کائنات کا مخالف نہیں ہے بلکہ اس کے امور کی دریافت کی دعوت دیتا ہے تا کہ انسان کائنات میں پوشیدہ اسرار کو معلوم کر کے معبود حقیقی کو پا سکے۔ ارشاد خداوندی ہے:" **ما خلقنا السمٰوٰت والارض وما بينهما لعبين**". (الدخان:38)(ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو ان کے درمیان ہے محض تماشہ کی خاطر پیدا نہیں کیا۔" ایک جگہ بیان کیا گیا ہے: "**الم تروا ان اللہ سخر لكم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض**" (لقمان:20)(اللہ نے تمہارے لیے مسخر کر دیا اس چیز کو جو زمین و آسمان میں موجود ہے)۔ دوسری جگہ واضح طور پر بیان کیا گیا ہے:" **الم تروا ان الله سخر لكم مافی السمٰوٰت ومافی الارض**". (وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے قابو میں کر دیا سمندر کو تا کہ اس کے اندر تم بحکم خدا جہاز چلاؤ (اور دور دراز ممالک سے تعلقات قائم کر کے) اللہ کا فضل (نفع) حاصل کرو اور خدا کا شکر ادا کرو (اور نہ صرف سمندر کو) بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے ان سب کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے (اور تمہارے لیے ممکن اور جائز کر دیا کہ جس کو چاہو وہ چاند ہو یا سورج یا دوسرے سیارے یا سمندر میں قدرتی خزانے ان کے علاوہ اور کوئی چیز جہاں تمہاری رسائی ہو سکے ان کو اپنے تصرف میں لاؤ) بے شک اس میں بہت سی دلیلیں ہیں ان کے لیے جو فکر سے کام لیتے ہیں۔" (اور کائنات کے رازہائے سربستہ پر غور کرتے رہتے ہیں)(جاثیہ:13-12)

آج سائنس اور اعلیٰ پیمانہ کی صنعتوں کا زمانہ ہے۔ انٹرنیشنل منڈیاں وجود میں آ چکی ہیں جن میں سونا، فولاد، کوئلہ اور پٹرول اور اناج وغیرہ کی خاص مانگ اور اہمیت ہے، بلکہ

وہی قوم آج طاقتور مانی جاتی ہے جن کے پاس یہ پیداواریں ہوں۔قرآن پاک میں انھیں خزانوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "**ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمعیاً**". (تمام کائنات اور زمین کے خزانے تمہارے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔'' (البقرۃ:29) فولاد کی اہمیت وافادیت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:''ہم نے فولاد اتارا جس میں زبردست ہیبت اور دنیا کے لیے بے شمار فوائد ہیں۔''

بہرحال قرآن پاک میں اسی طرح مطالعہ کائنات سے متعلق سات سو چھپن آیات ہیں جن کے مطالعہ سے تسخیر کائنات کا جذبہ ابھرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جاہل واَن پڑھ عربوں نے سب سے پہلے قرآن پر ایمان لاکر قرآن کے سائنسی اشارات کی تفصیلات مرتب کرکے تحقیق وتجربہ کی بنیاد ڈالی اور ضروریات زمانہ کے مطابق علوم وفنون حاصل کیے،ان کو درجہ کمال تک پہنچایا۔دراصل دنیا کو بالخصوص یوروپ کو علم وسائنس وفنون کی روشنی دکھانے والے عرب مسلمان ہی تھے،جن کا یوروپی مؤرخین کو اعتراف ہے۔ہنری لوئس اپنی کتاب ''تاریخ فلسفہ'' میں لکھتے ہیں کہ''مسلمانوں ہی کی وجہ سے یوروپ ہے،اس سے بڑا احسان عربوں کا یوروپ پر یہ ہے کہ ان لوگوں نے علم ہندسہ،علم ہیئت،علم طب اور علم کیمیا میں بڑی کوشش کی اور اسی کی بدولت اسپین سے فرانس ہوکر انگلستان علم پہنچا۔

گستوورکس جیس نے''اسلام کا احسان یوروپ پر'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے، وہ لکھتا ہے''یوروپ سائنٹفک انکشافات میں اسلام کا ممنون ہے۔اسلام ہی کے طفیل علماء سائنس بیکن ، نیوٹن وغیرہ جیسے لوگ پیدا ہوئے۔اگر مسلمانوں نے کاغذ بارود،قطب نما اور دیگر آلات ترقی کو رواج نہ دیا ہوتا تو یورپ کی سائنس اور تہذیب کی چودہ سو برس پہلے جو حالت تھی وہی آج ہوتی۔''(بحوالہ کتاب اسلام اور دور جدید)

پروفیسر فلپ کے ہٹی قرون وسطیٰ کے عربوں کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:''یہی مسلمان آگے چل کر قرون وسطیٰ میں یورپ کو ایسے ذہنی اثرات منتقل کرنے کا

وسیلہ بنے جنھوں نے مغربی دنیا کو بیدار کرکے اسے نشاۃ ثانیہ (Renacence) کی شاہراہ پر گامزن ہونے کے قابل بنادیا۔(The Arab Short History)

اس میں ذرّہ برابر شک نہیں کہ یہ مسلمانوں کے علوم وفنون تھے جنھوں نے بالآخر مغربی دنیا کو اس قابل بنایا کہ اس نے سائنس وجدید ایجادات واکتشافات کے سلسلے میں دنیا بھر کی امامت کرلی اور مسلمانوں نے جب اپنی غفلت وناعاقبت اندیشی سے قرآن کو چھوڑا تو ایک طرف تو روحانی واخلاقی دولت سے تہی دست رہ گئے اور دوسری طرف علوم وفنون اور سائنس کو چھوڑ بیٹھے تو دین ودنیا کا نقصان اٹھایا۔

☆☆

قرآن اور سائنس

● ڈاکٹر رضی احمد کمال

قرآن کریم مذاہب کی تاریخ میں وہ پہلی کتاب ہے جس نے خدا کی صفات وافعال کے لیے عقلی تصور قائم کیا اور اس حقیقت کو واضح کیا کہ اس کی حکمتیں اور مصلحتیں خدا کی قدرت کاملہ کا حق ہیں۔ قرآن نے دین حق، یعنی اسلام کو دین فطرت قرار دیا ہے، یعنی یہ دین فطرت کے تقاضوں کو تکمیل کرتا ہے۔ انسانی فطرت کی تردید اور تنسیخ نہیں کرتا، بلکہ ان تقاضوں اور احساسات وجذبات کو انسانیت کے مطابق پورا کرنے میں ان کی پوری مدد کرتا ہے۔ یہ پوری کائنات جو ایک راز ہے، اس کے رازوں کو کھولنے والی بھی یہی کتاب عظیم ہے۔ کتاب اللہ کے بغیر کوئی انسان زندگی اور کائنات کے معموں کو حل نہیں کرسکتا۔ قرآن کریم کائنات کے خالق ومالک کا جس طرح ہم سے تعارف کرواتا ہے دوسری کوئی کتاب ایسا نہیں کرسکتی، وہ اللہ ربّ العزت کی کارفرمائیوں کو ہمارے سامنے کھول کر بیان کرتا ہے، وہ آخرت کے بارے میں صرف اطلاع ہی نہیں دیتا بلکہ اس روز کی ہولناکی کی اس طرح منظر کشی کرتا ہے کہ آنے والا دن بالکل نظروں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔

یہ وہ کتاب ہدایت ہے کہ جس میں انسانیت کی تعمیر اور سماج کی تنظیم کے لیے بہترین بنیادیں موجود ہیں۔ یہ حق وباطل کی بہترین اور مکمل نشان دہی کرتا ہے، اس کی مدد سے بھٹکے ہوئے راہ ہدایت پاتے ہیں۔ قرآن کریم وہ عظیم واسطہ ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ہم کلام ہوتا ہے۔ یہ وہ پیمانہ ہے جس کے ذریعہ انسانوں کے تعلق باللہ کو ناپا

جاسکتا ہے۔ قرآن کریم ہمیں عدل واعتدال، میانہ روی، انصاف پروری کی دعوت دینے کے ساتھ ساتھ انتہا پسندی اور شدت پسندی سے بچنے کی برابر تاکید کرتا ہے، اسی لیے اس نے اس آخری امت کو امت وسط، یعنی اعتدال پر قائم ملت کے لقب سے پکارا ہے، اس لیے کہ یہ کتاب ہدایت ہے، اس کے مخاطب جن وانس ہیں، انھیں کی رہنمائی اس کا مقصود اساسی ہے۔ قرآن کریم کی عظمت کے سلسلہ میں اگر یہ کہا جائے کہ ساری دنیا کے انسان مل کر بھی اگر اس کی عظمت پوری طرح بیان کرنا چاہیں تو ان کے لیے یہ ممکن نہیں ہوگا، اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا عطا کیا ہوا شاہکار ہے، یہ معمولی احکامات کا مجموعہ نہیں ہے۔ یہ آخری اور سب سے بڑے زندہ سچ کا منبع ہے، اسی لیے یہ خود بھی ایک زندہ سچ ہے۔ ہر گزرنے والا دن اس کی حقیقت کا بار بار زندہ اور قائم ودائم ہونے کا ثبوت مہیا کرتا ہے۔

ہمارے چاروں طرف اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نمونے اور شاہکار بکھرے پڑے ہیں۔ اگر ہم ان کو نہیں پہچانیں گے تو بھلا کیسے خالق کی کاریگری اور اس کی عظمت کے قائل ہوں گے۔ تخلیقات کے ذریعہ ہی ان کے خالق کی عظمت کا بھرپور احساس ہوتا ہے، مگر یہ عجیب بات ہے کہ جب اسلام اور سائنس یا قرآن اور سائنس کی بات کہی جاتی ہے تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سائنس اور اسلام یا سائنس اور قرآن کا مقابلہ کیا جارہا ہے یا (نعوذ باللہ) سائنس کی مدد سے قرآن پاک کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس ہمیں اس کائنات اور اس میں پھیلے ہوئے اجسام کو سمجھنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے اور خداوند کریم تو خود اس چیز کی دعوت دیتا ہے کہ اس کائنات کی ساری چیزوں کو دیکھو، ان کو سمجھو تاکہ صحیح طور پر اس کی خالقیت اور ربوبیت کو سمجھا جاسکے۔ قرآن پاک میں اسی لیے وہ بار بار اشارہ کرتا ہے۔ مشاہدہ کرنے، غور وفکر کرنے، عقل استعمال کرنے اور دیکھنے سننے کا، یہ بھی اس کی عبادت کا ایک انداز ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ بار بار اس کی تاکید کیوں فرماتا، بندگی محض ارکان ورسوم کی ادائیگی ہی کا نام نہیں ہے، بلکہ اس میں دل ودماغ بھی شامل

ہوتے ہیں، اسی لیے دل و دماغ کو خالق کی عظمت کا احساس دلانا ضروری ہے، اسی لیے قرآن فہمی کے درس کے ساتھ ساتھ سائنسی تعلیم بھی دی جائے تاکہ مکمل علم حاصل کیا جاسکے۔ یادرکھیں کہ مکمل بندگی کے لیے مکمل علم لازمی ہے۔

ہمارا دین دین فطرت ہے اور سائنس نظام فطرت کے مطالعہ کا نام ہے۔ اس لحاظ سے نظام فطرت کے مطالعہ کے بغیر قرآن فہمی اور دین اسلام کا حق پورے طور پر ادا نہیں ہوگا۔ جگہ جگہ نظام فطرت کا مطالعہ اور اس میں غور وفکر کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ پورے قرآن کریم میں تقریباً 750 مقامات پر کائنات کے مطالعہ کی ترغیب دی گئی ہے۔ یہاں ایک بات کی طرف دھیان دلانا ضروری تصور کرتے ہوئے عرض کرنا ہے کہ وہ ادیان جو دیومالاؤں میں گم ہیں اور ان کے پاس کوئی مستقل لائحۂ عمل نہیں ہے ان کی وکالت کرنے والے سائنس سے نہ صرف پہلوتہی کرتے نظر آتے ہیں بلکہ یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ مذہب اور سائنس دو الگ الگ چیزیں ہیں، جبکہ خالق کی خالقیت کی عظمت اور بلندی کو اسی وقت سمجھا جاسکتا ہے کہ جب اس کی تمام تخلیقات کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے، چنانچہ قرآن کریم ہم سے اسی مطالعہ کا متقاضی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنسی معلومات ایک اوزار یا ایک ایسے آلے کی حیثیت رکھتی ہے جن کی مدد سے اللہ رب العزت کی قدرت اور اس کے کلام پاک کو بہتر انداز میں سمجھا جاسکتا ہے۔

مثلاً اللہ تعالیٰ نے کائنات کو اصولوں اور قوانین کے تحت کیوں بنایا ہے؟ وہ تو سب کا مالک ہے، جس چیز سے کہتا 'ہوجا' وہ ہوجاتی، گویا آسمان میں چاند، سورج اور تاروں کو تیرانا چاہتا تو وہ کسی بھی انداز سے یہ کام کرسکتا تھا، انسان کو زمین پر آباد کرنے کے لیے زمین کو حکم دیتا تو وہ یکلخت وجود میں آجاتی۔ پھل دار درختوں یا اور دوسری تمام مخلوقات کو حکم کرتا اور وہ ایک دم ظاہر ہوجاتے۔ وہ ایسا کرسکتا تھا، لیکن اس نے یہ سب کام اس انداز اور ان قوانین کے تحت کیے جنھیں انسان سمجھ سکے۔ یہ ساری چیزیں اس کی تخلیق کاری کی بہترین نشانیاں

ہیں، اسی لیے اہل علم اور غور وفکر کرنے والوں کو کھلے عام دعوت غور وفکر دیتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی یہ عین خواہش ہے کہ انسان اس کی تخلیقات کے بارے میں معلومات حاصل کرے، ان کی بناوٹ پر غور کرے، ان کی کارکردگی کو سمجھتے ہوئے اپنے خالق کائنات کی عظمت کا سچے دل سے قائل ہو، نہ کہ محض عقیدے، خوف یا لالچ کی وجہ سے اس کا قائل ہو، اس کی تمام تخلیقات کا علم صرف اور صرف ان علوم کی مدد سے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے، جن کو آج دنیا ''سائنس'' کے نام سے پکارتی ہے۔ چنانچہ سورۃ رعد میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ''**وھو الذی مد الارض و جعل فیھا رواسی و انھٰرا و من کل الثمرٰت جعل فیھا زوجین اثنین یغشی الیل النھار ان فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یتفکرون**''. (سورۂ رعد:3) (اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلا دیا ہے اور اس میں پہاڑ کے کھونٹے گاڑ دیے ہیں اور نہروں کو بہادیا ہے، اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں اور وہی ڈھانپتا ہے رات کو دن سے، ان ساری چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرنے والے ہیں)۔

اسی طرح ایسی سیکڑوں آیات ہیں جو کائنات کا مطالعہ کرنے کی ترغیب دینے والی ہیں۔ سورۂ فاطر میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ''**الم تر ان اللہ انزل من السماء ماء فاخرجنا بہ ثمرٰت مختلفا ألوانھا و من الجبال جدد بیض و حمر مختلف ألوانھا و غرابیب سود**''. (سورۃ فاطر:27) (کیا تو نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ اللہ بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے مختلف اقسام کے پھل پیدا کرتا ہے اور پہاڑوں میں دیکھو کہ کس طرح سفید اور سرخ خطے ہیں جن کی مختلف اقسام ہیں اور بعض ان میں سے بہت سیاہ ہیں اور اسی طرح انسانوں میں اور دیگر جانداروں میں بھی مختلف اقسام ہیں)۔

اب اس بات پر غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے بارش کے پانی کو دوسرے پانیوں پر ترجیح کیوں دی ہے؟ جبکہ پانی تو سمندر، دریا، کنویں اور چشموں سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ بارش

کے پانی کو ترجیح اس لیے دی گئی ہے کہ اس میں مختلف قسم کی کھادیں ہوتی ہیں، جو کہ فضا میں نائٹروجن اور آکسیجن کے کیمیاوی عمل سے نائٹرک آکسائڈ وجود میں آتی ہیں۔ یہ آکسائڈ ہوا میں موجود امونیا سے مل کر امونیم نائٹریٹ بناتا ہے جو ایک طرح کی کھاد ہے۔ بارش کا پانی جس میں تیزاب ملا دیتا ہے زمین پر موجود چونے سے مل کر کیلشیم نائٹریٹ بناتا ہے۔ یہ بھی ایک کھاد ہے۔ اس طرح بارش کے پانی میں موجود ان کھادوں کی مدد سے بھرپور فصلیں اگتی ہیں، کیونکہ یہ زمین کو زرخیزی عطا کرتی ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نباتات پیدا کرنے میں بارش کے پانی کو افضلیت دی ہے۔

سورۃ حم السجدہ قرآن کریم کی اہم سورت ہے، جسے نبی کریمؐ اکثر پڑھا کرتے تھے۔ قرآن میں حم سے شروع ہونے والی ساتوں سورتوں کے بارے میں اسلام کے مفکرین اور دانش مندوں کی متفقہ رائے ہے کہ ان سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے کائنات کے متعلق بہت سے رازوں کو بیان فرمایا ہے، ان میں بھی حم، م، سجدہ میں خاص طور پر دنیا کی پیدائش اور کائنات کی مادی اصلیت پر بڑے لطیف پیرائے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ (حم السجدہ:11-10)

اسی طرح بہت سی قرآنی آیات میں کرۂ ہوا، کرۂ عرض، کرۂ آب کے بارے میں بہت کچھ بیان کیا گیا ہے، مثلاً سورۂ حدید میں آسمان زمین کی پیدائش کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

(1)" **ھوالذی خلق السمٰوٰت والارض فی ستة ایام** ". (سورہ حدید: آیت نمبر۔۴) (خدا نے آسمان وزمین کو چھ روز میں پیدا فرمایا)۔(2)" **ان السمٰوٰت والارض کانتارتقا ففتقنٰھما.** " (الانبیا:30) (شروع میں زمین وآسمان ایک ساتھ ملے ہوئے تھے، خدا نے ان کو ایک دوسرے سے الگ کیا)۔(3)"**وسخرلکم اللیل والنھار والشمس والقمر والنجوم مسخرٰت بأمرہ ان فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یعقلون**". (سورۃ النحل:12) (اسی نے تمہاری بھلائی کے لیے رات اور دن، چاند،

سورج اور ستاروں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا، ان میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل وخرد والے ہیں)۔

سورۂ اعلیٰ میں کرۂ عرض پر پیدا ہونے والی نباتات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: "**والذی اخرج المرعیٰ فجعلہ غثاء احویٰ**" (سورۃ اعلیٰ:۵۔۴) (جس اللہ نے نباتات اگائیں اور پھر ان کو سیاہ کوڑا (سیلاب) میں تبدیل کر دیا)۔

اس سورت کی پہلی تین آیتوں میں کائنات کی تخلیق کے بنیادی قوانین بیان کیے گئے ہیں، جیسے: "**سبح اسم ربک الاعلیٰ الذی خلق فسوی والذی قدر فھدیٰ**" (**سورہ اعلیٰ**: آیت نمبر. ۳. ۲. ۱) (تمہارا رب جس نے پیدا کیا اور جس نے تناسب قائم کیا، جس نے راستہ دکھایا)۔

ان آیات کو پڑھنے والا شخص یہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ ان میں علم ارضیات سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ زمین پر زندگی کی نشانیوں میں وہ بڑے بڑے جنگلات بھی تھے جو کبھی ارضیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے زیر زمین چلے گئے اور کچھ مخصوص کیمیائی عمل کے بعد تیل کی صورت اختیار کر لی۔ آیت 3 میں مقرر کردہ تناسب اور مقدار کا جو ذکر کیا گیا ہے اسی کے تحت یہ سارے عظیم جنگلات اور دیوہیکل نباتات اس وقت دفن کر دیے گئے جب ان کا کام ختم ہو گیا، انھیں سے تیار شدہ یہ تیل ہے جو زیر زمین ایک سیاہ سال یا سیاہ دریاؤں کی صورت میں بہتا ہے جسے آج کل Oilmigration کہا جاتا ہے۔

قرآن نے چودہ سو سال پہلے اس کا اشارہ کرتے ہوئے اس کو سیاہ کوڑے والے سیلاب کے نام سے پکارا ہے۔ اسی طرح انسانی اجسام سے متعلق بھی قرآن کریم میں بیان فرمایا گیا ہے جیسے کہ "**وانظر الی العظام کیف النشرھا ثم نکسرھا لحما**" (دیکھو اپنی ہڈیوں کو کہ ہم نے کیسے انھیں ساتھ ساتھ باندھ کر ان پر گوشت اور کھال کا کور چڑھا دیا ہے) (البقرۃ:259)

غرض اسی طرح علم اجسام، علم فلکیات، علم ادویات کوئی بھی ایسا موضوع نہیں ہے جو ہمیں قرآن میں نہ ملتا ہو۔ یہ سارے علوم چونکہ انسانی فلاح و بہبود سے متعلق ہیں اور قرآن کریم انسانی فلاح و بہبود کے لیے بہترین رہنمائی کا ذریعہ ہے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ یہ سب علوم اس میں شامل نہ ہوں۔ قرآن اور سائنس کے تحت اس مختصر مطالعہ کے بعد یہ بات پورے یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ قرآن اور سائنس ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ایک معقول مناسبت رکھتے ہیں، بلکہ میرا خیال ہے کہ ایک سائنس داں قرآن کی آیات کو اپنے مشاہدات اور تجربات کی مدد سے عام انسان کے مقابلہ میں زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ ایک امریکن سائنس داں ماریو کیلے نے تو یہاں تک ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن میں جو سائنسی معلومات ہیں وہ آج کی سائنسی معلومات کے مطابق ہیں۔ یہ میرا یقین ہے کہ جیسے جیسے سائنس ترقی کرے گی وہ باقی امور کائنات کو سمجھتی جائے گی۔ یہی اللہ رب العزت کا مقصد بھی ہے کہ دنیا اس کی تخلیق کے ذریعہ اس کو پانے اور پہچاننے کی کوشش کرے۔

☆☆

تفسیر بالماثور کی نمائندہ کتابوں کا طریقۂ تدریس

● مولانا محمد ارشد مدنی

قرآن کریم دنیا کی وہ واحد کتاب ہے جس کے ترجمہ و تفسیر کا اہتمام دنیا کی تمام زندہ زبانوں میں کیا گیا ہے۔ آج کتب تفسیر کی صورت میں جو علمی ذخیرہ دستیاب ہے، اس کی نظیر علمی دنیا پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہ فن دنیا کی مقدس ترین کتاب سے متعلق ہونے کے ناطے بے حد اہم ہے۔ میں نے تفہیم کی آسانی کی خاطر اس مقالے کو درج ذیل نقاط میں تقسیم کیا ہے اور انہی پر اختصار کے ساتھ کچھ عرض کرنے کی کوشش کروں گا:

۱- تفسیر کا لغوی و اصطلاحی مفہوم۔
۲- تفسیر قرآن کی تاریخ
۳- تفسیر ماثور
۴- تفسیر میں محدثین کا منہج
۵- تفسیر میں مفسرین کا منہج
۶- عصر حاضر کی چند معروف ماثور کتب تفاسیر
۷- مدارس اسلامیہ ہند کے نصاب تعلیم پر ایک نظر
۸- مدارس اسلامیہ ہند کے نصاب تعلیم میں ''تفسیر'' کی شمولیت
۹- مدارس اسلامیہ میں ''تفسیر'' کا رائج طریقۂ تدریس
۱۰- تفسیر بالماثور کی نمائندہ کتابوں کا طریقۂ تدریس

تفسیر کا لغوی واصطلاحی مفہوم

(الف) تفسیر کا لغوی معنی: تفسیر، فسر یفسر کا مصدر ہے، جو "الفسر" سے ماخوذ ہے، جس کا معنی بیان اور وضاحت ہے۔ کہا جاتا ہے "اسفر الصبح" صبح واضح ہوگئی۔ (۱) قرآن مجید میں ہے: "ولا یأتونک بمثل الا جئناک بالحق وأحسن تفسیرا". (۲) یعنی "احسن بیانا و تفصیلا."

(ب) تفسیر کا اصطلاحی معنی: هو علم یعرف فیه فهم کتاب الله المنزل علی نبیه محمد ﷺ وبیان معانیه واستخراج أحکامه وحکمه. (۳) یعنی تفسیر ایسا فن ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی اس کتاب کو سمجھا جائے جو محمد ﷺ پر نازل کیا گیا اور اس کے معانی کو بیان کیا جائے اور اس کے احکام اور اس کی حکمتوں کو واضح کیا جائے۔

تفسیر قرآن کی تاریخ:

تفسیر قرآن کی تاریخ نزول قرآن سے شروع ہوتی ہے اور قرآن مجید کے بیان کے مطابق سب سے پہلے مفسر قرآن نبی اکرم ﷺ ہیں۔ "وأنزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیهم". (۴) یعنی ہم نے قرآن مجید آپ پر اس لیے نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کو وضاحت کے ساتھ یہ بتادیں کہ ان کے لیے کیا نازل کیا گیا ہے۔

اس حکم الٰہی کے مطابق محمد عربی ﷺ نے اپنے اقوال وافعال اور سیرت وکردار سے قرآن مجید کی پوری تفسیر بیان فرمادی۔ اس کے علاوہ صحابہ کرام بھی قرآنی آیات کی تفسیر و وضاحت کے لیے آپ ﷺ سے رجوع کرتے تھے اور آپ ان کی تفسیر بیان فرماتے تھے۔ جب قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: "الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانهم بظلم اولئک لهم الأمن وهم مهتدون". (۵) تو صحابہ کرام پریشان ہوگئے اور اللہ

کے رسول ﷺ سے کہا کہ ہم میں سے کون ظلم سے بری ہے، اس وقت آپ نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے اور اس آیت کریمہ سے استدلال کیا: "ان الشرک لظلم عظیم". (۶)

دیگر تمام علوم کی طرح علم تفسیر بھی جمع وترتیب کے تین مراحل سے گزر کر ایک باضابطہ فن کی شکل میں ہمارے سامنے آیا ہے۔

۱- مرحلۂ کتابت: عہد رسالت میں کتابت کے لیے چمڑوں، تختوں اور کھجور کے تنوں کے علاوہ صحیفہ کا ذکر بھی کتابوں میں ملتا ہے۔ اس دور میں تفسیری مرویات کو بھی احادیث کی طرح جمع کرلیا گیا تھا۔

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح بخاری میں حضرت ابوجحیفہؓ سے ایک حدیث نقل کیا ہے۔ حضرت ابوجحیفہ کہتے ہیں: میں نے حضرت علیؓ سے پوچھا: هل عندکم کتاب؟ کیا آپ کے پاس کوئی کتاب ہے؟ حضرت علی نے فرمایا: "لا! الا کتاب الله أو فهم اعطیه رجل مسلم أو ما فی هذه الصحیفة...." (۷) نہیں! سوائے قرآن یا اس بصیرت کے جو ایک مسلمان آدمی کو عطا کیا گیا ہے یا اس صحیفہ کے جو میرے پاس ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث کے ضمن میں لکھا ہے: "قال ابن المنیر: فیه دلیل علیٰ أنه کان عنده اشیاء مکتوبة من الفقه المستنبط من کتاب الله وهی المراد بقوله: أو فهم أعطیه رجل مسلم". (۸) ابن منیر کہتے ہیں: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت علیؓ کے پاس کتاب اللہ کے کچھ مستنبط مسائل تحریری شکل میں موجود تھے اور ان کے اس قول "أو فهم اعطیه رجل مسلم" کا یہی مطلب ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حدیث کی طرح تفسیر کی جمع وتدوین کا کام عہد رسالت میں صحابہ کرام کی توجہ کا اہم مرکز نہیں رہا اور اس کی دو اہم وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ رسول اللہ

ﷺ کی ذات گرامی بحیثیت شارع ومفسر موجود تھی اور دوسری وجہ یہ کہ اس دور میں کتابت سے زیادہ حافظہ پر اعتماد کیا جاتا تھا، البتہ صحابہ کرام کے فوراً بعد تابعین کے عہد میں سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے تفسیر کو جمع کیا گیا۔ مفسرین نے تفسیر کی تمام جزئیات وتفصیلات سے قطع نظر اہم اہم تفسیری اقوال وآثار پر اپنی توجہ مرکوز رکھی اور تدوین تفسیر کا یہی منہج تابعین اور تبع تابعین کے زمانے تک جاری رہا۔

تدوین تفسیر کی تاریخ میں سب سے پہلی تفسیر **مجاهد بن جبر المخزومی المکی** (ت۱۰۴ھ) کی تفسیر مانی جاتی ہے، جن کا شمار کبار تابعین میں ہوتا ہے۔

علامہ ابن جریر طبری (ت۳۱۰ھ) ابن ابی ملیکہ سے بسند خود روایت کرتے ہیں: ''**رأيت مجاهدا يسأل ابن عباس عن تفسير القرآن ومعه الواحه، فيقول له ابن عباس: اكتب، قال: حتى سأله عن التفسير كله**''. (۹)

ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں: میں نے مجاہد کو دیکھا کہ وہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے قرآن کی تفسیر پوچھتے تھے، ان کے پاس تختیاں ہوتی تھیں۔ ابن عباس کہتے لکھ لو، اس طرح مجاہد نے عبداللہ بن عباس سے پورے قرآن کی تفسیر پوچھ لی۔

ابن ابی ملیکہ کی اس تاریخی شہادت سے ہم اس معتبر ترین تفسیر کی تاریخ تدوین کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس کی وفات ۶۸ھ میں ہوئی، جس کا مطلب یہ ہے کہ ''تفسیر مجاہد'' ۶۸ھ سے پہلے لکھی جا چکی تھی۔ یہ قدیم ترین تفسیر دو مرتبہ طبع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۷۴ء میں عبدالرحمٰن السورتی کی تحقیق کے ساتھ اور دوسری مرتبہ ۱۹۸۹ء میں محمد ابوالنیل کی تحقیق کے ساتھ۔

مجاہد کے بعد مکہ ہی کے ایک دوسرے مشہور تابعی سعید بن جبیر نے ایک دوسری تفسیر لکھی۔ ابن ابی حاتم الرازی (ت۳۲۷ھ) اپنے والد ابوحاتم سے بیان کرتے ہیں کہ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان (ت۸۶ھ) نے ایک مرتبہ سعید بن جبیر کو لکھا کہ قرآن

مجید کی ایک تفسیر لکھیں اور سعید بن جبیر نے ایک تفسیر لکھ کر ان کو بھیج دی۔ (۱۰)

تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ سعید بن جبیر ۹۸ھ میں حجاج ابن یوسف کے ہاتھوں قتل کئے گئے، اس لئے کہ انھوں نے ۸۱ھ میں حجاج بن یوسف کے خلاف ابن الاشعث کی بغاوت میں حصہ لیا تھا اور یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ عبدالملک بن مروان نے ایک ایسے شخص سے تفسیر لکھنے کا مطالبہ کیا ہو جو اس کی حکومت کے خلاف بغاوت میں شریک ہوا اور یہ بات بھی خلاف قیاس معلوم ہوتی ہے کہ سعید بن جبیر نے بغاوت کی حالت میں عبدالملک بن مروان کے حکم کی تعمیل کی ہوگی، اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ کام عبدالملک بن مروان کی ابتدائے حکومت، یعنی ۶۵ھ سے ابتدائے بغاوت، یعنی ۸۱ھ کے درمیان انجام پایا ہوگا۔

کبار تابعین کے عہد میں ان ہی دو تفسیروں کا پتہ چلتا ہے، البتہ اس کے بعد تدوین تفسیر کا کام بڑی تیزی سے شروع ہو گیا اور دوسری صدی ہجری تک پانچ تفسیریں منظر عام پر آ گئیں، جن میں سے تین کا تعلق تفسیر ماثور سے ہے اور دو کا تعلق تفسیر بالرائے سے ہے۔ ماثور تفسیروں میں عبدالملک بن جریج (ت۱۴۹ھ) کی تفسیر ''**الآثار و حروف التفسير**''، مقاتل بن سلیمان (ت۱۵۰ھ) کی ''**التفسير الكبير**'' اور یحییٰ بن سلام البصری (ت۲۰۰ھ) کی تفسیر اور تفسیر بالرائے میں واصل بن عطاء (ت ۱۳۱ھ) کی ''**معانی القرآن**'' اور عمرو بن عبید (ت۱۴۴ھ) کی تفسیر تھی۔ (۱۱)

۳- مرحلۂ تصنیف و تالیف: اس مرحلہ میں تفسیر ایک فن کی حیثیت سے پوری جامعیت کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے اور ساتھ ہی مفسرین دو مکتب فکر میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک تفسیر ماثور اور دوسرا تفسیر بالرائے، بعد میں آنے والے تمام مفسرین نے انہی دونوں مکتب فکر سے متاثر ہو کر تفسیری خدمات انجام دی ہیں۔

تفسیر ماثور:

تفسیر ماثور کی بنیاد ان ہی مصادر پر ہے جو شریعت کے معتبر اور متفق علیہ مصادر تسلیم کیے جاتے ہیں، یعنی قرآن مجید، سنت صحیحہ، صحابہ کرام اور تابعین سے ثابت شدہ موقوف تفسیری روایات۔ تفسیر میں سب سے زیادہ صحیح ذخیرہ وہ ہے جو کتب حدیث میں کتاب التفسیر یا ابواب التفسیر کے نام سے موجود ہے۔

تفسیر ماثور میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کو دو تصنیفی مناہج میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱-محدثین کا منہج: محدثین کرام نے جو تفسیری خدمات انجام دیں ان میں تفسیر کے لیے قرآنی آیات، احادیث صحیحہ اور اقوال صحابہ پر اکتفا کیا۔ کہیں کہیں کبار تابعین کے ان اقوال سے بھی تفسیر بیان کی جو صحیح سند کے ساتھ ثابت تھے، ان لوگوں نے اپنی تفسیروں کو اسرائیلی روایات اور موضوع احادیث سے بالکل پاک رکھا اور اگر کہیں ذکر بھی کیا تو تردید کی غرض سے، اس منہج کی چند مشہور تفسیریں یہ ہیں:

حافظ عبدالرحمٰن بن ابی حاتم کی "**تفسیر القرآن العظیم سندا عن الرسول و الصحابة و التابعین**" اس تفسیر کے چند اجزاء تحقیق کے بعد طبع ہوئے ہیں اور باقی ہنوز مخطوطے کی شکل میں موجود ہے۔

امام ابومحمد حسین البغوی (ت۵۱۰ھ) کی "**معالم التنزیل**" جو ثعلبی (ت۴۲۷ھ) کی تفسیر کی تلخیص ہے۔

اس طرز تصنیف کی سب سے مشہور تفسیر امام ابوالفداء اسماعیل ابن کثیر (ت۷۷۴ھ) کی "**تفسیر القرآن العظیم**" ہے، جو تفسیر کی تمام کتابوں میں جامعیت اور روایات پر نقد کے اعتبار سے ممتاز حیثیت کی حامل ہیں، عام قاری کے لیے اب اس کی تلخیص بھی دستیاب ہے جو اکثر مدارس میں داخل نصاب ہے۔

۲-مفسرین کا منہج: محدثین اور مفسرین کے منہج میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مفسرین نے قرآن و حدیث اور اقوال صحابہ و تابعین کے علاوہ اہل کتاب کی عام تفسیری مرویات کو بھی اپنی تفسیروں میں داخل کیا، بلکہ بعض مفسرین نے تو ضعیف اور متروک روایات سے بھی احتراز نہیں کیا، حتیٰ کہ فضائل سور اور قصص انبیاء میں موضوع احادیث کو بھی داخل کر دیا، جبکہ محدثین نے صرف قرآن و حدیث اور اقوال صحابہ و تابعین ہی پر اکتفا کیا اور شاید مفسرین کے اسی منہج کو دیکھ کر امام احمد بن حنبل نے کہا تھا: "**ثلاثة أمور ليس لها اسناد: التفسير و الملاحم و المغازی.**" (۱۲) یعنی تین علوم ایسے ہیں جن کی سند نہیں ہے، تفسیر، ملاحم اور مغازی۔ اس منہج کی چند مشہور تفاسیر یہ ہیں:

عبد الرزاق بن همام الصنعانی (ت۲۱۱ھ) کی "**تفسیر القرآن الکریم**" اس منہج کی سب سے معتبر تفسیر ہے، جو حال ہی میں طبع ہوئی ہے۔

امام ابن جریر طبری (ت۳۱۰ھ) کی "**جامع البیان فی تفسیر القرآن**" امام ابن جریر کی یہ تفسیر سابقہ تمام کتب کی جامع ہے اور اسی لئے بعد میں آنے والا کوئی بھی مفسر اس سے مستغنی نہیں رہ سکتا ہے۔

ابو اللیث السمرقندی (ت۳۷۵ھ) کی "**بحر العلوم**" یہ کتاب اسرائیلیات اور موضوعات کا سب سے عظیم مرجع ہے۔

ابو اسحاق احمد الثعلبی (ت۴۲۷ھ) کی "**الکشف و البیان عن تفسیر القرآن**" فضائل سور سے متعلق موضوعات اور اسرائیلیات کے لیے یہ کتاب کافی شہرت رکھتی ہے۔

علامہ عبدالرحمٰن بن الجوزی (ت۵۹۷ھ) کی "**زاد المسیر فی علم التفسیر**" اور امام عبدالرحمٰن السیوطی (ت۹۱۱ھ) کی "**الدر المنثور فی التفسیر بالماثور**" بھی اسی منہج کی تفسیر مانی جاتی ہے۔

عصر حاضر کی چند معروف ماثور کتب تفاسیر:

عہد حاضر کے تقریباً تمام مفسرین نے اپنی تفسیروں میں وہی منہج اختیار کیا ہے جو متقدمین مفسرین کا منہج تھا، چنانچہ اثری، فقہی، لغوی، علمی اور بلاغی تفسیریں اس دور میں لکھی گئی ہیں۔ دونوں میں صرف اسلوب اور طرز نگارش کا فرق ہے، البتہ دور حاضر میں تفسیر کے کچھ نئے مناہج بھی سامنے آئے ہیں۔

(۱) اصلاحی تفسیر: اس قسم کی تفسیر میں مفسرین ان آیات کو منتخب کرتے ہیں جن میں اصلاح معاشرہ یا دیگر اصلاحی امور پر روشنی ڈالی گئی ہے اور نہایت مفصل انداز میں ان کی تفسیر بیان کرتے ہوئے اپنے معاشرہ کی موجودہ صورت حال سے ان کا ربط وتعلق واضح کرتے ہیں۔

(۲) نشریاتی تفسیر: یہ بالکل جدید دور کی پیداوار ہے۔ اس میں مفسر ریڈیو یا ٹیلی ویژن کے توسط سے قرآنی آیات کو بہت سہل اور آسان اسلوب میں عوام کے لیے بیان کرتا ہے، پھر اس کے بعد اسے کتابی شکل دے دی جاتی ہے۔ اس طرز کی کئی تفسیریں منظر عام پر آچکی ہیں۔

(۳) موضوعی تفسیر: اس میں مفسر کسی ایک موضوع کی تعیین کرتا ہے اور اس سے متعلق قرآنی آیات کو بالترتیب جمع کر لیتا ہے، پھر ان کی تفسیر لکھتا ہے۔ مثال کے طور پر ''عورت قرآن کی نظر میں''، ''انسان قرآن کے آئینہ میں'' وغیرہ، چونکہ یہ ایک موضوع پر محدود آیات کی تفسیر ہوتی ہے، اس لیے مختصر بھی ہوتی ہے اور عام لوگ اس سے استفادہ بھی کرتے ہیں۔

ذیل میں ماثور اور مقبول منہج پر لکھی جانے والی جدید تفسیروں کا جائزہ فن کے اعتبار سے پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) اثری تفسیر: معاصر اثری تفاسیر میں بھی قدیم ماثور تفسیروں کی طرح اسرائیلیات،

موضوعات اور واہیات وخرافات روایات سے احتراز کرتے ہوئے صرف صحیح احادیث و اقوال پر اعتماد کیا گیا ہے اور نص کی عدم موجودگی میں کہیں کہیں متقدمین کی طرح اجتہاد سے بھی کام لیا گیا ہے۔

معاصر اثری تفاسیر میں سے چند مشہور تفسیریں یہ ہیں:

۱-فتح البیان، نواب صدیق حسن خان قنوجی (ت ۱۳۰۷ھ)

۲-أضواء البیان، محمد امین شنقیطی (ت ۱۳۹۷ھ)

۳-تفهیم القرآن (عربی) سید ابوالاعلیٰ مودودی (ت ۱۳۹۹ھ)

۴-صفوة التفاسیر، محمد علی الصابونی

(۲) فقہی تفسیر: عصر حاضر میں فقہی تفسیروں کی ایک خصوصیت یہ سامنے آئی ہے کہ عام طور پر کلیہ یعنی بی اے کے نصاب تعلیم کے حقدار کو ذہن میں رکھ کر بعض تفسیریں مرتب کی گئی ہیں۔ دور جدید کی چند فقہی تفسیریں یہ ہیں:

۱-نیل المرام من تفسیر آیات الاحکام، نواب صدیق حسن خان قنوجی (۱۳۰۷ھ)

۲-تفسیر آیات الأحکام، محمد علی السایس (ت ۱۳۹۶ھ)

۳-روائع البیان فی تفسیر آیات الأحکام، محمد علی الصابونی

۴-تفسیر آیات الاحکام، مناع خلیل القطان

۵-فیوض العلام علی تفسیر آیات الأحکام، ڈاکٹر محمد لقمان السلفی

(۳) بلاغی تفسیر: تفسیر کی اس قسم میں قرآن کے فنی محاسن کو امثال وقصص جیسی آیات کی روشنی میں اجاگر کیا جاتا ہے۔ معاصر تفسیروں میں اس اعتبار سے سید قطب کی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

(۴) علمی تفسیر: دور حاضر میں اکثر مفسرین کا رجحان اسی تفسیر کی جانب ہے۔ یہ الگ

بات ہے کہ اکثر کی کوششیں علمی تفسیر کے اصول وضوابط سے ہم آہنگ نہیں ہیں، بلکہ علمی تفسیریں کم اور موضوعی تفسیریں زیادہ ہوگئی ہیں۔ اس سلسلہ کی ایک معروف تفسیر محمد علی البار کی "**خلق الانسان بین العلم والقرآن**" ہے، جہاں تک شیخ طنطاوی جوہری (ت۱۹۴۰ء) کی "**الجواهر فی تفسیر القرآن**" کا تعلق ہے تو یہ تفسیر کی کتاب کہے جانے کے لائق نہیں ہے، اس لیے کہ مؤلف نے قرآنی آیات کے معانی بیان کرنے سے زیادہ اپنی تفسیر کو حیوانات ونباتات اور اسرائیلی روایات سے بھر دیا ہے۔(۱۳)

(۵) اصلاحی تفسیر: مفسر اس قسم کی تفسیر میں اصلاحی مضامین کی آیتوں سے بحث کرتا ہے۔ کہیں کہیں مغربی تہذیب، مادی وسائل اور اسلامی تعلیمات کا تقابلی جائزہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اس موضوع کی چند جدید تفسیریں یہ ہیں:

۱-تفسیر القرآن الحکیم، محمد رشید رضا (ت۱۹۳۵ء)۲-تفسیر المراغی، احمد مصطفی المراغی (ت۱۹۴۵ء)۳-تفسیر التحریر والتنویر، محمد طاهر بن عاشور (۱۹۷۳ء)

(۶) نشریاتی تفسیر: اس کی ابتدا امین الخولی (ت۱۹۶۶ء) کے اس نشریاتی پروگرام سے ہوئی جو انھوں نے ۱۹۴۴ء سے مسلسل مصری ریڈیو پر درس قرآن کی صورت میں دیا، جو بعد میں الگ الگ کتابوں کی شکل میں طبع ہوکر منظر عام پر آئے۔ ویسے اس کو تفسیر کی بجائے وعظ وارشاد کی کتاب کہنا مناسب ہوگا۔

امین خولی کے بعد نشریاتی تفسیر کا کام انجام دینے والے چند مشہور نام یہ ہیں:

۱-محمد شلتوت (ت۱۹۶۴ء) جن کی تفسیر "**تفسیر الاجزاء العشرة الأولیٰ**" کے نام سے طبع ہوئی۔

۲-محمد المکی الناصری (ت۱۴۱۴ھ) جن کی تفسیر "**التیسیر فی احادیث التفسیر**" ہے۔

۳-عبدالرحمن بن سعدی، ان کی تفسیر "تفسیر کلام المنان" کے نام سے مشہور ہے۔(۱۴)

مدارس اسلامیہ ہند کے نصاب تعلیم پر ایک نظر:

ہندوستان کے وسیع وعریض خطے پر پھیلے ہوئے تمام مدارس اسلامیہ کے نصاب پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ ان مدارس میں جو نصاب تعلیم رائج ہے اس میں چند مضمون کے علاوہ اکثر مضامین میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ حفظ وتجوید، تفسیر وعلوم تفسیر، حدیث واصول حدیث، فقہ واصول فقہ، عقیدہ وادب، سیرت وتاریخ، نحو وصرف، بلاغت اور اسرار شریعت، فرق وادیان، فرائض اور انگریزی کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، البتہ کتابوں کے انتخاب واختیار میں خاصہ اختلاف پایا جاتا ہے۔

مدارس اسلامیہ کے نصاب تعلیم میں "تفسیر" کی شمولیت:

چونکہ قرآن کریم اور حدیث شریف پر شریعت اسلامیہ کا دارومدار ہے۔ انسانوں کی زندگی میں پیش آمدہ مسائل کا مرجع کتاب وسنت ہے، اس وجہ سے ہندوستان کے تمام اہل حدیث گور غیر اہل حدیث اداروں میں تفسیر وعلوم تفسیر کی تعلیم وتدریس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ان مدارس کے نصاب تعلیم سے واضح ہوتا ہے، البتہ فن تفسیر کی کتابوں کے انتخاب واختیار اور طریقۂ تدریس میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

مدارس اہل حدیث میں تفسیر علوم تفسیر کی جو کتابیں داخل نصاب ہیں، ان میں "**تفسیر جلالین، تفسیر فتح القدیر، تفسیر ابن کثیر، تفسیر کشاف، تفسیر بیضاوی، فیوض العلام علیٰ تفسیر آیات الاحکام، الاتقان، الفوز الکبیر**" خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

حنفی مکتب فکر کے مدارس، جن میں دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سرفہرست ہیں، ان میں ''تفسیر جلالین، تفسیر مدارک التنزیل، تفسیر مظھری، تفسیر کشاف، تفسیر بیضاوی اور الفوز الکبیر'' اہمیت کی حامل ہیں۔

بریلوی مکتب فکر کے مدارس میں ''تفسیر کشاف، تفسیر آیات الاحکام، تفسیر جلالین، تفسیر مدارک التنزیل'' اور ''تفسیر بیضاوی'' جیسی تفسیر کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔

مدارس شیعہ میں ''تفسیر صافی، تفسیر نمو'' اور ''تفسیر موضوعی'' داخل نصاب ہیں۔

مدارس اسلامیہ میں تفسیر کا رائج طریقۂ تدریس:

ہندوستان کے مدارس اسلامیہ میں عام طور پر تفسیر کا جو طریقۂ تدریس رائج ہے اس میں کتب تفسیر کی عبارت خوانی طلبہ سے کرائی جاتی ہے، پھر اساتذہ عبارت کا ترجمہ و تفہیم کرتے ہیں۔ سال بھر یہی طریقۂ تدریس و تعلیم باقی رہتا ہے۔ طلبہ ششماہی و سالانہ امتحانات کے موقع سے پڑھے ہوئے حصے کو رٹ ڈالتے ہیں اور پھر امتحان میں شریک ہوکر اس مادہ میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

اس طرح کے طریقۂ تدریس سے چند امور سامنے آتے ہیں:

۱- اس طرح پڑھانے سے معلومات وسیع تر نہیں ہو پاتی ہیں، بلکہ معلومات کا دائرہ درسی کتابوں کے چند مخصوص صفحات تک ہی محدود ہوتا ہے۔

۲- اس طرح کے طریقۂ تدریس سے طالب علم کو جماعت یا مرحلہ کی ترقی مل جاتی ہے، البتہ علمی ترقی سے وہ محروم رہ جاتا ہے۔

۳- اس طرح پڑھانے سے طالب علم کا مطالعہ محدود ہوکر رہ جاتا ہے، کیونکہ مقررہ چند صفحات کے حل و فہم کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔

۴- اس طرح پڑھنے کا مطلب عبارت کو بلا سمجھے بوجھے رٹنا اور یاد رکھنا سمجھا جاتا ہے۔

۵- اس طرح کے طریقۂ تدریس میں حکم ماننے اور فرماں بردار بننے پر زور دیا جاتا ہے۔ خارجی سوالات کے پوچھنے، فقہی تفسیر و توضیح معلوم کرنے اور فقہی مسائل و احکام کے استنباط و استخراج کے متعلق سوالات کرنے سے روکا جاتا ہے۔

۶- معمولات کی پابندی اور پڑھنے کے دوران استاذ کی ہدایت پر عمل کرنے کی عادت زبردستی پیدا کرائی جاتی ہے۔

۷- سیکھنے اور پڑھنے کے لیے صرف انہی مواد کا استعمال کیا جاتا ہے جو داخل نصاب صفحات پر محیط ہوتے ہیں۔ خارجی مواد دیگر علمی اور فقہی تفسیروں کے مطالعہ کی روشنی میں ہرگز پیش نہیں کئے جاتے۔

۸- طلبہ کو مطالعہ کے لیے چند مخصوص کتب تفسیر تک ہی محدود رکھا جاتا ہے، اس سے موافق و مخالف دلیل کا علم نہیں ہو پاتا ہے۔

۹- اس طرح کے طریقۂ تدریس سے تمام طرح کے تعلیمی امور کی انجام دہی خود استاذ ہی کو کرنا پڑتی ہے، طلبہ کلاس میں صرف جسم اور کتاب کے ساتھ حاضر ہوجاتے ہیں۔

۱۰- طلبہ کو اظہار رائے، اختلاف احکام و مسائل اور استنباط و استخراج احکام کی چھوٹ نہیں دی جاتی، بلکہ جو کچھ زیر درس کتابوں میں لکھا ہوتا ہے اسے زبردستی یاد کرایا جاتا ہے۔

۱۱- سیکھنے اور حاصل کرنے کے لیے کبھی کبھی غیر فطری اور بے معنی طریقوں سے آمادگی پیدا کرائی جاتی ہے، جیسے سزا وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر بالماثور کی نمائندہ کتابوں کا طریقۂ تدریس:

مدارس اسلامیہ ہند کے نصاب تعلیم میں داخل کتب تفاسیر کا مختصر اور سرسری جائزہ سے یہ بات مترشح ہوچکی ہے کہ بہت کم ہی تفسیر بالماثور کی کتابیں ان مدارس میں داخل ہیں، بلکہ ان مدارس میں اس وقت ماثور نمائندہ تفسیروں کی بجائے ایسی تفسیریں داخل نصاب ہیں جو اولاً غیر مستحسن مناہج پر مشتمل ہیں اور ثانیاً ان میں سے بعض بے حد مختصر ہیں۔ ترجمہ کی حد تک وہ تفسیریں تو مفید ضرور ہیں، لیکن اصل قرآن فہمی میں جو تفسیر کا مقصد ہے ان سے زیادہ مدد نہیں ملتی، اختصار کے باوجود بھی ان میں اسرائیلیات اور یونانی اوہام مخلوط ہیں، صحیح روایات کا التزام نہیں۔ اکثر مقامات پر یہ سمجھنا مشکل ہوجاتا ہے کہ اگر اسرائیلی روایات سے قطع نظر کرلی جائے اور یونانی تصورات علیحدہ کردیے جائیں تو خالص عربی اسلوب عبارت اور لسانی اصول وقواعد کے تحت ان کا کیا مفہوم ہوگا اور قرن اوّل میں کیا مفہوم سمجھا جاتا تھا۔ قرآن کریم میں صحیح تدبر اور غور کرنے کی نہ مشق ہوتی ہے اور نہ ان کے حقیقی حدود متعین ہو پاتے ہیں، لہٰذا تفسیر کے فن میں جو کتابیں داخل نصاب ہیں ان میں نظر ثانی کرکے محدثین ومفسرین کے مناہج پر مشتمل ماثور کتب تفاسیر نیز عصر حاضر میں ماثور اور مقبول منہج پر موجود اثری تفسیر، فقہی تفسیر، بلاغی تفسیر، علمی تفسیر اور اصلاحی تفاسیر کو داخل نصاب کیا جائے اور قدیم روایتی طریقۂ تدریس جو کم نفع اور زیادہ نقصان وخسارہ کا متحمل ہے، کی بجائے جدید طریقۂ تدریس کو اختیار کیا جائے۔ اس کے لیے ذیل کے چند طریقۂ تدریس مفید ہوسکتے ہیں:

۱- اس وقت کتب تفسیر کا جو طریقۂ تدریس رائج ہے، اس میں اساتذہ وطلبہ کی تمام تر توجہ کتابوں کی عبارتوں اور ان کے ترجمہ اور عبارتوں کا مطلب ومفہوم معلوم کرنے پر مرکوز رہتی ہے، گویا طالب علم فن نہیں پڑھتا بلکہ کتاب پڑھتا ہے اور اس کو سمجھ لینے کو ہی اپنے لیے

معراج کمال جانتا ہے۔ یہ طریقۂ تدریس وتعلیم زیادہ سے زیادہ مرحلہ متوسطہ وثانویہ کے طلبہ کے لیے مفید ہوسکتا ہے، مگر عالمیت (Intermidiate) اور فضیلت (B.A.) کے طلبہ کے لیے کچھ بھی مفید نہیں۔ اس طریق درس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب کچھ پڑھ لینے کے بعد بھی طالب علم کو فن نہیں آتا۔ فن کے اصول وفروع اور اس کے آداب ومبادی پر اس کی نظر نہیں ہوتی اور اس کا ذہن تخلیقی ہونے کی بجائے محض تقلید میں ہوکر رہ جاتا ہے، لہٰذا ضرورت ہے کہ اس کو بدل کر لکچر دینے کا طریقہ عالمیت وفضیلت کے کلاسوں میں رائج کیا جائے اور طلبہ میں خود مطالعہ اور غور وفکر کا مادہ پیدا کیا جائے۔

۲- طلبہ میں ایک عام رجحان یہ پایا جاتا ہے کہ تفسیر کے مضمون سے ان کی کوئی دلچسپی نہیں، اس کی جہاں بہت ساری وجوہات ہیں وہاں ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ استاذ تفسیر کی تدریس کو پراثر نہیں بنا پاتے۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ طریقۂ تدریس کوئی ایسا پیمانہ نہیں کہ جسے استعمال کرکے مضمون کی تدریس کو مؤثر بنایا جاسکے، بلکہ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ:

اولاً: وہ نفس مضمون (صرف مخصوص زیر تدریس کتاب ہی نہیں) کا گہرا اور عمیق مطالعہ اور فہم کے بعد تدریسی فریضہ انجام دینے کے لیے کلاس میں حاضری دے۔

ثانیاً: سیکھنے کے عمل میں طلبہ کی فعال شرکت کو اپنے گوناگوں خصائص کے ذریعہ ممکن بنانے کا طرز اختیار کیا جائے۔

ثالثاً: استاذ کو طلبہ کی نفسیات اور تعلیمی نفسیات اور اصول تعلیم سے گہری واقفیت حاصل ہو۔

رابعاً: اساتذہ کی فن سے گہری دلچسپی اور فن میں باقاعدہ تربیت ہو۔ ظاہر سی بات ہے کہ تدریس کے عمل کو اس طرح انجام دینا ہے کہ طالب علم سیکھنے کے عمل میں دلچسپی لے اور فعال شرکت کرے تاکہ اس کی جملہ ذہنی، جذباتی اور دیگر صلاحیتوں کو فروغ دیا جاسکے اور اس کی شخصیت کا ہمہ جہتی ارتقا ہوسکے، مگر مدارس اسلامیہ ہند میں عام طور پر یہ بات محسوس کی جاتی ہے کہ کسی بھی استاذ کو تفسیر کا مضمون تدریس کے لیے دے دیا جاتا ہے جس سے اس کو

نہ کوئی دلچسپی ہوتی ہے اور نہ اس فن میں اس کو پہلے سے کوئی تربیت ملی رہتی ہے، جس کا نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ وہ تدریسی ذمہ داری کو نبھانے سے قاصر رہتا ہے اور طلبہ کو سوائے نقصان کے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، لہٰذا تفسیر کی تدریس کو مؤثر بنانے کے لیے ان ہی اساتذہ کا انتخاب بہتر ہوگا جن کو اس فن سے دلچسپی اور ساتھ ہی ساتھ اس فن میں ان کی تربیت ہوئی ہو۔

۳- طلبہ کو اظہار رائے، اختلاف احکام و مسائل اور اختلاف استنباط و استخراج کا بھرپور موقع دیا جائے، بلکہ ہر گھنٹی کے اخیر میں پانچ چھ منٹ کا وقت دیا جائے، جس میں طلبہ اپنے اندر پانے والے سوالات واشکالات کو اساتذہ کے سامنے رکھ سکیں۔

۴- چونکہ تمام تفسیر بالماثور نمائندہ کتابوں کو نصاب تعلیم میں داخل کر کے کلاسوں میں ان کو پڑھانا ممکن نہیں ہے، اس بنا پر ہفتہ یا پندرہ دن میں یا مہینے میں مختلف جماعتوں کے طلبہ کے اجتماع عام میں کسی تفسیر بالماثور نمائندہ کتاب کی تدریس کا طریقہ بتایا جائے۔ اس کا انداز محاضرہ اور لکچر کا ہو، جس میں محاضر مصنف کتاب، کتاب، مشتملاتِ کتاب، مناہجِ کتاب اور اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالنے کے بعد چند مخصوص سورتوں کی تفسیر و تفہیم کا اہتمام کرے، پھر اس سے استفادہ کے طریقہ پر روشنی ڈال کر محاضرے کو ختم کردے۔ اس کی اہمیت اور اس طرح کے طریقۂ تدریس سے استفادہ کرنے کو پر مؤثر بنانے کے لیے اس کو شش ماہی و سالانہ امتحان سے جوڑ دیا جائے، جس کا نمبر پندرہ یا بیس ہو۔

۵- جس استاذ کے ذمہ تفسیر کا مضمون ہو، اس کو کم سے کم گھنٹیاں دی جائیں تاکہ وہ جس ماثور نمائندہ تفسیر کی تدریس کا کام انجام دے رہا ہو اس کے ساتھ ساتھ مزید کم از کم پانچ ماثور تفسیروں کا مطالعہ کر کے تدریس کے فرائض انجام دے، نیز طلبہ کو بھی وہ رہنمائی کرے کہ وہ چند دیگر ماثور تفسیروں کا مطالعہ کر کے کلاس میں آیا کریں۔

۶- طلبہ کو اس بات کا مکلّف نہ کیا جائے کہ شش ماہی و سالانہ امتحانات میں زیر درس داخل تفسیر ہی سے جواب دیں، بلکہ ان کو اس بات کا پورا اختیار دیا جائے کہ درست جواب

ہو، البتہ زیر درس داخل تفسیر اور اس کے علاوہ دیگر جس تفسیر سے بھی چاہیں جواب لکھ سکتے ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ طلبہ کے اندر خوب تر کی تلاش کا جذبہ موجزن ہوگا اور اس طرح سے ان کی صلاحیت ولیاقت میں کافی ترقی ہوگی۔

۷- تفسیر بالماثور کی نمائندہ کتابوں کو اس ڈھنگ سے پڑھایا جائے کہ تقریباً اس کے تمام ہی مناہج پر مشتمل کتابیں فضیلت (B.A.) کے سالوں تک آجائیں، مثلاً کسی سال محدثین کے منہج پر مشتمل تفسیر بالماثور کی نمائندہ کتاب کو پڑھایا جائے تو کسی سال مفسرین کے منہج پر مشتمل تفسیر بالماثور کی نمائندہ کتاب کو۔ اسی طرح کسی سال عصر حاضر میں ماثور و مقبول منہج پر لکھی جانے والی تفسیروں میں اثری تفسیر، فقہی تفسیر، بلاغی تفسیر، علمی تفسیر اور اصلاحی تفسیر کو پڑھایا جائے۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ فراغت کے سال تک ایک طالب علم تفسیر بالماثور کی تمام مناہج پر مشتمل کتابوں سے استفادہ کر لے گا۔

۸- فضیلت (B.A.) کے سالوں کے طلبہ کو اپنے اپنے مضمون کے تحت آئے احادیث، آثار اور اقوال کی تحقیق وتخریج پر آمادہ کرنا مفید ہوگا۔

۹- پورے سال تفسیر کے موضوع پر مختلف مقالے لکھوانا بھی مفید ہوگا۔

۱۰- اساتذہ طلبہ کو اثنائے درسِ تفسیر درج ذیل موضوعات کے مطالعے کی ترغیب دلائیں تو فائدہ بخش ہوگا:

تاریخ القرآن، تاریخ علم التفسیر، لغات القرآن و اعرابه و مشکلاته ومتشابهاته، احکام القرآن، عقائد القرآن وحججه، اخبار القرآن و ارضه، اعجاز القرآن و تنزیهه عن المطاعن، الانموذجات من التفسیر بالروایة والدرایة وغیره.

☆☆

قرآن کریم اور نظام معیشت

● مولانا عبداللہ ابن القمر الحسینی

حق تعالیٰ رب العالمین اور خالق جہاں ہے، اس کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے انسانی ضروریات میں تمام انسانوں کا یکساں حق ہے، اس میں مومن و کافر کا، امیر و غریب کا، حاکم و محکوم کا، کاشتکار و زمیندار کا کوئی امتیاز و فرق نہیں۔ مال و دولت اور ضروریات کی چیزوں کی جمع اندوزی اگر نہ کی جائے، بلکہ اس کی گردش پورے انسانوں میں خاطر خواہ ہوتی رہے تو کوئی انسان بھوکا، ننگا اور فقیر نہیں رہ سکتا، مگر ہوتا یہ ہے کہ مال سے صرف خود ہی فائدہ اٹھائے دوسروں تک اس کا فائدہ نہ پہنچے، اس بخل و حرص نے دنیا میں اکتناز دولت اور سرمایہ پرستی کے پرانے اور نئے بہت سے طریقے ایجاد کرائے، جن کے ذریعہ اس دولت کی گردش صرف سرمایہ داروں اور بڑے لوگوں کے ہاتھوں میں محدود ہو کر رہ گئی۔ عام مساکین محروم کر دیے گئے، جس کے ردّعمل نے دنیا میں کمیونزم اور سوشلزم جیسے نامعقول طریقے ایجاد کیے۔

سرمایہ دارانہ نظام:

دنیا میں عموماً معاشی بحران اور اقتصادی فساد جن وجوہ سے پھیلتا ہے ان میں سے پہلی وجہ سرمایہ داروں کا وہ ظالمانہ و بہیمانہ نظام ہے، جسے قرآن نے قارونیت و اکتنازیت کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس کی بنیاد شخصی یا طبقاتی فوائد، خودغرضی اور ذاتی منافع پر ہے۔ سرمایہ دارانہ

نظام میں سرمایہ دار دولت و زمین کو اپنی پیدا کردہ ذاتی ملکیت سمجھتا ہے اور اس کے تصرف و نمو کا اپنے کو مختار مطلق گردانتا ہے، جس میں وہ کسی خدائی ضابطہ یا حقیقی اخلاقی اقدار کا پابند نہیں ہوتا اور نہ ہی ملت و انسانیت اور دیگر طبقات انسانی کے مفادات کو اپنا ذاتی مفاد اور ان کے نفع و ضرر کو اپنا نفع و ضرر سمجھتا ہے۔ الحاصل سرمایہ دار مال و دولت کو صرف اپنی ملکیت سمجھتا ہے اور اس میں ہر جائز و ناجائز تصرف کو اپنے ذاتی مصالح و مفادات کے ماتحت جائز سمجھتا ہے اور اس کے حصول کے لیے جائز و ناجائز کوئی بھی طریقہ استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ سود، سٹہ، ذخیرہ اندوزی، رشوت وغیرہ ناجائز طریقے اپناتا ہے۔

یہ ایسا ظالمانہ نظام ہے جو انسانیت کی چولیں ہلا دیتا ہے، فقیر محتاج کو مزید محتاج و بے کس کر دیتا ہے، ظلم و زیادتی کو بڑھاوا دیتا ہے اور غیر اخلاقی و غیر عادلانہ طریقوں کو ایجاد کرتا ہے۔ افسوس کہ پوری دنیا میں سرمایہ داروں نے اس وقت اسی نظام کو اپنا رکھا ہے اور خوب خوب دولت جائز و ناجائز طریقے سے سمیٹ رہے ہیں، جس کی وجہ سے بھکمری اور غربت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ امریکہ جو اس نظام کو پوری دنیا میں رائج کرنے میں پیش پیش ہے اور ترقی یافتہ کہلاتا ہے، اسی سرمایہ دارانہ نظام کی بدولت اس کے یہاں کا حال یہ ہے کہ ''ہر آٹھ میں سے ایک امریکی شہری غربت کا شکار ہے، جبکہ ہر چار سیاہ فاموں میں سے ایک شخص افلاس زدہ ہے۔'' (اخبار راشٹریہ سہارا اردو، ۳۱/اگست ۲۰۰۶ء)

اشتراکی نظام:

سرمایہ دارانہ نظام میں ''دولت'' کی ناجائز و غلط لوٹ کھسوٹ کے ردّعمل میں وہ منفی نظام جسے اشتراکیت و اشتمالیت، انقلابی سوشلزم وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے وجود میں آیا۔ یہ نظام چوں کہ مالدار اور نادار کی آویزش کی نقیب ہے، اس لیے انسانی آبادی کا وہ بڑا حصہ جسے سرمایہ داری کے ظالمانہ نظام نے قلاش بنا دیا ہے، یعنی مزدوروں، کسان، غریب،

مفلس، اس کے مسائل حل کرنے کی دعوت کو لے کر یہ آگے بڑھتا ہے۔ گویا یہ نظام ایک طبقہ کے مسائل کے حل کا داعی ہے۔

اشتراکیت ذرائع آمدنی اور مصادر و منابع پیداوار کی عام ملکیت کی قائل ہے، اس لیے نجی ملکیت کا وہ انکار کرتی ہے مگر یہ سبز باغ ہی ہے، عملاً اشتراکی ممالک میں مصادر و منابع پیداوار، مملکت کی ملکیت قرار پاتے ہیں، مملکت کی باگ ڈور چونکہ ''کمیونسٹ پارٹی'' کے ہاتھ میں ہوتی ہے، جو ایک مخروطی پارٹی ہے، جس پر صرف چند چوٹی کے لیڈروں کا عملاً اختیار ہوتا ہے، اس لیے سب دولت و سرمایہ کے سپید و سیاہ کے مالک و حاکم ''کمیونسٹ پارٹی'' بالفاظ دیگر اس کے چند سرکردہ لیڈر قرار پاتے ہیں۔ جن کے خلاف کسی کا آواز اٹھانا بغاوت قرار دیا جاتا ہے۔ اس طرح اشتراکی ممالک میں دولت و زمین، غریب مزدور کسان کو نہیں ملتی، بلکہ سرکاری ملکیت بن کر کمیونسٹ پارٹی کے قبضہ میں چلی جاتی ہے اور غریب بیچارے کے ہاتھ کچھ بھی نہیں لگتا، وہ جہاں تھا وہیں کا وہیں رہ جاتا ہے۔

اسلامی نظام معیشت:

قرآن کا لایا ہوا نظام اقتصاد و معیشت کی بنیاد چونکہ اللہ تعالیٰ کے تصور ربوبیت، مالکیت و حاکمیت پر قائم ہے اور اسلام میں اصلاً کوئی انسان کسی چیز کا حقیقی مالک اور متصرف نہیں، اللہ ربّ العزت کا ارشاد ہے: ''**وللہ خزائن السمٰوٰت والارض**'' (سورہ منافقون: ۷) (اللہ ہی کے ہیں سب خزانے آسمانوں اور زمین کے)۔

لیکن اس کی حکمت کا تقاضہ ہے کہ انسانوں کو اپنا خلیفہ اور نائب بنا کر مجازی طور پر اپنے احکام اور نازل کردہ حدود و قیود کی پابندی کے ساتھ، مختلف طبقات انسانیہ کو ان کے مفادات کی رعایت کرتے ہوئے اور ان کی صلاحیتوں کو روبہ کار لانے کے لیے جتنا مناسب سمجھے زمین و دولت کا نجی مالک بنا دے۔ یہ نجی ملکیت آزادی اور من چاہی خواہشوں

کی پابندی نہیں ہوگی بلکہ احکام الٰہی کی پابند اور حدود الٰہیہ سے مقید ہوگی۔ اس نجی ملکیت و دولت کا حصول و استعمال انسان ایک امین کی حیثیت سے کرے گا جس کے ایک ایک پائی کا حساب اسے اللہ کو دینا ہوگا۔ کہاں سے حاصل کیا، کس طریقے سے حاصل کیا اور کہاں، کیسے، کس مقصد سے خرچ کیا؟۔

قرآن نے نجی ملکیت کی اجازت ان حدود و قیود کے ساتھ مقید کر کے دی جو ظالمانہ سرمایہ دارانہ نظام کو جنم نہ دے سکے، بلکہ دولت کی ایسی عادلانہ تقسیم ہو کہ ایک ہموار معاشی زندگی وجود میں آسکے اور ارتکاز دولت نہ ہو سکے۔ ارشاد ہوا: ''**کی لایکون دولۃ بین الاغنیاء منکم**'' (سورہ حشر: ۷) (تاکہ دولت تمہارے مالداروں ہی میں سمٹ کر نہ رہ جائے)۔

لیکن اسلام جہاں ارتکاز کو روکتا ہے وہیں انسان کے اخلاق و کمالات کے بقا کے لیے مساویانہ تقسیم دولت کا بھی قائل نہیں کہ اگر دولت سب میں برابر تقسیم ہو جائے تو جود و سخا، صبر و شکر، ایثار و قربانی، بھائی چارگی و غم گساری وغیرہ انسانی صفات بھی ختم ہو جائیں اور انسان صرف ایک حیوان یا ایک خودکار مشین بن کر رہ جائے۔ کیا آپ کی عقل سلیم یہ گوارہ کرتی ہے کہ ایک گنوار و جاہل اور ایک یونیورسٹی کا اعلیٰ تعلیم یافتہ اجرت میں دونوں برابر ہوں۔ ایک انجینئر و ماہر ڈاکٹر اور ایک لیبر و رکشہ پولر اجرت میں برابر قرار دیے جائیں۔

اسلام کے نظام معاشیات میں مساوات نہیں مواسات ہے، اس میں مزدور کے مفادات کی نگہداشت کو سرمایہ دار کا دین بنا دیا۔ کاشتکار کے حقوق کی ادائیگی زمیندار کا مذہب قرار دیا گیا۔ مالدار، حاکم و محکوم، کاشت و زمیندار، مزدور و مالدار ہر طبقہ و ہر گروہ کے مفادات کو آپس میں ٹکرایا نہیں، بلکہ انسانیت کی بنیاد پر جملہ طبقات کے حقوق کی حفاظت کرتے ہوئے انھیں آپس میں جسم واحد کی طرح جوڑ دیا گیا۔ ارشاد باری ہے: ''**نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیوٰۃ الدنیا و رفعنا بعضھم فوق بعض درجٰت**

لیتخذ بعضهم بعضا سخریا" (زخرف:۳۲) (دنیوی زندگی میں ان کی روزی ہم نے تقسیم کر رکھی ہے اور (اس تقسیم میں) ہم نے ایک کو دوسرے پر رفعت دے رکھی ہے، تا کہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے)۔

الحاصل اللہ ربّ العزت نے اپنی حکمت بالغہ سے دنیا کا نظام ایسا بنایا ہے کہ یہاں ہر شخص اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے دوسرے کی امداد کا محتاج ہے اور تمام لوگ اسی باہمی احتیاج کے رشتے میں بندھے پورے معاشرے کی ضروریات کی تکمیل کر رہے ہیں۔ اس آیت نے یہ بات کھول کر بیان کر دی کہ اللہ تعالیٰ نے تقسیم معیشت کا کام اشتراکیت کی طرح کسی با اعتبار انسانی ادارے کے سپرد نہیں کیا، بلکہ یہ کام اپنے ہاتھ میں رکھا، بایں طور کہ ہر شخص کو دوسرے کا محتاج بنا کر دنیا کا نظام ہی ایسا بنا دیا ہے جس میں اگر اجارہ داریوں وغیرہ کے ذریعہ غیر فطری رکاوٹیں پیدا نہ کی جائیں تو خود بخود تمام مسائل حل ہو جائیں۔ قرآنی نظام نے ایک طرف تو شخصی ملکیت کا اتنا احترام کیا کہ ایک شخص کے مال کو اس کی جان کے برابر اور جان کو بیت اللہ کی حرمت کے برابر قرار دیا، اس پر کسی کے ناجائز تصرف کو شدت سے روکا۔ دوسری طرف جو ہاتھ ناجائز طور پر اس کی طرف بڑھا وہ کاٹ دیا گیا۔ تیسری طرف ایسے تمام دروازے بند کر دیے کہ قدرتی وسائل سے حاصل ہونے والی چیزوں پر کوئی خاص شخص یا جماعت قبضہ کر کے نہ بیٹھ جائے اور عوام کو محروم نہ کر دے۔

کسب و اکتساب کے مروّجہ طریقوں میں سود، سٹہ جوا ایسی چیزیں ہیں کہ ان کے ذریعہ دولت سمٹ کر چند افراد و اشخاص میں دائر ہو کر رہ جاتی ہے، ان سب کو حرام قرار دے کر تمام معاملات تجارت و کرایہ داری وغیرہ میں ان کی جڑ کاٹ دی اور جو دولت کسی شخص کے پاس جائز طریقوں سے جمع ہو، اس میں بھی غریبوں، فقیروں کے حقوق، زکوٰۃ، عشر، صدقۃ الفطر، کفارات وغیرہ مقررہ فرائض کی صورت میں اور اس سے زائد رضا کارانہ صورت میں قائم فرما دیے اور ان سب اخراجات کے بعد بھی جو کچھ انسان کے مرنے کے وقت باقی رہ گیا

اس کو ایک خاص حکیمانہ اصول کے مطابق تقسیم کر دیا کہ اس کا حق دار، اسی مرنے والے کے رشتہ داروں کو الاقرب فالاقرب کے اصول پر بنا دیا اور اس کو عام فقراء میں تقسیم کرنے کا قانون اسلیے نہ بنایا کہ ایسا ہوتا تو مرنے والا اپنے مرنے سے پہلے ہی اس کو جا و بے جا خرچ کر کے فارغ ہونے کی خواہش طبعی طور پر رکھتا، اپنے ہی خویش و اقارب کو ملتا دیکھ کر یہ داعیہ اس کے دل میں پرورش نہ پائے گا۔

یہ ہے مختصر انداز میں دنیا دارانہ نظام معیشت اور الٰہی نظام معیشت کی تفصیل۔ جس زمانے میں الٰہی نظام معیشت کو صحابہ کرام نے نافذ کیا تو جہاں حال یہ تھا کہ لوگ نان شبینہ کو ترستے تھے اور اب حال یہ ہو گیا تھا کہ لوگ مال و زکوٰۃ لے کر نکلتے کہ کوئی مستحق ملتا تو اسے دے دیتے مگر کوئی نہ ملتا۔ اس کے بالمقابل جب لوگوں نے سرمایہ دارانہ نظام یا اشتراکی نظام لاگو کرنا چاہا تو اس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ کس قدر غربت و افلاس کا دور دورہ ہے اسے بتلانے کی ضرورت نہیں۔ آج بھی اگر انسانیت فلاح و بہبود چاہتی ہے، غربت و افلاس سے نجات چاہتی ہے، عزت و ترقی چاہتی ہے تو اسے قرآنی نظام معیشت ہی کو اپنانا ہوگا، اسی کے بتلائے ہوئے طریقوں پر چل کر ہی دنیا و آخرت میں نجات حاصل کی جا سکتی ہے، اس کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں۔

والله يهدى السبيل.

☆☆

قرآن کریم اور عقیدۂ آخرت

● مولانا قمر عثمانی

قرآن کریم حق تعالیٰ جل شانہ کا کلام ہے، یہ سرچشمہ ہدایت ہے، سراپا نور ہے، دین اور دنیا کی فلاح اور کامیابی کا ضامن ہے۔ رحمتوں اور برکتوں کا حامل ہے، صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے۔ جملہ سعادتوں اور کرامتوں تمام فضیلتوں اور عظمتوں کا امین ہے۔ خیر اور بھلائی، ثواب اور حسن جزا کا موجب ہے۔ رضائے حق کے حصول کا وسیلہ ہے، قلب میں نورانیت پیدا کرنے والا اور روح میں سکون طمانیت پیدا کرنے والا ہے۔ حدیث شریف میں ارشاد ہے: ''تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن کریم سیکھے اور سکھائے۔''

ظاہر ہے کہ جب قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہونے کی وجہ سے سب سے افضل کلام ہے تو اس کا سیکھنے والا اور سکھانے والا بھی افضل ترین ہوگا۔ ایک بزرگ سہل تستریؒ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ جل شانہ سے محبت کی علامت یہ ہے کہ اس کے پاک کلام کی محبت قلب میں ہو۔ قرآن کریم کی فضیلت کے ذیل میں یہ بھی سمجھئے کہ قیامت کے ہولناک دن میں عرش کے سائے کے نیچے وہ لوگ بھی ہوں گے جو مسلمانوں کے بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیتے ہیں۔ قرآن وہ پاک کلام ہے جس کے ایک ایک حرف پر دس دس نیکیاں نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہیں۔ قرآن کریم کی تلاوت ناظرہ ہو یا حفظ، دونوں صورتوں میں بے انتہا اجر و ثواب کا مستحق بنا دیتی ہے۔ جو خوش نصیب قرآن کریم حفظ کر لیتا ہے اس کی فضیلت کا کیا ٹھکانہ۔

حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا کہ صاحب قرآن سے کہا جائے گا کہ قرآن شریف پڑھتا جا اور بہشت کے درجوں پر چڑھتا جا اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھتا تھا، بس تیرا مرتبہ وہی ہے جہاں آخری آیت پر پہنچے۔

اس حدیث شریف سے قرآن کریم اور تلاوت کرنے والے حافظ قرآن دونوں کی فضیلت اور عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ قرآن کریم ایک دستور حیات، اصول اخلاق اور راہ ہدایت کے لیے مشعل راہ اور ظاہر و باطن کی پاکیزگی کا پاکیزہ وسیلہ اور ذریعہ ہے۔ معرفت حق کا واسطہ ہے، طاعت و عبادت کا محرک ہے۔ انسانیت کے آداب اور شرافت کا آئینہ ہے۔ اس پاک کتاب میں سلیم الفطرت انسان کے لیے وہ سب کچھ ہے جو ابدی سعادتوں کے حصول کے لیے ضروری ہے۔ قرآن کریم میں توحید ایمان اور اعمال صالحہ کا تذکرہ بڑے اہتمام اور متعدد مواقع پر کیا گیا ہے، کیونکہ یہ چیزیں قرآن کا موضوع اصلی ہیں، ایمان اور اعمال صالحہ۔ اگر غور کیا جائے تو تمام تر فلاح و کامیابی کا ذریعہ بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا سبب بھی۔ ان ہی دو چیزوں کی بنیاد پر انسان بامراد اور کامیاب ہوتا ہے اور آخرت میں بلند درجات حاصل کرتا ہے جو واقعی اور اصلی کامیابی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہوگی کہ ایمان اور اعمال صالحہ آخرت کی کامیابی وہاں کی راحت اور سربلندی حاصل کرنے کا ایک وسیلہ اور واسطہ ہیں۔ مقصود اصلی یہی ہے کہ انجام کار آخرت کی کامرانی اور فلاح حاصل ہو جائے اور چونکہ آخرت ہی مقصود اصلی ہے اس لیے حق تعالیٰ جل شانہ نے کلام پاک میں متعدد مواقع پر مختلف انداز اور مختلف اسالیب میں آخرت کا ذکر فرمایا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ارشاد خداوندی ہے: ''اور اصل زندگی عالم آخرت ہے، اگر ان کو علم ہوتا تو ایسا نہ کرتے۔''

یہاں پر حق تعالیٰ نے دنیا کی زندگی کو کھیل اور تماشا قرار دیتے ہوئے اصل زندگی آخرت کو قرار دیا ہے، کیونکہ دنیا کی زندگی فانی ہے اور آخرت کی زندگی ابدی اور دائمی ہے

اور فانی کے مقابلے میں دائمی شئے یقیناً برتر اور فائق ہوگی۔ اس سے ملتا جلتا مضمون دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا، ارشاد ہے: (اے منکرو تم دنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو حالانکہ آخرت دنیا سے بدرجہا بہتر اور پائیدار ہے)۔

دونوں آیتوں میں یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ دنیا اور دنیا کی زندگی کے مقابلے میں بہرصورت اور بہرحال آخرت قابل ترجیح ہے۔ ایک اور موقع پر ارشاد ہے: ''جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو، ہم اس کو ترقی دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو تو اس کو ہم دنیا دے دیں گے اور آخرت میں ان کا کچھ حصہ نہیں۔'' اس آیت میں واضح طور سے آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتے ہوئے اس کو طلب کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے: ''جو شخص دنیا میں راہ نجات کے دیکھنے سے اندھا رہے گا وہ آخرت میں منزل نجات تک پہنچنے سے اندھا رہے گا، اور زیادہ گم کردہ راہ ہوگا۔''

اس آیت سے بالکل واضح ہو رہا ہے کہ آخرت میں نجات پانے کے لیے ضروری ہے کہ دنیا میں راہ نجات کو اختیار کیا جائے، اس پر چلا جائے اور اس سے چشم پوشی نہ کی جائے۔ اگر یہاں راہ نجات کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے غفلت اختیار کی تو یہ کوتاہی آخرت میں نجات کو ناممکن بنادے گی۔ اسی طرح ایک موقع پر ارشاد ہے: ''جس شخص نے آخرت کے ثواب کی نیت کی اور اس کے لیے جیسی سعی کرنی چاہیے تھی ویسی سعی کی، بشرطیکہ وہ مومن ہو سو ایسے لوگوں کی یہ سعی مقبول ہوگی۔'' اس آیت کے ذیل میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے فرمانے کے مطابق تصحیح نیت یعنی نیت کا صحیح ہونا، تصحیح عمل، یعنی عمل شریعت کے مطابق ہونا، تصحیح عقیدہ یعنی عقیدے کا صحیح ہونا تینوں چیزیں شامل ہوگئیں۔ کسی عمل کے عنداللہ مقبول ہونے کے لیے تینوں چیزیں ضروری ہیں۔ اگر ان میں سے ایک چیز بھی معدوم ہوگی تو بارگاہ الٰہی میں عمل مقبول نہیں ہوگا۔ تصحیح نیت پر **ومن اراد الآخرة** کا جملہ دلالت کر رہا ہے۔ تصحیح عمل پر ''**وسعی لها سعیها**'' (سورہ اسراء:) کی دلالت ہو رہی

ہے اور تصحیح عقیدہ پر **وھو مومن** کی دلالت ہو رہی ہے۔ مذکورہ آیت بوضاحت آخرت کی تقدیم اور ترجیح ثابت ہو رہی ہے۔

ان مذکورہ آیات کے علاوہ بھی دیگر مواقع پر آخرت اور اس سے متعلق ضروری باتیں ذکر کی گئی ہیں جس کی بنا پر بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم عقیدہ آخرت کو بنیادی اہمیت کی چیز قرار دیتا ہے اور اس کو بہت زیادہ لائق اعتنا تصور کرتا ہے۔ آخرت اور بعث بعد الموت کا تذکرہ قرآن کریم میں شدومد کے ساتھ اس وجہ سے بھی کیا گیا ہے کہ کفار اور منکرین قیامت کہا کرتے تھے: ''کیا ہم ہڈی اور چورا چور ہوجائیں گے، تو کیا ہم دوبارہ ازسرنو اٹھائے جائیں گے۔'' قرآن کریم نے ان کے فاسد عقیدے کو باطل قرار دیتے ہوئے پوری قوت کے ساتھ عقیدۂ آخرت کو ثابت کیا۔

اس موضوع پر اور بھی گفتگو کی گنجائش موجود ہے، لیکن بات کو مختصر کرتے ہوئے اور موضوع کو سمیٹتے ہوئے آخر میں یہ بات ضروری محسوس ہوتی ہے کہ پیدا ہونے والے ایک وہم کا ازالہ ہوجائے، وہ یہ کہ ذہن میں وسوسہ پیدا ہوسکتا ہے کہ جب دنیا اتنی حقیر اتنی ذلیل اور اتنی لائق اجتناب ہے تو اس کو پیدا کیوں کیا گیا، علائق دنیا کو انسان کے ساتھ وابستہ کیوں کیا گیا؟ حب دنیا کی مذمت میں حدیث شریف میں ارشاد ہے: ''دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے۔'' اس کے علاوہ اور مواقع پر بھی دنیا کی شناعت اور مذمت بیان کی گئی ہے، جس سے دنیا اور علائق دنیا کی بے حیثیتی بلکہ حقارت صاف ظاہر ہوتی ہے۔ اس اشکال اور وہم کا حل اور اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا کو حق تعالیٰ نے آخرت کی کامیابی اور منزل نجات کے حصول کا ایک ذریعہ اور وسیلہ بنایا ہے، بالفاظ دیگر یوں کہا جائے گا کہ دنیا دارالعمل ہے، اعمال صالحہ پر محنت کرنے کی جگہ اور ایک مہلت ہے اور آخرت دارالجزا، یعنی محنت کا نتیجہ اور ثمرہ حاصل ہونے کی جگہ ہے، یعنی محنت اور سعی یہاں ہوگی اور ثمرہ وہاں آخرت میں مرتب ہوگا، چنانچہ اس بات کی تائید اس حدیث شریف سے ہوتی ہے

جس میں فرمایا گیا ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے، محنت ایک وقت میں ہوتی اور اس کا ثمرہ دوسرے وقت میں مرتب ہوتا ہے۔ یہی حال اور یہی ترتیب دنیا اور آخرت کی بھی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ قرآن کریم بڑی قوت، بڑے اہتمام اور بڑے شدومد کے ساتھ عقیدۂ آخرت کو اپنا مقصود اصلی بنا کر بیان کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو فہم صحیح اور اعمال صحیحہ کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

☆☆

القرطبی کی الجامع لأحکام القرآن
(طریقۂ استفادہ)

● ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی

قرآن مجید اللہ ربّ العزت کی طرف سے پوری انسانیت کے لئے وہ نعمت غیر مترقبہ ہے جس کی تعلیمات آدمی کو انسان بنا دیتی ہیں اور تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتی ہیں۔ ضلالت و گمرہی کے قعر مذلت سے نکال کر رشد و ہدایت کی شاہراہ پر گامزن کر دیتی ہیں۔ اس کتاب عزیز کے احکام وفرامین ایک طرف آخرت کی ابدی اور سرمدی فوز وفلاح کے لئے توشۂ راہ فراہم کرنے کا خوگر بنا دیتے ہیں تو دوسری طرف ہر شعبۂ زندگی اور ہر ناحیہ عالم میں راہنما نقوش فراہم کرتے ہوئے جہاں بینی اور جہاں بانی کے قیمتی اسباق بھی فراہم کرتے ہیں۔ قرآن مجید دین اسلام کا شک و ریب سے پاک ومستند، محفوظ و مامون اور سراپا ممدوح ومبارک منشور ہے، جسے سراپا نور و ہدایت، فیصل وفرقان اور شرح و بیان کی حیثیت حاصل ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہیں ہوگا کہ یہ ہادی بھی ہے، مرشد بھی، مؤدب بھی ہے اور معلم بھی، منذر بھی ہے اور مبشر بھی، مصلح بھی ہے اور مقوم بھی، محسن بھی ہے مبین بھی، نیز مجمل بھی ہے اور مفصل بھی۔

چوں کہ قرآن مجید آفاقی مذہب کا آفاقی ضابطہ زندگی ہے، اس لئے اس کی دینی عظمت اور شرعی حیثیت کی ترجمانی وتفسیر کو اعزاز وتکریم اور شرف وسعادت کا ذریعہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قرآنی عظمت کے اس پہلو کو عہد نبوی سے

ہی موضوع بحث بنایا گیا اور ترجمہ وتفسیر کے مقدس فریضے کی انجام دہی کا یہ مبارک اور لامتناہی سلسلہ چل پڑا۔

چوں کہ قرآن مجید اللہ ربّ العزت کا عطا فرمودہ ضابطہ زندگی ہے، یہیں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ کتاب اپنے جلو میں ایسی آیات لئے نازل ہوئی جو فقہی احکام پر مشتمل تھیں، چونکہ یہ احکام فلاح دنیوی اور سعادت اخروی دونوں کے حصول کے لئے ضمانت کے طور پر تھے اور ان کی یہی حیثیت قیامت تک رہے گی، اس لئے اس سے وابستگی کو ایمان وایقان کا جزو لاینفک قرار دیا جاتا رہا ہے اور یہ مقدس رشتہ انشاء اللہ العزیز قیامت تک برقرار رہے گا۔ چونکہ رسالت مآب ﷺ کے عہد مبارک کی زبان عربی تھی، اس لئے وہ فہم لغت کی دشواریوں سے مبرا تھے اور بآسانی آیات بینات سے مترشح ہونے والے احکام پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ ہاں اگر بعض امور ومسائل کے فہم وادراک میں غموض وابہام ہوتا تو بلاتردّد رسول اکرم ﷺ کی طرف رجوع کرتے اور مطلوبہ امور ومسائل میں استفسار کرتے ہوئے اپنے آپ کو مطمئن کرتے۔

سرور کائنات ﷺ کے وصال کے بعد صحابہ کرام بعض ایسے مسائل ومعاملات سے دوچار ہوئے جن کا شریعت کی روشنی میں حل مطلوب تھا، چنانچہ اس غایت منشورہ کے حصول کی راہ میں سب سے پہلے کتاب اللہ کی طرف توجہ مبذول کی، اس کے بعد مسائل کی عقدہ کشائی کے لئے قرآن مجید کی مستند شرح، یعنی سنت رسول کی طرف رجوع کیا اور سنت رسول بھی اگر کسی مخصوص ومتعین مسئلہ میں کافی وشافی حل فراہم نہیں کرتی تو اجتہاد کی روش پر گامزن رہتے ہوئے قرآن وسنت کی روشنی میں حل کے لئے کوشاں رہے، چنانچہ عہد نبوت سے لے کر فقہی مسالک ومکاتب کے قیام تک اور پھر ظہور تقلید کے بعد تک تفسیری ادب کا کارواں قرآن کے مطلوب ومقصود معانی واحکام تک رسائی کے لئے سرگرم عمل رہا۔

علماء، صوفیہ، فلاسفہ اور فقہاء کے ذریعہ بلاشبہ تفاسیر قرآن کا ایک قیمتی اثاثہ منظر عام پر

آیا۔ باضابطہ تفاسیر کے علاوہ قرآن مجید کے مخصوص اور متعین مباحث پر جداگانہ اور مستقل تصانیف کا سلسلہ بھی علم وفن کے عباسی عہد زرّیں میں دراز ہوتا نظر آتا ہے۔ بعض نے اگر مسائل فقہیہ پر بحث مرکوز کی تو بعض نے اسباب نزول پر کتابیں لکھیں، کسی نے صرف غیر زبانوں کے الفاظ کو جمع کیا تو کسی نے امثال قرآنی پر توجہ کی اور بعض نے آیات مکررہ کے نکات ومصلحتیں بیان کیں۔ قرآن پاک کی باضابطہ تفاسیر کے علاوہ قرآن کے مخصوص مباحث وموضوعات پر جو گراں قدر سرمایے زیور طبع سے آراستہ ہوئے انھیں فقہی، تاریخی، ادبی، نحوی، لغوی اور کلامی اقسام پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ائمہ اربعہ کے دور تک فقہی تفسیر میں یہ صحت منداور خوش گوار روایت برقرار رہی کہ تعصب وتنگ نظری کے حصار میں گھرنے کے بجائے انھوں نے نئے پیدا شدہ احوال وکوائف میں ابھرتے ہوئے مسائل ومعاملات کو کتاب وسنت کی روشنی میں دیکھا اور ان کے حل کی صورتیں نکالیں۔ اگرچہ دلائل وبراہین کی روشنی میں بعض فیصلے متفقہ ہوتے تو بعض مختلف، تاہم فیصلوں میں اختلاف کے باوجود تعصب وہٹ دھرمی کا نام ونشان نہیں ملتا۔ ہاں ظہور تقلید کے بعد متعصب اور غیر متعصب مقلدین کی جماعت سامنے آئی جس کی بنا پر تفسیر قرآن کے دو مختلف مناہج سامنے آئے۔ اس کے باوجود اس امر میں صداقت یہ ہے کہ عصر تدوین سے قبل فقہاء مفسرین کی باضابطہ قابل قدر کوششوں کا سراغ نہیں ملتا، بجز اس کے کہ فقہائے صحابہ وتابعین سے کچھ تفسیری اقوال منقول ہیں۔ ہاں عصر تدوین کے بعد فقہاء حضرات نے مذاہب ومسالک کے اختلاف کے باوجود قرآن مجید کی فقہی تفسیر میں بہت سی کتابیں مرتب کی ہیں۔ اس جہت کی تفسیری کاوشوں میں ابوعبداللہ قرطبی کی ''الجامع لاحکام القرآن'' کو بڑا نمایاں مقام حاصل ہے۔

آپ کا نام نامی ابوعبداللہ محمد بن احمد انصاری خزرجی اندلسی قرطبی ہے۔ دنیائے علم وفضل میں قرطبی کے نام سے معروف ومشہور ہیں۔ آپ بڑے عالم وفاضل اور عابد شب

زندہ دار تھے۔آپ متقی و پرہیزگار اور تکلّفات و رسمیات سے کوسوں دور رہتے تھے۔اعلیٰ درجے کی سادگی ان کا طرۂ امتیاز تھا۔اوقات کے استعمال کے لحاظ سے بڑے سنجیدہ تھے یا تو عبادت اور توجہ الی اللہ میں وقت صرف کرتے یا تالیف وتصنیف کو اپنا معمول بناتے۔مشہور محدث ابوعلی حسن بن محمد البکری اور دیگر علماء عظام سے حدیث کا درس لیا۔آخر زمانے میں سرزمین مصر میں آپ نے کوچ کیا اور وہیں ماہ شوال ۶۷۱ ہجری میں اپنی جان جانِ آفریں کے حوالے کی۔آپ کی گراں بہا اور مایۂ ناز تصنیفات میں ''**الجامع لأحکام القرآن** کے علاوہ **شرح اسماء اللہ الحسنیٰ**، **کتاب التذکار فی افضل الاذکار**، **التذکرۃ بامور الآخرۃ**، **کتاب شرح التقضی** اور **قمع الحرص بالزھد و القناعۃ**'' قابل ذکر ہیں۔

قرطبی کی الجامع لاحکام القرآن کا شمار تفسیر کی انتہائی اعلیٰ درجے کی کتب میں ہوتا ہے۔قرطبی کی مندرجہ ذیل عبارت اس کارِعظیم کا محرک خاص متعین کرتی ہے جس کی روشنی میں قرطبی کے اخلاص وتقویٰ کی جلوہ گری ہوتی ہے۔

''**فلما کان کتاب اللّٰہ ھو الکفیل بجمیع علوم الشرع، الذی استقلَّ بالسنّۃ والفرض، ونزل بہ امین السماء الیٰ امین الأرض رأیت ان اشتغل بہ مدی عمری، وانشغرغ فیہ منتی**''. (جب اللہ کی کتاب تمام شرعی علوم کی ضامن ہے اور اسے آسمان کا امین، زمین کے امین پر لے کر اترا ہے تو ہم نے یہ مناسب سمجھا کہ میں اپنی زندگی کو اس کتاب میں لگا اور اس میں اپنی پوری قوت کو جھونک دوں)۔

اس تفسیر کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے حد درجے کی یکسوئی والتفات اور سعی بلیغ کا سرمایہ لٹایا ہے۔یہ چیزیں مؤلف کے مباحث میں عمق نظر، قرآن فہمی اور شرعی علوم کے ساتھ زبان و ادب اور بلاغت پر قدرت تامہ کی دلیلیں بنتی ہیں۔یہ سارے اوصاف اس وقت دعوت ملاحظہ دے رہے ہوتے ہیں جب مؤلف آیات کریمہ کے نصوص

سے احکام شرعیہ کا استنباط کر رہے ہوتے ہیں، یہاں تک کہ اس تفسیر کے قاری یا مخاطب کو شرعی احکام ومسائل میں فقیہ کی دیگر کتب سے بے نیازی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

قرطبی اپنی اس تفسیر میں اسباب نزول، اقسام قرأت اور اعراب سے تعرض کرتے ہیں، اس کے ساتھ ہی ساتھ قرآن مجید کے غریب الفاظ پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اور اپنے موقف و مدعا کی وضاحت میں اکثر و بیشتر لغات کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اشعار عرب کو بھی بطور استنباط حوالہ قارئین کرتے ہیں۔

مؤلف کو یہ احساس تھا کہ فقہ وتفسیر کی بیشتر کتب میں جو احادیث نبویہ وارد ہوتی ہیں بغیر سند وروایت کے حوالے سے ہوتی ہیں، اس لئے استنباط واستدلال کے صحیح طور پر مفید اور نفع بخش ہونے کا پہلو پوری طرح واضح نہیں ہوتا ہے۔اسی طرح اقوال کو ان کے قائلین کی طرف منسوب نہ کرنے کی روایت کا بھی مؤلف محترم کو شدت سے احساس تھا۔اس سلسلے میں آپ کا موقف یہ تھا کہ علم سے کما حقہ اس وقت تک استفادہ نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اقوال یا افکار کا ان کے قائلین کی طرف انتساب نہ ہو، چنانچہ انھوں نے اقوال کو ان کے قائلین کی طرف اور احادیث نبویہ کو راویوں کی وضاحت کے ساتھ ان کے جامعین و مؤلفین کی طرف منسوب کر دیا ہے تاکہ پورے طور پر ان احکام سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

قرطبی اپنی تفسیر میں معتزلہ، قدریہ، شیعہ اور غالی صوفیاء کے افکار وعقائد پر جرح کرتے نظر آتے ہیں اور ابطال وتردید کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔قرآنی آیات جو احکام پر مشتمل ہوتی ہیں، مؤلف موصوف تھوڑا یا زیادہ تعلق رکھنے والے احکام اور ان کے دلائل وبراہین کو تفصیل سے واضح کرتے ہیں۔

قرطبی کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ فقہ کے مالکی مکتبہ فکر سے وابستہ ہونے کے باوجود تعصب وتنگ نظری یا تقلید محض اور بے جا حمایت سے پاک تھے۔دلیل وبرہان آپ کا بہت بڑا سرمایہ تھا، اس لئے آپ بعض بڑے مسائل میں امام مالک سے زیادہ دوسرے ائمہ

کی آراء کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

تفسیر قرطبی کا علمی مقام و مرتبہ کیا ہے، اسے علماء زبان و ادب اور مؤرخین کے تاثرات قلبی کی روشنی میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے: ا۔ علامہ ذہبی کے بقول قرطبی کی عظیم الشان تفسیر کے نشان راہ پر مفسرین کا ایک قافلہ رواں دواں ہے۔ وہ اپنے معنی و مفہوم اور مقصد و غایت میں کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔

زبان و ادب، علم و فضل اور تاریخ و ثقافت کے باذوق ماہر علامہ ابن خلدون کے بقول قرطبی ابن عطیہ الاندلسی کے شانہ بشانہ چلتے نظر آتے ہیں، بلکہ یہ ان خصوصیات سے مزین اور آراستہ ہیں جو علماء کرام میں قرطبی کے قد کو بڑھا دیتی ہیں۔

الصفدی تفسیر القرطبی کی بابت اپنا یہ تاثر حوالہ ناظرین کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ امام قرطبی مشہور و معروف تفسیر کے مؤلف ہیں۔ تفسیر کے فن میں یہ قدر و منزلت کی حامل ہے۔ اس تفسیر کے نقوش راہ پر ایک کارواں چل پڑا ہے۔

ابن فرحون تفسیر القرطبی کے سلسلے میں رطب اللسان ہیں کہ اس تفسیر کا شمار عظیم الشان تفاسیر میں ہوتا ہے اور ان سب میں زیادہ نفع بخش ہے، چنانچہ انھوں نے قصص و تواریخ سے گریز کرتے ہوئے احکام قرآن کو مرکزی حیثیت دی ہے۔

المقری قرطبی اور ان کی تفسیر کی شان میں گویا ہیں کہ قرطبی علم و فضل کے لحاظ سے طویل القامت شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی تصانیف علم کی گیرائی و گہرائی سے مزین و آراستہ ہیں اور ان تصانیف میں آپ کی شہرت یافتہ تفسیر تفسیر قرطبی ہے جو ۲۲ جلدوں پر مشتمل ہے اور جو اپنے موضوع و مقصد کے لحاظ سے بڑی بلندی پر متمکن ہے۔

راقم کے پیش نظر بیروت سے شائع شدہ تفسیر القرطبی کا پہلا ایڈیشن ہے جو ۱۹۹۵ء میں دلکش اور جاذب نظر صورت میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ پہلی جلد میں ناشر کی طرف سے تمہیدی کلمات ہیں پھر عبدالعلیم البردونی کا وہ مقدمہ اس کی زینت بنتا ہے جو مصر سے شائع

شدہ دوسرے ایڈیشن میں پہلے سے موجود ہے۔ اس کے بعد مؤلف کا خود اپنا مقدمہ ہے جس میں قرآن پاک کی عظمت، قرآن پاک سے تعلق رکھنے والوں کی فضیلت، خیر امت اور امت وسط ہونے کے لحاظ سے قرآنی تعلیمات کی تفسیر و تبیین کی اہمیت جیسے موضوعات کو مؤلف نے قرآن و سنت کی روشنی میں واشگاف کیا ہے۔ ان وضاحتوں کے بعد تفسیر میں اپنے طریقۂ کار اور تفسیر کے مقدس عمل سے اپنا رشتہ استوار کرنے کی ضرورت و مصلحت کی نشان دہی فرمائی ہے اور اپنے منفرد منہج تفسیر کو یوں بیان فرمایا ہے:

وشرطی فی ھٰذا الکتاب: اضافة الاقوال الی قائلیھا والاحادیث الی مصنّفیھا، فانه یقال: من برکة العلم ان یضاف القول الی قائله وکثیراً ما یجیء الحدیث فی کتاب الفقه والتفسیر مبھماً لایعرف من اخرجه الا من اطّلع علی کتب الحدیث، فیبقی من لاخبرة له بذلک حائداً. لایعرف الصحیح من السقیم، ومعرفة ذلک علم جسیم فلا یقبل منه الاحتجاج به ولا الاستدلال.

''اس کتاب کی تالیف میں میں نے اس شرط کا التزام کیا ہے کہ اقوال کو ان کے قائلین کی طرف اور احادیث کو جامعین و مؤلفین کی طرف منسوب کر دیا جائے، کیونکہ یہ مقولہ ہے کہ علم کی برکت میں یہ ہے کہ قول کو ان کے قائل کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ فقہ و تفسیر کی کتابوں میں جو بیشتر احادیث وارد ہوئی ہیں وہ مبہم ہیں۔ حدیث کی کتابوں کا ہر شخص ہی جان سکتا ہے کہ کس نے ان کی تخریج کی ہے۔ پس جسے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہے وہ حیران رہتا ہے اور صحیح و سقیم سے ناآشنا ہوتا ہے، حالانکہ اس کی معرفت علم کثیر سے ہی ہو سکتی ہے۔ پس ایسے شخص کی کوئی حجت و دلیل قبول نہیں کی جا سکتی۔''

تمہید و تقدیم کے بعد قرآن مجید کی فضیلت اور اس سے تعلق خاطر کے باب میں، قرآن مجید اور احادیث نبویہ کی روشنی میں، تاکید و تلقین اور ترغیب و ترہیب، کتاب اللہ کی

تلاوت کے آداب، اہل قرآن اور اہل علم کا ریا کاری سے اجتناب، صاحب قرآن کو اپنے آپ کو کن باتوں کا عادی بنالینا چاہئے، اعراب قرآن کی اہمیت وفضیلت، قرآن پاک کی تفسیر اور مفسرین کے بارے میں فضائل، حامل قرآن کا مقام ومرتبہ اور وہ کون لوگ ہیں، تفسیر بالرائے پر وعیدیں، قرآن مجید کی تفسیر وتبیین میں سنت کی حیثیت، کتاب اللہ سے اخذ واستفادہ کیسے کیا جائے، قرأۃ سبعہ کی حقیقت، قرآن پاک کی جمع وتدوین اور زمانہ نبوت میں حفاظ صحابہ کرام، قرآنی سور وآیات کی ترتیب اور موجودہ کتابی شکل میں آنے سے متعلق تفصیلات، سورت، آیت، کلمہ اور حرف کے معانی کی وضاحت، کیا قرآن مجید میں عربی زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان کے الفاظ آگئے ہیں، اعجاز القرآن، معجزہ کے شرائط، قرآنی سورتوں کی فضیلت سے متعلق موضوع احادیث پر تنبیہ، قرآن پر انگشت نمائی کرنے والوں کے رد میں دلائل، استعاذہ اور بسملہ کے باب میں، ان سب موضوعات پر قرطبی نے آغاز تفسیر سے قبل قرآن وسنت کی روشنی میں گفتگو کی ہے، جو واقعی تفسیر کے طلبہ کے لئے نقوش راہ ثابت ہوئے ہیں۔

قرطبی حریت فکر ونظر کے علم بردار ہیں۔ اگر کسی پر نقد وجرح کرتے ہیں تو اس میں اعتدال پسندی ان کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ غلط، ناجائز اور خلاف شان امور میں سمجھوتہ نہیں کرتے اور سچائی کو جرأت مندی کے ساتھ فاضلانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں قرآن مجید، سنت نبوی، آثار صحابہ کو بترتیب پیش نظر رکھتے ہیں۔ لغوی مشکلات کی عقدہ کشائی میں کلام عرب سے استشہاد کرتے ہیں، تاکہ معانی ومفاہیم اپنی روح کے ساتھ جلوہ گر ہوجائیں، چونکہ قرآن مجید کی تعلیمات اور اس کے احکام دین ودنیا دونوں کی سعادت و خوش بختی کے ضامن ہیں اور بلاشبہ یہی درخشاں پہلو تفسیر کے میدان میں قرطبی کی معرکہ آرائی کا محرک خاص بنتا ہے۔ حکمت عملی، علمی بصیرت، عالمانہ شان، حریت فکر اور حق گوئی کی جرأت و بیبا کی یہ سب خصوصیات شروع سے آخر تک قرطبی کی تفسیر میں نمایاں ہوتی

ہیں۔ بطور نمونہ چند آیات کریمہ کی تفسیر وتوضیح ملاحظہ کی جائے جن کی روشنی میں ایک طرف تقلید سے آزاد قرطبی کا ذہن وفکر عیاں ہوتا ہے تو دوسری طرف عمق فکر ونظر اور وسعت مطالعہ کی حقیقت ظاہر وباہر ہے۔ یہ آیت کریمہ ملاحظہ ہو:

''واقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وارکعوا مع الراکعین'' (البقرہ:۴۳)۔

اقامت صلوٰۃ کا اصل مفہوم کیا ہے؟ زکوٰۃ کی حقیقت کیا ہے اور اس کے متشقات کیا ہیں اور کن کن معنوں میں یہ لفظ مستعمل ہے؟ اس آیت کریمہ میں زکوٰۃ مفروضہ مراد ہے یا صدقۃ الفطر؟ رکوع کے لفظی اور اصطلاحی معنی کیا ہیں؟ رکوع کی تخصیص میں جو اختلافات واقع ہوئے ہیں، ان کی اصلیت کیا ہے اور صحیح ترین مسلک کیا ہے؟ رکوع شرعی کی حیثیت کیا ہے؟ رکوع قرآن وسنت کی روشنی میں فرض ہے۔ سجدہ کس طرح کیا جائے؟ اس سلسلے میں جو اختلافات ہیں ان میں مناسب ترین مسلک کیا ہے؟ مع الراکعین میں کیا ''مع'' معیت اور جماعت کا مقتضی ہے اور اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ امامت کا مستحق کون ہے؟ بچے کی امامت کا کیا حکم ہے؟ اسی طرح کے تقریباً چونتیس اہم مسائل اس آیت کریمہ سے متعلق قرطبی نے چھیڑے ہیں اور بڑی شافی گفتگو کی ہے۔

قرطبی کی یہ خوبی کہ فقہ کے مالکی مسلک سے وابستہ ہونے کے باوجود تعصب وتنگ نظری سے پاک تھے، ان کا یہ وصف ان کی تفسیر میں جابجا نظر آتا ہے۔ زیر بحث آیت کریمہ میں امامت صغیر سے متعلق قرطبی کی گفتگو بہت معنی خیز ہے اور اس میں ان کی بالغ النظری اور تقلید سے آزاد ذہن وفکر واضح ہے۔ سب سے پہلے زیر بحث مسئلہ سے متعلق جواز وعدم جواز کی بابت مانعین ومجوزین کے اقوال کا استقصاء کرتے ہیں۔ مانعین میں امام مالک، سفیان ثوری اور اصحاب الرائے شامل ہیں، لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ مؤلف نے دلیل وبرہان کی روشنی میں بڑی جرأت مندی کے ساتھ اور عالمانہ انداز میں اپنے امام امام مالک کے مسلک سے اختلاف کیا ہے۔ نابالغ کی امامت کے جواز کی توجیہ

میں قرطبی رقم کرتے ہیں:

''نابالغ کی امامت جائز ہے بشرطیکہ وہ قرآن مجید پڑھے ہوا ہو۔ صحیح بخاری میں حضرت عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میرا خاندان پانی کے ایک چشمہ کے قریب سکونت پذیر تھا۔ لوگ وہاں سے گزرتے تھے اور ہم ان سے نبی کریم ﷺ کے بارے میں معلوم کرتے رہتے تھے۔ وہ ہمیں یہ بتاتے تھے کہ اس کا یقین ہے کہ اللہ نے اُسے رسول بنایا ہے اور اس پر فلاں فلاں وحی نازل کی ہے۔ میں اُسے یاد کرلیا کرتا تھا یہاں تک کہ وہ میرے دل میں بس جاتا تھا۔ پس عرب کے عام لوگ یہ کہتے تھے کہ اگر نبوت کا یہ مدعی اپنی قوم پر غلبہ پا گیا تب تو اسے سچا جانو اور اگر ایسا نہیں ہے تو اُسے اور اس کی قوم کو نظر انداز کرو۔ جب فتح مکہ ہوئی تو لوگوں نے اسلام قبول کرنے میں تیزی دکھائی، چنانچہ میری قوم میں سے میرے والد باقی لوگوں سے پہلے مشرف با اسلام ہوئے۔ جب والد آئے تو کہنے لگے کہ میں نبی صادق کے یہاں سے آیا ہوں۔ آپ نے نمازوں کے اوقات بتائے اور فرمایا کہ جب نماز کا وقت ہو جائے تو تم میں سے کوئی اذان کہے اور تم میں سے جو شخص زیادہ قرآن پڑھے ہوا ہو وہ امامت کرے۔ ایسے شخص کو تلاش کیا گیا، لیکن میرے علاوہ کوئی بھی ایسا شخص نہیں تھا جو مجھ سے زیادہ قرآن پڑھے ہوا ہو، اس لئے کہ میں آنے جانے والوں سے سن کر قرآن مجید یاد کرلیا کرتا تھا۔ میری عمر چھ یا سات برس کی تھی۔ انھوں نے مجھے امامت کے لئے آگے بڑھا دیا۔ میرے جسم پر ایک ہی چادر تھی، چنانچہ جب سجدہ کرتا تو چادر جسم سے گر جاتی۔ قبیلے کی ایک عورت معترض ہوئی اور کہا کہ امام کی ستر پوشی کا تو اہتمام کیجئے، چنانچہ اہل قبیلہ نے میرے لئے کپڑا خریدا اور ایک قمیص بنوادی۔ قمیص کو دیکھ کر جتنی مجھے خوشی ہوئی اتنی خوشی کبھی نہیں ہوئی تھی۔

قرطبی کے تبحر علمی، قرآن وسنت پر گہری بصیرت، تقلید بے جا سے دوری اور دیانت دارانہ شخصیت سے روشناس ہونے کے لئے ایک آیت کریمہ سے متعلق قرطبی کی وضاحت

ملاحظہ فرمائیے:

''شهر رمضان الذی اُنزل فیه القرآن''۔ (سورہ بقرہ: آیت نمبر۔۱۸۵)
(رمضان کا مہینہ جس میں قرآن کریم نازل کیا گیا)۔

اس آیت کریمہ کے تحت قرطبی نے بعض اہم مسائل پر بحث کی ہے جن میں ایک اہم مسئلہ عیدالفطر کی نماز سے متعلق ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں مؤلف نے اس مسئلے میں علماء کرام کا اختلاف نقل کیا ہے کہ آیا عیدالفطر کی نماز دوسرے دن ادا کی جاسکتی ہے یا نہیں۔ ابن عبدالبر نے امام مالک اور ان کے اصحاب وتلامذہ سے یہ نقل کیا ہے کہ عید کی نماز صرف عید ہی کے دن ادا کی جاسکتی ہے۔ اگر عید کی نماز کے اصل وقت کے گزر جانے کے بعد بھی ادا کی جاسکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ فرائض کی طرح ہے، اس لئے کہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سنتوں کی قضا نہیں ہوتی اور ظاہر ہے کہ عید کی نماز سنت ہے۔ قرطبی ابن عبدالبر کے مذکورہ بالا موقف ومسلک پر اعتراض وارد کرتے ہیں اور اپنے اس مسلک کو عالمانہ انداز میں پیش کرتے ہیں کہ دوسرے روز عید کی نماز ادا کرنا جائز ودرست اور حدیث نبوی کے عین مطابق ہے۔ آپ کی دلیل یہ ہے کہ اگرچہ بالعموم سنتوں کی قضا نہیں ہوتی، تاہم شارع ان میں سے بعض سنتوں کو مستثنیات میں شامل کرکے قضا کا حکم دے سکتے ہیں۔ دلیل کے طور پر ترمذی میں حضرت ابوہریرہ کی روایت کردہ حدیث کو پیش کرتے ہیں، جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے نماز فجر کی دوسنتیں نہ پڑھی ہوں وہ طلوع آفتاب کے بعد ان کو ادا کرے۔ ایک دوسری معقول دلیل بھی قرطبی پیش کرتے ہیں اور وہ یہ کہ عید کی نماز دوسرے روز ادا کرنے کی اجازت اس لئے بھی ہونی چاہئے کہ یہ سال بھر میں ایک بار ادا کی جاتی ہے۔ تیسری دلیل کے طور پر سنن نسائی کی وہ روایت پیش کی ہے جس میں یہ مذکور ہے کہ چند لوگوں نے عید کا چاند دیکھا اور بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر اس کی شہادت دی۔ اس وقت دن کا کافی حصہ گزر چکا تھا، اس لئے آپ ﷺ نے انہیں افطار

کرنے کا حکم دیا اور پھر فرمایا کہ عید کی نماز اگلے روز ادا کریں۔

سرچشمہ ہدایت قرآن مجید ہو یا احادیث نبویہ یا پھر فکر و تدبر اور علم وفن کے لحاظ سے کوئی اور وقیع سرمایہ ان سب سے استفادہ کی جو اوّلین شرط ہے وہ یہ کہ قاری یا ناظر اخلاص وتقویٰ کی اوّلین صفت سے آراستہ ہو۔ اس صفت عالیہ کی حکمرانی جب اس کے قلب و ذہن پر ہوگی تو بلاشبہ اس کے حق میں نوازشوں کا ظہور ہوگا اور اخلاص کا یہی سرمایہ توشہ آخرت بھی قرار پائے گا۔ قرآن مجید بلاشک وریب مستند ضابطہ زندگی، نور ہدایت اور چشمہ صافی ہے، اس کے لعل و گہر اس وقت تک ہاتھ نہیں آسکتے جب تک کہ اپنے قلب و ذہن پر للّٰہیت طاری نہ کرلی جائے۔ اس وصف کے ساتھ ہی تفسیری کاوشوں کے ساتھ ہی ساتھ قرطبی کے اس عظیم الشان تفسیری کارنامے سے مستفید و مستفیض ہوا جاسکتا ہے اور طلبہ کو کتاب اللہ کی روح تک پہنچانے میں کامیابی کی کلید ہاتھ آسکتی ہے۔

طلب صادق دوسری شرط ہے، جس کے بغیر کوئی چھوٹی یا بڑی چیز حاصل نہیں کی جاسکتی اور اگر بادل نخواستہ کسی کو اگر کوئی چیز ہاتھ لگ جاتی ہے تو پھر اس کی قدر و قیمت اس کی نگاہ میں نہیں ہوتی ہے، بالآخر اُسے محرومی اور شومی قسمت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ قرآن پاک بلاشبہ کتاب ہدایت ہے جو تمام انسانوں کے لئے اور قیامت تک کے لئے قطع و برید اور حذف واضافہ سے پاک ہے، لیکن طلب وجستجو کے بغیر اس کتاب ہدایت سے بھی فیض نہیں حاصل کیا جاسکتا۔ قرآن مجید میں جابجا اس صداقت واصول کی صدائے بازگشت سنی جاسکتی ہے۔ طلب صادق اور جستجوئے کامل کا اصول کسی بھی علمی سرمایے سے استفادہ کی راہیں ہموار ہی نہیں کرتا بلکہ ایسے طالبین علم و ہدایت کی زندگیوں پر مثبت اور خوشگوار نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

تعصب وتقلید بے جا سے گریز واجتناب بھی حقائق ومعارف سے کما حقہ آگہی اور ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کے لئے ناگزیر شرط قرار پاتی ہے۔ قرآن مجید کا ایک ادنیٰ

طالب علم بھی رشد و ہدایت کے باب میں قرآن کے اصول کی کارفرمائی کو ملاحظہ کرسکتا ہے کہ یہ وہ مرض ہے جو انسان کو ظاہری اور معنوی دونوں لحاظ سے کھوکھلا بنا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے زمانہ نزول کے مخاطبین سے قرآن بار بار تعصب وتنگ نظری اور تقلید وآباء پرستی کا قلع قمع کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اس کے بالمقابل وسعت ظرفی اور حریت فکر کی صدائیں بلند کرتا ہے تاکہ ضلالت و گمرہی کے قعر عمیق سے نکال کر رشد و ہدایت کی عظیم ترین اور مؤقر شاہراہ پر گامزن کردے۔ آج کا یہ المیہ ہے کہ مدارس دینیہ جو دین اسلام کے محفوظ و مامون قلعے ہیں اور جہاں کم وبیش قرآن مجید کی تعلیم وتدریس کو لازمی مضمون کی حیثیت حاصل ہے، گروہی تعصب اور مسلکی تصادم کے شکار ہیں۔ اتحاد واتفاق کا شیرازہ بکھرتا نظر آرہا ہے۔ اسلام اور قرآن مجید کا علم بلند کرنے والی امت مسلمہ کے جیالے اپنے اپنے مسالک نظر اور مکاتب فکر وخیال کی حفاظت واشاعت میں سرگرداں ہیں اور ''**کل حزب بما لدیه فرحون**'' کے نادیدنی حالات سے مجموعی طور پر پوری امت دوچار ہے، حالانکہ امت کے ہر طبقہ کے ہر فرد کا ایک اللہ پر، رسول پر اور آخرت پر ایمان ہے، قرآن پر بھی ایمان ہے اور حدیث پر بھی ایمان ہے اور اس امت کا ہر گروہ غلبہ دین کے قرآنی مشن و مقصد سے پوری طرح متحد ومتفق ہے، لیکن گروہوں اور جتھوں میں بٹ کر، تعصب وتقلید جامد کے حصار میں ہوتے ہوئے اور اپنے فکر وخیال اور منہج وموقف کی وکالت کرتے ہوئے افراد امت داعی امت کی شناخت کھو چکے ہیں اور ہر گروہ ایک دوسرے کے لئے ناقابل برداشت وجود بن گیا ہے۔ ایسے قلق انگیز اور شرمناک حالات میں قرآن مجید کے دیے گئے پیغام حریت فکر ونظر کو حرز جاں بنائے جانے کی ضرورت اور بڑھ جاتی ہے۔ قرطبی کی تفسیر الجامع لاحکام القرآن حریت فکر کی عملی ترجمان ہے۔ مؤلف نے قرآنی آیات، احادیث نبویہ اور اشعار عرب کی مدد سے وسعت ظرفی اور آزادئ فکر ونظر کے ساتھ علم کے جو بیش قیمت موتی بکھیرے ہیں ان سے اخذ واستفادہ بھی اسی صورت میں ممکن ہے کہ رواداری

اور کشادہ قلبی کے ساتھ ''الحکمۃ ضالۃ المؤمن'' کو نقوش راہ بناتے ہوئے اس گراں بہا سرمایۂ قرآن فہمی کی طرف رجوع کیا جائے۔

اسلام چونکہ قولی سے زیادہ عملی مذہب ہے۔ آزادیٔ فکر ونظر اور وسعت ظرفی کا نقش طلبہ کے اذہان وقلوب پر بھی اُسی وقت قائم ہوسکتا ہے جبکہ اساتذۂ کرام اور مدارس کے منتظمین حضرات اپنی عملی سرگرمیوں میں، دوسرے مسالک ومکاتب کے علم برداروں سے مناقشوں اور مباحثوں میں آزادیٔ فکر کے اس قرآنی نظریے کو عملی تطبیق دینے میں کوشاں و سرگرم عمل ہوں، بصورتِ دیگر صرف فکر کے پیامی بن کر دوسری شخصیات سے یا دوسروں کی وقیع علمی خدمات سے استفادہ کے لئے طلبہ کے ذہن وفکر کو سازگار نہیں بنایا جاسکتا اور اس طرح قرآنیات کے قابل قدر علمی ذخیروں سے طلبہ کی بے اعتنائی اور بڑھتی جائے گی۔

قرآن مجید چونکہ مذہب اسلام کا منشور اور دستور زندگی ہے۔ اس جہت سے وہ احکام وہدایات اس کتاب عزیز میں مندرج ہیں، جو اس دنیا میں ایک نمونے کے انسان کی حیثیت سے جینے کا قرینہ سکھاتی ہیں اور فرد اور معاشرے کو روح پرور ہدایات کے ذریعہ خیرات و حسنات کا پیامی ونقیب بنادیتی ہیں اور دوسری طرف یہی اصول وہدایات ابدی زندگی کی سرمدی فوز وفلاح کے لئے زادِراہ بھی بنتے ہیں۔ اس جہت سے زیر بحث تفسیری کارنامہ ایک بیش قیمت تحفہ ہے، کیونکہ احکامی آیات پر بالخصوص مؤلف نے عمق علم اور وسعت فکر و نظر کا خوب سے خوب تر سرمایہ لٹایا ہے۔

اگرچہ ۲۲ جلدوں پر مشتمل اس تفسیر قرآن کو باضابطہ شامل نصاب نہیں کیا جاسکتا تاہم سفارشی یا امدادی کتب میں بالخصوص احکامی آیات وسور میں اسے قابل ذکر تفسیری سرمایے کی حیثیت سے ملحوظ خاطر رکھا جانا چاہئے اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرطبی مسلکاً فقہ کے مالکی مکتبہ فکر سے وابستہ ہوتے ہوئے تقلید محض سے گریز کرتے ہیں اور امام مالکؒ کے بعض آراء وافکار سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے موقف کی وضاحت میں دلائل وبراہین کے

انبار لگادیتے ہیں۔ بایں طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلکی تعصب سے پاک اور گروہی منافرت سے دور یہ تفسیر قرآن کے طلبہ کے لئے چاہے فقہ کے کسی مکتبہ فکر سے وہ وابستہ ہوں، ایک گراں قدر دولت ہے جو طلبہ کی پختگی فکر، وسعت معلومات اور اجتہادی بصیرت جیسی صلاحیتوں سے مزین کرنے میں اہم رول ادا کرسکتی ہے۔

قرآن مجید چونکہ اللہ ربّ العزت کے مقبول وپسندیدہ دین دینِ اسلام کا وہ آفاقی ضابطہ زندگی ہے جو وسعت فکر ونظر اور زبان وادب میں لاثانی و بے نظیر ہے۔ یہ کتاب برحق ضلالت وگمرہی اور زوال وادبار کے قعر عمیق سے نکال کر انسانیت کو رشد وہدایت کی منور شاہراہ دکھاتی ہے اور دین ودنیا دونوں جہاں کی سعادت وکامرانی کا قیمتی توشہ ثابت ہوتی ہے۔ قرآن مجید کی اسی دینی عظمت اور شرعی حیثیت کے پیش نظر ہی اس کی ترجمانی وتفسیر وجہ سعادت سمجھی جاتی رہی ہے۔ عربی زبان وادب میں جو تفسیریں منظر عام پر آچکی ہیں ان میں فقہی اعتبار سے علامہ قرطبی کی تفسیر ''الجامع لاحکام القرآن'' کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ مؤلف موصوف قرآن وسنت اور شرعی علوم میں بالغ النظری کے ساتھ زبان وادب پر قدرت تامہ رکھتے ہیں۔ قرطبی حریت فکر ونظر کے نقیب بن کر اخلاص، اعتدال پسندی، عمق نظر اور اجتہاد کو سرمایۂ تفسیر بناتے ہوئے بے غل وغش اس میدان میں اپنی لیاقتوں کے جوہر لٹاتے ہیں۔ بلاشبہ قرآن مجید کی تعلیمات اور اس کے احکام وہدایات دین ودنیا دونوں کی فلاح وسعادت کے ضامن ہیں۔ قرآنی عظمت کا یہی درخشاں پہلو قرطبی کے اس میدان میں معرکہ آرائی کا اہم محرک بنتا ہے۔ اخلاص وللّٰہیت، طلب صادق اور تعصب وتقلید محض سے گریز واجتناب کرتے ہوئے اسلاف کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں اگر اس عظیم تفسیری سرمایے سے استفادہ کیا جائے تو ایک طرف تو طلبہ میں اجتہادی بصیرت پیدا ہوگی اور دوسری طرف بالخصوص احکامی آیات میں اس سے مراجعت فقہ کی دیگر کتابوں سے بہت حد تک مستغنی وبے نیاز بھی کردے گی۔

قرآن مجید کی عظمت و تقدس کو آج داخلی اور خارجی دونوں قسم کے چیلنجز سے سابقہ ہے۔ ایک طرف داعی امت کی ایک بڑی تعداد کی طرف سے تقویٰ کی آڑ میں قرآن کے معانی و مفاہیم سے دور رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ملت کی ایک بڑی تعداد ان حضرات پر مشتمل ہے جن کی طرف سے کتاب الٰہی کو ضابطہ زندگی کی حیثیت سے اختیار کرنے کی بجائے ریشم کے قیمتی قیمتی جزدانوں میں سجا کر اونچے اونچے طاقتوں پر رکھنے کو، موت کے وقت اور اس کے بعد قرآنی خوانی کا اہتمام کر لینے کو، دوکانوں و مکان کی تعمیر کے وقت کتاب الٰہی کی آیات سے آغاز و افتتاح کی رسم انجام دے لینے کو اور تبرک کے طور پر تلاوت قرآن کر لینے کو عظمت قرآن اور تقدس کتاب الٰہی کے اصل مظاہر قرار دیے جارہے ہیں اور دوسری طرف اغیار و اجانب کی طرف سے قومی اور بین الاقوامی سطح پر اس کتاب ہدایت و انقلاب کے تقدس و نورانیت اور عظمت و جلال کو مسموم و معاندانہ ذہنیت اور مذموم اہداف و مقاصد کے تحت داغدار و پامال کیا جارہا ہے۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں قرآن مجید اور اس سے متعلق تفسیری خدمات کو اخلاص، طلب صادق اور تعصب و تنگ نظری سے پاک ہو کر مرکز توجہ بنایا جائے، تبھی عروج و اقبال اور فوز و فلاح کی شاہ کلید ہاتھ آسکے گی۔

☆☆

قرآن کی تدریس میں سائنسی تحقیقات سے استفادہ

(کیوں اور کیسے؟)

● مولانا محمد مظہر الاعظمی

دشمنان اسلام کو اِس بات کا صرف احساس نہیں بلکہ یقین ہو چکا ہے کہ اس قدر کمزور اور بے بس ہونے کے باوجود مسلمانوں کی طاقت کا راز قرآن کریم میں مضمر ہے۔ وہ قرآن کو اللہ کا آخری پیغام اور حیاتِ انسانی کے لئے لائحۂ عمل مانتے ہیں۔ ان کے دلوں میں قرآن کی عظمت و جلال اس قدر گھر کئے ہوئے ہے کہ اس کے تحفظ کے لئے جسم کے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ سکتے ہیں، اس لئے اس روئے زمین اور تاریخ کے اوراق سے اگر مسلمانوں کو قصہ پارینہ بنانا ہے تو اُن کے لوح قلب سے قرآن کے نقوش کھرچنے ہوں گے اور دلوں سے اِس کی عظمت ختم کرنی ہوگی، اس کے بعد اس صفحۂ ہستی سے وہ خس و خاشاک کی طرح ختم ہو جائیں گے، جنھیں تیز و تند ہوائیں اڑا لے جاتی ہیں اور پھر یہ نہیں معلوم ہو سکے گا کہ یہاں اس سے پہلے کچھ تھا یا نہیں۔

قرآن کریم کی عظمت و وقار کو مسلمانوں کے دلوں سے نکالنے کے لئے ہر وقت نئے نئے طریقے اپنائے اور مختلف انداز اختیار کئے جاتے ہیں۔ کبھی قرآن میں تحریف کر کے اس کے نسخے مفت تقسیم کرائے جاتے ہیں اور کبھی ردّی کے بھاؤ بیچے جاتے ہیں تاکہ اس کے لفافے بنائے جائیں اور اس کی بے حرمتی ہو۔ چند سال پہلے مسلمانوں کو ایک رسالہ کے چند اوراق بھیجے گئے تھے، جن میں ننگی تصویروں پر قرآنی آیات چھاپی گئی تھیں۔ خواتین کے

لباس اور شراب کی بوتلوں پر قرآن شائع کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ قرآن کی عزت و احترام مسلمانوں کے دلوں سے نکل جائے۔

قرآن پر پابندی لگانے کے لئے چاندمل چوپڑا کا سپریم کورٹ میں درخواست دینا، ارون شوری کا اسے جھگڑے اور فساد کی کتاب قرار دینا اور قرآن سے کچھ آیات کے نکالنے کا مطالبہ کرنا بھی اسی کی کڑیاں ہیں۔

سلمان رشدی کی شیطانی آیات پڑھئے تو اندازہ ہوگا کہ اس کا مقصد رسول اللہ ﷺ کی تحقیر وتذلیل سے زیادہ مسلمانوں کے دلوں میں قرآن کے متعلق تشکیک پیدا کرنا ہے جس کے لئے حضرت جبرئیل کا کردار عجیب انداز میں پیش کیا گیا، نیز کاتبین وحی کو دکھلایا گیا ہے کہ وہ جو کچھ چاہتے حسب منشا لکھ دیا کرتے تھے۔

اس مختصر روداد کی روشنی میں یہ بات برملا کہی جاسکتی ہے کہ پوری دنیا مسلمانوں کو مٹانے کے درپے ہے اور اس کے لئے پہلے ان کے دلوں سے قرآن مٹا دینا چاہتی ہے، پس چہ باید کرد۔

یہ بات درست نہیں ہے کہ دشمنوں کی دشمنی کا گلہ اور شکوہ کرکے اپنی کمزوری چھپائی جائے، بلکہ غیروں کا گلہ اپنی کمزوری چھپانے کا چور دروازہ ہے، اس لئے اس چور دروازے کو بند کرکے اپنا جائزہ لینا چاہئے کہ جب مخالفین اسلام مسلسل ریشہ دوانی میں لگے ہوئے ہیں تو ہم نے کیا کیا؟ کیا دشمنان اسلام کے خلاف شور و ہنگامہ اور فلک شگاف نعرہ مسئلہ کا حل ہے۔ اگر یہی مسئلہ کا حل ہوتا تو عراق پر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے حملہ سے پہلے اور بعد میں پوری دنیا میں جتنے مظاہرے اور نعرے لگے، جس کی مثال سے تاریخ قاصر ہے، عراق کے پرخچے نہ اڑتے اور اس وقت عالمی منظر نامہ کچھ اور ہوتا، مگر عراق پر اتحادیوں کا حملہ چیخنے اور چلانے کے باوجود جس میں دوسرے مذاہب کے لوگ بھی انسانیت کے نام پر شریک تھے، اس بات کا ثبوت ہے کہ تمام مظاہرے اور نعرے بیکار ہیں، اگرچہ یہ

ہمارے جمہوری حقوق ہیں۔ ہمیں اپنے تحفظ کے لئے خود میدان میں اترنا ہوگا، کیونکہ ہم جن سے تحفظ اور امن کی بھیک مانگ رہے ہیں اور کشکول گدائی لئے در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں وہ خود ظالم و غاصب ہیں۔ نہ ہمارا ان سے تحفظ مانگنا درست ہے اور نہ ہی وہ دے سکتے ہیں۔

ایسے ناگفتہ بہ حالات میں ہمارا فرض ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم عام کردیں اور مسلمانوں کے ذہن وقلب کے دریچے کھولیں۔ اس کی روشنی سے منور کرنے کے ساتھ اس کی تعلیمات پر عمل کرنے کا خوگر بنائیں، تاکہ جس طرح نزول قرآن کے زمانے میں ایک منادی کی آواز پر مٹکے اور صراحیاں توڑ دی جاتیں، شراب بہادی جاتی اور جام و مینا کے ساتھ میخانے ویران ہوجاتے، آج بھی اسی طرح قرآن کے احکام وفرامین پر عمل پیرا ہوجائیں، کیونکہ اسلام دشمن طاقتوں اور مخالفین کی ریشہ دوانیوں کا جواب اور قرآن کا تحفظ اسی میں ہے کہ قرآن کو گلے سے لگایا جائے، جس میں انسانیت کی کامیابی وکامرانی کا راز بھی پوشیدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص قرآن کا مطالعہ وسعت قلب ونظر کے ساتھ کرتا ہے وہ اس سچائی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس پیاسی دنیا کو قرآن کے دو آتشہ کی ضرورت ہے، کیونکہ ہر ایک نظامِ زندگی جو انسانی ذہن کی اُپج اور پیداوار ہے، اپنے فطری انجام کو پہنچ کر اپنا اعتبار کھو چکا ہے اور جو باقی بچا ہوا ہے اس کا بھی ثمرہ دنیا دیکھ رہی ہے، مگر عبرت کے لئے دل بینا کی ضرورت ہے۔

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

۹ ستمبر 2004 کے دی ٹائمس آف انڈیا میں نپولین بوناپارٹ کی درج ذیل تحریر شائع ہوئی ہے جس کو پڑھنے کے بعد یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس وقت انسانیت کی متلاشی دنیا کس طرف جارہی ہے اور یہ حالات ہم سے کیا تقاضا کررہے ہیں۔

"I hope the time is not far off when I shall be able to unit all the wise and educated men of all the countries and establish a uniform regime based on the principles of the Qur'an which alone are true and which alone can lead men to happiness."

''مجھے امید ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب تمام ملکوں کے دانشور اور تعلیم یافتہ لوگوں کو متحد کر کے ایک ایسا یکساں نظام حکومت قائم کریں گے، جن کے اصول قرآن پر مبنی ہوں گے اور صرف یہی اصول لوگوں کو خوشیاں دے سکتے ہیں۔''

اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کے موضوع پر آج کا سیمینار وقت کی ضرورت اور حالات کے تقاضے کے مطابق منعقد ہوا ہے۔ قابل صد مبارکباد ہیں وہ لوگ جنھوں نے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس سیمینار کے انعقاد کا فیصلہ کیا اور شب و روز کی انتھک محنت کے بعد یہ خوبصورت محفل سجائی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ امت مسلمہ کے لئے اس پر آشوب دور میں یہ سیمینار سنگ میل ثابت ہو۔

قرآن کے موضوع پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس وقت بھی لکھا جا رہا ہے اور مستقبل میں بھی لکھا جائے گا، کیونکہ اس موضوع پر لکھنے کی نہ کوئی سیما ہے اور نہ حد، جہاں پہنچ کر یہ کہا جا سکے کہ ہم اب انتہا کو پہنچ گئے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کا قاری جب اس بحر بیکراں میں اترتا ہے اور جتنی ہی گہرائی میں پہنچتا ہے اتنے ہی قیمتی اور عمدہ موتی نکال کر لاتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ غواص اس کی گہرائی میں اترے اور خالی ہاتھ واپس آئے، اس لئے قیامت تک لوگ موتیاں نکالتے رہیں گے، مگر موتیوں کے کم ہونے کا شکوہ کبھی نہیں ہوگا۔

آبروئے اردو ادب حضرت فضا ابن فیضی فرماتے ہیں:

نیچے اتر خزانے سمندر کی تہ میں ہیں
اٹھ اور اپنی کشتی جاں میں شگاف کر

مدارس اور قرآن:

ہمارے مدارس و جامعات مسجد نبوی اور صفہ کا پرتو ہیں، جہاں شب و روز قرآن پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے میں صحابہ کرام مصروف رہتے تھے۔ اصحاب صفہ نے تو قرآن کے لئے اپنے کو وقف ہی کر دیا تھا۔ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے صرف اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کے گرویدہ ہو گئے تھے، یہاں تک کہ ضروریات زندگی سے بھی دست کش تھے۔ اصحاب خیر جو کھجور کے خوشے لا کر رکھ دیتے اسی پر بسر اوقات کرتے اور حیات مستعار کی قندیل کو روشن رکھتے، کیونکہ انھیں تو یقین ہو چکا تھا کہ اس قندیل حیات میں تو اصل روغن کتاب اللہ کا جلتا ہے، جس طرح عام قندیل میں تیل، لیکن اس کی لو باقی رکھنے اور روشنی بڑھانے کے لئے شیشہ بھی درکار ہوتا ہے، جس کے لئے چند کھجوروں کا خوشہ کافی ہے۔

صحابہ کرام نے قرآن فہمی کے جو طریقے اختیار کئے تھے اسے اجمالاً تین قسموں میں منقسم کیا جا سکتا ہے:

(۱) رسول اللہ ﷺ سے ضرورت کے مطابق دریافت کرنا۔

(۲) صحابہ کرام کا آپس میں ایک دوسرے سے پوچھنا۔

(۳) قرآن کے مفہوم پر غور و فکر کرنا۔

قرآن کی تفسیروں میں عموماً یہ تینوں چیزیں پائی جاتی ہیں، البتہ غور و فکر ایک لامتناہی چیز ہے۔ صحابہ کرام نے اپنی استعداد اور صلاحیت کے لحاظ سے کیا، اس کے بعد تابعین اور تبع تابعین اپنے اپنے انداز میں کرتے رہے اور اس کے بعد سے آج تک قرآن پڑھنے اور اس سے شغل رکھنے والے اپنے اپنے طریقے پر کر رہے ہیں، کیونکہ قرآن نے غور و فکر پر بار بار زور دیا ہے تاکہ امت مسلمہ انجماد کا شکار نہ ہو جائے اور ترقی پذیر حالات کا ساتھ دینے اور اس کے قدم سے قدم ملا کر چلنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

صاحب ''مناھل العرفان'' کائنات میں غور وفکر کے متعلق اپنی کتاب میں رقم طراز ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اکثر مقامات پر لوگوں کو دعوت دی ہے کہ وہ اس کائنات میں غور وفکر کریں اور پورے زور سے انھیں اس بات پر ابھارا ہے کہ وہ اس صحیفہ کائنات کو بنظر غائر پڑھیں تا کہ اولاً تو کائنات سے صانع کائنات کو پہچانیں اور موجودات سے موجد پر استدلال کرسکیں اور ثانیاً اس لئے کہ اس عظیم قوتوں سے اچھی طرح نفع اٹھائیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے ہی پیدا کیا ہے اور انہی کے نفع کے لئے ان کو مسخر کردیا ہے، جیسا کہ سورۂ جاثیہ میں ارشاد ہوا ہے:

''**اللّٰہ الذی سخر لکم البحر لتجری الفلک فیہ بأمرہ ولتبتغوا من فضلہٖ ولعلکم تشکرون. وسخر لکم ما فی السمٰوت وما فی الارض جمیعاً منہ. ان فی ذلک لاٰیات لقوم یتفکرون**''.

تو یہ بات تعجب خیز نہ ہوگی کہ کائنات میں پھیلی ہوئی ان چیزوں کا ذکر قرآن میں جن الفاظ سے آیا ہے، ان کو لوگ اسی طریقہ پر سمجھیں جس طریقہ کی رہبری انھیں عصر حاضر کا علم اور وہ ثقافت کرتی ہے جو سائنسی علوم کی بدولت پروان چڑھی ہے۔''

(بحوالہ تاریخ افکار وعلوم اسلامی، ج ا، ص ۲۴۸)

قرآن نے کائنات اور خصوصاً انفس وآفاق کے بہت سے ایسے حقائق بیان کئے ہیں جن کی تہ تک پہنچنا ڈیڑھ ہزار سال قبل بہت مشکل تھا، بلکہ اس وقت بھی بہت سی ایسی پیچیدہ گتھیاں ہیں جنہیں عقل انسانی سلجھانے سے قاصر ہے، لیکن عصر حاضر کی ترقی یافتہ سائنس نے جس کا مزاج تحقیق وجستجو اور حقائق تک پہنچنے کی کوشش ہے، بہت سے مسائل کو حل کردیا ہے اور بہت سے ایسے امور ہیں جن کا راستہ ہموار کردیا ہے، جو راستہ انشاء اللہ کامیابی کی منزل تک لے جائے گا۔

جن حقائق کو قرآن نے اُس وقت بیان کیا تھا جب اتنے زیادہ جدید وسائل وذرائع نہیں تھے جن کے ذریعہ وہاں تک پہنچنا ممکن ہوتا، آج جب وہاں تک ایک ماہر فن پہنچتا ہے تو یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ قرآن ایک سچی کتاب ہے۔ قرآن نے اس احساس اور اعتراف کے متعلق بھی بتادیا تھا کہ لوگ ہماری نشانیوں کو دیکھنے کے بعد قرآن کی حقانیت کو ضرور تسلیم کریں گے۔

قرآن، بائبل اور سائنس کے مصنف ڈاکٹر موریس بوکائلے (Maurice Bucaille) نے 1975 میں فرعون کی لاش کا معائنہ کیا، اس کے بعد انھوں نے اپنی کتاب میں لکھا کہ:

"Those who seek among modern data for proof of the veracity of the Holy Scriptures will find a magnificent illustration of the verses of the Quran deeling with the pharoh's body by visiting the Royal Mummies Room of the Egyptian Museum, Cairo."

''وہ لوگ جو مقدس کتابوں کی سچائی کے لئے جدید ثبوت چاہتے ہیں وہ قاہرہ کے مصری میوزیم میں شاہی ممیوں کے کمرہ کو دیکھیں۔ وہ وہاں قرآن کی ان آیتوں کی شاندار تصدیق پالیں گے جو کہ فرعون کے جسم سے بحث کرتی ہیں۔''

جس طرح فرعون کی ممی قرآن کی حقانیت پر دال ہے، اسی طرح ڈاکٹر موریس بوکائلے کی مذکورہ تحریر بھی جس کے متعلق قرآن نے واضح کردیا تھا کہ:

''**سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی أنفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق**''.

(**سورۃ حم السجدۃ: ۵۳**)

(ہم انہیں اپنی نشانیاں اطراف عالم اور ان کی ذات میں دکھلائیں گے، تا کہ یہ بات

ان کے لئے واضح ہوجائے کہ قرآن (اللہ) کی برحق کتاب ہے)۔

نشانیوں کو دکھلانے اور ان نشانیوں کو دیکھ کر قرآن کو اللہ کی برحق کتاب تسلیم کرنے کی یہ پیشین گوئی ڈاکٹر موریس بوکائلے کی اس تحریر پر صد فیصد صادق آتی ہے، جو اس بات کا بھی بین ثبوت ہے کہ اس قسم کی کھلی پیشین گوئی جو صدیوں پہلے کی گئی تھی اس کا آج صادق آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہوسکتا۔

سائنسی تحقیقات سے استفادہ کیوں؟:

یہ فطری بات ہے کہ جب کسی سنی ہوئی چیز کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کرلیا جاتا ہے تو یقین کے اندر اور زیادہ پختگی پیدا ہونے کے ساتھ دلی خوشی بھی حاصل ہوتی ہے اور اگر پہلے سے پختہ یقین ہو اور وہ مشاہدہ میں آجائے تو مسرت کی انتہا نہیں رہتی۔

ترا دیدہ ویوسف راشنیدہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ

اسی طرح قرآن جس کے حرف حرف پر ہم پختہ ایمان وایقان رکھتے ہیں، اس کے کسی زیر وزبر پر شک وشبہ کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ جب اس کے بیان کردہ حقائق سائنسی تحقیقات کے ذریعہ روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتے ہیں اور اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا جاتا ہے تو ایمان ویقین کو جلا ملتی ہے اور خوشی بھی حاصل ہوتی ہے۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ اس سے مقصد قطعاً یہ نہیں ہے کہ ہم سائنسی تحقیقات سے قرآن کی حقانیت ثابت کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ قرآن اپنی حقانیت کے لئے سائنسی تحقیقات کا محتاج نہیں۔

مشک آنست کہ خود ببویدنہ کہ عطار بگوید

بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ تدریس قرآن کے دوران، قرآن کے بیان کردہ حقائق کے ساتھ سائنسی تحقیق کو ذکر کرکے، طلبا کے ذہن ودماغ میں اس کی سچائی اور قلب میں اس کی حقانیت نقش کردی جائے، جو عصر حاضر کے ترقی یافتہ اور تہذیب وثقافت سے مرصع قوم و

نسل کی ضرورت اور وقت کا تقاضا بھی ہے۔

حضرت تمیم داری اور دجال کا واقعہ:

دجال کا واقعہ رسول اللہ ﷺ نے بیان کرنے کے ساتھ اس کی تفصیلات سے صحابہ کرام کو آگاہ کردیا تھا، جیسا کہ حدیث کی مختلف کتابوں میں موجود ہے، لیکن حضرت تمیم داری نے دجال سے ملاقات کی روداد سنائی تو آپ ﷺ خوش ہوگئے اور صرف آپ خوش ہی نہیں ہوئے، بلکہ صحابہ کرام کو جمع کرکے حضرت تمیم داری کا بیان کردہ دجال سے ملاقات کا پورا واقعہ سنایا۔ ایسا بالکل نہیں تھا کہ جس دجال کے متعلق بتایا گیا تھا اس پر صحابہ کرام کو شک وشبہ رہا ہو اور آپ نے اس تفصیل سے اس شک کو دور کرنا چاہا ہو، بلکہ صرف مقصود یہ تھا کہ صحابہ کرام کے قلوب میں ایمان کی لو اور تیز ہوجائے اور جلا و بالیدگی حاصل ہو۔

صحیح مسلم ج ۲ میں **باب قصة الجساسة** کے تحت حدیث میں حضرت فاطمہ بنت قیس دجال کا واقعہ اس طرح بیان فرماتی ہیں: ''جب میری عدت گزر گئی تو میں نے پکارنے والے کی آواز سنی، وہ پکارنے والا منادی تھا رسول اللہ ﷺ کا، پکارتا تھا نماز کے لئے جمع ہوجاؤ۔ میں بھی مسجد کی طرف نکلی اور میں نے بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی۔ میں اس صف میں تھی جس میں عورتیں تھیں لوگوں کے پیچھے۔ جب آپ نے نماز پڑھ لی تو منبر پر بیٹھے اور آپ ہنس رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: ہر ایک آدمی اپنی نماز کی جگہ پر رہے، پھر فرمایا: تم جانتے ہو میں نے تم کو کیوں اکٹھا کیا ہے؟ وہ بولے: اللہ اور اس کا رسول خوب جانتا ہے۔ آپ نے فرمایا: قسم خدا کی میں نے تم کو رغبت دلانے یا ڈرانے کے لئے جمع نہیں کیا ہے، بلکہ اس لئے جمع کیا ہے کہ تمیم داری ایک نصرانی تھا۔ وہ آیا اور اس نے بیعت کی اور مسلمان ہوا اور مجھ سے ایک حدیث بیان کی جو موافق پڑی اس حدیث کی جو میں تم سے

بیان کیا کرتا تھا، دجال کے باب میں۔ اس نے بیان کیا کہ وہ شخص یعنی تمیم داری سوار ہوا سمندر کے جہاز میں تیس آدمیوں کے ساتھ، جو لخم اور جذام کی قوم سے تھے، سو ان سے ایک مہینہ بھر لہر کھیلا کی سمندر میں (شدت موج سے جہاز تباہ رہا) پھر وہ لوگ جا لگے سمندر میں ایک ٹاپو کی طرف سورج ڈوبتے، پھر وہ جہاز سے ہلوار (یعنی چھوٹی کشتی) پر بیٹھے اور ٹاپو میں داخل ہوئے۔ وہاں ان کو ایک جانور بھاری دم بہت بالوں والا ملا کہ اس کا آگا پیچھا معلوم نہ ہوتا تھا بالوں کی کثرت کی وجہ سے، لوگوں نے اس سے کہا: اے کمبخت تو کیا چیز ہے؟ اس نے کہا: میں جاسوس ہوں۔ لوگوں نے کہا: جاسوس کیا؟ اس نے کہا: اس مرد کے پاس چلو جو دیر میں ہے، اس واسطے کہ وہ تمہاری خبر کا بہت مشتاق ہے۔ تمیم نے کہا کہ جب اس نے مرد کا نام لیا تو ہم اس جانور سے ڈرے کہ کہیں شیطان نہ ہو۔ تمیم نے کہا: پھر ہم چلے دوڑتے ہوئے یہاں تک کہ دیر میں داخل ہوئے۔ دیکھا تو وہاں ایک بڑے قد کا آدمی ہے کہ ہم نے اتنا بڑا آدمی اور ویسا سخت جکڑا ہوا کبھی نہیں دیکھا، جکڑے ہوئے ہیں اس کے دونوں ہاتھ گردن کے ساتھ، درمیان دونوں زانو کے دونوں ٹخنوں تک لوہے سے۔ ہم نے کہا: اے کمبخت تو کیا چیز ہے؟ اس نے کہا: تم قابو پا گئے میری خبر پر (یعنی میرا حال تم کو اب معلوم ہو جائے گا) تم اپنا حال بتاؤ کہ تم کون ہو؟ لوگوں نے کہا: ہم عرب لوگ ہیں جو سمندر میں سوار ہوئے تھے جہاز میں، لیکن جب ہم سوار ہوئے تو سمندر کو جوش میں پایا، پھر ایک مہینہ کی مدت تک لہر ہم سے کھیلتی رہی، بعد اس کے آ لگے اس ٹاپو میں، پھر ہم بیٹھے چھوٹی کشتی میں اور داخل ہوئے ٹاپو میں، سو ملا ہم کو ایک بھاری دم کا جانور بہت بالوں والا۔ ہم نہ جانتے تھے اس کا آگا پیچھا بالوں کی کثرت کی وجہ سے، ہم نے اس سے کہا: اے کمبخت! تو کیا چیز ہے؟ سو اس نے کہا: میں جاسوس ہوں۔ ہم نے کہا: جاسوس کیا؟ اس نے کہا: چلو اس مرد کے پاس جو دیر میں ہے کہ البتہ وہ تمہاری خبر کا مشتاق ہے، سو ہم تیری طرف دوڑتے آئے اور ہم اس سے ڈرے کہ کہیں بھوت پریت نہ ہو، پھر اس مرد نے کہا: مجھ کو

خبر دو بیسان کے نخلستان سے، ہم نے کہا کہ کون سا حال اس کا تو پوچھتا ہے؟ اس نے کہا: میں اس کے نخلستان سے پوچھتا ہوں کہ پھلتا ہے؟ ہم نے اس سے کہا کہ ہاں پھلتا ہے۔ اس نے کہا کہ خبردار رہو کہ وہ وقت قریب ہے کہ وہ نہ پھلے گا۔ اس نے کہا کہ بتلاؤ مجھ کو طبرستان کا دریا، ہم نے کہا: کون سا حال اس دریا کا تو پوچھتا ہے؟ وہ بولا: اس میں پانی ہے۔ لوگوں نے کہا: اس میں بہت پانی ہے۔ اس نے کہا: البتہ اس کا پانی عنقریب جاتا رہے گا، پھر اس نے کہا: خبر دو مجھ کو زغر کے چشمے سے۔ لوگوں نے کہا: کیا حال اس کا پوچھتا ہے؟ اس نے کہا: اس چشمہ میں پانی ہے اور وہاں کے لوگ اس پانی سے کھیتی کرتے ہیں؟ ہم نے اس سے کہا: ہاں، اس میں بہت پانی ہے اور وہاں کے لوگ کھیتی کرتے ہیں اس کے پانی سے۔ اس نے کہا: مجھ کو خبر دو عرب کے پیغمبر سے۔ لوگوں نے کہا: وہ مکہ سے نکلے اور مدینہ گئے۔ اس نے کہا: کیا عرب کے لوگ اس سے لڑے؟ ہم نے کہا: ہاں۔ اس نے کہا: کیوں کر انھوں نے عربوں کے ساتھ کیا؟ ہم نے کہا: وہ غالب ہوئے اپنے گرد و پیش کے عربوں پر اور انھوں نے اطاعت کی ان کی۔ اس نے کہا: یہ بات ہو چکی؟ ہم نے کہا: ہاں۔ اس نے کہا: خبردار رہو، یہ بات اس کے حق میں بہتر ہے کہ پیغمبر کے تابع دار ہوں اور البتہ میں تم سے اپنا حال کہتا ہوں کہ میں مسیح ہوں، یعنی دجال، تمام زمین کا پھرنے والا اور البتہ وہ زمانہ قریب ہے جب مجھ کو اجازت ہوگی نکلنے کی، سو میں نکلوں گا اور سیر کروں گا اور کسی بستی کو نہ چھوڑوں گا جہاں نہ جاؤں۔ چالیس رات کے اندر سوائے مکہ اور طیبہ کے، وہاں جانا مجھ پر حرام ہے، یعنی منع ہے۔ میں جب ان دو بستیوں میں سے کسی کے اندر جانا چاہوں گا تو میرے آگے بڑھ آئے گا ایک فرشتہ اور اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار ہوگی۔ وہ مجھ کو وہاں جانے سے روک دے گا اور البتہ اس کے ہر ناکہ پر فرشتے ہوں گے جو اس کی چوکیداری کریں گے۔ پھر حضرت محمد ﷺ نے اپنے پشت خار سے منبر پر ٹکوا دیا اور فرمایا کہ طیبہ یہی ہے، طیبہ یہی ہے، طیبہ یہی ہے، یعنی طیبہ سے مراد مدینہ منورہ ہے۔ خبردار ہو، بھلا میں تم کو اس حال کی خبر

دے چکا ہوں تو اصحاب نے کہا کہ ہاں۔ حضرت محمد ﷺ نے فرمایا کہ مجھ کو اچھی لگی تمیم کی بات جو موافق پڑی اس چیز کے جو میں تم کو دجال، مدینہ اور مکہ کے حال سے فرمادیا کرتا تھا۔ خبردار رہو کہ البتہ دریائے شام یا دریائے یمن میں ہے نہیں، بلکہ وہ پورب کی طرف ہے، وہ پورب کی طرف ہے، وہ پورب کی طرف ہے۔ (پورب کی طرف بحر ہند ہے، شاید دجال بحر ہند کے کسی جزیرہ میں ہو) اور آپ نے اشارہ کیا پورب کی طرف۔ فاطمہ بنت قیس نے کہا: تو یہ حدیث میں نے رسول اللہ ﷺ سے یاد رکھی۔'' (ترجمہ علامہ وحید الزماں)۔

اس طویل روایت سے معلوم ہوا کہ جب رسول اللہ تمیم داری کا واقعہ سنانے کے لئے منبر پر بیٹھے تو ہنس رہے تھے اور واقعہ سنانے سے پہلے فرمایا کہ **حدثنی حدیثاً وافق الذی کنتُ اُحدثکم عن مسیح الدجال.** ''تمیم داری نے مجھ سے ایسی حدیث بیان کی ہے جو اُس حدیث کے موافق ہے جسے میں بیان کیا کرتا تھا'' اور پھر آخر میں واقعہ سنانے کے بعد فرمایا کہ ''**الاھل کنت حدثتکم ذلک فقال الناس نعم، فانه اعجبنی حدیث تمیم انه وافق الذی کنت احدثکم عنه وعن المدینة و مکة**''. (خبردار! کیا میں تم کو اس سے متعلق بتا نہیں چکا ہوں۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں۔ مجھ کو اچھی لگی تمیم کی بات جو موافق پڑی اس چیز کے جو میں تم سے بیان کیا کرتا تھا دجال اور مدینہ ومکہ کے متعلق)۔

چونکہ حضرت تمیم داری کے سفر کا یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی ان باتوں کے موافق تھا، جس کو صحابہ کرام سے بیان فرما چکے تھے، اس لئے خوشی کا اظہار کیا اور صحابہ کرام کو اس خوشی میں شریک ہونے کے لئے سنایا۔

مجزز مدلجی کی موافقت پر اظہار مسرت:

''**عن عائشة قالت دخل علی رسول الله ﷺ ذات یوم مسروراً فقال**

یا عائشة الم تری ان مجزِّزاً المُدلِجی دخل علی فرأی اسامة و زیداً وعلیهما قطیفة قد غطیا رؤسهما وبدت اقدامهما فقال ان هذهِ الاقدام بعض من بعض''. (**صحیح مسلم، ج ا، کتاب الرضاع**)

(حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ میرے پاس خوش وخرم آئے اور فرمایا کہ اے عائشہ! تجھے نہیں معلوم کہ مجزز مدلجی میرے پاس آیا، اسامہ اور زید کو ایک چادر میں لپٹے لیٹے ہوئے دیکھا، دونوں کے سر ڈھکے ہوئے اور پیر کھلے ہوئے تھے تو کہا کہ یہ پیر بعض بعض سے ہیں)۔

رسول اللہ ﷺ نے علم قیافہ کی بنیاد پر مجزز مدلجی کے بیان پر خوشی کا اظہار فرمایا اور یہ خوش خبری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی دی، کیونکہ یہ بیان امر واقعہ کے موافق تھا، جسے اہل عرب بھی علم قیافہ کی صحت کی بنیاد پر تسلیم کرتے تھے۔

''عون المعبود'' کے مصنف نے اس معنی کی روایت نقل کرنے کے بعد امام خطابی کا قول تحریر فرمایا ہے کہ ''**فی هذا الحدیث دلیل علی ثبوت امر القافة وصحة الحکم بقولهم فی الحاق الولد وذلک ان رسول اللّٰه ﷺ لایظهر السرور الا بما هوا حق عنده**''. (یعنی اس حدیث میں قیافہ اور اس کی بنیاد پر بچے کو باپ سے ملا دینے کے حکم کی صحت پر دلیل ہے، اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کے نزدیک جو چیز صحیح ہوتی تھی اسی پر خوشی کا اظہار فرماتے تھے)۔

آج کے سائنس اور ٹیکنالوجی کے ترقی یافتہ دور میں بہت سی سائنسی تحقیقات ایسی آرہی ہیں جو قرآنی حقائق کی موافقت کرتی ہیں، اس لئے مذکورہ دونوں احادیث کی روشنی میں درس قرآن کے دوران تحقیقات سے استفادہ کرنا ہمارے لئے بالکل ضروری ہے، جو وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا بھی ہے۔ قرآن کے موافق تحقیقات کو یہ کہہ کر ٹھکرانا کہ قرآن نہ سائنس کی کتاب ہے اور نہ ہی قرآن کو سائنس کی تائید کی ضرورت ہے، بہت

ہی نامناسب اور غیر معقول بات ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ ہمارے لئے اسوۂ حسنہ ہے اور آپ نے حضرت تمیم داری کے واقعہ اور مجز زمدلجی کی بات پر خوشی کا اظہار فرمایا، جبکہ آپ کو قطعاً ضرورت نہیں تھی کہ اپنی باتوں کے لئے ان واقعات سے تائید حاصل کریں اور نہ ہی صحابہ کرام کے ایمان وایقان اور اس کی پختگی کے لئے ان واقعات کا سنایا جانا ضروری تھا، مگر جو مقصد ان واقعات کی صحت سے اس وقت حاصل کیا گیا تھا وہ آج کی تحقیقات بتا کر حاصل کیا جاسکتا ہے جو قرآن کے موافق ہوں۔

ذیل میں چند ایسی مثالیں دینے کی کوشش کی گئی ہے، جن سے یہ بات اظہر من الشمس ہوجائے گی کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں جو تحقیقات ہوئی ہیں وہ کس طرح قرآنی حقائق سے موافقت کررہی ہیں۔

فرعونِ موسیٰ کی لاش ایک علامت:

"**فالیوم ننجیک ببدنک لتکون لمن خلفکَ... آیة**". (یونس:۹۲)

(پس آج ہم ایسا کریں گے کہ تیرے جسم کو (سمندر کی موجوں سے) بچالیں گے تاکہ ان لوگوں کے لئے جو تیرے بعد آنے والے ہیں، (قدرت حق کی) ایک نشانی ہو)۔

یہ آیت کریمہ فرعون موسیٰ سے متعلق ہے، جس میں اس کے غرق آب ہونے اور اس کی لاش کو بچا کر بعد میں آنے والوں کے لئے سامان عبرت بنانے کا ذکر ہے۔ یہ واقعہ ہزاروں سال پرانا ہے۔ نزول قرآن تک کسی کو نہیں معلوم تھا کہ فرعون کی لاش محفوظ بھی ہے، لیکن قرآن نے اس اعلان کے ذریعہ کہ "**لتکون لمن خلفک... الآیة**". ایک عجیب چیز پیش کردی، جسے ایک حیرت انگیز واقعہ سمجھا گیا، پھر بھی قدیم مفسرین کے لئے اس آیت کی تفسیر میں مشکلات تھیں، کیونکہ قرآن کے بیان سے لاش کا محفوظ ہونا تو متحقق ہو چکا تھا، لیکن چودہ سو سال تک کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ لاش کہاں محفوظ ہے، جس کی وجہ سے قرآن

کی روشنی میں یہ کہنا تو آسان تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کی لاش کو نشانی بنادیا ہے، مگر عملاً اس نشانی کا دکھلانا مشکل تھا جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان القرآن میں رقم طراز ہیں:

''آیت ۹۲ کا مضمون بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے، یعنی مشیت الٰہی کا یہ فیصلہ کہ فرعون کے جسم کو غرق ہونے سے نجات دی جائے گی، تاکہ آنے والی قوموں کے لئے قدرت حق کی نشانی ہو اور اسی لئے قدیم مفسرین کو حل مطلب میں مشکلات پیش آئیں۔''

مفسرین کی یہ مشکلات ۱۸۹۸ء میں اس وقت دور ہوئیں جب پروفیسر لاریٹ (Loret) نے مصر کے ایک قدیم مقبرہ میں جاکر دریافت کیا کہ فرعون کی لاش موجود ہے۔ اس کے ۹ سال بعد ۸/جولائی ۱۹۰۷ء کو الیٹ اسمتھ (Elliot Smith) نے فرعون کی لاش پر لپٹی ہوئی چادر کو ہٹایا اور اس کی باقاعدہ سائنسی تحقیق کی تو لاش پر نمک کی ایک تہ جمی ہوئی پائی گئی، جو کھارے پانی میں اس کے غرقابی کی کھلی علامت تھی۔ (تفہیم القرآن و عظمت قرآن)۔

مذکورہ تحقیق کے بعد اب یہ بتانا آسان ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح فرعون کی لاش کو بعد میں آنے والوں کے لئے سبق اور نشانی بنادیا، کیونکہ اس کی لاش قاہرہ کے عجائب گھر میں موجود ہے، جسے جانے والے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور جو لوگ وہاں تک نہیں پہنچ پاتے وہ فوٹو اور سی ڈی وغیرہ کے ذریعے دیکھتے ہیں، اس کی سی ڈی اب بالکل عام ہوچکی ہے۔ گویا اس کی لاش کو اس طرح نشانی بنادیا کہ اس نشانی کو پوری دنیا اپنے گھر بیٹھی ہوئی دیکھ رہی ہے، جو قرآن کی صداقت کی منہ بولتی تصویر ہے۔

جنین کے لئے علقہ اور مضغہ کی تعبیر:

"**ولقد خلقنا الانسان من سلالة من طین o ثم جعلناه نطفة فی قرار**

مکین o ثـم خـلـقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظاماً فكسونا العظام لحماً ثم انشأناه خلقاً آخر فتبارک اللّٰه أحسن الخالقين".

(سورة المؤمنون: ۱۲-۱۴)

(اور ہم نے انسان کو مٹی کے ٹھیکرے سے پیدا کیا o پھر ہم نے اسے نطفہ کی شکل میں ایک محفوظ جگہ پہنچادیا، پھر نطفہ کو منجمد خون بنادیا، پھراس منجمد خون کو گوشت کا ایک ٹکڑا بنادیا، پھراس ٹکڑے سے ہڈیاں پیدا کیں، پھران ہڈیوں پر گوشت چڑھادیا، پھر ہم نے تخلیق کے دوسرے مرحلہ سے گزار کر اسے پیدا کیا۔ پس برکت والا ہے اللہ جو سب سے عمدہ پیدا کرنے والا ہے)۔

مذکورہ آیات میں جنین کی نشو ونما اور اس کے مراحل کا ذکر اتنی باریکی اور لطافت کے ساتھ کیا گیا ہے کہ وہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی حیرت انگیز چیز ہے، کیونکہ قرآن کو نازل ہوئے چودہ سو سال سے زیادہ کا عرصہ گزرا، اس وقت جنین کے ابتدائی مراحل کو دیکھنے اور مطالعہ کرنے کا تصور بھی محال تھا، اسی لئے اس صدی کے ماہرین یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ''قرآن سائنس سے آگے ہے۔''

آیت میں جنین کے ابتدائی مراحل کے لئے دو لفظ علقہ اور مضغہ کا استعمال زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ جن دونوں کے استعمال نے اس فن کے ماہرین کی آنکھیں کھول دیں کہ یہ الفاظ جس مرحلہ کو بیان کرنے کے لئے استعمال ہوئے ہیں وہ مراحل ان الفاظ سے حیرت انگیز حد تک موافقت رکھتے ہیں۔

علقہ کا لفظ منجمد خون (لوتھڑا) اور جونک کے لئے استعمال ہوتا ہے، لیکن مترجمین نے خون کے لوتھڑے کا ہی ترجمہ کیا ہے، جو لوتھڑا جونک سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس مرحلہ میں خون کا یہ ٹکڑا جونک سے مشابہت کے ساتھ اسی جونک کی طرح رحم سے چپک جاتا ہے اور جس طرح جونک خون چوستی ہے اسی طرح یہ بھی غذا حاصل کرتا ہے۔

In comparing a leech to an embryo in the "alaqah" stage, we find similarity between the two, Also, the embryo at this stage obtains nourishment from the blood of the mother, similer to the leech, which feeds on the blood of others." (A breif Illustrated guide to understanding Islam, page 6).

''علقہ کے مرحلہ میں جب ہم جونک (Leech) کا جنین سے موازنہ کریں تو دونوں میں ہمیں بہت مطابقت ملے گی، اس مرحلہ میں جنین ماں کے خون سے اپنی غذا ٹھیک ایسے ہی حاصل کرتا ہے، جیسے ایک جونک دوسرے کے خون سے اپنی غذا حاصل کرتی ہے۔''

ڈاکٹر کیتھ مور جو جنینیات کے ماہر اور اس موضوع پر کئی کتابوں کے مصنف ہیں، جب ان سے علق کے متعلق دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ عرب میں پائی جانے والی جونک اور چوبیس دن کے جنین میں حیرت انگیز طور پر مشابہت پائی جاتی ہے، مزید یہ کہ اس مرحلہ پر جنین رحم کی دیوار سے جونک کی طرح لپٹ جاتا ہے۔ (عقلیات اسلام، ص ۹۶)

جنین کا دوسرا مرحلہ مضغہ کا ہے، جس کا معنی گوشت کا ٹکڑا اور چبائی ہوئی چیز کے ہے، جس کی تفصیل درج ذیل عبارت میں ہے:

The next stage mentioned in verse is the mudghah stage. The Arabic word mudghah means "chewed - like substance" if one were to take a piece of gum and chew it in his or her mouth then compare it with an embryo at the mudghah stage. We would conclude it with an embryo at the mudghah stage acquires the appearance of a

chewed like substance. This is because of the somites at the back of the embryo that somewhat resemble teethmarks in a chewed substance. (A brief illustrated guide to understanding Islam, page 8 by I.A.Ibrahim)

''آیت میں جنین کے نشوونما کا دوسرا مرحلہ جو بیان کیا گیا ہے وہ ہے مضغہ، اس کے معنی Chewed- like substance یعنی چبائی ہوئی چیز کے ہے۔ اگر کوئی گوند (یا چیونگ گم) کا ایک ٹکڑا لے اور اسے اپنے منھ میں رکھ کر چبائے اور اس کو مضغہ مرحلہ کے جنین سے ملائے تو وہ اس کی شکل کو مضغہ مرحلہ کے جنین کی شکل کا پائے گا۔ جنین کی پشت پر Somites (ریڑھ کی ہڈی) ہونے کی وجہ سے یہ جنین چبائی ہوئی چیز پر دانوں کے نشان جیسا دکھائی دیتا ہے۔''

ڈاکٹر کیتھ مور سے جب مضغہ کے متعلق دریافت کیا گیا تو انھوں نے پلاسٹک کی ایک چھوٹی سی چیز تیار کی اور پھر اسے اپنے دانتوں سے چبایا اور بتایا کہ ۲۸ روز کے جنین کی شکل ہو بہو ایسی ہی ہوتی ہے اور اس پر جو نشانات پائے جاتے ہیں وہ بھی دانتوں کے نشان کے مماثل ہوتے ہیں۔ مذکورہ حقائق کی وضاحت اور قرآنی بیان و سائنسی تحقیقات میں حیرت انگیز موافقت کے بعد اس نے برملا کہا کہ ''مجھے اس بات نے حیرت میں ڈال دیا، جب مجھے یہ پتہ چلا کہ قرآن نے ساتویں صدی عیسوی میں جو حقائق پیش کئے وہ کس قدر درست اور سائنسی صداقتوں کے حامل ہیں۔''

پہاڑوں کے لئے ''فی'' اور ''اوتاد'' کی معنویت:

''**وجعلنا فی الارض رواسی ان تمید بھم**''. (الانبیاء: ۳۱) (اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنا دیے، تاکہ وہ (زمین) انھیں (مخلوق کو) لے کر ہلتی نہ رہے)۔

''**والقی فی الارض رواسی أن تمید بکم**''. (سورۃ لقمان: ۱۰) (اور اس نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں ہچکولے کھلائے)۔

''**الم نجعل الارض مھادا. والجبال اوتادا**''. (النباء: ۶-۷) (کیا ایسا نہیں کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح (اس میں) گاڑ دیا)۔

مذکورہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس روئے زمین پر اونچے اونچے فلک بوس پہاڑوں کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ زمین توازن کے ساتھ برقرار رہے۔ ڈھلکے، چھلکے اور ہچکولے نہ کھائے، نیز لفظ ''اوتاد'' جو میخ اور کھونٹی کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ پہاڑ مٹی کے ٹیلوں اور تودوں کی طرح زمین پر رکھے اور پڑے ہوئے نہیں ہیں بلکہ میخ کی طرح گاڑے ہوئے ہیں، لیکن ڈیڑھ سو سال پہلے تک پہاڑوں کے متعلق یہ خیال عام تھا کہ یہ سب زمین پر رکھے ہوئے ہیں، جس کا اندازہ قرآن کے مترجمین کے ترجمہ سے بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگوں نے ''**جعلنا فی الارض**'' اور ''**القی فی الارض**'' کا ترجمہ (زمین پر کیا ہے)۔ ''**فی**'' اور ''**اوتاد**'' کی معنویت کا عقدہ اس وقت کھلا جب سائنسی تحقیقات سے ثابت ہو گیا کہ یہ پہاڑ زمین میں گڑے ہوئے ہیں اور جس طرح کھونٹی کا جتنا حصہ باہر رہتا ہے اس سے زیادہ عموماً اندر ہوتا ہے۔ اسی طرح ان پہاڑوں کا معاملہ ہے کہ جتنے حصہ اور اونچائی کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اس سے زیادہ اندر ہے۔ جدید زمینی سائنسز نے یہ ثابت کر دیا کہ پہاڑوں کی زمین کے اندر گہری جڑیں ہوتی ہیں اور یہ جڑیں زمین کے اوپر کے پہاڑ کے مقابلہ میں زمین کے اندر کئی گنا زیادہ گہری ہوتی ہیں، اس وجہ سے اس گہرائی کی بنا پر اسے میخ یا کھونٹی (peg) کا نام دینا زیادہ مناسب ہے۔

۱۹۸۷ء میں رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے اسلام آباد (پاکستان) میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس میں ایک امریکی سائنس داں نے قرآن کی ان چند آیات کا ترجمہ

پیش کرتے ہوئے کہا (جن میں پہاڑ کو میخ کہا گیا ہے) کہ سو سال پہلے سائنس دانوں کا یہ خیال تھا کہ پہاڑ ایسے ہی ٹیلے ہیں جیسے ریت کے ٹیلے بن جاتے ہیں یا قدرتی طور پر مسلسل آندھی وطوفان کے نتیجہ میں کسی جگہ مٹی، ریت اور پتھروں کا ڈھیر لگ جاتا ہے، مگر اب جدید تحقیقات سے معلوم ہوا کہ پہاڑ ایک میل اونچا ہو تو اس کی جڑ کئی میل تک گہری ہوتی ہے، جس طرح میخ کا کچھ حصہ اوپر نظر آتا ہے، جبکہ اس کا بڑا حصہ زمین میں ہوتا ہے۔

(ماہنامہ محدث پاکستان، ستمبر ۲۰۰۳ء)

سائنسی تحقیقات سے استفادہ کیسے:

قرآن کے موافق سائنسی تحقیقات کی جو میں نے چند مثالیں پیش کی ہیں، اس قسم کی تحقیقات سے قرآن اور اس کی تفسیر پڑھنے والے طلبہ کا واقف ہونا عصر حاضر کا تقاضا ہے، کیونکہ جس طرح ان تحقیقات سے ایمان کو تازگی اور روح کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے، اسی طرح غیر مسلموں کے سامنے اسلام اور قرآن کا تعارف کرانے کے ساتھ قرآن کی حقانیت کو ثابت کرنے کا معقول اور مؤثر ذریعہ بھی ہے۔ بہت سے نومسلموں کے قبول اسلام کی وجہ اس قسم کی تحقیقات بھی ہیں، جس کی حقانیت اور عصری معنویت اسلام قبول کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ بھی نصرانی ہی تھے، لیکن انھوں نے بھی دجال سے ملاقات کے بعد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی اور اسلام قبول کر لیا۔

مدارس و جامعات کے موجودہ نصاب تعلیم میں کتاب وسنت کے افہام وتفہیم اور اس کے رموز کو سمجھنے کے لئے جتنے بھی علوم معاون کے طور پر پڑھائے جاتے ہیں وہ سب لازمی اور ضروری ہیں، یہی وجہ ہے کہ جب کبھی موجودہ نصاب میں کتاب کے اضافہ کی بات آتی ہے تو سب سے اہم مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اگر اس کتاب کو داخل نصاب کیا جائے تو نصاب بھاری ہوگا اور اگر کسی کتاب کی جگہ داخل کیا جائے تو کس کتاب کو نکالا جائے، کیونکہ تمام

کتابیں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ کسی کتاب کا کم کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے، اس لئے یہ اہم اور مشکل سوال ہے کہ سائنسی تحقیقات سے استفادہ کی ایسی کون سی صورت ہو کہ نصاب تعلیم بوجھل اور طلبہ کی استطاعت سے باہر بھی نہ ہو اور استفادہ بھی آسان ہو۔

میرے علم اور ناقص معلومات میں طلبہ کے ذہن وفکر کے معیار کی اردو زبان میں کوئی ایسی کتاب نہیں جس میں قرآن کے موافق تحقیقات کو جمع کیا گیا ہو، بلکہ جستہ جستہ مختلف رسائل وجرائد اور بعض کتابوں میں جزوی طور پر یہ چیزیں ملتی ہیں، اس لئے طلبہ کا ان سے استفادہ آسان نہیں۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ طلبہ کے معیار کو سامنے رکھ کر کوئی کتاب ترتیب دی جائے اور اس کے لئے کسی ماہر فن اور متخصص کی خدمت حاصل کی جائے یا چند ماہرین پر مشتمل ایک بورڈ بنا کر یہ کام اس کے حوالہ کر دیا جائے تاکہ یہ کام جلد اور آسانی سے ہو سکے اور اس کے بعد یہ کتاب نصاب میں اس طرح داخل کی جائے کہ طلبہ اسے برداشت کر سکیں، یعنی ہفتہ میں صرف ایک ایک دو گھنٹی اور اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو پھر طلبہ کے لئے مطالعہ میں رکھ دی جائے جس کا باقاعدہ دیگر نصابی کتابوں کی طرح امتحان بھی ہوتا کہ طلبہ اسے پڑھیں اور مقصد حاصل ہو۔

چونکہ مدارس و جامعات کے طلبہ جدید سائنسی اصطلاحوں سے ناواقف ہوتے ہیں، نیز انگریزی زبان میں ہونے کی وجہ سے ان کا بآسانی یاد کر لینا بھی مشکل ہوتا ہے، اس لئے کتاب کی ترتیب میں اس بات کی بھی کوشش ہونی چاہئے کہ جہاں تک ممکن ہو ان پیچیدہ اور غیر مانوس اصطلاحوں سے اعراض کیا جائے تاکہ اصل مقصود کو سمجھنے میں پیچیدہ اصطلاحیں رکاوٹ نہ بنیں، کیونکہ ہمارا مقصود تو صرف قرآن سے سائنسی تحقیقات کی موافقت پیش کرنا ہے نہ کہ سائنسی علوم وفنون اور ان کی اصطلاحوں سے واقف کرانا۔

سہل اور آسان اسلوب میں کتاب ترتیب دینے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اس کتاب سے طلبہ کے علاوہ دوسرے لوگ بھی حسب استطاعت استفادہ کریں گے اور ان کو

بھی قرآن کی حقانیت کو عصری اسلوب میں سمجھنے کا موقع ملے گا۔

طلبہ کے استفادہ کی دوسری شکل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ عربی درجات کی تمام جماعتوں میں ہفتہ میں ایک روز کسی ایسے استاذ کے لکچر کا انتظام کیا جائے جسے جدید تحقیقات سے دلچسپی ہو اور وہ پوری تیاری کے ساتھ اپنی معلومات طلبہ تک پہنچائے، لیکن اس لکچر میں جو کچھ بتایا جائے اس کے امتحان کا بھی نظم ہو، بصورت دیگر استاذ تو لکچر کی تیاری کرے گا، مگر طلبہ اسے غیر ضروری سمجھ کر توجہ نہیں دیں گے اور مقصد فوت ہوجائے گا۔ طلبہ کے استفادہ کی تیسری شکل یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً ماہرین کا محاضرہ منعقد کیا جائے جس میں تمام اساتذہ اور طلبہ شریک ہوں، لیکن محاضرہ اور درس کا جو فرق ہے وہ رہے گا اور محاضرہ کے ذریعہ اس طرح استفادہ ممکن نہیں جیسے درس سے ہوتا ہے، لیکن نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے۔

سائنسی تحقیقات سے استفادہ کا مذکورہ طریقوں کے علاوہ ایک طریقہ اور بھی ہے، وہ یہ کہ قرآن اور اس کی تفسیر پڑھانے والے اساتذہ خود ان مقامات کی وضاحت کریں، جن کی موافقت سائنس کر رہی ہے۔ یہ طریقہ مذکورہ طریقوں سے بہت آسان ہے مگر مشکل بھی۔ آسان اس وجہ سے کہ مذکورہ طریقوں میں سے کسی کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی، مگر مشکل اس اعتبار سے کہ ہر استاذ کو اس قسم کے فنون سے دلچسپی نہیں ہوتی اور بغیر دلچسپی اور شوق کے اس موضوع پر مواد اکٹھا کرنا اور طلبہ کے سامنے پیش کرنا مشکل ہے، اس لئے اگر اس آخری طریقہ کو اختیار کرلیا جائے تو میرے خیال میں قرآن کی تدریس میں سائنسی تحقیقات سے استفادہ سب سے آسان ہوگا۔

☆☆

قرآن کریم اور نظام زکوٰۃ

● مولانا رضوان الحق قاسمی

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو انسان کی ہر موڑ پر کامل راہ نمائی کرتا ہے۔ یہ راہ نمائی صرف انفرادی زندگی کی کامیابی و کامرانی کے لیے نہیں، بلکہ اجتماعی طور پر دنیا و آخرت کی کامیابی و کامرانی کے تصور پر قائم ہے، اس لیے ہر مومن کو جن اعمال و افعال کا مکلّف بنایا گیا ہے وہ اللہ کی رضا کے حصول کے ساتھ دوسروں کے خیر کے جذبات سے لبریز ہیں۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو جو نظام عبادت دیا اس میں نماز، روزہ، حج جیسی عبادات کے ساتھ ساتھ مالی عبادت یعنی زکوٰۃ کا حکم دیا۔ زکوٰۃ کی ادائیگی دین اسلامی کا بنیادی رکن ہے جو اللہ کے حکم کی تعمیل کی وجہ سے ایک طرف اللہ رب العزت کی عبادت ہے تو دوسری طرف دیگر حاجت مندوں کی ضروریات۔ زندگی کی تکمیل کے لحاظ سے دوسروں کے لیے سراپا خیر بننے کی ترغیب ہے۔ اسلام کا پورا کا پورا نظام قرآن شریف کے تناظر میں ہے، اس لیے زکوٰۃ کے سلسلہ میں قرآن پاک میں اس کی افادیت اس کی سماجی اور معاشرتی حیثیت اور دین اسلام میں اس کا مقام کیا ہے؟

زکوٰۃ کا لفظ زکا، یزکو سے ہے جس کے معنی پاک ہونے کے ہیں۔ عربی میں نفس زکیہ اس نفس کو کہتے ہیں جو گناہوں سے پاک صاف ہو۔ دوسرا مفہوم اس مادہ کے اندر بڑھنے اور نشو ونما پانے کا ہے۔ زکوٰۃ الزرع کے معنی کھیتی بڑھنے کے ہیں۔ کھیتی بڑھی اور اچھی۔ زکوٰۃ کے اندر پاکیزگی اور نشو ونما دونوں کا حکم پایا جاتا ہے، اس لیے کہ زکوٰۃ نفس اور مال

دونوں کو پاکیزگی بخشتی ہے اور اس سے مال میں برکت اور بڑھوتری بھی ہوتی ہے۔ قرآن کریم کی بعض آیات سے اس طرف اشارہ بھی ہوتا ہے:

''اور جو تم دیتے ہو سود تا کہ لوگوں کے مال میں بڑھوتری ہو تو یہ چیز اللہ کے یہاں نہیں بڑھتی، اور جو تم دیتے ہو زکوٰۃ اللہ کی رضا جوئی کے لیے تو یہی لوگ اپنے دیے ہوئے کو اللہ کے یہاں پڑھانے والے ہیں۔ زکوٰۃ کا لفظ تو ابتدا میں انفاق فی سبیل اللہ کی تمام قسموں کے لیے استعمال ہوتا رہا اور اس کا مفہوم وہی تھا جو لفظ صدقہ کا ہے، لیکن بعد میں قرآن و حدیث کے استعمالات نے اس کو انفاق کی اس متعین مقداروں کے لیے خاص کر دیا جو اللہ اور رسول نے ہر حال میں غربا اور فقرا کے لیے خاص کر دیا ہے۔'' (الروم:۳۹)

قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر جہاں نماز کا حکم آیا ہے متصلاً زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم بھی بیان کیا گیا۔ نماز قائم کرنے کا حکم دیا تو زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دے کر اللہ نے بندوں کے ساتھ تعلق جوڑنے اور ان کے دکھ درد اور دنیاوی پریشانیوں کو دور کرنے کا حکم بھی ارشاد فرمایا۔ ایک طرف نماز کو عبادت قرار دیا جس کا تعلق بندے اور اس کے رب کے ساتھ تو دوسری طرف زکوٰۃ کو بھی عبادت قرار دیا جو بندوں کا اللہ کے بندوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے کا نام ہے، گویا اللہ کی ذات سے تعلق جوڑنا بھی عبادت ہے۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر اس کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔

(متقی وہ ہیں) ہم نے انھیں جو رزق دیا ہے اس سے وہ خرچ کرتے ہیں)۔ (البقرۃ: ۳:۲) (آپ ان کے مالوں سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کیجیے کہ آپ اس صدقہ کے باعث انھیں گناہوں سے پاک فرمائیں اور انھیں ایمان و مال کی پاکیزگی سے برکت بخش دیں۔) (التوبۃ: ۹:۱۰۳) (اور جو کچھ خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس کی جگہ اور عطا فرمائے گا)۔ (السبا:۳۴:۳۹) (اور فلاح پاتے ہیں جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں)۔ (المومنون:۲۳)

(جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس دانہ کی سی ہے جس

سے سات بالیاں اگیں اور پھر ہر بالی میں سو دانے ہوں (یعنی سات گنا اجر پاتے ہیں) اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے (اس سے بھی) اضافہ فرما دیتا ہے، اور اللہ بڑی وسعت والا اور خوب جاننے والا ہے۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اپنے خرچ کیے ہوئے کے پیچھے نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ اذیت دیتے ہیں ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے اور (روز قیامت) ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (سائل سے) نرمی سے گفتگو کرنا اور درگزر کرنا اس صدقہ سے کہیں بہتر ہے جس سے (اس کی) دل آزاری ہو اور اللہ بے نیاز بڑا حلم والا ہے)۔ (البقرۃ:۲۶۳)۔

(اور جو لوگ اس (مال و دولت) میں سے دینے میں بخل کرتے ہیں جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے عطا کیا ہے وہ ہرگز اس بخل کو اپنے حق میں بہتر خیال نہ کریں بلکہ یہ ان کے حق میں برا ہے۔ عنقریب روز قیامت انھیں (گلے میں) اس مال کا طوق پہنایا جائے گا، جس میں وہ بخل کرتے رہے ہوں گے)۔ (آل عمران:۱۸۰)

چنانچہ احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے، بخاری اور مسلم کی روایت ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بنے تو اس وقت کچھ لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے ان کے خلاف جہاد کا حکم دیا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ آپ ان کے ساتھ قتل کیسے کر سکتے ہیں؟ آپؓ نے ارشاد فرمایا: مجھے حکم ہے کہ لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کہیں اور جس ن لا الٰہ الا اللہ کہہ لیا اس نے اپنی جان و مال کو بچا لیا سوائے حق کے اور اس کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔ تو صدیق اکبرؓ نے فرمایا: خدا کی قسم اس سے جہاد کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کرے۔ خدا کی قسم بکری کا بچہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کیا کرتے تھے اگر مجھے دینے سے انکار کریں گے تو میں ان سے جہاد کروں گا۔ فاروق اعظمؓ فرماتے ہیں ''خدا کی قسم میں نے دیکھا اللہ تبارک و تعالیٰ

نے ابوبکر صدیقؓ کا سینہ کھول دیا ہے۔اس وقت میں نے پہچان لیا کہ وہی حق ہے۔

اللہ رب العزت نے انسان کو بے شمار نعمتیں عطا فرمائی ہیں جن کا شکر ادا کرنا شان بندگی ہے۔شکر ادا کرنے سے بندوں پر اللہ کی طرف سے نعمتوں کے نزول میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ارشاد ربانی ہے:''اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں تمہاری نعمتوں میں اضافہ کروں گا اور اگر تم ناشکری کرو گے تو میرا عذاب یقیناً سخت ہے۔''(ابراہیم:۷)

مال و دولت بھی نعمت خداوندی ہے اور اس کی زکوٰۃ ادا کرنا اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرنا ہے جو اس میں کئی گنا اضافہ کا سبب ہے،اگر زکوٰۃ ادا نہ کی جائے تو یہ کفران نعمت ہے۔ اللہ کی رضا کے لیے مال خرچ کرنا بندہ مومن کی شان ہے چونکہ یہ انفاق اللہ کے حضور میں بھیجنے کے لیے کیا جاتا ہے اس لیے اللہ نے مومنین کو حکم فرمایا کہ وہ عمدہ پاکیزہ مال اس کی راہ میں خرچ کریں۔

ارشاد ربانی ہے:''اے ایمان والو! پاکیزہ کمائیوں میں سے اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا ہے(اللہ کی راہ میں) خرچ کیا کرو اور اس میں گندے مال کو خرچ کرنے کا ارادہ مت کرو کہ (اگر وہی تمھیں دیا جائے تو) تم خود اسے ہرگز نہ لو، سوائے اس کے کہ تم اس میں چشم پوشی کر لو اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ بے نیاز ہر حمد کے لائق ہے۔شیطان تمھیں (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکنے کے لیے) تنگ دستی کا خوف دلاتا ہے اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور اللہ تم سے اپنی بخشش اور فضل کا وعدہ فرماتا ہے اور اللہ بہت وسعت والا جاننے والا ہے۔ جسے چاہتا ہے دانائی عطا فرما دیتا ہے اور جسے (حکمت) دانائی عطا کی گئی اسے بہت بڑی بھلائی نصیب ہوگئی اور وہی لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں جو صاحب عقل و دانش ہیں اور جو تم کچھ بھی خرچ کرو یا جو بھی منت مانو تو اللہ تعالیٰ اسے یقیناً جانتا ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں۔اگر خیرات ظاہر کر کے دو تو یہ بھی اچھا ہے(اس سے دوسروں کو ترغیب ہوگی) اور تم اگر انھیں مخفی رکھو اور انھیں محتاجوں تک

پہنچا دو تو یہ تمہارے لیے اور بہتر ہے اور اللہ (اس خیرات کی وجہ سے) تمہارے کچھ گناہوں کو تم سے دور فرما دے گا اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔ان کو ہدایت دینا آپ کے ذمہ نہیں، بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت سے نوازتا ہے اور جو تم مال خرچ کرو سو وہ تمہارے فائدہ میں ہے۔اللہ کی رضا جوئی کے علاوہ تمہارا خرچ کرنا مناسب ہی نہیں ہے اور جو مال بھی خرچ کرو گے (اس کا اجر) تمھیں پورا پورا دیا جائے گا اور تم پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (خیرات) ان فقرا کا حق ہے، جو اللہ کی راہ میں (کسب معاش سے) روک دیے گئے ہیں۔ وہ (امور دین میں ہمہ وقت مشغول رہنے کی باعث) زمین میں چل پھر بھی نہیں سکتے، ان کے طمع سے باز رہنے کی باعث نادان (جو ان کے حال سے بے خبر ہیں) انھیں مالدار سمجھے ہوئے ہیں۔تم انھیں ان کی صورت سے پہچان لوگے وہ لوگوں سے بالکل سوال ہی نہیں کرتے کہ کہیں (مخلوق کے سامنے) گڑگڑانا نہ پڑے۔اور تم مال بھی جو خرچ کرو اسے اللہ خوب جانتا ہے۔وہ لوگ (اللہ کی راہ میں) شب و روز مال پوشیدہ اور ظاہر کرتے ہیں تو ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے اور (روز قیامت) ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔''(البقرۃ:۲۶۷-۲۷۴)

قرآن نے انسانی مساوات کا درس دیا ہے کہ تمام انسان اپنی تخلیق کے اعتبار سے اللہ رب العزت کے یہاں برابر ہیں،لیکن جو شخص اپنے رب کے حکم کی تعمیل اور اس کی اطاعت میں آگے بڑھ جاتا ہے اس کو دوسروں پر فوقیت حاصل ہو جاتی ہے۔تخلیق کے اعتبار سے تمام انسان اگرچہ برابر ہیں،لیکن وسائل زندگی کے اعتبار سے نہیں۔یعنی تمام انسانوں کو وسعت کے ساتھ مال و دولت عطا نہیں فرمایا گیا۔اگر تمام لوگوں کو مالی فراخی میسر آجاتی تو وہ زمین پر بغاوت کر دیتے۔

(اگر اللہ اپنے تمام بندوں کے لیے رزق کو کشادہ کر دیتا تو وہ زمین میں سرکشی کرنے لگتے،لیکن وہ ایک اندازے سے رزق اتارتا ہے جتنا چاہتا ہے، بے شک وہ اپنے بندوں

کے احوال سے خوب آگاہ ہے)۔ (الشوریٰ: ۲۷) اگر اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو مال و دولت کے اعتبار سے یکساں بناتا تو دنیا کا نظام تباہ و برباد ہوجاتا۔ ساری زمین میں فتنہ و فساد کے شعلے بھڑک اٹھتے۔ انسانی معاشرہ میں جو زندگی کے مختلف کاموں میں مختلف انسانوں کی ضرورت پیش آتی ہے وہ پوری نہ ہوتی، اس لیے تمام انسانوں کو برابر مال و دولت عطا نہیں کی گئی۔

جس طرح مال و دولت کا زیادہ فرق بھی طبقات کو پیدا کرتا ہے۔ تمام انسانوں کے لیے برابر وسائل کی تقسیم معاشرتی بگاڑ کا باعث ہے۔ دوسری طرف وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم طبقات کو جنم دیتی ہے۔ اگر وسائل کو حلال وحرام کی تمیز کے بغیر کسی شخص کے پاس جمع کرنے کی اجازت دے دی جائے تو تمام وسائل آہستہ آہستہ چند افراد کے پاس جمع ہوتے چلے جائیں گے جس کے نتیجہ میں امراء اور محروم لوگوں کے درمیان طبقات پیدا ہوجائیں گے۔ ایک طرف صاحب ثروت لوگ ہوں گے تو دوسری طرف غربت سے پسے ہوئے لوگ۔ محروم اور غربت میں پسے ہوئے لوگوں کے ہاتھ صاحب ثروت لوگوں کے گریبانوں تک جا پہنچیں گے۔ اس طرح طبقاتی جنگ معاشرہ انسانی کی تباہی و ہلاکت کا سبب بن جائے گی۔

فلسفہ زکوٰۃ کے لیے راہ اعتدال:

چونکہ مذکورہ دونوں صورتیں انسانی معاشرہ کا امن وسکون برباد کرنے کا باعث ہیں، اس لیے اسلام نے ان دونوں کو رد کر کے اعتدال کا راستہ عطا فرمایا۔ مالی وسائل کے اعتبار سے تمام انسانوں کو برابر بھی نہیں کیا، تاکہ معاشرتی نظام چلتا رہے اور مختلف لوگ انسانی ضروریات کی تکمیل کے لیے مختلف کام اور مختلف ذمہ داریاں نبھاتے رہیں اور وسائل کی ایسی غیر منصفانہ تقسیم کی اجازت بھی نہیں دی جس سے امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا چلا جائے، جس کے نتیجہ میں نفرت اور حسد کی آگ بھڑک اٹھے جو کسی وقت پورے معاشرۂ

انسانی کو تباہ کردے۔ افراط وتفریط کے ان دونوں انتہاؤں کے درمیان توازن پیدا کرنے اور ان دونوں صورتوں میں پیدا ہونے والے نقصانات کے ازالہ کے لیے اسلام نے صاحب ثروت لوگوں پر زکوٰۃ کو فرض کیا تاکہ ان کے وسائل سے کچھ حصہ لے کر محروم لوگوں کی محرومی کا خاتمہ کیا جائے۔

"**توخذ من اغنیاء هم و تردالی فقراء هم**" (زکوٰۃ اغنیا سے وصول کی جائے گی اور ان کے فقرا میں لوٹا دی جائے گی)۔

یہ قرآن کا زکوٰۃ کے لیے راہ اعتدال ہے کہ اغنیا سے لے کر فقرا کو دے دی جائے تاکہ وہ غریب سے غریب تر نہ ہوجائیں اور اغنیا امیر سے امیر تر نہ ہوجائیں۔

زکوٰۃ صاحب ثروت کا فرض اور مستحق کا حق:

اللہ تعالیٰ نے متقین کے اوصاف میں ارشاد فرمایا: "اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کے لیے حق ہے۔" گویا زکوٰۃ ادا کرنے والا اپنے اس عمل سے دوسرے پر احسان نہیں کر رہا ہے کہ زکوٰۃ ادا کر کے ان محروموں اور غریبوں پر احسان کرتا ہے، اس لیے ساری زندگی اس کے مرہون احسان ہونا چاہیے، بلکہ اس قبیح طلب کے خاتمہ کے لیے قرآن نے تقین کی اوصاف میں یہ بھی شمار کرادیا کہ ان کے مالوں میں محروم کے لیے حق ہے۔ اس طرح سے زکوٰۃ ادا کر کے احسان نہیں کیا، بلکہ ان غرباء اور مساکین کا حق تھا جس کو اپنے فرض سے سبکدوش ہوا ہے۔

خلاصہ:

یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن نے زکوٰۃ کو جہاں اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرنے کا ایک ذریعہ بتایا وہیں سماجی نظام میں انتشار اور حسد ونفرت کے بھڑکنے والے شعلوں کو نظام

زکوٰۃ سے بالکل دبا دیا اور معاشرتی نظام کو اتنا مستحکم بنا دیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ زکوٰۃ کے نظام میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ مالدار اپنے مال کو بڑھا کر بالکل مالدار نہ ہو جائیں اور غریب غریب ہی نہ رہ جائے اور نان شبینہ تک کا محتاج نہ رہے، بلکہ مالداروں کے لیے ضروری کر دیا کہ اپنے مال کا ایک متعین حصہ غریبوں کو دو یہ تمہارے اوپر فرض ہے۔ اس سے اللہ کی رضا بھی حاصل ہوگی اور غریب ومحروم اپنی محرومی سے باہر نکل سکیں گے۔ ساتھ ہی واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ یہ جو مال کا حصہ تم نے غربا کو دیا ہے اس کے بدلے تم ان پر احسان نہ جتانا، بلکہ یہ تو تمہارے مال میں ان کا حق تھا جو ہم نے متعین کیا ہے۔ اسے ادا کر کے تم اس فرض سے سبکدوش ہو گئے جو ہم نے تم پر عائد کیا تھا۔

☆☆

سنن ترمذی میں ابواب فضائل القرآن
(ایک مطالعہ)

● مولانا عبداللہ مدنی جھنڈانگری

سنن ترمذی کے مصنف کا اسم گرامی محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک السلمی الترمذی ہے، کنیت ابوعیسیٰ ہے۔ حافظ ابن اثیر رحمہ اللہ نے آپ کے تعارف میں یہ جملہ تحریر فرمایا ہے: ''**أحد الأئمة الذين يقتدى بهم فى علم الحديث وأحد العلماء الحفاظ الأعلام**''. آپ کی ولادت ۲۰۰ھ میں ہوئی۔ سن وفات دوسو اناسی (۲۷۹ھ) ہے۔

امام ابوعیسیٰ ترمذی کی کتاب جامع الترمذی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ خود مصنف کے بقول: **من كان فى بيته هذا الكتاب فكأنما فى بيته نبىٌّ يتكلم**. ''جس کے گھر میں یہ کتاب ہو گویا اس گھر میں نبی محو کلام ہیں۔''

بعض اعتبار سے جامع ترمذی کو دیگر کتب حدیث میں امتیاز حاصل ہے۔ حسن ترتیب، عدم تکرار، فقہی مذاہب اور استدلال کے بیان اور اقسام حدیث: صحیح، حسن، ضعیف، غریب اور معلل کی وضاحت کی بنیاد پر یہ کتاب نمایاں مقام کی حامل ہے، البتہ اپنی جلالت علمی کے باوجود احادیث کی تصحیح وتحسین میں آپ کو متساہل قرار دیا گیا ہے۔ علامہ ذہبی ''میزان الاعتدال'' میں رقم طراز ہیں:

''**لا يعتمد العلماء على تصحيح الترمذى**''.

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ امام ترمذی جب تصحیح وتحسین میں متفرد ہوں، تو ان پر اعتماد نہیں کیا جاتا، لیکن جب دوسرے ان کی موافقت کرتے ہوں تو تصحیح وتحسین قابل اعتماد ہے۔ (تفصیل کے لیے مقدمہ تحفۃ الاحوذی ملاحظہ فرمائیں)

اس مختصر سی ضروری تمہید کے بعد ''ابواب فضائل القرآن'' پہ ایک نظر ڈالی جارہی ہے۔

ابواب فضائل القرآن کے تحت ۲۵ ابواب قائم کیے گئے ہیں، جن میں کل ۵۲ احادیث مذکور ہیں۔ ''باب ما جاء فی سورة الاخلاص'' میں سب سے زیادہ ۶ حدیثیں لائی گئی ہیں۔ سورۃ بقرہ اور آیۃ الکرسی کی فضیلت میں ۴، بقیہ کسی باب میں ۲-۲، ۳-۳، دیگر ۱۹ ابواب میں ایک ایک حدیث ذکر کی گئی ہے۔

قرآن کریم کی فضیلت، قاری قرآن کی عظمت، تعلیم قرآن کا بیان، تلاوت قرآن کا اجر، قرآن سے بے توجہی کی بے برکتی، حفظ کے بعد قرآن بھولنے کا گناہ، نبی اکرم ﷺ کا اسلوب قرأت وتلاوت، قرآن کی تلاوت اور اللہ سے سوال، تبلیغ قرآن کی شدید خواہش جیسے ابواب کے علاوہ بقیہ ابواب کا تعلق، **فاتحة الكتاب، آيت الكرسی، سورة بقره** کی آخری آیات، **سورة آل عمران، سورة كهف، سورة يٰسين، حٰم الدخان، الملك، إذازلزلت، أخلاص** اور **معوذتين** کے فضائل سے ہے۔

☆ آغاز **فاتحة الكتاب** کی فضیلت کے بیان سے ہوا ہے۔ حدیث کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ روایت میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو لازم قرار دیا گیا اور سورۃ فاتحہ کی بابت آپ نے فرمایا کہ اس کے مثل تورات، انجیل، زبور اور خود قرآن میں دوسری کوئی سورت نہیں ہے۔ اس روایت میں سورۃ فاتحہ کا نام **أم القرآن** اور **سبع مثانی -سبعٌ من المثانی-** بھی بتایا گیا ہے۔ یہ روایت حسن صحیح ہے۔

☆ دوسرا باب سورہ بقرہ اور آیت الکرسی سے متعلق ہے۔ راوی حضرت ابو ہریرہ رضی

اللہ عنہ ہیں۔ اس روایت سے سورۃ البقرۃ کی فضیلت بایں طور واضح ہوتی ہے کہ آپ نے ایک نوعمر کو سورہ بقرہ حفظ ہونے کی وجہ سے ایک جماعت کا امیر مقرر فرمایا تھا۔ الفاظ ہیں:

أمعك سورة البقرة؟ قال: نعم، قال: ''اذهب فأنت أميرهم.'' اشراف میں سے ایک صاحب گویا ہوئے، اللہ کے رسول! خدا کی قسم، سورہ بقرۃ میں نے صرف اس لیے نہیں یاد کیا کہ اسے تہجد میں نہ پڑھ سکنے کا اندیشہ تھا۔ آپ نے فرمایا: قرآن سیکھو، اسے پڑھو، قرآن سیکھنے، اس کے پڑھنے اور عمل کرنے کی مثال ایسی تھیلی کی مانند ہے جو مشک سے بھری ہوئی ہو اور اس کی خوشبو ہر جگہ بکھری ہوئی ہو اور وہ شخص جو قرآن تو سیکھے مگر سو جائے اس حال میں کہ قرآن اس کے سینے میں محفوظ ہو، وہ مشک کی اس تھیلی کی طرح ہے جس کا منھ باندھ دیا گیا ہو۔ یہ روایت درجہ حسن تک پہنچتی ہے۔

سورۃ بقرہ کی فضیلت میں دوسری حدیث اس طرح ہے:

''لاتجعلوا بيوتكم مقابر وان البيت الذى تُقرأ البقرة فيه لا يدخله الشيطان. حديث حسن صحيح''.

اس سے معلوم ہوا کہ گھروں میں ذکر وطاعت کے مشاغل جاری رہیں ورنہ وہ قبرستان کی طرح ہوں گے اور یہ کہ سورہ بقرہ کی تلاوت سے شیطان دور دور رہتا ہے۔ سورہ بقرہ اور آیت الکرسی سے متعلق تیسری اور چوتھی حدیث کو امام ترمذی نے **''هذا حديث غريب''** کہا ہے۔

☆ تیسرے باب میں حضرت ابوایوب کی ایک دیو سے ملاقات کا ذکر ہے، جس کے لیے غول کا لفظ حدیث میں وارد ہوا ہے، جس کے معانی انسانوں کو کھانے والا شیطان یا شکل وصورت اور رنگ وروپ بدلنے والے جن وشیطان ہیں۔ اس شیطان نے حضرت ابوایوب کی گرفت سے رہائی پانے کے لیے شیطان سے بچاؤ کا یہ نسخہ بتایا تھا کہ تم اپنے گھر میں آیت الکرسی پڑھ لیا کرو، شیطان تمہارے قریب نہیں آئے گا۔ نبی اکرم ﷺ نے اس کی

تائید فرمائی اور شیطان کو جھوٹا قرار دیا- **صدقت وهي كذوب** - امام ترمذی کے نزدیک یہ حدیث حسن غریب ہے۔

☆ چوتھے باب کی پہلی حدیث میں سورہ بقرہ کی آخری دو آیتوں کی تلاوت کا فائدہ بتایا گیا ہے کہ اس کے پڑھنے سے ہر شر اور خوف وخطر سے محفوظ رہے گا۔ دوسری روایت سے واضح ہوتا ہے کہ ان آخری آیات کی مستقل تین دن کسی گھر میں تلاوت سے شیطان قریب بھی نہیں جائے گا۔ یہ حدیث نئے نسخوں میں غریب بتائی جاتی ہے، لیکن علامہ منذری نے ترغیب میں اس حدیث کے ذکر کے بعد کہا: **رواه الترمذی وقال حديث حسن غريب، تحفه ۱۵۴/۸**۔

☆ پانچواں باب سورہ آل عمران سے متعلق ہے۔ سورہ بقرہ کی فضیلت کا بیان بھی مذکور ہے۔ راوی نواس بن سَمعان ہیں، حدیث کا حاصل یہ ہے کہ قیامت کے دن سورۃ البقرہ اور آل عمران کے پڑھنے کا ثواب قرآن پڑھنے والے کے آگے ہوگا۔ آپ نے ان کی مثال بھی پیش کی۔ یہ دو الگ الگ چھتریوں کی طرح ہوں گے یا دو کالے گھنے بادلوں کے مانند یا پر پھیلائے ہوئے پرند کے سائبان جیسے۔ یہ سورتیں اپنے قاری کی سفارش بھی کریں گی۔

☆ چھٹے باب میں سورہ کہف کی تلاوت کے وقت بدلی کی شکل میں سکینت وطمانیت کے نزول کا ذکر ہے۔ اس روایت کو امام ترمذی نے حسن صحیح کہا ہے۔

دوسری حدیث بھی حسن صحیح ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سورہ کہف کی ابتدائی آیات پڑھنے سے فتنہ دجال سے محفوظ رہا جاسکے گا۔ ''**من قرأ ثلاث آيات من أول الكهف عصم من فتنة الدجال**''.

☆ ساتویں باب میں مذکور حدیث سورہ یٰسین کی اہمیت کا اظہار کرتی ہے۔ حدیث میں یٰسین کو قرآن کا دل کہا گیا ہے اور فضیلت یہ بتائی گئی ہے کہ اسے ایک بار پڑھنے سے

دس مرتبہ قرآن پڑھنے کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔ (حدیث حسن غریب)

☆ آٹھواں باب **حٰم الدخان** کی فضیلت میں ہے۔ رات کو اس سورت کی تلاوت کرنے والا اس حال میں صبح کرتا ہے کہ اس کے لیے ستر ہزار فرشتے استغفار کرتے ہیں... **أصبح يستغفر له سبعون ألف ملك**. یہ حدیث غریب ہے۔ دوسری روایت: ''**من قرأ حم الدخان في ليلة الجمعة غفر له**''. ہے، یہ حدیث بھی غریب ہے۔

☆ نوویں باب میں سورۃ الملک کی فضیلت بیان کی گئی ہے جو ایک واقعہ کے ضمن میں آئی ہے۔ کسی صحابی نے ایک خیمہ غیر شعوری طور پر ایک قبر پر لگا دیا، اچانک انھوں نے سورۃ الملک پڑھتے ہوئے ایک انسان کی آواز سنی۔ صاحب خیمہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اللہ کے رسول! بلا سمجھے میں نے اپنا خیمہ ایک قبر پر لگا دیا تھا، اچانک اس میں سے ایک انسان کے سورۃ الملک پڑھنے کی آواز سنائی دی، اس نے مکمل تلاوت کی تھی۔ آپ نے فرمایا: ''**هي المانعة، هي المنجية تنجيه من عذاب القبر**''. یہ سورت عذاب قبر سے نجات دلاتی ہے۔

یہ حدیث غریب ہے۔ صاحب تحفہ نے یحییٰ بن عمرو بن مالک کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اس باب کی دوسری روایت بتاتی ہے کہ قرآن کی ایک سورت نے جو تیس آیات پر مشتمل ہے، ایک شخص کی سفارش کی، نتیجے میں اسے بخش دیا گیا۔ یہ حدیث مرتبہ حسن تک پہنچتی ہے۔ تیسری حدیث میں نبی اکرم ﷺ کا یہ معمول بیان ہوا ہے کہ آپ **الم تنزيل** اور **تبارك الذي بيده الملك** پڑھے بغیر نہیں سوتے تھے۔

☆ دسواں باب ''**اذا زلزلت**'' کے فضائل پر مشتمل ہے۔ اس سورت کی تلاوت کرنے والا نصف قرآن کے مساوی ثواب حاصل کرے گا۔ ایسے ہی ''**قل يا أيها الكافرون**'' پڑھنے والا ربع قرآن اور ''**قل هو الله أحد**'' کا قاری ثلث قرآن کی تلاوت کے اجر کا مستحق ہوگا۔ یہ حدیث غریب ہے۔

اس باب کی دوسری روایت میں بھی انہیں سورتوں کے مذکورہ ثواب کا بیان ہوا ہے، یہ حدیث بھی غریب ہے۔

تیسری حدیث میں ایک نادار صحابی کو "قل هو الله أحد"، "إذا جاء نصر الله والفتح"، "قل يٰأيها الكافرون"، "إذا زلزلت الأرض" کے ثواب کے حوالے سے آپ نے شادی کا حکم فرمایا ہے، البتہ اس حدیث میں إذا زلزلت الأرض کا ثواب ربع قرآن کے برابر بتایا گیا ہے، یہ حدیث حسن ہے۔ ابن ابی شیبہ نے ترمذی کی تحسین کے باوجود سلمہ بن وردان کے ضعف کی وجہ سے حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ (تحفہ)

☆ باب نمبر ۱ میں "سورة الأخلاص" اور "سورة اذا زلزلت" کی تلاوت کا اجر وثواب بیان ہوا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ایک شب میں تہائی قرآن تم میں سے کوئی پڑھنے سے قاصر ہے؟ جواباً آپ نے ارشاد فرمایا: جس نے "اللّٰه الواحد الصمد" کی تلاوت کی اس نے ثلث قرآن پڑھ لیا۔ (حدیث حسن)

بعض نسخوں میں "من قرأ قل هو اللّٰه أحد، الله الصمد" بھی ہے۔ ویسے "اللّٰه الواحد الصمد" اس سورت کا نام بھی ہوسکتا ہے، اختلاف قرأت کی بنیاد پر بھی ممکن ہے۔ حضرت عمرؓ "الله أحد الله الصمد" بغیر قل کے پڑھتے تھے۔ (تحفہ)، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بعض علماء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ قرآن احکام، أخبار اور توحید پر مشتمل ہے اور اس سورت میں توحید کا بیان ہے، اس لیے تہائی قرآن کے مساوی ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ "الأحد" اور "الصمد" جمیع اوصاف کمال اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں جو دوسری سورتوں میں وارد نہیں ہوئے۔

ثلث قرآن کے مساوی ہونے کی شرح میں اختلاف ہے۔ صاحب تحفة الأحوذی کا رجحان اس طرف ہے کہ اس سورت کا پڑھنے والا ثلث قرآن کی تلاوت کے

ثواب کا مستحق ہوگا۔

اس باب کی دوسری روایت میں سورہ اخلاص پڑھنے والے کو جنت کی بشارت دی گئی ہے۔

تیسری حدیث میں واضح کیا گیا ہے کہ دن میں جو شخص دوسو مرتبہ "قل هو الله أحد" پڑھے گا، اس کے پچاس برسوں کے گناہ نامہ اعمال سے مٹا دیے جائیں گے، الا یہ کہ وہ قرض دار ہو۔ اسی سند سے ایک دوسری روایت میں ہے۔ آپ نے فرمایا: جو آدمی اپنے بستر پہ سونے کا ارادہ کرے اور دائیں کروٹ پر لیٹے پھر سو بار "قل هو الله أحد" پڑھے، قیامت کے دن اللہ اس سے کہیں گے: "يا عبدی أدخل علی يمينک الجنة". (میرے بندے! داہنی جانب جنت میں داخل ہوجاؤ)۔ (حدیث غریب)

چوتھی حدیث میں "قل هو الله أحد" کو ثلث قرآن کے برابر بتایا گیا ہے۔

پانچویں حدیث میں نبی اکرم ﷺ کا فرمان نقل ہوا: اکٹھے ہوجاؤ میں تمہارے سامنے ثلث قرآن کی تلاوت کروں گا۔ کچھ لوگ جمع ہوگئے۔ نبی اکرم ﷺ تشریف لائے، آپ نے "قل هو الله أحد" کی تلاوت فرمائی، پھر گھر میں داخل ہوگئے۔ لوگ باہم گفتگو کرنے لگے کہ آپ نے فرمایا تھا: ثلث قرآن پڑھوں گا، ایسا لگتا ہے یہ آسمان سے خبر آئی ہے۔ آپ دوبارہ تشریف لائے اور فرمایا: میں نے کہا تھا: ثلث قرآن کی تلاوت کروں گا، یہ سورت ثلث قرآن کے برابر درجہ رکھتی ہے۔ هذا حديث حسن صحيح غريب.

اس باب کی چھٹی اور آخری حدیث کچھ طویل ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک انصاری صحابی مسجد قبا میں امامت کرتے تھے اور کوئی سورت پڑھنے سے قبل ہر رکعت میں "قل هو الله أحد" پڑھا کرتے تھے۔ لوگوں نے اعتراض کیا کہ یا تو صرف "قل هو الله" پڑھیں یا اس کے علاوہ کوئی دوسری سورت پڑھیں۔ وہ اپنے معمول کو چھوڑنے پر رضامند نہ ہوئے، بلکہ یہ بھی کہا کہ تم سب چاہو کہ اسی معمول کے مطابق پڑھتا رہوں تو ٹھیک، ورنہ

امامت چھوڑ دوں۔ وہ ان کی بزرگی کے سبب دوسرے کی امامت بھی ناپسند کرتے تھے۔ آخر کار نبی اکرم ﷺ کو اس کی اطلاع دی گئی، آپ نے استفسار فرمایا کہ ایسا کیوں کرتے ہو؟ ''**قال یا رسول الله انی أحبها فقال رسول الله ﷺ ان حبها أدخلک الجنة.**'' اس سورت کی محبت تمہیں جنت میں لے جائے گی۔ **حدیث حسن غریب (صحیح).**

☆ ''**باب ما جاء فی المعوذتین**'' بارہواں باب ہے۔ تعوذ کے حوالے سے قرآن میں ''**قل أعوذ برب الفلق**'' اور ''**قل أعوذ برب الناس**'' جیسی دوسری کوئی سورت قرآن میں نہیں ہے۔ ان دو سورتوں کے بارے میں آپ نے فرمایا: ''**لم یُرَ مثلُهن**'' سحر اور نظر بد کے لیے یہ دونوں سورتیں مفید ہیں۔ آپ نے سحر کے اثرات کو انہیں کے ذریعے دور فرمایا تھا۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

اس باب کی دوسری حدیث حضرت عقبہ ابن عامر سے مروی ہے، جن کو نبی اکرم ﷺ نے حکم دیا تھا کہ وہ ہر نماز کے بعد معوذتین پڑھ لیا کریں۔ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

☆ قاری قرآن کی فضیلت سے متعلق قائم کردہ باب نمبر ۱۳ میں ماہر و مشاق شخص کے ساتھ تلاوت میں کمزور شخص کے لیے بھی بشارت ہے۔ ماہر تلاوت کرنے والا انبیاء، معززین و مقربین اور اطاعت گزار اشخاص کے ساتھ ہوگا جبکہ اٹک اٹک کر پڑھنے والے کے لیے دوہرا اجر ہوگا۔

اس کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ تلاوت میں کمزور شخص ماہر تلاوت کرنے والے سے زیادہ اجر پائے گا، بلکہ اسے قرأت کا اجر بھی ملے گا اور مشقت برداشت کرنے کا ثواب بھی۔

اس باب کی دوسری روایت ضعیف ہے جس کے مطابق قرآن پڑھنے والا، یاد کرنے والا اور اس پر عمل کرنے والا جنت میں داخل ہوگا اور اس کی سفارش سے اس کے اہل خانہ میں سے دس افراد جنت میں جائیں گے جو جہنم کے مستحق تھے۔

☆ چودھواں باب قرآن کریم کی فضیلت سے متعلق ہے۔ ذکر کردہ حدیث کی سند مجہول ہے، اس روایت میں قرآن کو فتنے سے نجات کا سبب بتایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کئی ایک خصوصیات بھی بیان کی گئی ہیں۔

☆ پندرہویں باب کا تعلق تعلیم قرآن سے ہے۔ ابوعبدالرحمٰن تابعی نے حضرت عثمانؓ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **خیرکم من تعلم القرآن وعلمه.** ''سب سے بہتر تم میں وہ شخص ہے جو قرآن کو سیکھے اور اس کی تعلیم عام کرے۔'' راوی حدیث ابوعبدالرحمٰن کہتے ہیں: اسی فضیلت کے پیش نظر میں یہاں بیٹھ کر قرآن کی تعلیم میں مشغول ہوں۔ یہ سلسلہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے سے حجاج بن یوسف کے عہد تک قائم رہا۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

☆ سولہویں باب میں قرآن کے ایک حرف کے پڑھنے کا ثواب بیان کیا گیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جس نے قرآن کا ایک حرف پڑھا، اس کے بدلے ایک نیکی ملے گی اور ہر نیکی کا ثواب دس گنا ہوگا۔ آپ نے ''**الم**'' کو ایک حرف نہیں قرار دیا بلکہ **الف، ل، م** کو علیحدہ علیحدہ حرف شمار فرمایا۔ **حدیث حسن صحیح غریب.**

☆ سترہواں باب ''قرآن اللہ سے تقرب کے لیے بے مثل ہے۔'' اس میں دو رکعت نماز کی ادائیگی کو اللہ کے نزدیک افضل عمل بتایا گیا ہے اور یہ کہ بندہ جب تک نماز میں مشغول ہوتا ہے اس کے سر پر نیکیوں کی جھڑی لگی ہوتی ہے۔ **ان البر لیُذر علی رأس العبد مادام فی صلاته.** یہ بھی بتایا گیا کہ قرآن اللہ سے تقرب کے لیے بے مثل نسخہ ہے۔ یہ حدیث غریب ہے، بکر بن خنیس متکلم فیہ ہیں۔

☆ باب نمبر اٹھارہ میں حضرت عبداللہ ابن عباس سے روایت ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جس شخص کے اندر قرآن کا کوئی جز نہیں ہے یعنی اسے قرآن یاد نہیں ہے وہ ویران گھر کی طرح ہے۔ **حدیث حسن صحیح.**

اس باب کی دوسری روایت حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: صاحب القرآن سے کہا جائے گا، پڑھو اور چڑھتے جاؤ، جس طرح دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھتے تھے اسی طرح پڑھو۔ قرآن کی آخری آیت تک جہاں پہنچو گے وہی تمہاری منزل قرار پائے گی۔ **حدیث حسن صحیح.** باب کی تیسری روایت میں بیان ہوا ہے کہ قیامت کے دن قرآن صاحب قرآن کے لیے اللہ سے عرض کرے گا: مولا! اسے زیور سے آراستہ کردے، تو اسے کرامت کا تاج پہنایا جائے گا۔ دوبارہ عرض کرے گا: اللہ مزید عنایت فرما، پھر کرامت کا خلعت عطا ہوگا۔ قرآن کہے گا: اللہ اس سے راضی ہوجا۔'' اللہ اس سے راضی ہوجائے گا اور کہے گا: تم قرآن پڑھو اور درجات عالیہ تک چڑھتے جاؤ۔ ہر آیت کے بدلے ایک نیکی بڑھائی جائے گی۔ **حدیث حسن صحیح.**

☆ باب نمبر ۱۹ میں قرآن یاد کرنے کے بعد بھلا دینے کو بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: میرے آگے میری امت کی نیکیاں لائی گئیں۔ اس میں مسجد سے نکالے جانے والے تنکے کا بھی ذکر تھا۔ میری امت کے گناہ بھی پیش کئے گئے، اس میں ذنب اعظم یہ تھا کہ قرآن کے حفظ کی توفیق ملنے کے بعد اسے بھلا دیا گیا۔ حدیث غریب ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں: اس حدیث کا تذکرہ میں نے محمد بن اسماعیل سے کیا، ان کے نزدیک یہ معروف نہیں تھی۔ **فلم یعرفه و استغربه.**

☆ **''من قرأ القرآن فلیسأل الله به''** بیسواں باب ہے۔ قرآن پڑھنے والے کو اپنی حاجت کا اظہار اللہ سے ہی کرنا چاہئے۔ حضرت عمران بن حصین کا گزر ایک شخص کے پاس سے ہوا جو قرآن پڑھ کر بھیک مانگ رہا تھا۔ آپ نے **''انا لله وانا اليه راجعون''** پڑھتے ہوئے فرمایا: میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے سنا ہے کہ جو قرآن پڑھے اسے اللہ سے ہی سوال کرنا چاہئے۔ مستقبل میں کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو قرآن پڑھ کر لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کریں گے۔ **حدیث حسن.**

دوسری روایت حضرت صہیب سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو قرآن کی حرام کردہ اشیاء کو حلال سمجھے وہ مومن نہیں ہے۔ تیسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کو آہستگی سے پڑھنا چاہئے۔ فرمایا: **''الجاهر بالقرآن كالجاهر بالصدقة والمُسِرُّ بالقرآن كالمُسرّ بالصدقة. حديث حسن غريب.**

☆ باب نمبر ۲۱ میں سونے سے قبل سورہ بنی اسرائیل وزمر پڑھنے کا بیان ہے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے: **''كان النبي، ﷺ لا ينام حتى يقرأ بني اسرائيلَ والزمر.''** امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن غریب کہا ہے۔

باب کی دوسری حدیث حضرت عرباض بن ساریہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں: آپ کا معمول تھا کہ سونے سے قبل **مسبّحات** پڑھتے تھے اور فرمایا: اس میں ایک ایسی آیت ہے جو سو آیتوں سے بہتر ہے۔ حدیث حسن غریب ہے۔ **مسبّحات** سے مراد وہ سورتیں ہیں جن کے آغاز میں **سُبحانَ یا سَبَّحَ یا یُسَبِّحُ یا سَبِّحَ** جیسے الفاظ مذکور ہیں، جو سات ہیں: **سبحان الذی أسری، الحدید، الحشر، الصف، الجمعة، التغابن، الأعلی.** سو آیات سے بہتر آیت لیلۃ القدر کی طرح مخفی رکھی گئی ہے، تاکہ تمام سورتوں کی تلاوت کی جاتی رہے۔ یہ روایت حسن غریب ہے، راوی بقیہ ابن الولید کے بارے میں کلام کیا گیا ہے۔ یہ **کثیر التدلیس** ہیں۔

☆ باب نمبر ۲۲۔ سورۂ حشر کی آخری آیات پڑھنے کی فضیلت میں ہے۔ فرمان نبوی میں بتایا گیا ہے کہ جس نے صبح کے وقت تین بار **''أعوذ باللّٰه السميع العليم من الشيطان الرجيم''** پڑھ کر سورۂ حشر کی آخری تین آیات پڑھیں، اللہ ربّ العالمین اس کے لیے ستر ہزار فرشتوں کو مقرر فرمائیں گے، جو شام تک اس کے لیے دعائے رحمت کرتے رہیں گے۔ اسی دن اگر اسے موت آگئی تو وہ درجہ شہادت پر فائز ہوگا۔ جو شخص ان آیات کو شام کے وقت پڑھے گا صبح تک اسے یہی شرف حاصل ہوتا رہے گا۔ **حدیث حسن غریب.**

☆ باب نمبر۲۳۔اس میں آپ کی قرأت کا اسلوب بیان کیا گیا ہے۔اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ نے وضاحت فرمائی ہے کہ آپ نماز پڑھتے پھر اتنی دیر تک سوجاتے ،جتنی دیر نماز پڑھی تھی۔پھر آپ اتنی ہی دیر نماز پڑھتے جتنی دیر کے لیے آپ سوئے تھے، پھر آپ اتنی دیر کے لیے سوجاتے جتنے وقت تک نماز ادا کی تھی۔صبح تک یہی کیفیت رہتی تھی۔ حضرت اُمّ سلمہ نے پھر آپ کی تلاوت کا انداز بیان کیا:

”**فاذا هى تنعتُ قراءةً مفسرةً حرفاً حرفاً**“ آپ کا طرز تلاوت اس طرح تھا کہ ہر حرف شمار کیا جاسکتا تھا۔**حديث حسن صحيح غريب.**

اس باب کی دوسری حدیث میں اس امر کی حضرت عائشہؓ کی جانب سے ایک سوال کے جواب میں وضاحت ہوئی ہے کہ وتر، شب کے اوّل وآخر دونوں حصوں میں پڑھی جاسکتی ہے۔شریعت نے گنجائش رکھی ہے، صلاۃ اللیل میں قرأت جہراً وسراً دونوں کی جاسکتی ہے۔اسی طرح غسل جنابت سے متعلق یہ آسانی ہے کہ چاہے تو سونے سے قبل غسل کرلے یا صرف وضو کرکے سوجائے (پھر اٹھ کر غسل کرلے)۔حدیث حسن غریب۔ شریعت میں دی جانے والی سہولیات اللہ کی نعمت ہیں۔اس کو جذبہ شکر کے ساتھ قبول کرنا چاہئے۔(تحفہ)

☆ باب نمبر۲۴۔حدیث میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ کی اس شدید خواہش کا ذکر کیا ہے جس کا اظہار قرآنی تعلیمات کو عام کرنے کی غرض سے آپ قبائل کے سامنے موسم حج میں فرماتے تھے:**ألا رجلٌ يَحمِلُني إلى قومِه فان قريشا قد مَنعوني أن أُبلّغَ كلامَ ربّي.** ”کوئی ایسا شخص ہے جو مجھے اپنی قوم تک لے چلے، قریش نے تو مجھے اپنے رب کا کلام دوسرے تک پہنچانے سے روک رکھا ہے۔

(حديث حسن صحيح غريب، صححه الحاكم)

حدیث مذکور کی باب سے مناسبت اس طرح ہے کہ جب آپ قرآن کی تبلیغ ودعوت کا

فریضہ انجام دیتے تو تلاوت مرتّل ہوتی، ہر ہر حرف واضح ہوتا تا کہ لوگ مستفیض ہوں اور غور وفکر کرسکیں۔

☆ باب نمبر۲۵۔اس باب میں ذکر کردہ حدیث میں اللہ کی طرف سے یہ بشارت ہے کہ جس شخص کو تلاوت قرآن میں مشغولیت کے سبب ذکر ودعا کی مہلت نہ ملی اسے اپنی حاجت طلب کرنے والوں سے بہتر اور زیادہ عطا کیا جاتا ہے۔اللہ کے کلام کی فضیلت دوسرے کلام کے مقابلے میں ایسے ہی ہے جیسے مخلوق کے مقابلے میں خود اللہ کی عظمت۔ حدیث غریب۔عطیہ العَوفی اور محمد بن الحسن بن ابو یزید الہمدانی ضعیف ہیں۔اگر یہ روایت ضعیف نہ ہوتی تو ذکر ودعا سے زیادہ اجر وثواب قاری قرآن کو حاصل ہونے کی بڑی واضح دلیل بنتی۔

ابـواب فـضـائـل القرآن کی ۱۵۲ احادیث میں سے ۲۹ صحیح روایات ہیں، جنہیں محدث عصر علامہ محمد ناصر الدین البانی نے **صحيح سنن الترمذى** میں شامل فرمایا ہے۔

مذکورہ روایات سے قرآن کریم کی عظمت روز روشن کی طرح عیاں ہو رہی ہے۔ قرآن کریم کی تلاوت کرنے والوں کا اجر وثواب اور مقام ومرتبہ واضح ہو رہا ہے۔قرآن اپنے پڑھنے والوں کے لیے ایک ایسے حصار کے طور پر سامنے آرہا ہے جس سے شیطان کے مکر سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔اس سے نظر بد اور جادو کے اثرات کا ازالہ ہوتا ہے۔یہ انسانیت کے لیے مشعل راہ ہے، باعث ہدایت وطمانیت ہے۔اس کی تلاوت سے دنیاوی سعادتوں اور اخروی نعمتوں کے حصول کی امید ہوتی ہے۔قرآن کا متعلّم افضلیت کا مستحق قرار پاتا ہے اور معلم قرآن سب سے بہتر ہونے کا لقب حاصل کرتا ہے۔ہر ہر حرف کے بدلے نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔قرآن سے لگاؤ رکھنے والے تاج وخلعت سے نوازے جائیں گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں اللہ کی رضامندی حاصل ہوگی جس سے بڑی کسی دوسری نعمت کا مرد مومن کے نزدیک کوئی تصور ہی نہیں ہے۔

قرآن کے مقصد نزول پر توجہ

ترمذی کے ابواب فضائل قرآن میں مذکور نبی اکرم ﷺ کی احادیث مبارکہ سے قرآن کی جو عظمت و رفعت آشکارا ہو رہی ہے، امت ان کی روشنی میں اپنا جائزہ لے کہ اس عظیم الشان کتاب سے ہمارا تعلق کس حد تک ہے؟ کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ امت کے بیشتر افراد قرآن کریم کے مقصد نزول سے ناواقف ہیں، اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا تو دور خود اس کی تلاوت سے بھی غفلت برتی جا رہی ہے۔ کیا یہ افسوس ناک امر نہیں ہے کہ ایک بڑی تعداد بچپن میں قرآن کی تعلیم نہیں حاصل کر پا رہی ہے۔ سمجھنا کیا پڑھنا بھی نہیں جانتی۔

ایک طرف اس کتاب حکیم سے ہماری بے توجہی کا یہ عالم ہے، دوسری طرف دنیا اس کتاب کو اپنے لیے ایک چیلنج سمجھ رہی ہے۔ کہیں قرآنی آیات کو تبدیل و تحریف کا نشانہ بنا کر اسے بے اثر کیے جانے کی سعی ہو رہی ہے۔ کہیں مخصوص آیات کو قرآن سے خارج کیے جانے کے مطالبات کیے جا رہے ہیں۔ دنیا یہ حقیقت تسلیم کر چکی ہے کہ جب تک قرآن باقی ہے، قرآنی تعلیمات زندہ ہیں، دلوں میں قرآن کی عظمت برقرار ہے، مسلمانوں کو ان کی مخصوص ثقافت سے کاٹنے کی ہر کاوش رائیگاں جائے گی۔ کاش! ہم اپنے عقائد و اعمال قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ڈھال لیں۔ اسے اپنی زندگی کا دستور بنا لیں اور ہمارے شب و روز کے معمولات اسی کے مطابق انجام پائیں۔

☆☆

قرآن کریم علم و حکمت کا خزانہ

● اشرف فردوسی ندوی

حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے نبوت کا سلسلہ چلا آ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ انسانوں کی ہدایت کے لیے کتابیں نازل کرتا رہا ہے، یہاں تک کہ آخری نبی رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے اور آپ کی بعثت کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے آخری نبی کو ایک عظیم الشان کتاب عنیت کی جس کو قرآن کریم کہتے ہیں۔ اس کتاب میں تمام قوانین منضبط کر دیے گئے ہیں جو قیامت تک انسانی زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین پوری توجہ کے ساتھ اس کتاب کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کتاب نے مسلمانوں کے ذہن کھول دیے اور اپنے متبعین کو اس کتاب نے اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اس عالم کونین میں غور و فکر کریں، اس کے اسرار کو تلاش کریں، اس کے غوامض کو منور کریں۔ چنانچہ ایسے بڑے بڑے ماہرین فن علماء و فضلاء پیدا ہوئے جنھوں نے راستہ کو منور کر دیا اور اپنے مابعد والوں کے لیے اس پر چلنا آسان کر دیا۔ یہی وہ کتاب ہے جس نے فکر اسلامی کے لیے آفاق جدیدہ پیدا کیا اور علماء و فضلاء نے ان آفاق میں گم ہو کر منہج کا پتہ چلایا اور ایک قیمتی تہذیب و تمدن دنیا کے سامنے پیش کیا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے ''العلماء ورثۃ الانبیاء'' اس فرمان کے تحت سلف صالحین میں بڑے بڑے علماء و فضلاء نے اس ثقیل میراث کو اپنی گردن پر اٹھا لیا اور اسی چیز نے ان کو اس نتیجہ تک پہنچایا کہ دنیا کی تمام اشیاء کی جستجو کے قبل حقیقت علم کی تلاش کی جائے اور اس

چیز نے فکر عربی کو تمام تقلیدی قیود سے بھی بالکل آزاد کر دیا۔ حضارت انسانی کے ماہرین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مسلمان ہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اسلام کے زیر سایہ دنیا کی سب سے اعلیٰ تہذیب وتمدن پیدا کیا اور اپنی نظروں کو نہ صرف دینی مسائل، بلکہ دنیا کے تمام تجرباتی مسائل کی طرف متوجہ کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے بے شمار علوم وفنون ایجاد کیے جن کا ان کے قبل کچھ پتہ بھی نہیں تھا۔ اس طرح سے ان لوگوں نے اپنے کو اس بات کا حقدار ثابت کر دیا کہ یہ عالم اسلام کے اساتذہ شمار کیے جائیں۔ مسلمانوں نے مختلف علوم و فنون کی ایجادیں کیں اور یہ سب کچھ قرآن کریم کی مرہون منت ہے۔ مثلاً:

(۱) جب میدان جنگ میں قراء صحابہؓ بہت زیادہ شہید ہونے لگے تو حضرت ابوبکرؓ کو اندیشہ پیدا ہوا کہ اس طرح سے کہیں قرآن نہ ضائع ہو جائے، تب انھوں نے قرآن کو ایک کتابی شکل میں جمع کرا دیا، کیونکہ یہ قرآن کی حفاظت کا سب سے اہم وسیلہ اور ذریعہ تھا۔

(۲) جب حضرت عمر بن الخطابؓ نے محسوس کیا کہ قرآن وسنت کا سمجھنا اہل لسان کے کلمات پر زیادہ موقوف ہے، کیونکہ قرآن وحدیث میں دقیق اشارے اور غریب عبارتیں بھی موجود ہیں تو انھوں نے اشعار جاہلیت کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور اپنے خطبہ میں فرمایا: ''اپنے دیوان کو اختیار کرو گم نہ ہونے پائے۔'' لوگوں نے پوچھا: یہ دیوان کیا ہے؟ تو فرمایا: دور جاہلیت کے اشعار جن میں تمہاری کتاب کے معنی موجود ہیں۔ اس طرح سے ''عربی ادب'' کے فن کی بنیاد پڑ گئی۔

(۳) جب حضرت علیؓ نے محسوس کیا کہ عجمی لوگ عربی میں غلطی کرتے ہیں اور ایسا نہ ہو کہ بعد میں عربیت ضائع ہو جائے تو انھوں نے علم 'نحو' کی بنیاد رکھی، کیونکہ 'نحو' ہی زبان عربی کی حفاظت کا اہم ذریعہ ہے اور زبان عربی کی حفاظت کتاب وسنت کے سمجھنے کا ذریعہ ہے۔

(۴) بڑے بڑے صحابہؓ اور تابعینؒ نے جب یہ بات سمجھ لی کہ ہر شخص خود بخود معانی

قرآن کما حقہ نہیں سمجھ سکتا تب وہ لوگ اس کی تفسیر میں مشغول ہوئے اور ان لوگوں نے ''تفاسیر'' کی تدوین کی، پھر احادیث نبویہ کو مدون کیا، کیونکہ اتباع شریعت کا واحد اہم ذریعہ یہی دونوں ہیں۔ اس طرح سے 'علم حدیث وتفسیر' کی بنیاد پڑی۔

(۵) ابتدائی دور میں جو حدیثیں منقول ہوئی تھیں وہ سب متواتر اور صحیح نہیں تھیں، بلکہ بعض ان میں سے سنداً صحیح ہوئی تھیں اور بعض غیر صحیح۔ تب ائمہ دین اس طرف متوجہ ہوئے کہ صحیح کو غیر صحیح سے اور معمول کو غیر معمول سے ممیّز کر دیا جائے، اس کے لیے ان لوگوں نے ''علم اصول حدیث'' کی بنیاد رکھی اور ''فن اسماء الرجال'' ایجاد کیا۔

(۶) وہ احکام جو سنت سے لیے جاتے تھے کچھ ان میں سے اعمال کے ساتھ اور کچھ ان میں سے محض اعتقاد کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ کیفیت عمل کسی حد کے ساتھ محدود نہیں ہے، اس لیے احکام علمیہ کثیر ہیں۔ وقت ضرورت کے لیے ان کا حفظ کرنا مشکل ہے، اس لیے ائمہ دین قوانین کلی بنانے کی طرف متوجہ ہوئے تاکہ وقت ضرورت ان سے جزئی مسائل مستنبط کیے جا سکیں۔ اس طرح سے جو علم پیدا ہوا اسے ''فقہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

(۷) جب ائمہ دین مسائل جدیدہ کے استنباط کے لیے بعض مقدمات کلیہ کے محتاج ہوئے اور یہ ایسے مقدمے تھے جن پر بہت سے احکام متفرع ہوتے تھے تو یہ دیکھنے کے لیے کہ فقہ کے کون سے احکام درست اور کون سے غیر درست ہیں ایک جدید علم کی بنیاد رکھی گئی جس کو ''علم اصول فقہ'' کہتے ہیں۔

(۸) ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کے اعتقادات بالکل صحیح وسالم اور محفوظ تھے، لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا امت مسلمہ مختلف فرقوں میں تقسیم ہونے لگے اور باطل پرستوں کا مقابلہ پوری طاقت کے ساتھ کرنے لگے۔ اس مقابلہ میں لوگ کچھ مقدمات کلیہ اور قواعد واصطلاحات عقلیہ کے محتاج ہوئے تاکہ دفاع پورے طور سے ہو سکے تو اس کے لیے ان لوگوں نے ''علم کلام'' کا بہترین فن ایجاد کیا۔ پھر اسی علم کلام کی طاقت سے ائمہ دین نے

باطل پرستوں کے پرخچے اڑا دیے۔

(۹) کتاب وسنت کے الفاظ عربی تھے اور ان کا سمجھنا عرب کی لغت کے سمجھنے پر موقوف تھا تو ان لوگوں نے لغت کو واضح کیا اور اس کو مدون کر کے ایک ''جدید علم لغت'' کی بنیاد رکھی۔

(۱۰) چونکہ شریعت کا ثبوت موقوف تھا، صداقت رسولؐ پر اور صداقت موقوف تھی معجزہ کے ثبوت پر اور سب سے بڑا معجزہ قرآن کریم تھا۔ اس میں مجازات، استعارات اور کنایات بہت زیادہ ہیں، لہٰذا ائمہ دین ان کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کی تحقیق کے لیے ایک نئے علم کی بنیاد رکھی جس کو ''علم البلاغت'' کہتے ہیں۔

(۱۱) چونکہ نماز وروزہ کی ادائیگی کے لیے معرفت ساعات لیل ونہار ضروری تھا۔ اس کے لیے ایک جدید علم کی بنیاد رکھی جس کو ''علم ہیئت'' کہا جاتا ہے۔ اس طرح سے اور بھی بہت سے علوم وفنون مثلاً حساب، عمارت سازی، انجینئرنگ وغیرہ کی طرف مسلمان محض قرآن کریم کی وجہ سے متوجہ ہوئے اور ان علوم کو باقاعدہ مدوّن کیا۔

☆☆

عظمت قرآن اور اس کے تقاضے

● مولانا ارشد سراج الدین مکی

قرآن مجید اللہ وحدہٗ لاشریک کا کلام ہے۔ جس طرح اللہ کی ذات عظیم اور بابرکات ہے، اسی طرح اس کا کلام بھی۔ اللہ کا کلام ہونے کی وجہ سے قرآن مجید کے اندر وہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں، جو کسی اعلیٰ وارفع کلام کے اندر ہونی چاہئیں۔ قرآن کی عظمت کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اللہ کی کتاب ہے اور اس نے قیامت تک اس کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے۔ قرآن آج بھی اپنی اصل صورت میں محفوظ ہے، جیسا کہ وہ ساتویں صدی عیسوی میں محمد عربی ﷺ پر اترا تھا۔ قرآن کا اپنی اصلی صورت میں باقی رہنا اس کو دوسری کتب سماویہ سے ممتاز کرتا ہے۔ یہی محفوظیت قرآن کی اصل امتیازی خصوصیت ہے۔ قرآن کی حفاظت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''**إنّا نحن نزلنا الذكر وانا له لحافظون**''. (**الحجر: ۹**)

(بلاشبہ یہ یاددہانی ہم ہی نے نازل کی ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)۔

''قرآن کی صداقت کا یہ واضح ثبوت ہے کہ آج قرآن لفظاً لفظاً اپنی اصل شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ نہ صرف امت کے حفاظ اِسے نسلاً بعد نسلٍ سینہ بہ سینہ نقل کرتے رہے، بلکہ نبی ﷺ کے زمانے سے یہ تحریری شکل میں بھی منتقل ہوتا رہا ہے۔ اس کا قدیم ترین نسخہ جو خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور جو مصحف عثمانی کہلاتا ہے، آج بھی دنیا میں موجود ہے۔'' (مولانا شمس پیرزادہ، تفسیر دعوۃ القرآن، جلد

اوّل، ممبئی، ۱۹۹۷ء، صفحہ ۷۷)

جہاں قرآن مجید کا ایک ایک حرف اس کی عظمت بیان کر رہا ہے، وہیں رسول اللہ ﷺ نے قرآن مجید کی عظمت ذہن نشین کرنے کے لیے بے نظیر مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو مومن قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال ترنج کی سی ہے کہ اس کی خوشبو بھی عمدہ ہوتی ہے اور اس کا مزہ بھی اچھا ہوتا ہے اور جو مومن قرآن نہیں پڑھتا، اس کی مثال کھجور کی سی ہے کہ اس کی خوشبو تو نہیں ہوتی البتہ مزہ اس کا میٹھا ہوتا ہے۔'' (مسلم جلد اوّل، کتاب فضائل القرآن، باب فضیلۃ حافظ القرآن)

ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ''وہ مومن جو قرآن پڑھتا ہے اور اس کے مطابق عمل کرتا ہے، اس کی مثال ترنج کی سی ہے اور وہ مومن جو قرآن نہیں پڑھتا، مگر اس کے مطابق عمل کرتا ہے، اس کی مثال کھجور کی سی ہے۔''

ان دونوں روایتوں میں فرق کی نوعیت بس اتنی ہے کہ ایک روایت میں قرآن پڑھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کے نتائج بیان کیے گئے ہیں اور دوسری روایت میں قرآن نہ پڑھنے مگر اس کے مطابق عمل کرنے کے نتائج بیان کیے گئے ہیں۔

''کائنات ایک راز ہے اور جو کتاب اس راز کو کھولتی ہے وہ قرآن ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کتاب الٰہی کے بغیر کوئی شخص حیات و کائنات کے معمے کو حل نہیں کر سکتا..... اِس معمے کو خدا کی کتاب حل کرتی ہے۔ اس آسمان کے نیچے آج قرآن ہی ایک ایسا صحیفہ ہے جو پورے یقین کے ساتھ تمام حقیقتوں کے بارے میں ہم کو قطعی علم بخشتا ہے۔ جن لوگوں نے کتاب الٰہی کے بغیر کائنات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے ان کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے اندھوں کے پاس ایک ہاتھی کھڑا کر دیا جائے اور پھر ان سے پوچھا جائے کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے تو جس کا ہاتھ اس کی دم پر پڑے گا وہ کہے گا کہ ہاتھی ایسا ہوتا ہے، جیسے مورچھل۔ کوئی کان ٹٹول کر

کہے گا کہ ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے سوپ۔ کوئی پیٹھ پر ہاتھ پھیرے گا اور کہے گا کہ ہاتھی ایسا ہوتا ہے، جیسے تخت۔ کوئی پاؤں چھو کر کہے گا کہ ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے کھمبا۔ تمام بے خدا فلسفیوں اور مفکروں کا یہی حال ہے۔ انھوں نے کائنات کے اندر حقیقت کو ٹٹولنے کی کوشش کی مگر علم کی روشنی سے چونکہ وہ محروم تھے، اس لیے ان کی تمام کوششوں کا ماحصل اس کے سوا اور کچھ نہ نکلا، جیسے کوئی شخص اندھیرے میں بھٹک رہا ہو اور اٹکل کے ذریعے الٹے سیدھے فیصلے کرتا رہے۔'' (مولانا وحید الدین خاں، عظمت قرآن، مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء، صفحہ ۴۱-۴۵)

اس اعتبار سے مدارس میں پڑھنے اور پڑھانے والے حد درجہ خوش نصیب ہیں۔ انھیں انبیاء کرام کی وراثت حاصل ہے۔ ''العلماء ورثة الانبياء''. ان حضرات کو اس حدیث کا صحیح مصداق بننے کی کوشش کرنی چاہیے، جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

خیر کم من تعلّم القرآن وعلّمه. (بخاری)

''تم میں سے بہترین وہ ہے کہ جس نے قرآن سیکھا اور اسے (دوسروں کو) سکھایا۔''

یعنی اہل ایمان میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں اور قرآن پڑھیں اور پڑھائیں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ دینی مدارس نے ماضی بعید ہی میں نہیں بلکہ ماضی قریب میں بھی اپنی متعدد ذمے داریوں کی ادائیگی کے لیے نہایت گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ انھی خدمات کی قدر افزائی کے لیے علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے یہ الفاظ ایک بڑی حقیقت کا پتہ دیتے ہیں:

''ان مکتبوں (مدرسوں) کو اسی حالت میں رہنے دو۔ غریب مسلمانوں کے بچوں کو انھی مکتبوں میں پڑھنے دو۔ اگر یہ ملا اور یہ درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا، میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ اگر ہندوستان کے مسلمان ان مکتبوں کے اثر سے

محروم ہوگئے تو بالکل اسی طرح جس طرح ہسپانیہ (اسپین) میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ وقرطبہ کے کھنڈر اور الحمراء اور باب الاخوین کے سوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا۔ (یہاں بھی) — تاج محل اور دہلی کے لال قلعہ کے سوا مسلمانوں کی — تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔''

اس چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے ہمیں مدارس کے طلباء میں ایمان ویقین کی برقی لہر دوڑانا ہوگی، جس کے نتیجے میں سند فضیلت حاصل کرنے والے طلباء:

(۱) قرآن وسنت کا گہرا علم اور دینی بصیرت رکھتے ہوں اور اسلامی اخلاق وکردار کے حامل ہوں۔

(۲) اعلاء کلمۃ اللہ کا سچا جذبہ رکھتے ہوں۔

(۳) وقت کے اہم مسائل پر گہری نظر رکھتے ہوں۔ غیر اسلامی نظریات سے بخوبی واقف ہوں اور عصر حاضر کے مسائل ومعاملات پر مطالعہ کرنے کا عزم رکھتے ہوں۔

(۴) گروہی، تنظیمی، فقہی اور مسلکی تعصّبات واختلافات سے بالاتر وسعت قلب و نظر کے ساتھ معاشرے کی اصلاح وتعمیر کا فریضہ انجام دینے کے لیے آمادہ ہوں۔

قرآن کی تدریس:

مدارس نے ماضی میں قرآن کریم کی تعلیم کا جو روشن باب رقم کیا ہے، وہ اب امتداد زمانہ کی وجہ سے صرف اپنی روایتی شکل میں باقی رہ گیا ہے۔ اب صورت حال بڑی ناگفتہ بہ ہے۔ اکثر دینی مدارس میں قرآن کریم کی تعلیم براہ راست متن کی بنیاد پر نہیں دی جاتی۔ قرآن پڑھانے کے بجائے قرآن کی بعض تفسیریں پڑھانے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ قرآن کو براہ راست قرآن سے سمجھنے کی کوشش کم ہی کی جاتی ہے۔ یہ قرآن کی بڑی حق تلفی ہے۔

''معلّم قرآن کا فرض ہے کہ وہ اپنے طلباء کے لیے قرآن فہمی کی راہ ہموار کرے اور ان کے اندر قرآن کا خاص ذوق پیدا کرنے کی کوشش کرے، جیسے ایک سائنس داں کی شاگردی میں اگر طالب علم نے محض سائنس کی کچھ معلومات حاصل کیں اور Scientific attitude اسے حاصل نہ ہو، اس کے سوچنے اور غور کرنے کا ڈھنگ سائنٹفک نہ ہوسکا تو اس نے کچھ حاصل نہ کیا۔ ٹھیک اسی طرح طلباء کے اندر اگر Quranic Attitude پیدا نہ ہو، سمجھئے کہ طلباء نے قرآن سے استفادہ نہیں کیا۔ طالب علم کو اگر وہ نگاہ مل جائے جو قرآن ان کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے اور اسے وہ دل میسر آجائے، جیسا دل قرآن کو مطلوب ہے، اس وقت ہمیں سمجھنا چاہیے کہ قرآن کی تعلیم دینے میں ہمیں کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے، لیکن اگر قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی طلباء تنگ نظر رہے، پستی فکر ونظر سے انھیں نجات نہ مل سکی، کشادہ دلی کی کیفیت، بردباری، عفو وکرم اور ایثار وقربانی کی لذت سے وہ ناآشنا ہی رہے تو سمجھئے کہ وہ قرآن پڑھنے کے باوجود قرآن سے دور ہیں۔ ہم انھیں قرآن کے قریب لانے میں ناکام ہیں۔'' (مولانا محمد فاروق خان، قرآن کے تعلیمی و تدریسی مسائل، دینی مدارس اور ان کے مسائل، مقالات سمینار، اعظم گڑھ، ۱۹۹۰ء)

''عام طور پر قرآن کی تعلیم مکمل کرنے کے باوجود قرآن کے طلباء کی زندگیوں میں کوئی امید افزا تبدیلی کے آثار نظر نہیں آتے۔ وہ قرآن پڑھنے سے پہلے جیسے کچھ تھے قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی وہ وہی رہتے ہیں۔ اُن کی فکر میں نہ وہ وسعت پیدا ہوتی ہے اور نہ ان کے قلب میں وہ فراخی دکھائی دیتی ہے، جو قرآن کو مطلوب ہے..... اس میں جہاں طلباء کی کوتاہیوں کا دخل ہوسکتا ہے، وہیں اس سے کہیں زیادہ طریق تعلیم کا دخل ہے۔ تعلیم دینے والا بالعموم خود اس احساس سے خالی ہوتا ہے کہ وہ کتنی عظیم اور رفیع المرتبت چیز پیش کرنے جارہا ہے اور اس سے خود اس کی اپنی زندگی کتنی منور ہونی چاہیے۔ جو شخص خود عظمت

اور بڑائی کے مفہوم سے بے خبر ہو وہ اپنے طالب علموں کو بڑا کیسے بنا سکتا ہے۔ قرآن کی تعلیم کا مقصد ایسے افراد پیدا کرنا ہے جو بڑائی اور عظمت کے پیکر ہوں.....۔''

(قرآن کی تعلیم و تدریس کے سلسلے میں ایک بڑی کوتاہی، محمد فاروق خاں، دینی مدارس اور ان کے مسائل، اعظم گڑھ، ۱۹۹۰ء، ص ۱۳)

قرآن کی عظمت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ انسان قرآن کو اپنے جملہ مسائل کے لیے راہنما بنائے۔ اسی کتاب کی رہنمائی میں ہی انسانیت کے بھٹکے ہوئے قافلے منزل پا سکتے ہیں۔ اسی کتاب پر عمل کر کے ہی انسانیت کی تعمیر ہو سکتی ہے۔

☆☆

نزول قرآن کا مقصد اور انسانی دنیا پر اس کے ہمہ گیر اثرات

● مولانا محمد عظمت اللہ ندوی

قرآن مجید کا مخاطب انسان ہے اور اس کی غرض و غایت انسان کو سعادت ابدی سے ہمکنار کرنا ہے۔ وہ انسان کے ظاہر و باطن کی ایسی تعمیر کرنا چاہتا ہے کہ حیات اخروی میں وہ سرخرو اور سرفراز ہو جائے۔ قرآن مجید نے اسی غرض و غایت کو سامنے رکھ کر اپنا تعارف کرایا ہے۔ اس سلسلہ کی چند آیات ملاحظہ فرمائیں:

''**ذلک الکتاب لا ریب فیه هدی اللمتقین**''. (**سورة البقرة: ۲**)

''**إن هذا القراٰن یهدی للتی هی أقوم**''. (**سوره اسراء**)

''**وننزل من القراٰن ما هو شفاء ورحمة للمؤمنین**''. (**الاسراء**)

اہل علم کی ایک جماعت جس میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہیں، نے اس کو قرآن کا اصل ہی نہیں، بلکہ اس کا اعجاز قرار دیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے الفوز الکبیر (ص ۲۹) میں صراحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ قرآن مجید کے نزول کا اصلی مقصد انسانوں کو تہذیب و تربیت اور انسان کے عقائد باطلہ اور اعمال فاسدہ کی اصلاح ہے۔ مولانا اویس صاحب ندوی نزول قرآن کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ بے شک قرآن مجید نے دنیاوی زندگی کے تمام اصول و قواعد مرتب فرمائے ہیں، مگر ان تمام امور میں بنیادی نقطہ نظر اخروی سعادت

ہےاورقرآن کااصل موضوع انسان کی رہنمائی ہے جس سے دنیامیں وہ ایسی زندگی گزارے جو آخرت میں اس کے لیے نفع بخش ہواوررضاءالٰہی اس کے نصیب میں آئے۔

متذکرہ بالاعبارتوں کا حاصل یہ ہے کہ قرآن مجید کے احکامات،تعلیمات،ارشادات اور ہدایات ہی اس کے وہ اوصاف خصوصی ہیں جواس کی دعوت کا اصل موضوع ہیں۔

بلاشبہ قرآن حکیم خدا تعالیٰ کی وہ آخری کتاب ہے جومخلوق کی ہدایت اوراس کی اصلاح وتربیت کے لیے پیغمبرآخرالزماں حضرت محمدؐ پرنازل ہوئی۔یہی وہ خدائی دستوراور ابدی قانون ہے جوانسان کی تمام دینی ودنیوی ضروریات کاکفیل اوراس کے فلاح وبہبود کا ضامن ہےاوریہی وہ آخری آسمانی صحیفہ اورمکمل نظام حیات ہے جوتمام شعبہ ہائے زندگی پر حاوی ہے۔عقائدوعبادات سے لےکراخلاق ومعاملات تک سیاست وحکومت سے لےکر بین الاقوامی تعلقات تک،حقوق اللہ سے لےکرحقوق العبادتک اورقیامت تک پیش آنے والے جملہ مسائل کا شافی وکافی حل پیش کرتا ہے۔

۲۳رسال کی مدت میں اس عظیم کتاب کا نزول ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے تاریخ عالم میں وہ بےمثال اورحیرت انگیز انقلاب برپا کیا جس نے اذہان وافکار کی کایا پلٹ دی۔صدیوں پرمحیط انسانیت کی غیرفطری خدابیزارتہذیب اورقانون کا خاتمہ کردیا۔ تمام سابقہ آسمانی کتابوں اورصحیفوں پرخط نسخ پھیردیا۔فکروعمل کی نئی بنیادی استوارکریں اور جاں بلب انسانیت کونئی زندگی،نئی طاقت،نیاتمدن اورنیاعزم ویقین عطا کیا۔دنیانے دیکھ لیا کہ کفروضلالت کےصحرامیں بھٹکنے والےاس کتاب کی برکت سےعظیم ہادی اوررہنما بن گئے۔مشرک،موحداوربت فروش وبت پرست،بت شکن بن گئے۔جاہلانہ حمیت وعصبیت نے دم توڑدیا۔تہذیب وشائستگی کا درس وتمدن کا سبق سکھایا۔اخلاق حمیدہ کے زیور سے آراستہ کیا۔حکومت وسیاست میں رہتے ہوئے زہد وقناعت کا سبق پڑھایا اور جوہر انسانیت کوگوہراخلاق سے مالامال کردیا،جوساربان تھےان کوجہاں بان بنادیا۔

انسانیت دنیاپرقرآن کریم کے ہمہ گیراثرات کے تمام پہلوؤں کا استفادہ کرنا اس مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں ہے،اس لیےقرآن کےان تین بنیادی عناصرعوامل کی نشان دہی کریں گےجن کا نوع انسانی کی رہنمائی اورتعمیروترقی میں اہم کردارر ہا ہے۔وہ قرآنی عوامل ومحرکات درج ذیل ہیں:

(۱) قرآن کااعلان توحید: عقیدہ توحیدانسانیت کے لئے انمول تحفہ

چھٹی صدی مسیحی میں بت پرستی اپنے نقطہ عروج پرپہنچ گئی تھی،صرف ہندوستان میں اس صدی میں معبودوں کی تعداد۳۳رکروڑ تک پہنچ گئی تھی،ضلالت وجہالت کے ایسے تاریک دور میں قرآن نے اللہ کی وحدانیت کا اعلان کیا:''تمہارا معبودصرف ایک اللہ ہے۔'' مفکراسلام مولانا سیدابوالحسن علی ندویؒ رقم طراز ہیں کہ محمد رسولؐ نے قرآن کے ذریعہ انسانیت کوتوحید خالص کا قیمتی عطیہ دیا جومعبودان باطل کا تختہ پلٹ دینے والا ایسا عقیدہ ہے کہ نہ انسانیت نے اس سے پہلے ایسا کوئی عقیدہ پایا تھااورنہ قیامت تک پاسکے گی۔مشہورہندوستانی فاضل پانیکراسلامی عقیدہ توحید کے ہندوستانی ذہن فلسفہ کےاثرات سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ ایک مسلم بات ہے کہ ہندو مذہب پراسلامی عہد میں اسلام کا بڑا گہرااثر پڑا۔ہندوؤں میں اللہ کی عبادت کا تصوراسلام کا نتیجہ ہے۔مشہورمصری فاضل ڈاکٹراہرامن اپنی شہرہ آفاق کتاب ضحیٰ الاسلام میں لکھتے ہیں:مسیحی دنیامیں کچھ ایسے اختلافات رونما ہوئے جن میں اسلام کا اثر صاف نظرآتا ہے۔یہی حال سکھ فرقہ کا ہے،اس مذہب کے بانی گرونانک اسلامی تعلیمات سے بہت متاثر تھے۔

(۲) نزول قرآن سےقبل انسانی مساوات کا تصور:

انسان پرایسا دور بھی گزرا ہے جب اس کے ذہن پربعض اقوام وقبائل کےافضل و مافوق البشر ہونے کا خیال حاوی وطاری تھا،چنانچہ بعض خاندان اورنسلوں کے افرادا پنا

نسب سورج، چاند اور خدا سے ملاتے تھے۔ قرآن نے یہود و نصاریٰ کے اس تصور برتری کو اس طرح ذکر کیا ہے۔ یہود و نصاریٰ نے بزعم خود یہ کہا کہ ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں، فراعنہ مصر کا خیال تھا کہ سورج دیوتا راع کا مظہر و مجسمہ ہیں۔ ہندوستان میں دو خاندانوں کو سورج بنسی اور چندر بنسی کہا گیا، ایران کے کسریٰ کو یہ زعم تھا کہ ان کی رگوں میں الٰہی خون گردش کر رہا ہے۔ کسریٰ پرویز کی تعریف یہ کی جاتی تھی کہ وہ خداؤں میں انسان لافانی اور انسانوں میں خدائے لاثانی ہے۔ قیصر روم بھی خدا سمجھے جاتے تھے اور ان کا لقب Aucest (عظیم و جلیل) ہوتا تھا۔ چینی اپنے شہنشاہ کو آسمان زادے سمجھتے تھے۔ عرب اپنے سوا سب کو عجم سمجھتے تھے۔ قبیلہ قریش اپنے تمام قبائل عرب سے افضل سمجھا جاتا تھا۔ قرآن کریم کی دوسری بڑی دولت و عطیہ وحدت انسانی کا تصور ہے۔ قرآن کے اس واضح اعلان نے قبائل و اقوام کو اونچے نیچے طبقات تک نسلی دائروں اور باہم فرق و امتیاز کی حد بندیوں سے نکال کر وحدت انسانی کی لڑی میں پرو دیا۔

قرآن کے پیام مساوات کا اثر:

جواہر لال نہرو ہندوستان میں اسلامی مساوات کے اثر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسلامی اخوت و مساوات نے جس پر مسلمانوں کا عمل و ایمان تھا، ہندوستانیوں کے ذہنوں پر گہرا اثر ڈالا۔ مشہور مستشرق پروفیسر گپ عالمی تہذیب کے لیے اسلام کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھتا ہے: اسلام کو ابھی انسانیت کی ایک اور خدمت انجام دینی ہے لوگوں کے مراتب و مواقع اور عمل کے لحاظ سے مختلف نسلوں کے درمیان مساوات قائم کرنے میں کسی سوسائٹی نے اس جیسی کامیابی نہیں حاصل کی ہے۔

(۳) نزول قرآن سے بیشتر طبقہ نسواں کی حالت:

نزول قرآن سے قبل دنیا کے مذاہب و معاشروں میں عورت کا کیا مقام تھا اس پر ایک

طائرانہ نظر ڈال لیں۔ یونان میں عورت کو شیطان کی بیٹی اور نجاست کا مجسمہ سمجھا جاتا تھا۔ سقراط نے اسے فساد کی جڑ بتایا ہے۔ افلاطون نے برے لوگوں کی روح سے تعبیر کیا ہے۔ ارسطو نے سبب زوال گردانا ہے اور عام یونانیوں نے اس کے زہر کو لاعلاج اور اس کے وجود کو غیر ضروری بتایا ہے۔ مجوس فارس کی اخلاقی حیثیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایران کا بادشاہ یزدگرد ثانی اپنی بیٹی سے اپنا عقد کرتا ہے اور پھر اس کو قتل کر ڈالتا ہے۔ ہندوئیت میں عورت کو غلامی و محکومیت کا درجہ دیا گیا ہے۔ عورت ان کے یہاں مال و جائیداد سے زیادہ معمولی چیز تھی۔ عورتوں کے سلسلے میں قرآنی تعلیمات کی ہمہ گیریت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید پر ایک سرسری نظر بھی عورت کے بارے میں جاہلی نقطہ نظر اور اسلامی زاویہ نگار کے کھلے فرق کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ قرآن کا فرمان ہے: مومن مرد و عورت جنت میں داخل ہوں گے اور ذرہ برابر ظلم نہیں ہوگا اور اللہ کے رسول نے فرمایا: دنیا کی بہترین نفع بخش شئے صالح عورت ہے۔ انھی تعلیمات کا نتیجہ ہے کہ مسلمان عورتوں نے عہد نبوی سے لے کر آج تک اور بالخصوص ابتدائی عہد میں جس کردار کا ثبوت دیا اس کی کوئی قوم نظیر نہیں رکھتی۔ مسٹر N.L. Coulsen لکھتے ہیں: بلاشبہ عورتوں کی حیثیت کے معاملہ میں قرآنی قوانین افضلیت کا مقام رکھتے ہیں۔ مذہب و اخلاق کے انسائیکلوپیڈیا کا مقالہ نگار لکھتا ہے: پیغمبر اسلام نے یقیناً عورت کا درجہ اس سے زیادہ بلند کیا جو اسے قدیم عرب میں حاصل تھا۔

یہ ہیں نزول قرآن کے وہ بنیادی مقاصد، جس کسی نے اس پر ایمان لانا قبول کیا اور دستور حیات کی حیثیت سے اس سے روشنی پائی تو اس کی دنیاوی و اخروی زندگی میں انقلاب آ گیا اور جس نے اس پر ایمان لانا پسند نہیں کیا، کم و بیش قرآنی تصورات سے وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔

☆☆

القرآن الکریم-ایک معجزہ

● مولانا محمد احترام الحسن کاندھلوی

معجزہ کے لفظی معنی عاجز کرنے والی چیز کے آتے ہیں، یعنی وہ چیز جس کے کرنے سے دوسرے لوگ عاجز ہوں۔ یہ معجزے کی اجمالی تعریف ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دنیا میں رونما ہونے والے حالات تین قسم پر ہیں۔ ایک عادیات یعنی وہ حالات جو اسباب عادیہ کے تحت ہوں، جیسے دانہ زمین میں ڈالنے سے پودے کا نکل آنا، گٹھلی بونے سے درخت کا پیدا ہونا، دوا استعمال کرنے سے بیماری کا دور ہوجانا، پانی پینے اور کھانا کھانے سے بھوک پیاس کا رفع ہوجانا۔ یہ تمام چیزیں عادیات میں داخل ہیں۔ ان امور کو سمجھنے کے لیے کسی ماہر فن کی ضرورت نہیں، ہر آدمی سمجھ دار ہو یا نہ سمجھ، بچہ ہو یا بڑا، ان باتوں کو سمجھ بھی لیتا ہے اور کر بھی لیتا ہے۔

دوسرے عجائبات یعنی وہ حالات جو انسان دنیاوی اسباب و وسائل کو جمع کر کے غور و تدبر سے کام لے کر نئے حالات پیدا کرلے۔ جیسے ہوائی جہاز، راکٹ، بحری جہاز، ریل، موٹر اور ریڈیو بنالینا۔ یہ سب چیزیں عام انسانوں کے لیے عجوبہ ضرور ہیں، لیکن ماہرین فن کے لیے کوئی عجوبہ نہیں۔ جو شخص بھی یہ مہارت فن رکھتا ہو وہ ان اسباب و وسائل کو جمع کر کے یہ سب چیزیں بنا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک چیز ابتداً ایک جگہ بنتی ہے اور جب اس کا طریقۂ کار عام ہوجاتا ہے تو پھر ہر جگہ بننی شروع ہوجاتی ہے۔

تیسرے معجزات یعنی وہ حالات جن میں دنیاوی اسباب و وسائل کا استعمال نہ ہو اور

جس کے کرنے پر دوسرے انسان قادر نہ ہوں۔ یہ مافوق الفطرت حالات انبیاء کے ساتھ پیش آئیں تو معجزات کہلاتے ہیں اور اولیاء اللہ کو پیش آئیں تو کرامات ہیں۔

تخت سلیمانی ہوا میں اڑتا تھا، ہوائی جہاز بھی ہوا میں اڑتا ہے۔ اوّل الذکر حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ ہے، لیکن ہوائی جہاز کو معجزہ نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ ہوائی جہاز کا اڑنا اسباب و وسائل اور فنی مہارت کے تحت ہے۔

الغرض اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آخر الزمان رسالت مآب ﷺ تک تمام انبیاء کرام کی برگزیدہ جماعت کو معجزات کے ذریعہ تقویت عطا فرمائی اور ان معجزات کو ان نبی کے لیے دلیل و برہان بنایا، لیکن دیگر انبیاء کرام اور سرور کائنات ﷺ کے معجزات میں دو فرق ہیں۔ اوّل یہ کہ جتنے معجزات دیگر انبیاء کرام کو جدا جدا مرحمت فرمائے گئے وہ تمام معجزات سرور کائنات ﷺ کو یکمشت مرحمت فرمائے گئے۔

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

مزید برآں دیگر انبیاء کرام کے معجزات ان کی حیات تک باقی رہے، جب وہ نبی دنیا سے تشریف لے گئے تو ان کے معجزے بھی اٹھا لیے گئے۔ آج وہ نبی دنیا میں تشریف فرما ہیں اور نہ ان کے معجزات، لیکن چونکہ سرور کائنات ﷺ کی نبوت و رسالت رہتی دنیا تک کے لیے تھی اس لیے آپ کو دو معجزات ایسے عطا فرمائے گئے جو رہتی دنیا تک باقی رہنے والے ہیں۔ آج بھی آپ ﷺ کے وہ دونوں معجزات چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود ہمارے سامنے موجود ہیں اور انشاء اللہ قیامت تک موجود رہیں گے۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی کتاب خصائص الکبریٰ میں مختلف احادیث کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے کہ سرور کائنات ﷺ کے دو معجزات ایسے ہیں جو آج تک باقی ہیں اور قیامت تک باقی رہیں گے، ان دو میں سے ایک یہ قرآن پاک ہے جو اس وقت ہمارے

آپ کے ہاتھوں میں موجود ہے۔قرآن پاک سرور کائناتﷺ کا ایسا معجزہ ہے جو قیامت تک باقی رہنے والا ہے۔

یہ قرآن پاک معجزہ نبوی کیوں ہے؟ اس کے دلائل وشواہد پر علماء کرام نے سیکڑوں کتابیں لکھی ہیں۔سب سے پہلی کتاب تیسری صدی ہجری میں جاحظ نے اعجاز قرآنی پر نظم القرآن کے نام سے لکھی،اس کے بعد سے آج تک سیکڑوں کتابیں خاص طور پر اسی موضوع پر لکھی جا چکی ہیں۔بہرحال مختصر یوں کہا جاسکتا ہے کہ اولاً قرآن پاک کا اپنے الفاظ،اپنے حروف،اپنے معانی،اپنی مراد،اپنی ترتیب آیات اور اپنی ترتیب سورت کے ساتھ مکمل طور پر محفوظ ہونا کہ ہر دور میں ہر قسم کے تغیر وتبدل سے قرآن پاک محفوظ رہا اور آج تک محفوظ ہے، یہاں تک کہ یہ بات دعوے کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ قرآن پاک جو ہمارے ہاتھوں میں ہے، ہو بہو یہی قرآن پاک ہے جو نبی اکرمﷺ پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا تھا اور قرآن پاک میں کوئی تغیر وتبدل کیسے ہوسکتا تھا،جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا اور اس وعدہ کا قرآن پاک میں اعلان بھی کر دیا گیا۔ارشاد خداوندی ہے: بے شک ہم نے ہی قرآن پاک نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے قرآن پاک میں وعدہ کا اعلان کرنا یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے قرآن کی حفاظت کا یہ وعدہ قیامت کے لیے ہے۔ ہر ہر زمانہ کے لیے ہے اور ہر ہر خطہ کے لیے ہے،جبکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن پاک کے علاوہ دنیا میں کوئی بھی مذہبی کتاب تغیر وتبدل اور تحریف وتصرف سے نہیں بچ سکی۔انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی،لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دنیا سے اٹھائے جانے کے بعد سو سال کے اندر اصل انجیل مقدس تو بالکل گم ہو چکی تھی اور لوگوں نے اپنی اپنی انجیلیں بنالی تھیں۔سو سال کے اندر چار سو انجیلیں وجود میں آچکی تھی، ہر ایک کی بغل میں ایک نئی انجیل موجود تھی اور ہر ایک کا دعویٰ یہی تھا کہ میری انجیل اصل ہے باقی سب غلط ہیں۔

دوسرے اللہ تعالیٰ نے حفاظت کے وعدہ کی تکمیل کا یہ سامان کیا کہ امت محمدیہ کے سینوں کو قرآن پاک کے الفاظ وحروف کے حفظ کے لیے کشادہ فرمادیا۔دنیا کے اندر چھوٹی سے چھوٹی کتاب مذہبی ہو یا غیر مذہبی،ایسی نہیں کہ جس کے اس کثرت سے موجود ہوں۔ سابقہ آسمانی کتابوں کا بھی خال خال کوئی حاف ہوتو ہو ورنہ عموماً کسی کتاب کا کوئی حافظ آپ کو نہیں ملے گا،لیکن صحابہ کرام کے زرانے سے لے کر آج تک کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس میں قرآن پاک لاکھوں کی تعداد میں موجود نہ ہو۔تیسرے قرآن پاک کی حلاوت و شیرینی کہ آدمی ہزار نہیں لاکھ بار بھی قرآن پاک کو پڑھ لے اور سن لے تو سیری نہ ہو۔دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں کہ جس کو دو چار بار پڑھ کر طبیعت نہ اکتا جائے۔چوتھے قرآن پاک کی قوت تاثیر سے پتھر سے پتھر دل کو موم بنا کر رکھ دے۔

مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ''معارف القرآن جلد اوّل'' میں علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی کتاب خصائص الکبریٰ سے قرآن پاک کی حلاوت وشیرینی اور اس کی قوت تاثیر کے بہت سے واقعات لکھے ہیں۔خود مشرکین مکہ کے سرداران ابوجہل،ابوسفیان اور اخنس بن شریق جو دن کے اجالوں میں قرآن پاک کو مٹانے پر کمربستہ رہتے تھے،لیکن رات کے اندھیروں میں وہ بھی چھپ کر قرآن سنا کرتے تھے اور اس کے سننے میں ایسے محو اور مستغرق ہوجاتے تھے کہ انھیں رات گزرنے کا بھی احساس نہیں ہوتا تھا۔قرآن پاک کی قوت تاثیر کا یہ عالم کہ عمر جیسا پتھر دل انسان رآن پاک کی ایک آیت سن کر موم ہوگیا۔الغرض یہ تمام چیزیں پکار پکار کر یہ بات کہہ رہی ہیں کہ قرآن پاک کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ کتاب ہے اور یہ رسول پاک علیہ السلام کا ایسا معجزہ ہے جو قیامت تک باقی رہنے والا ہے۔

☆☆

قرآن کریم کی تفاسیر
(ایک جائزہ)

● ڈاکٹر سید شاہد علی

قرآن وہ آخری محفوظ آسمانی کتاب ہے جو خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ پر اللہ رب العزت کی طرف سے نازل ہوئی۔ قرآن قرأ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں 'پڑھنا' اور بے شک اس کے نزول سے آج تک کوئی لمحہ بھی دنیا میں ایسا نہیں گزرتا جب اس کی تلاوت اور اس پر عمل نہ کیا جاتا رہا ہو۔

قرآن ایک مکمل دستور حیات ہے جس کی تعلیمات مکمل طور پر فطرت انسانی اور عقل سلیم کے مطابق ہیں۔ اس کا مقصد بنی نوع انسان کو راہ ہدایت دکھاتا ہے تاکہ اس پر عمل کر کے دنیا و آخرت کی کامیابی و کامرانی حاصل کی جاسکے۔ اپنی اسی اہمیت کے پیش نظر قرآن مسلمانوں کی توجہ کا سب سے زیادہ مرکز رہا اور اس کے فہم و تفہیم کے سلسلے میں زبردست کاوشیں کی گئیں۔ نتیجہ کے طور پر مختلف علوم جیسے لغات القرآن، اعراب القرآن، بدائع القرآن، قصص القرآن، احکام القرآن، اعجاز القرآن، الفاظ القرآن، امثال القرآن، متشابہات القرآن اور خواص القرآن وغیرہ وجود میں آئے جن کی تعداد علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب ''الاتقان فی علوم القرآن'' کے مقدمہ میں بیان کی ہے۔ (مولانا اسلم جیراجپوری، ہمارے دینی علوم، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1989، ص 31)

قرآن عربی میں نازل ہوا جس میں آیات مشابہات ہیں، اسی لیے یہ نور مبین کہلایا۔

بنیادی طور پر قرآن نے خود اپنی آیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (آل عمران:7)
آیات محکمات اور آیات متشابہات۔

آیات محکمات وہ ہیں جو اپنے مطلب کے بیان کرنے میں بالکل صاف اور واضح ہیں جن کا تعلق ہماری عملی و اعتقادی زندگی کے بنیادی مسائل سے ہے، یعنی جن اصول دین و احکام شریعت میں یا گزشتہ انبیاء و اقوام کے عبرت انگیز واقعات ہیں۔ آیات متشابہات وہ ہیں جن کا تعلق اس عالم محسوسات سے محورا احوال و امور سے ہے، جن کو صرف راسخون فی العلوم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ (آل عمران:7)

قرآن مجید میں انسانی فطرت کا لحاظ کرتے ہوئے طوالت و اختصار کے بیچ توازن برقرار رکھا گیا ہے اور محدود الفاظ میں لامحدود مطالب بیان کیے گئے ہیں جسے سمجھنے کے لیے علم تفسیر وجود میں آئی، جو ہر اس علم کو سموئے ہوئے ہے جس سے کلام الٰہی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہو۔ التفسیر 'سر' کا مصدر ہے اور اس کا مطلب بیان و شرح اور کشف و اظہار ہے، اسی لیے کلام الٰہی کی ایضاح و تشریح کا نام تفسیر ہے۔

بنیادی طور پر تفسیر کی دو قسمیں ہیں: (1) تفسیر بالماثور (منقولی تفسیر) وہ تفسیر جو قرآن، حدیث اور اقوام صحابہ و تابعین کی روشنی میں کی جائے۔ تفسیر بالماثور کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(ا) تفسیر القرآن بالقرآن: قرآنی آیات کی وہ تفسیر جو قرآن کی ہی دوسری آیات کی مدد سے کی جائے۔

(ب) تفسیر القرآن بالحدیث (قرآن کی وہ تفسیر جو احادیث صحیحہ کی مدد سے کی جائے)

(ج) تفسیر القرآن باقوال صحابہ و تابعین (قرآن کی وہ تفسیر جو آثار صحابہ و اقوام تابعین کی مدد سے کی جائے) تفسیر بالماثور میں 'جامع البیان فی تفسیر القرآن' از ابن جریر طبریؒ، تفسیر القرآن العظیم از ابن کثیرؒ اور الدر المنثور فی التفسیر الماثور، از جلال الدین سیوطی

وغیرہ مشہور و معروف تفاسیر ہیں۔

(2) تفسیر بالرائے: قرآن کی وہ تفسیر جو اجتہاد اور دلائل و استدلال کی مدد سے کی جائے۔ لفظ ''الرائے'' سے مراد اعتقاد، اجتہاد اور قیاس ہے اس لیے قیاس کے قائلین کو اصحاب الرائے کہتے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں:

(ا) تفسیر بالرائے جائز: قرآن کی وہ تفسیر جس میں ایسی رائے کا استعمال کیا جاتا ہے جو کتاب وسنت سے ہم آہنگ ہو اور اس میں تفسیر کی تمام ضروری شرائط کا دھیان رکھا گیا ہو نیز کلام عرب سے بھی استفادہ کیا گیا ہو۔

(ب) تفسیر بالرائے ناجائز: قرآن کی وہ تفسیر جس میں ایسی رائے کا استعمال کیا گیا ہو جو شرعی دلائل سے مطابقت نہ رکھتی ہو اور اس میں تفسیر کی ضروری شرائط کا فقدان ہو۔ (پروفیسر غلام محمد حریری، تاریخ تفسیر و مفسرین، تاج کمپنی، دہلی، ص 233-240) تفسیر بالرائے جائز میں مفاتیح الغیب، از امام رازی، انوار التنزیل واسرار التاویل از امام بیضاویؒ وغیرہ تفاسیر شمار کی جاتی ہیں۔

مآخذ تفسیر:

(1) قرآن: تفسیر قرآن کا اولین ماخذ خود قرآن کریم ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی قرآنی آیت کی تفسیر میں اس موضوع سے متعلق قرآن کی تمام آیات کو جمع کر لیا جائے، پھر ان کا تقابلی جائزہ لیا جائے، کیونکہ قرآن میں بعض آیات کا کہیں اجمالی بیان ہے اور کہیں تفصیلی بیان ہے، اسی لیے کہا جاتا ہے: **القرآن یفسر بعضه بعضاً.**

(2) حدیث: قرآن کی تفسیر کا دوسرا اہم ماخذ نبی کریم ﷺ کی حدیث وسنت ہے، کیونکہ تفسیر کے لیے آپ من جانب اللہ مامور تھے، البتہ تفسیر کے سلسلہ میں صرف صحیح و مرفوع احادیث کا استعمال ہی کیا جانا چاہئے۔

(3) آثار صحابہ: تفسیر قرآن میں کتاب وسنت کے بعد آثار صحابہ کی اہمیت ہے جنھیں بطور سند تسلیم کیا جاتا ہے، کیونکہ صحابہ کرام قرآن کے عالم محرر اور اس کے زندہ گواہ تھے۔ اس سلسلے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے، کیونکہ آثار صحابہ میں کافی ملاوٹ پائی جاتی ہے۔

(4) اقوال تابعین: تفسیر میں آثار صحابہ کے بعد اقوال تابعین کو اہمیت حاصل ہے، کیونکہ وہ صحابہ کے شاگرد اور خود قرآن کے زبردست عالم تھے، نیز ان کا زمانہ نزول قرآن کا قریب ترین زمانہ تھا، لہٰذا فہم قرآن میں ان کا درجہ بلند ہے۔

(5) لغت: تفسیر کے سلسلے میں عربی لغت کا ایک خاص مقام ہے، کیونکہ قرآن فصیح و بلیغ عربی میں نازل ہوا، لہٰذا ایک مفسر کے لیے لغت سے استفادہ کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

(6) خداداد فہم قرآن: قرآن کی تفسیر میں خداداد فہم کا ایک الگ رتبہ ہے، کیونکہ قرآن کے تقاضوں اور شریعت کی روح کے مطابق ہی تفسیر کی جاتی ہے۔ اس کا ثبوت رسول اللہ ﷺ کی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حق میں یہ دعا ہے کہ ''اے اللہ اسے دین کی سمجھ عطا کر اور اسے قرآن کی تاویل سکھا دے'' اور یہ کہ جب حضرت علیؓ سے یہ سوال کیا گیا کہ ''آیا قرآن کے سوا بھی آپ کے پاس رسول کریمؐ سے منقول کوئی چیز موجود ہے؟ آپ کا جواب تھا: خدا کی قسم ہمارے پاس اور تو کچھ نہیں صرف قرآن ہے جس کو خدا عطا کر دے۔''
(پروفیسر غلام احمد حریری، تاریخ تفسیر و مفسرین، تاج کمپنی، دہلی، ص 251)

عظمت کلام الٰہی میں احتیاط کے سبب متاخرین نے مفسر کے لیے ضروری قرار دیا کہ وہ کم از کم 15 علوم (لغت، نحو، صرف، اشتقاق، معانی، بیان، بدیع، قرأت، اصول دین، اصول فقہ، اسباب نزول، ناسخ و منسوخ، فقہ، قصص القرآن، حدیث میں مہارت رکھتا ہو۔ (اتقان، ج2، ص 187، بحوالہ اسلم جیراجپوری، ہمارے دینی علوم، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1989، ص28)

علوم اسلامی میں فنی اعتبار سے فن تفسیر ہی سب سے پہلے وجود میں آیا۔ قرآن کے

سب سے پہلے مفسر اللہ تعالیٰ اور پہلا تفسیری سرمایہ قرآن مجید ہے:

"**ثم انا علینا بیانه**". (۷۵/۱۹) (پھر اس کی تشریح بھی ہمارے ذمہ ہے)۔

"**کتاب احکمت آیته ثم فصلت من لدن حکیم خبیر**". (۱۱/۱) (یہ مکمل کتاب ہے جس کی آیات محکم بنائی گئی ہیں پھر حکمت اور خبر رکھنے والے اللہ کی طرف سے ان کی بیان تفصیل کی گئی ہے)۔

"**ولقد جئناهم بکتب فصلناه علیٰ علم**". (۵۲/۷) (ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے ہیں جس کی تفصیل ہم نے علم کے ساتھ کی ہے)۔

"**وهو الذین أنزل الیکم الکتب مفصلا**". (۱۱۵/۶) (اور وہی اللہ ہے جس نے تمہاری طرف کتاب اتاری تفصیل شدہ)۔

"**قد فصلنا الأیٰت لقوم یعلمون**". (۹۸/۶) (ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کے لیے کی ہے جو علم رکھتے ہیں)۔

"**قد فصلنا الأیٰت لقوم یفقهون**". (۹۹/۶) (ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کے لیے کی ہے جو فہم رکھتے ہیں)۔

قرآن کے دوسرے مفسر و ترجمان رسول اللہ ﷺ ہیں جن کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے:

"**وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس مانزل الیهم**". (النحل:۴۴) (اور ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا تا کہ آپ اسے لوگوں کے لیے واضح کر دیں)۔ اور اس طرح دوسرا تفسیری خزانہ احادیث رسولؐ ہیں۔ ابن جرجانی کا قول ہے کہ جس قدر صحیح حدیثیں ہیں ان کی اصلیت قرآن میں یا قریب قریب موجود ہے۔ (عبدالصمد صارم الازہری، تاریخ التفسیر، مکتبہ معین الادب، لاہور، 1982، ص19) اسی طرح صحابہ عام طور پر جب کوئی حدیث نقل کرتے تو اس کی تصدیق کے لیے اس کے ساتھ قرآنی آیت بھی پڑھتے۔

ابو ہریرہؓ نے کہا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسکین وہ نہیں جس کو ایک لقمہ یا دو لقمے دیے جاتے ہیں، مسکین وہ ہے جو سوال نہ کرے اس کی شہادت میں یہ آیت پڑھو: "**لایسئلون الناس الحافاً...**" ابو ہریرہؓ نے کہا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں نے اپنے بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کیا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا نہ کسی قلب میں اس کا خطرہ گزرا۔ اس کی تصدیق میں یہ آیت پڑھو: "**فلا تعلم نفس مااخفی لهم من قرة اعین**". (عبدالصمد صارم الازہری، تاریخ التفسیر، مکتبہ معین الادب، لاہور، 1982، ص20)

عہد رسالت میں آپ کی بتائی گئی قرآنی تفسیر زیادہ تر حفظ اور کچھ تحریر کر لی گئی مگر تفسیر کے نام سے باقاعدہ کوئی کتاب مرتب نہیں کی گئی تھی۔ (حضور کے اسم گرامی کے ساتھ ایک تفسیر منسوب ہے جس کا نام تفسیر النبی ہے۔ یہ شیخ ابوالحسن محمد بن قاسم الفقیہ کی روایت ہے۔ بحوالہ عبدالصمد صارم الازہری، تاریخ تفسیر مکتبہ معین الادب لاہور، 1982، ص20)

علامہ سیوطی نے اپنی کتاب "الاتقان فی علوم القرآن" کی آخری فصل میں ان تمام تفسیری روایات کو جو صحابہ کے توسط سے رسولؐ سے منقول ہیں اکٹھا کر لیا ہے۔ یہ تمام روایات ان کی کتاب کے بیس صفحات سے بھی کم پر مشتمل ہیں، نیز جرح و تنقید کے بعد ان میں اور بھی کمی ہو جاتی ہے۔ (مولانا اسلم جیراجپوری، ہمارے دینی علوم، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1989، ص16)

الغرض میدان تفسیر میں بھی علمائے حدیث و روایت نمایاں نظر آتے ہیں اور ان کی کتابوں میں تفسیر بالروایت ملتی ہے، جیسے امام بخاری کی صحیح بخاری میں "کتاب تفسیر القرآن" اور "کتاب فضائل القرآن" کے نام سے دو ابواب موجود ہیں، غالباً صحیح بخاری کے آٹھویں حصے کے برابر ہیں۔ (دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور، 1962، ج6، ص492)

قرآن حکیم میں جگہ جگہ تفکر وتدبر کی دعوت دی گئی ہے، چنانچہ صحابہ کرام قرآن مجید میں غور کرتے اور اگر مشکل پیش آتی تو رسول سے دریافت کرتے، البتہ سوال کرنے سے بہت زیادہ احتراز کرتے، کیونکہ کثرت سوال کی آفتوں کو اچھی طرح جانتے تھے، لہٰذا جو معلوم ہوتا اسی پر عمل کرتے ہوئے اکتفا کرتے اور خود تفسیر قرآن کے سلسلے میں وہی بات کہتے جو حضورؐ سے بلا واسطہ یا بالواسطہ معلوم ہوتی۔ تفسیر کے سلسلے میں صحابہ کے رویہ کی بہت خوبصورت ترجمانی حضرت ابوبکرؓ کا یہ واقعہ کرتا ہے۔ صدیق اکبر سے کسی نے 'ابا' کے معنی پوچھے (جس کے معنی چارہ کے ہیں) مگر چونکہ قریش کی لغت میں یہ لفظ متعارف نہیں تھا، آپ نے فرمایا: کون سی زمین مجھے اٹھائے گی اور کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا، اگر میں قرآن کے بارے میں کوئی ایسی بات کہوں جسے میں نے رسول اللہؐ سے نہیں سنا ہے۔ (مقالہ جمال الدین اعظمی، عربی و فارسی تفسیر نویسی میں ہندوستانی مسلمانوں کا حصہ، مرتبہ: عماد الحسن آزاد فاروقی، ہندوستان میں اسلامی علوم و ادبیات، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، دسمبر 1986، ص42)

عہد صحابہؓ میں مفسر کے لیے عربی زبان رد کیے گئے رسوم و عادات، قرآن سے متعلق عہد نبوی کے واقعات، رسول اللہ کے اقوال، اعمال اور قضایا وغیرہ میں کمال رکھنا ضروری تھا۔ تمام صحابہ فہم قرآن میں برابر نہ تھے، بلکہ بعض کو بعض پر تفوق حاصل تھا۔ صحابہ میں سے 10 حضرات (خلفاء اربعہ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو تفسیر بیان کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ سب سے زیادہ تفسیری اقوال رئیس المفسرین حضرت عبداللہ بن عباسؓ (جن کا لقب ترجمان القرآن ہے) سے مروی ہے۔ (پروفیسر غلام احمد حریری، تاریخ تفسیر و مفسرین، تاج کمپنی، دہلی، ص4)

عہد نبویؐ اور عصر صحابہ کی تفسیری خصوصیات حسب ذیل ہیں:

(1) اس دور میں قرآن مجید کی پوری تفسیر لکھی نہیں گئی۔

(2) قرآن مجید کی ان آیات کی تفسیر بیان کی گئی جن کے سمجھنے میں کچھ دشواری پیش آتی تھی یا ان میں اجمال پایا جاتا تھا۔

(3) صحابہ کرام میں قرآن مجید کے معنی و مطالب کے سمجھنے میں بہت کم اختلاف پایا جاتا تھا۔

(4) صحابہ کرام قرآن مجید کے اجمالی معنی پر اکتفا کرتے تھے اور تفصیلات میں جانا ضروری خیال نہیں کرتے تھے۔

(5) صحابہ کرام کم سے کم الفاظ میں لغوی معنی کی تشریح کو نا کافی سمجھتے تھے۔

(6) عہد صحابہ میں تفسیر کی کوئی جداگانہ منظم صورت نہ تھی۔ حضور اکرمؐ سے منقول آیات کی تشریح و توضیح احادیث نبوی کے زمرہ میں ہی شامل تھیں۔ (جمیل نقوی، اردو تفاسیر، کتابیات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1992، ص13-12)

حیات صحابہ میں ہی ان کے شاگردوں کے ذریعہ ان کے تفسیری بیانات بھی ضبط تحریر میں آ گئے تھے۔ چنانچہ تفسیر کے لیے پہلے قرآن پھر حدیث وسنت اور پھر آثار واقوال صحابہ سے مدد لی جاتی تھی۔ عصر تابعین میں امام ابن تیمیہؒ کے قول کے مطابق تفسیر کا علم زیادہ تر علمائے مکہ میں تھا جو حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد تھے۔ مثلاً عکرمہؒ، مجاہد اور عطاؒ پھر اہل کوفہ میں جو حضرات ابن مسعودؓ کے اصحاب تھے، جیسے حسن بصری اور مسروق وغیرہ، ان کے علاوہ سعید بن جبیر، ابوالعالیہ، ضحاک اور قتادہ کو علم تفسیر میں ملکہ حاصل تھا۔ (مولانا اسلم جیراجپوری، ہمارے دینی علوم، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1989، ص21)

تفسیر کی وہ کتابیں جو ناپید ہیں

تابع تابعین کا دور جو تقریباً دوسری صدی ہجری کے خاتمہ تک جاری رہا، میں تفسیر کی

کتابیں مدون کی گئیں اور علم تفسیر ایک علیحدہ فن کی شکل میں سامنے آیا، مگر اس ضمن میں اختلاف ہے کہ کون سی تفسیر کو مقام اوّلیت حاصل ہے، جیسے تفسیر ابن جریج، تفسیر سفیان بن عیینہ، تفسیر وکیع بن الجراح، تفسیر شعبہ، تفسیر ابوبکر بن ابی شیبہ وغیرہ، مگر یہ سب مٹ چکی ہیں۔ (ایضاً، ص23)

میزان الاعتدال ذہبی کے مطابق سب سے پہلے عہد تابعین میں علم تفسیر ایک الگ فن کی شکل میں سعید بن جبیر (م95ھ) کے ذریعے سامنے آیا، جب عبدالملک بن مروان (م86ء) نے ان سے تفسیر لکھنے کی درخواست کی، چنانچہ انھوں نے تفسیر لکھ کر دربار خلافت میں بھیج دی۔ عطا بن دینار کے نام سے جو تفسیر مشہور ہے وہ حقیقت میں یہی تفسیر ہے۔ (پروفیسر غلام احمد حریری، تاریخ تفسیر ومفسر، تاج کمپنی دہلی، ص4)

دور تابعین پر ایک اجمالی نظر ڈالنے سے ہمیں تفسیری ارتقا میں کچھ مخصوص رجحانات و میلانات نظر آتے ہیں، مثلاً اس دور میں عہد صحابہ کے مقابلے اختلافات کی خلیج گہری ہوگئی اور مذہبی اختلافات کی بنیاد پڑی، جیسے عقیدہ وتقدیر کے حامیوں ومنکروں نے اپنے اپنے نظریات کی اپنی تفسیروں میں نمائندگی شروع کردی، وغیرہ۔ دور تابعین میں وہی منقولی طریقہ رائج رہا، مگر اس میں تبدیلی واقع ہوئی کہ ہر شہر کے رہنے والے اپنے شہر کے امام و عالم کے اقوال سے ہی اپنی تفسیر میں استفادہ کرتے، جیسے اہل مکہ حضرت ابن عباسؓ سے، اہل مدینہ حضرت ابی بن کعبؓ اور عراقی حضرت ابن مسعودؓ سے۔

اس کے علاوہ اس عہد کی سب سے اہم خصوصیات یہ بھی رہی کہ تفسیر میں بغیر نقد وتبصرہ اسرائیلیات کی ملاوٹ شروع ہوگئی جو ان اہل کتاب سے اخذ کی جاتیں جو مسلمان ہوگئے تھے۔ دراصل اسرائیلیات کی طرف عربوں کا میلان عہد رسالت ہی سے شروع ہوگیا تھا جب پہلے یہودی عالم حضرت عبداللہ بن سلامؓ، مشرف بہ اسلام ہوئے، نیز حضور کا ارشاد گرامی بھی تھا کہ ''اہل کتاب کے اقوال کی نہ تصدیق نہ کرو نہ تکذیب، درحقیقت

اسرائیلیات کو مرغوب سمجھ کر قبول کرنے میں عربوں کے مزاج کا بڑا دخل تھا، جسے علامہ ابن خلدون نے اس طرح بیان کیا ہے:

''بالعموم عرب نہ پہلے سے اہل کتاب تھے نہ علم رکھتے تھے۔ ان کے اوپر بدویت غالب تھی۔ جب ان کو موجودات کے اسباب، ابتدائے تخلیق اور امم سابقہ کے حالات وغیرہ کے جاننے کا شوق ہوتا تو ان اہل کتاب سے جو مسلمان ہوگئے تھے دریافت کرتے یہ بھی زیادہ تر انھیں کی طرح بدوی تھے اور ان امور کو اسی قدر جانتے تھے جس قدر عوام اہل کتاب، انھیں کے بیانات لوگوں سے منقول ہوکر آیات کی تفسیروں میں شامل ہوگئے اور بوجہ اس کے کہ ان کا تعلق احکام شرعیہ سے نہ تھا، تدوین کے وقت مفسروں نے مسامحت سے کام لے کر ان کی تنقید کی طرف توجہ نہیں کی اور انھیں کو کتب تفاسیر میں درج کردیا۔''
(مقدمہ ابن خلدون، ص367، بحوالہ اسلم جیراجپوری، ہمارے دینی علوم، ص19)

تیسری صدی ہجری میں تدوین کتب کا عام رواج ہوگیا۔ اسی دور میں صحاح ستہ لکھی گئی جس میں ایک باب ''کتاب التفسیر'' ہوتا تھا جو تفسیری روایات پر مشتمل ہوتا تھا، البتہ اس مقام پر پہنچ کر علم تفسیر، احادیث سے علیحدہ ایک فن کی شکل میں ابھر کر سامنے آیا اور قرآنی ترتیب کے مطابق ایک ایک آیت اور سورت کی تفسیر لکھی جانے لگی۔

تیسری صدی ہجری کے آخر اور چوتھی صدی ہجری میں مکمل قرآن کی تفسیریں لکھی جانے لگیں۔ تفسیر ابن جریر طبری (م310ھ)، تفسیر ابن ابی حاکم (م723ھ)، تفسیر امام حاکم (م395ھ)، تفسیر ابن منذر (م318ھ)، تفسیر ابن حیان (م369ھ) اس دور کی اہم تفاسیر ہیں جن میں سے ابن جریر طبری کی تفسیر ''جامع البیان فی تفسیر القرآن'' کو آج تک مقام اولیت حاصل رہا ہے۔ قرآن کی تشریح کے سلسلے میں انھوں نے اس وقت دستیاب تمام روایات کو جمع کردیا ہے اور ان پر جرح وتعدیل کا کام دوسروں کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ گرچہ بعض اقوال کو کہیں کہیں راجح اور بعض کو مرجوح بھی قرار دیا ہے۔ اس دور کی

تفاسیر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تفسیر بالماثور کی حدود میں رہتے ہوئے قرآن، حدیث، اقوال صحابہ وتابعین ہی کی روشنی میں لکھی گئیں، مگر ان میں ایک تبدیلی یہ آئی کہ پہلے کی طرح اسناد کی شرط باقی نہ رہی۔ نتیجتاً بلاسند تفسیری اقوال نقل کرنے سے بہت سی من گھڑت باتیں تفسیر میں شامل ہوگئیں اور ان میں تمیز کرنا مشکل ہوگیا۔

تفسیر میں درآید کا چلن:

خلافت عباسیہ سے لے کر آج تک تفسیر کا جو دور رائج ہے اس میں روایت کے ساتھ درایت کا بھی استعمال ہونے لگا اور نقل وعقل میں رفتہ رفتہ آمیزش کی ابتدا ہوئی، لہٰذا منقولی کے علاوہ معقولی تفاسیر بھی وجود میں آئیں۔ اس دور کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس وقت کے پس منظر کو دھیان میں رکھا جائے۔ جب فلسفے کو فروغ ملا خصوصاً منطق وفلسفے کی کتابوں کا حکومت کی سرپرستی میں یونانی سے عربی میں ترجمہ ہوا جن کے اثرات سے مختلف عقائد و نظریات ابھرے اور نئے نئے فرقے وجود میں آئے۔ علم کلام، نیز مختلف مکاتب فکر حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی اور جعفری وغیرہ کا ظہور ہوا اور یہ کہ صرف ونحو اور عربیت سے متعلق علوم کی تدوین کی گئی۔ قرآن کے مختلف پہلوؤں جیسے ادبی، فقہی، لغوی، نحوی، تاریخی اور کلامی وغیرہ پر الگ الگ تصانیف قلم بند ہوئیں۔ خلاصہ یہ کہ نقل پر عقل کا غلبہ آہستہ آہستہ بڑھتا رہا اور ہر گروہ اپنی عقل کو ہی معیار اور کسوٹی سمجھتا رہا، لہٰذا مباحث کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا جو آج تک جاری ہے۔

ایسے ماحول کے زیر اثر کاملیت کو فروغ حاصل ہوا اور جو شخص جس فن میں ماہر ہوتا وہ قرآن کو اپنے فن کے قالب میں ڈھالنے کی پوری کوشش کرتا، مثلاً نحوی علماء کی تفاسیر (تفسیر زجاج، البسیط از واحدی، البحر المحیط از ابوحیان) نحوی مسائل سے پر ہیں۔ امام رازی کی تفسیر ''مفتاح الغریب المعروف تفسیر کبیر''، حکما وفلاسفر کے اقوال سے بھری ہوئی ہے۔

فقہاء کی تفاسیر (حصاص، قرطبی) فقہی فروعات کے ذکر سے مالا مال ہیں۔ صوفیاء (ابن عربی، ابوعبدالرحمٰن السلمی) کی تفاسیر میں آیات الٰہی سے صوفیانہ اشارات نکالے گئے ہیں۔ مبتدعین میں زمخشری کی الکشف، شیعہ اثنا عشریہ میں طبرسی اور ملامحسن کاشی، مؤرخین کی تفاسیر (ثعلبی اور ابن کثیر) سے ایسا لگتا ہے کہ قرآن صرف ایک تاریخی کتاب ہے وغیرہ وغیرہ۔ (پروفیسر غلام احمد حریری، تاریخ تفسیر، مفسرین، تاج کمپنی دہلی، ص ص 7-5)

مختصر یہ کہ اس وقت سے لے کر آج تک ہر زمانہ کی تفسیر اپنے وقت کی تحریکوں سے متاثر اور مخصوص نظریات کا آئینہ معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کا فائدہ یہ پہنچا کہ علم تفسیر میں وسعت پیدا ہوئی، مگر من مانی تاویلات کا دروازہ کھل گیا اور قرآن میں معنوی تحریف کی جانے لگی جس کی علامہ فتاری نے یہ تصریح کی ہے کہ ''علم تفسیر میں بحر چند امور کے اصول مطلقاً نہیں ہیں جن پر اس کی جزئیات کا مدار ہو۔ (مرأۃ التفسیر، ص 7، اسلم جیراج پوری، ہمارے دینی علوم، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1989، ص 28)

ظہور اسلام سے قبل ہندوستان اور عرب کے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ عہد رسالت میں ہی مسلمان جنوبی ہندوستان میں پہنچ گئے تھے۔ (حضرت تمیم صحابی کا مزار کولم علاقہ مدراس میں ہے اور یہیں ایک قبر پر کتبہ لگا ہے جس پر اسماعیل بن دینار (م 109ھ) لکھا ہے۔ مالک بن دینا 70ھ کے مشہور تابعی مفسر ہیں۔ اسماعیل ان کے بیٹے تابعی یا تبع تابعی ہیں۔ بحوالہ عبدالصمد صارم ازہری تاریخ التفسیر، مکتبہ معین الادب لاہور 1982، ص 34) اور جلد ہی مسلم فاتحین بھی شمالی ہند پر قابض ہوگئے۔ بنوامیہ کے دور میں سندھ اسلامی حکومت کا باقاعدہ ایک صوبہ بن گیا تھا۔ استحکام حکومت کے بعد نومسلموں کی تعداد یہاں بہت تیزی سے بڑھی، نیز عرب، ایران، ترکستان اور افغانستان سے مسلمان یہاں آکر آباد ہوگئے، اس لیے مذہبی ضرورت کے سبب دوسرے علوم کے علاوہ علم تفسیر پر بھی بکثرت کتب تحریر ہوئیں۔ چونکہ عربی مسلمانوں کے درمیان بین الاقوامی رابطہ کی زبان تھی اور اس کو

مذہبی اہمیت کے سبب عزت کی نگاہ سے بھی دیکھا جاتا تھا، اس لیے ابتدا میں تفسیریں عربی زبان اور پھر فارسی جو کہ مسلمانوں کی سرکاری زبان تھی میں لکھی گئیں۔

عربی زبان میں ہندستان میں لکھی گئی کتابیں

ڈاکٹر محمد سالم قدوائی نے مختلف تذکروں اور تاریخی کتابوں کی چھان بین کے بعد عربی زبان میں ہندوستان میں لکھی گئی تفسیروں اور علوم قرآن سے متعلق کتابوں کی تعداد 156 بیان کی ہے۔ (محمد سالم قدوائی، علوم اسلامیہ اور ہندوستانی علما، ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ، 1991، ص15)

ہندوستان میں پہلی عربی تفسیر کس نے لکھی ہے، یہ بات کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ دائرہ معارف الاسلامیہ (اردو انسائیکلو پیڈیا) کے مطابق عربی کی سب سے پہلی تفسیر ''غرابت القرآن و رغائب الفرقان'' از مولانا نظام الدین حسن بن محمد بن حسین شافعی ہے۔ اس تفسیر کو دولت آباد (دکن) میں مکمل کیا گیا۔ اس کی جلد اوّل وسوم 730ھ/ 1330ء اور جلد دوم 11 محرم 728ھ/ 1327ء میں لکھی گئی۔ (دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور، 1962، جلد 6، ص531)

جبکہ بعض حوالوں سے ابوبکر اسحاق بن تاج الدین ابوالحسن (م736ھ) کی تفسیر ''جواہر القرآن'' کی اوّلیت پتہ چلتی ہے جس کا خلاصہ بھی آپ نے ''جواہر القرآن فی بیان معنی فی القرآن'' کے نام سے تحریر کیا ہے جو برلن کی لائبریری میں موجود ہے۔ (جمیل نقوی اردو تفاسیر، کتابیات، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، فروری 1992، ص15) ان کے علاوہ ابتدائی تفاسیر میں کاشف الحقائق و قاموس الدقائق از محمد بن احمد گجراتی (821ھ)، تفسیر ملتقط از سید محمد گیسو دراز (828ھ) تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنان، از علی بن احمد مہائمی (835ء) وغیرہ ملتی ہیں۔

علماء کا فتویٰ ہے کہ قرآن کا ترجمہ و تفسیر ان لوگوں کے خاطر کرنا جو عربی زبان سے

ناواقف ہوں اس آیت 'وما ارسلنا من رسول إلا بلسان قومه'' (ابراہیم:4) ''ہم نے کسی پیغمبر کو نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان میں'' کی رو سے جائز ہے۔ (محمد سعود عالم، شاہ ولی اللہ دہلوی کی قرآنی فکر کا مطالعہ، اسلامک فاؤنڈیشن نئی دہلی، 1994، ص12)

اسی لیے جب مقامی زبانوں میں تفسیر نگاری کی ابتدا ہوئی تو ہندوستان میں ہندی زبان میں جو بعد میں اردو کہلائی قرآنی ترجمہ و تفسیر کو بہت تیزی سے فروغ حاصل ہوا۔ اگرچہ اردو زبان ہندوستانی زبانوں کے مقابلے سب سے کمسن اور دیگر بین الاقوامی زبانوں کے درمیان بھی کم عمر ہے، مگر چینی زبان کے بعد دنیا کی سب سے بڑی زبان ہے۔ اس میں 57 فیصد الفاظ قرآنی اپنے اصلی تلفظ اور معانی مقررہ کے ساتھ جوں کے توں استعمال کیے جاتے ہیں۔ اردو زبان میں علوم قرآنی سے متعلق کتب کی تعداد غالباً ایک ہزار سے زائد ہے جن میں سے مکمل و جزوی تراجم و تفاسیر ساڑھے چار سو ہیں۔ (ڈاکٹر محمد سالم قدوائی، علوم اسلامیہ اور ہندوستانی علماء، ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ، ص ص36-35)

ہندی زبان میں تفسیر:

مسلمان ہند میں اپنے ساتھ عربی و فارسی زبان لائے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے ہندوستانی مقامی بولیاں استعمال کیں۔ مشہور سیاح بزرگ بن شہریار نے اپنے سفرنامہ ''عجائب الہند'' میں لکھا ہے کہ کشمیر کے راجہ مہروک بن رائق تاجدار ''الرا'' کی فرمائش پر 270ھ/ 838ء میں منصورہ کے امیر عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز نے کسی عراقی الاصل سندھی عالم جس کی پرورش ہندوستان میں ہوئی تھی اور جو یہاں کی مختلف زبانوں کو جانتا تھا سے ہندی زبان میں قرآن کی تفسیر لکھوائی جو سورۂ یٰسین تک ہی لکھی گئی تھی۔ بزرگ بن شہر، کتاب عجائب الہند، ص3، بحوالہ دائرہ المعارف اسلامیہ، ص53)

اردو زبان میں لکھی گئی پہلی کتاب:

چودھویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی میں اردو نثر کا آغاز دینی کتابوں سے ہوا۔ خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی (م 1405) کا رسالہ 'اخلاق وتصوف' 1308 کی پہلی باقاعدہ تصنیف کہلاتی ہے۔ گرچہ اردو زبان میں تراجم وتفاسیر قرآنی کی ابتدا سولہویں صدی عیسوی کی آخری دہائی (دسویں صدی ہجری) سے شروع ہوتی ہے جو کچھ سورتوں یا پاروں پر مشتمل ہیں۔ دراصل دسویں وگیارہویں صدی ہجری میں تراجم پر تفسیری حاشیے چڑھا کر ان کو تفسیر کہا گیا جو مختلف مخطوطوں کی شکل میں مختلف لائبریریوں میں آج بھی موجود ہیں۔ یہ زیادہ تر دکن میں لکھے گئے ہیں، حالانکہ ان میں سے اکثر مصنّفین کے نام بھی معلوم نہیں ہوئے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب ''اردوئے قدیم'' میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ (جمیل نقوی، اردو تفاسیر، کتابیات مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1992، ص 24-23)

قرآن کا پہلا ترجمہ آج سے تقریباً چار سو برس پہلے ہندوستانی زبان ''باکھا'' میں کیا گیا جواب ناپید ہے۔ مشہور بزرگ مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی نے ایک روز عصر کے وقت اپنے خلیفہ مولانا محمد علی مونگیری کو بلا کر فرمایا کہ ''مولوی عبدالقادر صاحب کے ترجمے (1790) سے دوسو برس پیشتر 'باکھا' میں بہت عمدہ ترجمہ قرآن شریف کا ہوا جسے ہم نے دیکھا ہے۔ (محمد علی مونگیری، ارشاد رحمانی وفضل یزدانی، بحوالہ مولانا نظر علی خاں، قرآنی معارف، ص 178)

اردو زبان میں لکھی گئی سب سے پہلی تفسیر:

ابتدائی تراجم میں قاضی محمد معظم سنبھلی کا ترجمہ جو انھوں نے 1131ھ/ 1719ء میں لکھا تھا طبع نہ ہوسکا مگر خطی نسخہ موجود ہے، کو پہلا اردو ترجمہ کہہ سکتے ہیں جو خالص اردو میں نہیں بلکہ عربی و فارسی کے میل جول سے پیدا ہونے والی زبان میں تھا۔ (سپارہ

ڈائجسٹ، قرآن نمبر، ج 2، ص 858، بحوالہ ڈاکٹر احمد خاں، قرآن کریم کے اردو تراجم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، دسمبر 1987، ص 12)

بارہویں صدی ہجری کے اواخر میں شمالی ہند میں پہلی مرتبہ باقاعدہ تفسیر نگاری کی بنیاد پڑی جب شاہ مراداللہ انصاری سنبھلی کی پارہ عم کی تفسیر 'خدائی نعمت' معروف بہ تفسیر مرادی، جو 24 محرم بروز جمعہ 85-1184ھ میں مکمل ہوئی۔ یہ تفسیر پہلی مرتبہ 1247ھ میں ہوگلی میں طبع ہوئی، مگر وہابی لٹریچر سمجھ کر حکومت بنگال نے اسے ضبط کرلیا، پھر دوسری مرتبہ 1260ھ اور پھر تیسری مرتبہ 1298ھ میں شائع ہوئی۔ (محمد سالم قدوائی، علوم اسلامیہ اور ہندوستانی علماء، ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ، 1991، ص 36)

تفسیر مرادی کے بیس سال بعد 1790ء/ 1205ھ میں شاہ ولی اللہ دہلوی کا ترجمہ و حواشی ''موضح قرآن'' وجود میں آیا جو اردو زبان میں پہلی مکمل تفسیر ہے۔ اس طرح تیرہویں صدی ہجری سے ہندوستان میں اردو تراجم وتفاسیر کا ایک شاندار عہد شروع ہوتا ہے جو آج تک جاری ہے۔

☆☆

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دینیات فیکلٹی کی قرآنی خدمات

● ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی

قرآن کریم سرچشمہ ایمان اور علوم اسلامیہ کی جان ہے، اسی لیے ہر دور میں دینی علوم کی تدریس میں اسے مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی فیکلٹی دینیات میں بھی قرآن کی تعلیم و تدریس کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے۔ یونیورسٹی کے قیام کے وقت ہی سے قرآن کریم کی تدریس یہاں کی تدریسی سرگرمیوں میں نمایاں طور پر شامل رہی ہے۔ یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خاں نے روز اوّل سے قرآن کریم کے درس کے ذریعہ طلباء کے دل و دماغ کو منور کرنے اور معارف قرآنی سے ان کو بہرہ ور کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور اس اہم کام کے لیے انھوں نے مشہور عالم دین مولانا شبلی نعمانیؒ (م ۱۹۱۴ء) کو مامور کیا تھا۔ ایک موقع پر جب مولانا شبلی نعمانی نے اس ذمہ داری سے سبک دوش کیے جانے کی درخواست کی تو سرسید نے اسے منظور نہ کیا اور درس قرآن کی ذمہ داری ان سے بدستور وابستہ رہی۔

علامہ شبلی نعمانی کے بعد درسِ قرآن کی یہ ذمہ داری پہلے ناظم دینیات مولانا عبداللہ انصاری (م ۱۹۲۵ء) خویش مولانا قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کے سپرد کی گئی۔ ۱۸۹۳ء میں مولانا عبداللہ انصاری کا بحیثیت ناظم دینیات تقرر ہوا، ان کا محمڈن کالج کی

تعلیمی اور دینی فضا کو استوار کرنے میں نمایاں مقام تھا۔ سید افتخار عالم مارہروی نے ان کی علمی روحانی شخصیت کا تذکرہ کرنے کے ساتھ لکھا ہے: ''ہر جمعہ کے عام وعظ و پند کے علاوہ جناب مولانا صاحب طلباء مدرسۃ العلوم کو اسٹریچی ہال کے عظیم الشان کمرہ میں روزانہ بلاناغہ مدرسہ کے اوقات سے قبل کلام مجید کی تفسیر پڑھاتے ہیں جہاں کہ تمام اسکول اور کالج کے طلباء پیشتر سے جمع رہتے ہیں، ان مسلمان طالب علموں میں وہ دونوں مشہور فرقے شامل رہتے ہیں جو سنی اور شیعہ کے نام سے معروف ہیں۔''

۱۹۲۰ء تک مولانا عبداللہ انصاری نے کالج کی دینی و تعلیمی خدمت انجام دی۔ مولانا عبداللہ انصاری کے بعد درس قرآن کی ذمہ داری مولانا سلیمان اشرف بہلواری (۱۹۳۹ء) نے سنبھالی، ان کے درس میں قرآن سے دلچسپی رکھنے والے طلباء اور دیگر حضرات شریک ہوتے، ان کا درسِ قرآن بعد نمازِ عصر ہوتا۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں: ''یونیورسٹی علوم اسلامیہ کے درس کے علاوہ عصر بعد قرآن پاک کی تفسیر پڑھایا کرتے تھے، خاص خاص شوقین طالب علم اس میں شریک ہوا کرتے تھے۔''

یہ درسِ قرآن اس نصابی تعلیم سے الگ تھا جس کی پابندی طلباء پر لازم تھی۔ محمڈن کالج میں سنی اور شیعہ طلباء کی مذہبی تعلیم کا نصاب اور انتظام طے کرنے کے لیے دو الگ الگ کمیٹیاں بنائی گئی تھیں، سنی طلباء کی مذہبی تعلیم کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس کا نام ''مدبران تعلیم مذہب اہل سنت و جماعت'' تھا جبکہ شیعہ طلباء کی مذہبی تعلیم کے لیے نصاب کمیٹی کا نام ''کمیٹی مدبران تعلیم مذہب شیعہ اثنا عشریہ'' تھا۔ شیعہ کمیٹی میں ۲۳ علماء اور سنی کمیٹی میں ۱۴ علماء شامل کیے گئے تھے، ان دونوں کمیٹیوں کی ذمہ داریوں میں یہ شامل تھا کہ ''جن طالب علموں نے قرآن مجید نہیں پڑھا ہے ان کو قرآن مجید پڑھوانے اور ان کے لیے خاص فنڈ جمع کرنے کی تدبیر کرنا۔''

کالج کے دستور کی دفعہ نمبر ۱۷۰ میں طلباء پر لازم کیا گیا تھا کہ کل مسلمان بورڈروں کو

پنج گانہ نماز ادا کرنا اور رمضان میں بجز حالت عذرِ معقول کے روزوں کا رکھنا اور جن بورڈروں کے لیے قرآن مجید کی تعلیم کا انتظام ہوا ہو، ان کو مقررہ گھنٹوں میں قرآن مجید لازم ہوگا۔ ۱۹۲۰ء میں محمڈن کالج کو یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہوا، اس کے بعد سے دینیات گریجویشن کی سطح تک لازمی جز ونصاب کے طور پر پڑھائی جاتی رہی، بلکہ اب بھی پڑھائی جاتی ہے۔ اس نصاب دینیات میں قرآن کی تعلیم، قرآن کے تعارف اور قرآن سے متعلق ضروری معلومات کو ہمیشہ شامل رکھا گیا، تاکہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے والے عام طلباء کی ذہنی تعمیر میں قرآن بنیاد کی اینٹ کی طرح شامل رہے۔

جب دینیات کی تعلیم کے لیے مستقل فیکلٹی وجود میں آگئی تو خاص دینیات میں گریجویشن (بی ٹی ایچ) اور پوسٹ گریجویشن (ایم ٹی ایچ) کے کورس کھولے گئے اور ان دونوں کے نصاب تدریس میں قرآن مجید کے ترجمہ، تفسیر اور علوم کو کلیدی حیثیت دی گئی اور پہلا پرچہ ترجمہ وتفسیر قرآن ہی کا رکھا گیا۔

قرآن کی سورتوں اور قرآنیات پر تفسیروں اور کتابوں کے انتخاب میں تو حسب ضرورت وحالات تنوع ہوتا رہا، لیکن مرکزی حیثیت سے قرآن کی تعلیم کو مزید بہتر بنانے کی کوشش جاری رہی، چنانچہ آج بھی بی ٹی ایچ کی سطح پر قرآن کریم کی ۱۴ سورتوں کے ترجمے دونوں سالوں میں طلباء کو پڑھائے جاتے ہیں اور ساتھ ہی تاریخ القرآن وتدوین قرآن پر ضروری معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔

جب کہ ایم ٹی ایچ کے دوسالہ کورس میں قرآن کریم کی سورۂ یونس اور بعد کی ۱۳ منتخب سورتوں کی تفسیر متداول تفسیروں کی مدد سے پڑھائی جاتی ہے اور اسی کے ساتھ نظم قرآن، اقسام القرآن، قصص القرآن اور حکمت القرآن پر تفصیلی مطالعہ کرایا جاتا ہے۔

۱۹۸۵ء تک ایم ٹی ایچ ایک سالہ کورس تھا، اس لیے صرف قرآنی سورتوں کی تفسیر پڑھانے پر اکتفا کیا جاتا تھا۔ ۱۹۸۶ء سے جب یہ دوسالہ کورس بنا تو مذکورہ علوم القرآن کو

بھی شامل نصاب کیا گیا۔ اس طرح دینیات میں قرآن کریم کی تدریس کو مؤثر بنانے کی تدبیر کی گئی، اس سے طلباء میں قرآن فہمی کا ذوق پیدا کرنے اور قرآن کی تفسیر کا معقول منہج اختیار کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

دینیات فیکلٹی میں ۱۹۶۰ء کے بعد تدریس کے ساتھ ریسرچ وتحقیق کی سرگرمیاں بھی شروع ہوئیں اور ان تحقیقی سرگرمیوں میں قرآنی موضوعات پر بحث وتحقیق کو خصوصی اہمیت دی گئی۔ ریسرچ کے طلباء کے لیے ایسے موضوعات اور عنوانات منتخب کیے گئے جن کا تعلق اسلامی علوم وفنون سے بالعموم اور قرآنی موضوعات سے بالخصوص ہو۔ فیکلٹی میں اب تک جن قرآنی موضوعات پر ریسرچ کرایا گیا اس کی تعداد تیس ہے اور جن طلباء کو ان کے کام کے مکمل اور قابل اطمینان ہونے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ان کی تعداد سولہ ہے۔ ذیل میں ان کی فہرست دی جاتی ہے۔

(۱) قرآنک لائن آف ریزننگ، امّ ہانی فخر الزماں، ۱۹۶۸ء
(۲) تفسیر بیان القرآن کا تنقیدی مطالعہ، ریحانہ ضیا، ۱۹۷۳ء
(۳) بھگوت گیتا اور قرآن کی بنیادی تعلیمات کا تقابلی مطالعہ، امام مرتضیٰ ہاشمی، ۱۹۷۳ء
(۴) قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور ان کی تفسیر مظہری کا مطالعہ، رضوان الدین، ۱۹۷۶ء
(۵) عبرانی انبیاء کے بارے میں بائبل اور قرآن کے بیانات اور ان کا مسلمانوں پر اثر، عبدالخالق، ص ۱۹۷۹ء
(۶) دوسری اور تیسری صدی میں قرآن کے حالات، جلال الدین، ۱۹۸۳ء
(۷) بایولوجیکل ٹیچنگ آف ہولی قرآن، رضیہ خاتون، ۱۹۸۲ء
(۸) قرآن مجید کا نزول اور عوام کے عقائد، نسیم زہرہ، ۱۹۸۳ء
(۹) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بحیثیت ایک مفسر قرآن، محمد سعود عالم قاسمی، ۱۹۹۱ء
(۱۰) عقائد، عبادات اور اعمال کی تقسیم قرآن پاک اور سیرت نبوی کی روشنی میں، قیصر

جہاں ہاشمی، ۱۹۹۱ء

(۱۱) تفسیر طبری کے ماخذ کا تنقیدی مطالعہ، محمد شعیب ندوی، ۱۹۹۰ء

(۱۲) **ابی ابن کعب و اقوالہ فی التفسیر**، محمد راشد، ۱۹۹۱ء

(۱۳) تفسیر بالماثور اور اس کے مفسرین، احسان اللہ فہد، ۱۹۹۶ء

(۱۴) **الازواج المطهرات واقوالهن فی التفسیر**، شکیل احمد، ۱۹۹۶ء

(۱۵) **المقارنة بین امثال القرآن والامثال الاخریٰ فی الادب العربی**، محمد لقمان حسین، ۱۹۹۶ء

(۱۶) آٹھویں صدی ہجری کے عربی مفسرین، ایوب اکرم، ۱۹۹۷ء

تدریس اور رہنمائی تحقیق کے ساتھ دینیات فیکلٹی کے اساتذہ نے خود اپنی تصنیف تالیف کی بھی ایک معقول تعداد فراہم کی ہے۔ ان تصانیف میں قرآنیات کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے، چنانچہ جو کتابیں فیکلٹی کے اساتذہ نے قرآنیات سے متعلق رقم کی ہیں ان کا خلاصہ اس طرح ہے:

۱- مولانا عبداللطیف رحمانی صدر شعبہ سنّی دینیات نے تاریخ القرآن کے نام سے ایک اہم کتاب رقم کی ہے جس میں قرآن کریم کے نزول، کتابت، کاتبین جمع و تدوین وغیرہ کی تاریخ معتبر ماخذ سے بیان کی ہے۔ یہ کتاب مولانا زید فاروقی نے دہلی سے شائع کی ہے۔

۲- مولانا سید علی نقی النقوی (م ۱۹۸۹ء) اپنی علمی لیاقت اور وضع داری میں علماء اہلِ تشیع کے علاوہ اہلِ سنت کے حلقہ میں بھی معروف تھے۔ وہ شعبہ شیعہ دینیات کے صدر اور فیکلٹی دینیات کے ڈین بھی رہے۔ انھوں نے تفسیر قرآن کے نام سے اردو زبان میں قرآن پاک کی ایک مکمل، مفصل اور مبسوط تفسیر لکھی ہے۔ اس میں انھوں نے قرآنی آیات کی توضیح، قرآن و احادیث، اقوال ائمہ، لغت اور علوم اسلامیہ کے حوالے سے کی ہے۔

استدلال و استشہاد کے لیے توریت و انجیل کے حوالے بھی درج کیے ہیں اور شیعہ و سنی دونوں ماخذوں سے استفادہ کیا ہے۔ روایات نقل کرنے کے ساتھ عقلی اور منطقی استدلال سے بھی کام لیا ہے۔ ہندوستان کے علماء اہل تشیع میں غالباً اس سے بہتر تفسیر نہیں لکھی گئی۔ یہ تفسیر غلام محمد بٹ، ثمر بگ، کشمیری نے ۱۹۸۲ء میں شائع کی تھی۔

مولانا سید علی النقوی نے قرآن کریم کی مفصل تفسیر کے علاوہ مقدمہ تفسیر قرآن بھی لکھا ہے جو الگ سے شائع ہوا ہے۔ اس کتاب کے نو ابواب بعنوان تبصرہ ہیں۔ ان میں قرآن کے لغوی و اصطلاحی معنی، کلامِ الٰہی اور صفات الٰہی، نزولِ قرآن کی تاریخ، اعجاز قرآنی، قرآن مجید کی امتیازی خصوصیات، جمع و تدوین قرآن، نفی تحریف، قراء سبعہ، فہم قرآن کے مسائل، تفسیر و اصول تفسیر، محکم و متشابہ، تاویل، معجزہ قرآن جیسے موضوعات پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ یہ کتاب ''ادارہ معارف القرآن لکھنؤ'' سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی۔

مولانا سید علی نے تحریف قرآن کی حقیقت کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، اس میں انھوں نے علماء اہل سنت و اہل تشیع کے معتبر ماخذ و اقوال کے حوالہ سے یہ ثابت کیا تھا کہ قرآن آج تک اپنی اصلی حالت میں موجود ہے اس میں کوئی تحریف نہیں ہوئی۔

۳- مولانا پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی (م ۱۹۸۵ء) علماء اور دانشوروں کی صف میں محتاج تعارف نہ تھے۔ ماہنامہ برہان دہلی کے مرتب، مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل اور سینٹ اسٹیفن کالج دہلی کے عربی کے مدرس اور متعدد یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ فیکلٹی دینیات کے ڈین اور صدر شعبہ سنی دینیات کی حیثیت سے ان کی خدمات معروف ہیں۔ ان کی کتابوں میں صدیق اکبر، عثمان ذی النورین وغیرہ کے ساتھ وحی الٰہی اور فہم قرآن کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

وحی الٰہی میں انھوں نے تفصیل سے وحی کے تصور، وحی کے ذرائع، وحی کی ضرورت، قطعیت دینی اور اسلامی علوم میں اس کے مقام کو عقلی اور نقلی دلائل کے ساتھ واضح کیا ہے،

جبکہ فہم قرآن میں انھوں نے قرآن کریم سے استفادہ کے طریقے، تفسیر کے لیے ناگزیر علوم کی معرفت اور قرآن میں فکر وتدبر کی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ دونوں کتابیں قرآنیات کے طالب علموں کے لیے گراں قدر تحفہ ہیں۔ ندوۃ المصنّفین دہلی نے ان کو شائع کیا ہے۔

۴- فیکلٹی کے ایک اور استاد قاضی مظہر الدین بلگرامی (م ۱۹۹۵ء) نے جو صدر شعبہ اور ڈین بھی رہے، قرآنیات پر عیون العرفان فی علوم القرآن اور کنوز القرآن کے نام سے دو کتابیں رقم کیں۔ پہلی کتاب میں قرآن مجید کے جمع وتدوین، اسباب نزول اور محکم و متشابہ سے متعلق تفصیلی بحث ملتی ہے۔ یہ کتاب مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی صاحب کی تقاریظ کے ساتھ ۱۹۸۰ء میں ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے شائع ہوئی تھی۔

دوسری کتاب کنوز القرآن میں قرآن پاک کی آیات کو مختلف عنوانات کے تحت جمع کر کے ان کا اردو اور انگریزی ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مکتبہ برہان دہلی سے ۱۹۶۱ء میں مولانا اکبرآبادی کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

۵- فیکلٹی کے معروف استاد پروفیسر فضل الرحمٰن گنوری سابق صدر شعبہ دینیات وڈین نے علامہ جاراللہ زمخشری کی مشہور زمانہ تفسیر ''**الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل**'' پر ایک مبسوط کتاب رقم کی جس کا نام ہے ''زمخشری کی الکشاف ایک تحلیلی جائزہ'' یہ کتاب ۱۹۸۲ء میں فیکلٹی دینیات سے شائع ہوئی تھی۔ الکشاف کے تنقیدی مطالعہ پر اردو میں یہ پہلی مفصل کتاب ہے جس میں مصنف نے زمخشری کے حالات وتصانیف، بالخصوص الکشاف میں معتزلہ کے خیالات، اعجاز القرآن، تفسیری رجحانات، عقلی طرز فکر وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

۶- فیکلٹی کے ایک اور معروف استاذ پروفیسر محمد تقی امینی (م ۱۹۹۱ء) سابق صدر شعبہ و ڈین نے ''حکمت القرآن'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، اس میں حکمت کا مفہوم، قرآن

میں حکمت کا استعمال، حکمت کے مدارج اور حکمت کے ثمرات وفوائد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب ندوۃ المصنّفین دہلی سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی ہے۔ مولانا محمد تقی امینی نے ''ہدایت القرآن'' کے نام سے قرآن پاک کی عام فہم تفسیر بھی لکھنی شروع کی تھی، جو ان کے پندرہ روزہ پرچہ احتساب میں اور لاہور سے نکلنے والے رسالہ ''حکمت قرآن'' میں بالاقساط شائع ہوتی رہی۔ مولانا تقی امینی نے سورۃ المائدۃ تک یہ تفسیر لکھی تھی کہ ۱۹۹۱ء میں ان کا انتقال ہوگیا اور اس طرح یہ مفید سلسلہ منقطع ہوگیا۔

۷- شعبہ سنی دینیات کے ایک اور استاذ راؤ عرفان احمد خاں صاحب نے جو بعد میں امریکہ منتقل ہوگئے ''ان سائٹ ان دی ہولی قرآن'' کے نام سے قرآن کریم کی انگریزی میں تفسیر لکھی ہے۔ سورہ بقرہ کا حصہ راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے۔ یہ تفسیر انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی سے شائع ہوگئی ہے۔

۸- راقم الحروف نے بھی اس فیکلٹی میں تدریسی وانتظامی فرائض انجام دینے کے ساتھ قرآن پر حسب ذیل کتابیں رقم کی ہیں:

(۱) شاہ ولی اللہ کے قرآنی فکر کا مطالعہ: اس کتاب میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے حالات زندگی اور تصانیف کے تذکرہ کے ساتھ قرآنیات پر ان کی تصانیف کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے فارسی ترجمہ قرآن ''فتح الرحمٰن'' کا مفصل حاصل مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اسلامک بک فاؤنڈیشن دہلی سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی ہے اور لاہور سے اسلامک اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔

(۲) قرآن کی دعوت فکر: اس کتاب میں قرآن کی دعوتِ فکر، قرآن کریم میں قصص کی معنویت اور قرآن سرچشمہ ہدایت کے عنوان پر تین خطبات ہیں۔ کتاب کا دوسرا ایڈیشن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا ہے۔

(۳) منہاج ترجمہ وتفسیر: اس کتاب میں حضرت شاہ ولی اللہ کے قرآنی فکر کے ساتھ

اردو کے ممتاز مترجمین قرآن اور قدیم وجدید مفسرین مثلاً امام ابن تیمیہ، سرسید، مولانا فراہی اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کی تفسیری کاوشوں کا موازنہ کیا گیا ہے۔ پہلے یہ کتاب منہاج تفسیر کے نام سے شائع ہوئی تھی اور اب منہاج ترجمہ وتفسیر کے نام سے فاران اکیڈمی اقرأ کالونی علی گڑھ سے شائع ہوئی ہے۔

(۴) مطالعہ تفاسیر قرآن: اس کتاب میں عربی وفارسی اور اردو کی حسب ذیل تفاسیر تفسیر ابن کثیر، تفسیر نظم الدرر، تفسیر بحر مواج، **تفسیر معدن الجواھر، تفسیر تبجیل التنزیل**، تفسیر تدبر قرآن اور ترجمان القرآن کا مفصل مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب دینیات فیکلٹی اے ایم یو سے ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی ہے۔

(۵) علامہ شبلی نعمانی کی قرآن فہمی: اس کتاب میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پہلے مدرس قرآن اور معروف ادیب واسکالر وسیرت نگار علامہ شبلی نعمانی کی قرآن فہمی کا ان کی تحریروں کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب فاران اکیڈمی اقرأ کالونی علی گڑھ سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی ہے۔

۹- فیکلٹی کے ایک اور استاذ ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی نے قرآنیات کے تعلق سے حسب ذیل کتابیں لکھی ہیں:

قرآن اور مستشرقین، برطانوی مطالعہ قرآن، علماء سلف کی قرآن فہمی اور قرآن کا تصور جنگ وامن۔

قرآن کریم کی تدریس وتحقیق کے ساتھ قرآن کریم کی تجوید وقرأت پر بھی اس فیکلٹی نے شروع سے توجہ دی ہے، چنانچہ ایم او کالج میں طلباء کو قرآن کی تعلیم تجوید کے ساتھ دی جاتی تھی، تجوید وقرأت کی الگ سے کلاس ہوا کرتی تھی اور طلباء کو اسکالرشپ بھی دی جاتی تھی۔ تجوید وقرأت کے ممتحن باہر سے بلائے جاتے تھے، چنانچہ ۱۹۱۵ء میں جو لوگ ممتحن بن کر آئے ان میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا آزاد سبحانی وغیرہ شامل تھے۔

تجوید وقرأت کی تدریس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے، بلکہ قدرے وسعت کے ساتھ جاری ہے۔ تجوید وقرأت کی دو سطحوں پر تدریس ہوتی ہے۔ ایک سرٹیفکیٹ اِن قرأت اور دوسری ڈپلومہ اِن قرأت۔ ان دونوں کلاسوں میں طلباء کی بڑی تعداد داخلہ لیتی ہے، ان کلاسوں میں دیگر کورسوں کے ساتھ داخلہ مل جاتا ہے۔

تجوید وقرأت کی تدریس کے لیے ملک کے ممتاز قاری حضرات کو مقرر کیا گیا ہے، چنانچہ ابتدا میں مشہور قاری ضیاء الدین صاحب اور ان کے بعد قاری نیاز احمد صاحب یہ فریضہ انجام دیتے رہے اور ان کے بعد قاری سعید الاسلام اور قاری عتیق الرحمٰن صاحبان اس خدمت پر مامور ہیں۔ یہ حضرات نہ صرف تجوید وقرأت کی تدریس کرتے ہیں، بلکہ یونیورسٹی کے جلسوں، کانفرنسوں اور سمیناروں کے افتتاحی اجلاس میں قرأت کے لیے بلائے جاتے ہیں اور اپنی قرأت سے حاضرین کو مسحور کرتے ہیں۔

فیکلٹی دینیات کے تحت نظامت سنّی دینیات کا محکمہ بھی ہے، جس کا مرکزی کام یونیورسٹی کے ہاسٹل اور احاطہ میں ۲۶ مساجد کا انتظام اور نماز کا اہتمام کرنا ہے۔ یونیورسٹی کی مشاورتی کونسل نے ۱۹۷۳ء میں ائمۂ مساجد کے فرائض میں نماز کی امامت کے علاوہ یہ بھی شامل کیا کہ وہ ان بچوں کو جو ناظرہ قرآن پڑھنا نہیں جانتے ان کو قرآن پڑھائیں اور قرآن پاک کا درس بھی دیا کریں، چنانچہ یونیورسٹی کی اہم مساجد میں اس کا اہتمام جاری ہے۔ ۱۹۸۳ء میں وائس چانسلر سید حامد صاحب نے جامع مسجد میں حفظ قرآن کے لیے ایک سرکلر جاری کیا، جس کے تحت نظامت کے تین قاری حضرات حفظ قرآن کی تعلیم دینے کے لیے الگ سے مامور کیے گئے ہیں۔ حفظ قرآن کی کلاسیں جامع مسجد میں صبح اور شام کے اوقات میں ہوتی ہیں۔ نظامت سنی دینیات قرآن سے مناسبت کا مجموعی ماحول پیدا کرنے کے لیے مقابلہ قرأت اور تجوید وقرأت سمینار کا اہتمام بھی کرتی رہی ہے۔ اس طرح کی ایک کانفرنس ۱۹۹۲ء کے خصوصی شمارہ ''قرآن کریم حرف وصوت'' میں شائع ہو چکی ہے۔

رمضان المبارک میں تراویح میں قرآن پاک بالاستیعاب سنانے کا اہتمام یونیورسٹی کی ہر مسجد میں ہوتا ہے۔ بعض بڑی مساجد میں تراویح میں پڑھے گئے قرآن کا اردو ترجمہ اور خلاصہ بھی بیان کیا جاتا ہے، تاکہ طلباء میں قرآن سے استفادہ اور تفہیم کا ذوق پیدا ہو۔ تراویح کی ان نمازوں میں بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوتے ہیں۔ نئے تعلیمی سال سے قرآن مجید کے ترجمہ کی کلاسیں منتخب مساجد میں کھولی جارہی ہیں، تاکہ طلبا قرآن کریم کا ترجمہ سیکھ سکیں اور قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کریں۔ اللہ سے دعا ہے کہ قرآن کریم کے نور سے ہمارے دلوں اور یونیورسٹی کے ہاسٹلوں کو منور کردے۔

☆☆

متوازن اقتصادی نظام کے قرآنی اصول

● محمد ارتضاء الحسن رضی قاسمی کاندھلوی

ہر دستور حیات میں نظام معیشت کو بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ قرآن مجید بھی ایک مکمل دستور زندگی ہے، اس کی متعدد آیات مبارکہ میں معاشی نظام کے تعلق سے ایسے رہنما اصول بیان کیے گئے ہیں جن پر عمل کرکے ایک عادلانہ نظام معاش قائم کیا جاسکتا ہے، جو فطرت سے پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ قرآن کے نظام معاش کو سمجھنے سے پہلے دنیا میں رائج اقتصادی نظاموں کا اجمالی تذکرہ ضروری ہے، تاکہ قرآنی نظام کی اہمیت پوری طرح واضح ہوسکے۔

اس وقت دنیا میں دو نظام مقبول ہیں: ایک ''سرمایہ دارانہ'' دوسرا ''اشتراکی''۔ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد ایک ایسی انفرادی ملکیت پر ہے جس کے حصول وصرف میں آدمی آزاد و خودمختار ہو۔ اس نظام کا مقصد زائد سے زائد مال حاصل کرنا ہے۔ اس راہ میں حلال وحرام کا کوئی امتیاز نہیں۔ جھوٹ بولنا، دھوکہ دینا، حق تلفی وظلم کرنا، سود اور رشوت جیسی چیزوں کو مہذب وسائل کا درجہ حاصل ہے۔ یہ نظام جس طرح مال حاصل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تسلیم کرتا، اسی طرح خرچ میں بھی کوئی بندش قبول نہیں کرتا۔ معاشرے کی فلاح و پاکیزگی اور مذہبی واخلاقی حدود وقیود کو کوئی اہمیت نہیں دیتا اور اس نظام کے تحت غریبوں کے خون پسینے سے حاصل ہونے والی دولت عشرت کدوں، نائٹ کلبوں اور معاشرے کے لیے تباہ کن کاموں میں صرف ہوتی ہے۔

اشتراکی نظام دو اصولوں پر قائم ہے۔ ایک یہ کہ تمام وسائل دولت، صنعت، حرفت اور زراعت وغیرہ قومی ملکیت اور ملکی خزانہ ہیں۔ دوسرا یہ کہ ملک کے تمام باشندگان دولت میں برابر کے شریک ہیں۔ ایک کو دوسرے پر کوئی فوقیت نہیں۔ یہ نظام بظاہر جس قدر بے ضرر ہے بباطن اسی قدر زہرناک۔ ابتدا میں اشتراکیت کا نعرہ مزدوروں اور غریبوں کو بہت اچھا لگا تھا، مگر اس کا نتیجہ بھی سرمایہ دارانہ نظام سے مختلف نہیں نکلا۔ ان دونوں نظاموں میں تقسیم دولت عدم توازن کا شکار ہے۔ دونوں کا حاصل یہ ہے کہ غریبوں اور مزدوروں کی محنت کی کمائی سرمایہ دار کے قبضہ میں رہے یا ذی اقتدار گروہ کے ہاتھ میں۔ غریبوں کو ان کی محنت کے عوض دو وقت کی روٹی مل جائے جس طرح جانوروں کو خوراک دی جاتی ہے، یہی سبب ہے کہ دونوں نظام طرح طرح کے معاشی مسائل و مشکلات سے دوچار ہیں، جن کا حل صرف قرآن کا اقتصادی نظام ہی پیش کرسکتا ہے۔

قرآن کریم ان دونوں نظاموں کی تردید کرتا ہے اور ایسے اصول وضع کرتا ہے جن سے دولت کی تقسیم متوازن رہے۔ متوازن ہونے کا مطلب سو فیصد توازن نہیں ہے، کیونکہ ایسی تقسیم معاشرے کے لیے کسی طرح سودمند نہیں ہوسکتی۔ قرآن پاک ایسے کسی بھی نظام کو مسترد کرتا ہے جس میں اس بات کا دعویٰ کیا گیا ہو۔ ارشاد ربانی ہے: ''کیا یہ لوگ آپ کے رب کی رحمت ونعمت (اپنی رائے سے) تقسیم کریں گے؟ ہم ہی نے تقسیم کی ہے ان کے درمیان، ان کی روزی ان کی دنیوی زندگی میں اور بعض کو بعض پر درجات کے اعتبار سے فوقیت دی (کہ کسی کو بادشاہ بنایا، کسی کو چپراسی، کسی کو امیر بنایا، کسی کو غریب) تاکہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو خدمت میں لگائے رکھے۔'' (زخرف: ۳۲) ایک اور آیت شریفہ میں ہے: ''اور اللہ تم میں بعضوں کو بعضوں پر رزق میں فضیلت دی ہے۔'' (النحل: ۷۱)

قرآن وحدیث میں دولت کے دو حصے کیے گئے ہیں۔ ایک حصہ وہ ہے جس میں تمام انسانوں کے مشترک حقوق ہیں، جیسے خودرو گھاس، ہوا میں اڑنے والے پرندے، جنگل

کے شکاری جانور، پہاڑی درخت، پانی کے چشمے، پہاڑوں کی تہہ میں موجود قدرتی خزانے، دریا کا پانی وغیرہ۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں انسانی کوشش ومحنت کا دخل ہوتا ہے، جیسے صنعت تجارت اور زراعت وغیرہ سے حاصل ہونے والی دولت۔ اس حصہ دولت کو انسان اپنی کوشش ومحنت کے مطابق کم یا زیادہ حاصل کرسکتا ہے۔

قرآن کے نظام معاش کی بنیاد محنت پر ہے جو جس قدر محنت کرے اسی قدر حاصل کرے۔ اسی بنا پر قرآن کریم کی متعدد آیات شریفہ میں کسب معاش کی ترغیب دی گئی ہے۔ ایک جگہ ہے (تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ معاش تلاش کرو جو تمہارے پروردگار کی طرف ہے)۔ (البقرۃ: ۱۹۸) ایک اور جگہ ہے (پھر تم پھر وزمین میں اور خدا کی روزی تلاش کرو)۔ (الجمعۃ: ۱۰) ایک اور مقام پر ہے: (اور ہم نے ہی دن کو معاش کا وقت بنایا ہے)۔ (النبا: ۱۱)

قرآن پاک کے نظام معاش میں مال کے حصول وملکیت کی آزادی کے ساتھ ساتھ حلال وحرام کا معیار بھی قائم کیا گیا ہے، جس کی بنا قوم ومعاشرے کے مفاد پر ہے نہ کہ اصحاب اقتدار کے، کسب معاش کے ان ہی طریقوں کو حرام قرار دیا گیا ہے جن سے تقسیم دولت کا توازن بگڑے، مذہبی واخلاقی فساد پیدا ہو یا جن سے انسانی اقدار پر زد پڑے اور پاکیزگی حیات متاثر ہو۔ غرض معاشرتی استحکام اولین ترجیح ہے۔ خیال رہے سود، رشوت، جھوٹ، دھوکہ، ناپ تول میں کمی، بے ایمانی، خیانت وغیرہ سے حاصل ہونے والی آمدنی ناجائز ہے۔ شراب، خنزیر جیسی ناپاک اشیاء کی تجارت ممنوع ہے اور اس دور کے اہم ترین وسائل آمدنی عریانیت، فحاشی اور بے پردگی جیسی مخرب اخلاق چیزوں کی اس نظام میں کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن مقدس کی درج ذیل چند ہدایات ملاحظہ ہوں:

(اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر مت کھاؤ، لیکن کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے ہو تو مضائقہ نہیں)۔ (النساء: ۲۹)

(اے ایمان والو! سود مت کھاؤ اصل سے کئی حصے زائد کر کے)۔(آل عمران:۱۳۰)

(اے میری قوم! تم ناپ اور تول پوری کیا کرو اور لوگوں کا ان کی چیزوں میں نقصان مت کیا کرو)۔(ھود:۸۵)

(بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی)۔(مطففین)

قرآن پاک نے جس طرح مال و دولت کے حصول میں پاکیزگی و امانت داری کا لحاظ کیا ہے، اسی طرح اس کے صرف و استعمال کے بارے میں بھی واضح ہدایات دی ہیں۔ قرآن پاک حاصل شدہ مال میں ایجابی و سلبی دو طرح کے حقوق متعین کرتا ہے جن کی ادائیگی کے بعد فرد اپنے مال کے صرف میں آزاد ہے۔ ایجابی حقوق میں زکوٰۃ کو فرض قرار دیا گیا، کفارات کو واجب کیا گیا، صدقات کی بھرپور تاکید فرمائی گئی اور تبرع و احسان پر ابھارا گیا۔ یہ تمام حقوق غریبوں کی ضروریات کی کفالت کے لیے ہیں، ان کی ادائیگی اس بات کی ضامن ہے کہ معاشرے کا کوئی فرد بھوکا نہ رہے، کسی کے ہاتھ میں بھیک کا پیالہ نہ رہے۔ اسی طرح مال کی حفاظت کے لیے مرنے کے بعد وراثت کا مبنی بر انصاف نظام قائم کیا گیا۔

سلبی حقوق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی دولت کو ضائع نہ کیا جائے، فضول خرچی نہ کی جائے، نیز کسی فرد یا معاشرے کی مضرت و تکلیف دہی میں استعمال نہ کیا جائے۔ اس تفصیل کے بعد قرآن حکیم کی مندرجہ ذیل چند ہدایات پر غور فرمائیں:

(اور قائم کرو تم لوگ نماز کو اور دو زکوٰۃ کو)۔(البقرۃ:۴۳) کفارۂ یمین کے بارے میں ہے: (سو اس کا کفارہ دس محتاجوں کو کھانا دینا ہے اوسط درجے کا جو اپنے گھر والوں کو کھانے کو دیا کرتے ہو ان کو کپڑا دینا...الخ) (المائدۃ:۸۹) (اے ایمان والو! خرچ کیا کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے)۔(البقرۃ:۲۶۷) (تم خیر کامل کو کبھی نہ حاصل کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیزوں کو خرچ نہیں کرو گے)۔(آل عمران:۹۲) (اور تو بھی احسان کیا کر، جس طرح خدا تعالیٰ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے)۔(قصص:۷۷)

(اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے باب میں لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے...الخ) (النساء:۱۱) (اور مال کو بے موقع مت اڑاؤ، بیشک بے موقع اڑانے والے شیطانوں کے بھائی بند ہیں)۔(بنی اسرائیل:۲۶،۲۷) (کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی مت کرو، اللہ تعالیٰ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے)۔(الاعراف:۳۱)

یہ قرآن پاک کے نظام معیشت کا سرسری خاکہ ہے، جس کو پڑھ کر معمولی عقل و خرد والا بھی اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ ایسا معقول اور فطری نظام ہے جو معاشرے سے غیر محدود سرمایہ داری اور غربت و افلاس کی جڑوں کا پوری طرح خاتمہ کر سکتا ہے۔

آخر میں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ قرآن فطری اور آسمانی دستور زندگی ہے، یہاں دنیا کی زندگی، اخروی زندگی کی تمہید ہے، لہٰذا قرآن میں نظام معاش کو مقصد نہیں بلکہ آخرت کی حقیقی اور ہمیشہ کی زندگی کا وسیلہ فرمایا گیا ہے۔

قرآن پاک تاکید کرتا ہے (اے ایمان والو! تم کو تمہارے مال و اولاد اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دیں)۔(منافقون:۹) اور انھیں لوگوں کی تعریف کرتا ہے: (جن کو خرید و فروخت اور تجارت اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔) (النور:۳۷) نظام قرآن میں وہی شخص قابل تحسین و ستائش ہے جو (کھاؤ اپنے پروردگار کے رزق میں سے اور اس کا شکر بھی ادا کرو)۔(سبا:۱۵)، اس کے خلاف کرنے والوں کی عبرت کے لیے قرآن پاک نے قارون کا واقعہ ذکر فرمایا ہے جو اپنے زمانے کا امیر ترین تھا، لیکن خدا تعالیٰ کی شکر گزاری نہیں کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو مال و متاع سمیت زمین میں دھنسا دیا۔(قصص، رکوع:۱۱)

☆☆

قرآن کریم
ایک زندۂ جاوید معجزہ

● محمد ارتقاء الحسن رضی قاسمی

معجزہ اللہ تعالیٰ کی اس نشانی کو کہا جاتا ہے جو انبیاء کرام کے ہاتھوں ظاہر ہوتی ہے اور جس کو دیکھ کر ہر قوم کو اپنے نبی کی صداقت کا علم ہوتا ہے۔ آخری نبی محمد ﷺ سے پہلے جتنے نبی گزرے ان کی نبوت زمانی و مکانی اعتبار سے محدود تھی، اسی وجہ سے ان کو ایسے معجزات دیے گئے جو ان کے دنیا سے پردہ فرما جانے کے ساتھ ساتھ ختم ہو گئے، بعد میں آنے والے لوگوں نے ان کا مشاہدہ نہیں کیا، لیکن فخر موجودات محمد عربی ﷺ کی نبوت رہتی دنیا تک کی تمام انسانیت کے لیے ہے، اس لیے آپ کو قرآن عظیم کی شکل میں ایسا معجزہ دیا گیا جو قیامت تک باقی رہے گا اور ہر زمانے و علاقہ کے لوگ اسے پڑھ پڑھ کر آپ ﷺ کی صداقت پر ایمان لاتے رہیں گے، کسی کو اس معجزے پر انگشت نمائی کا موقع نہیں ملے گا۔

قرآن حکیم میں خدا تعالیٰ نے دعویٰ فرمایا ہے کہ تمام انسانیت متحد ہو کر بھی قرآن پاک کی مثال نہیں پیش کر سکتی۔ عام دعوت ہے کہ شک و شبہ ہو تو خدا تعالیٰ کے علاوہ اپنے تمام مددگاروں کو جمع کر لو اور زور آزمائی کی کوشش کر لو، پورا قرآن نہیں صرف ایک سورت کی مثال پیش کر کے دکھا دو۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے ادیبوں اور فہم و ذکاوت کے علم برداروں نے اس بارے میں قسمت آزمائی کی۔ سالہا سال پہاڑوں کی چوٹیوں اور

غاروں میں پڑے کاغذات سیاہ کرتے رہے، لیکن ناکامی و شرمندگی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ رہے قرآن کے وہ اوصاف و خصائص جن کی وجہ سے قرآن کو یہ عظیم الشان مقام حاصل ہوا تو ان کا کامل علم اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو نہیں ہو سکتا، البتہ علماء نے اس بحر بیکراں سے چند موتی اکٹھا کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ''معجز بیان'' کیوں ہے؟ ذیل میں علماء امت کے بیان کردہ اسباب میں چند ذکر کیے جا رہے ہیں۔

قرآن کے اعجاز کا پہلا سبب اس کی ترتیب کا حسن، الفاظ و آیات کا باہمی ارتباط و تناسب اور وہ بلند معیار فصاحت و بلاغت ہے، جس کے آگے عقل انسانی نے سر عاجزی خم کر دیا اور کمزور ذہنیت سحر اور جادو کہہ کر کنارہ کش ہو گئی۔ دوسرا سبب قرآن کا وہ نرالا اور انوکھا اسلوب بیانی ہے جس کی مثال دنیا کی کسی زبان اور ادب میں نہیں ملتی۔ قرآن کا انداز بیان متعارف تمام اسالیب سے جدا اور ممتاز ہے، ساتھ ہی اپنے اندر حد درجہ سحر آفرینی اور کشش رکھتا ہے۔ دنیا کے بلند پایہ ادباء و خطباء حیران ہیں کہ آخر یہ کون سا اسلوب اور اداب کی کون سی صنف ہے؟ اس کو شعر کہہ سکتے ہیں، جس کے وزن و قافیے کی نغمگی سے آدمی مست ہو جاتا ہے، نہ ہی اسالیب نثر کی روش پر ہے جس کی صنعت گری سے ذوق ادب وجد میں آجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلوب قرآنی شعر اور نثر دونوں کے اوصاف و خصائص جامع ہے، شعر کی نغمگی بھی رکھتا ہے اور نثر کی روانی بھی۔

تیسرا سبب گزشتہ قوموں اور بیتے ہوئے زمانے کے حالات و واقعات کا بیان ہے جن کو ایک امی شخص تو کجا علماء و اہل کتاب بھی نہیں جانتے تھے، بلکہ قرآن آگے بڑھ کر بنو اسرائیل کے ان معاملات میں فیصلہ کن بات اور واقعی صورت حال بیان کرتا ہے جن میں خود بنو اسرائیل خلاف و نزاع کا شکار تھے۔

چوتھا سبب غیب کی خبروں کا بیان اور مستقبل کے واقعات کی پیشین گوئیاں ہیں، جو حرف بحرف صادق آئیں اور دنیا نے ان کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کیا، مثلاً قرآن نے عجمیوں

پر رومیوں کے غلبہ حاصل کرنے کی خبر ایسے زمانے میں دی جب اسباب کی دنیا میں اس کا دور دور تک امکان نہیں تھا، چنانچہ دنیا نے دیکھا کہ پیشین گوئی کے مطابق ٹھیک نو سال بعد پانسہ پلٹا اور روم عجم پر غالب آ گیا۔

پانچواں سبب قرآن کی فصاحت و بلاغت کا ہر قوم و نسل کے نزدیک پسندیدہ و مسلم ہونا ہے، جبکہ فصاحت و بلاغت کی پسندیدگی کا معیار ہر قوم کے نزدیک جداگانہ ہوتا ہے، ضروری نہیں کہ ایک قوم کا معیاری اور پسندیدہ کلام دوسری قوم کے ذوق و مزاج سے بھی ہم آہنگ ہو۔

چھٹا سبب کسی بھی قصے یا مضمون کے تذکرے کے باوجود طبع انسانی کا بے کیف نہ ہونا ہے۔ یہ بات عقل و خرد سے ماورا ہے لیکن حقیقت ہے کہ قرآن میں جب کسی قصے یا مضمون کو دہرایا جاتا ہے تو طبیعت کو نیا کیف و سرور اور الگ نشاط حاصل ہوتا ہے، حالانکہ نفسیاتی اعتبار سے اگر کسی مضمون کو ایک ہی رنگ و قالب میں کثرت سے ذکر کیا جائے، یا کسی قصے کو بار بار دہرایا جائے تو طبیعت میں گرانی اور کدورت پیدا ہوتی ہے۔

ساتواں سبب قرآن کی بلاغت اور سحر بیانی کا آغاز سے اختتام تک کلی طور پر یک رنگ و ہم آہنگ ہونا ہے۔ قرآن کے جملہ محاسن جس طرح پہلے حرف، آیت یا سورت میں پائے جاتے ہیں اسی طرح آخر تک تمام حرفوں، آیتوں اور سورتوں میں نظر آتے ہیں۔ کہیں بھی یکسانیت میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا۔ کسی طویل کلام میں یہ خصوصیت پیدا کرنا انسانی حوصلہ و قوت سے بعید امر ہے۔ بڑے سے بڑا ادیب انشا پرداز جس رنگ و آہنگ کے ساتھ اپنے کلام کی ابتدا کرتا ہے، آخر تک اس پر برقرار نہیں رہ جاتا، جگہ جگہ وہ رنگ آہنگ پھیکا اور کمزور پڑ جاتا ہے، بلکہ ایسی فروگزاشتیں واقع ہو جاتی ہیں جن سے کلام کی حیثیت گر جاتی ہے۔

آٹھواں سبب قرآن کا شہنشاہانہ انداز بیان اور طرز تخاطب ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہر کلام سے متکلم کی حیثیت نمایاں اور ظاہر ہوتی ہے۔ بادشاہ کا کلام شاہانہ، عالم کا عالمانہ، فلسفی کا فلسفیانہ اور جاہل کا جاہلانہ ہوتا ہے، جس کو اہل ذوق صاف محسوس کرتے ہیں۔

قرآن چونکہ خالق فطرت اور مالک ارض و سما کا کلام ہے، اس لیے اس سے عظمت و کبریائی اور شان الوہیت ظاہر ہوتی ہے۔ بے شک آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا ہی کہہ سکتا ہے:

"یا أرض ابلعی مائک و یا سماء اقلعی".

(اے زمین! تو اپنا پانی چوس لے اور اے آسمان تو تھم جا)۔

انسانی طاقت یہ شان کہاں پیدا کر سکتی ہے۔

نواں سبب قرآن کے مفرد الفاظ سے تعلق رکھتا ہے۔ قرآن بسا اوقات رائج تعبیرات کو چھوڑ کر نئی تعبیر استعمال کرتا ہے اور یہ کسی ایسی حقیقت کے پیش نظر ہوتا ہے جس کا ادراک اللہ رب العالمین ہی کر سکتے ہیں۔ مثلاً عرب "موت" کے لیے مختلف الفاظ استعمال کرتے ہیں اور ہر لفظ اپنے جلو میں موت کے حوالے سے کئی نظریہ و خیال رکھتا ہے۔ قرآن ان تمام الفاظ سے صرف نظر کر کے موت کو اس طرح تعبیر کرتا ہے کہ تمام نظریات و خیالات کی تردید اور اصل حقیقت جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک کی تعبیر سے "توفی" جس کے معنی ہیں پورا پورا لے لینا اور موت کی حقیقت بھی جسم انسانی کے ہر ہر رگ و ریشے میں سرایت روح کے تمام اجزا کا نکل جانا ہے۔

مفرد الفاظ کے تعلق سے معجزہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآنی عبارت میں ایسے الفاظ ہیں، جن کو اگر قرآن کی عبارت سے الگ کر لیں تو اپنی ذات کے اعتبار سے وہ معیار فصاحت سے فروتر ہوں گے، جبکہ قرآن کی عبارت میں شامل ہو کر وہ فصاحت کے اعلیٰ مقام پر ہیں۔ مثلاً لفظ "ضیزی" فی نفسہٖ غیر فصیح لفظ ہے، لیکن ماہرین متحیر ہیں کہ قرآن میں جس جگہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے وہاں اس کی فصاحت پر کوئی نقل نہیں کر سکتا، بلکہ اگر اس کی جگہ کوئی ہم معنی فصیح لفظ رکھ دیا جائے تو عبارت کا سارا لطف اور مزہ جاتا رہے گا۔

دسواں سبب قرآن کی صوتیات سے تعلق رکھتا ہے۔ قرآن کریم کی آیات و کلمات میں ایسا صوتی حسن و جمال، حلاوت اور موسیقیت ہے، جسے ہر ایک محسوس کرتا ہے، چاہے وہ

قرآن کی زبان سے واقف یا ناواقف، بوڑھا ہو یا جوان، مرد ہو یا عورت، کسی بھی خطہ و علاقہ اور کسی بھی رنگ و نسل سے تعلق رکھتا ہو۔

قرآن کریم کے اعجاز کے اسباب و وجوہ بے شمار ہیں۔ علماء امت نے ان کو تفصیل سے بیان کیا ہے، کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے، نہ یہ سمندر کبھی ختم ہوگا نہ یہ تشنگی کبھی دور ہوگی، نہ قرآنی عجائبات وانکشافات کا سلسلہ تمام ہوگا، نہ تحیر واستعجاب کو راحت ملے گی۔ نئی نئی باتیں اور نکتے سامنے آتے رہیں گے اور قرآن مجید کی حقانیت واضح سے واضح ہوتی چلی جائے گی۔ آخرش وہ وقت آجائے گا جب انسانیت کا کوئی فرد قرآن کا انکار نہیں کر سکے گا۔

ذیل کے اس واقعہ پر اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں:

ابتدائی دور میں شعراء عرب کی عادت تھی کہ اپنے قصیدے "**ھل من مبارز**" (ہے کوئی مقابلہ کرنے والا) کے اعلان کے ساتھ ساتھ خانۂ کعبہ کی دیوار پر آویزاں کرتے تھے۔ اسی زمانے میں کسی صحابی نے ایک کاغذ پر سورۂ کوثر لکھ کر بیت اللہ شریف کی دیوار پر لٹکا دی اور نیچے کچھ لکھنے کے لیے خالی جگہ چھوڑ دی۔ ہر سال دور دراز سے آنے والے شعراء اسے پڑھتے تھے اور پوری کوشش کے باوجود اس کے نیچے کچھ لکھنے سے قاصر رہتے تھے۔ آخر میں ایک مشہور اور بلند پایہ شاعر نے ایک جملہ لکھا:

"**ما ھذا کلام البشر**"

(یہ انسان کا کلام نہیں ہے)۔

☆☆

قرآن کریم اور آسمانی صحیفے

● اجمل فاروق ندوی

اس کائنات کے خالق و مالک نے کائنات کی تخلیق میں کسی کی کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے۔ زمین بنائی تو اس کے جماؤ کے لیے میخوں اور کھونٹوں کے طور پر پہاڑ بنائے۔ پیڑ پودے خلق فرمائے تو ان کی بقا کے لیے دھوپ اور پانی کا بھی انتظام کیا۔ جانوروں اور چوپایوں کو بے زبان جاندار بنا کر زمین پر پھیلا دیا تو ان کے لیے گھاس پھوس اور دیگر اشیائے خورد و نوش بھی مہیا کر دیں۔ اسی طرح سے جب حضرت انسان کے سر پر 'اشرف المخلوقات' کا تاج رکھ کر اپنی خلافت کی ذمہ داری اس کے کاندھوں پر ڈالی تو اس کی ہدایت و راہ نمائی کے لیے موقع بموقع انبیاء و رسل کو بھی مبعوث فرمایا اور ان کے ساتھ حسب ضرورت کتابوں کی شکل میں ہدایت نامے بھی نازل کیے، تاکہ اصل راہ سے ہٹ کر ارد گرد کی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر چل نکلنے والی انسانیت کو اپنی گم رہی کا احساس ہو جائے اور وہ پھر سیدھے راستے پر گامزن ہو سکے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے انسانیت نے اپنا سفر شروع کیا، راہ میں بے شمار منزلیں آئیں، لاتعداد حادثات و واقعات کا سامنا کرنا پڑا اور ہر ہر قدم پر انسانیت نے اپنے سر پر خالق ارض وسما کی جانب سے بھیجی گئی۔ کس برگزیدہ ہستی کا سایہ محسوس کیا اور ساتھ ہی کسی صحیفے کی شکل میں ہمیشہ کچھ رہنما اصول وضوابط کو بھی اپنا ہم قدم پایا۔ حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت یونسؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت زکریاؑ، حضرت یحییٰؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت الیاسؑ،

حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور ان جیسے اَن گنت قدسی نفوس اور ان کے مختلف ادوار سے ہوتے ہوئے جب چھٹی صدی عیسوی میں انسانیت کی گاڑی آہستہ آہستہ ایک بار پھر پٹری سے اتر گئی تو اس کو راہ میں لگانے کے لیے رب دو جہاں نے ایک اور نبی کو بھیجا، لیکن اس نبی کی بعثت کے ساتھ یہ اعلان بھی کر دیا کہ بس یہ آخری نبی ہے۔ اب اس کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس کے ساتھ بھیجی گئی کتاب ہمارا آخری پیغام ہے۔ اب قیامت تک پیدا ہونے والے ہر انسان کے لیے لازمی ہے کہ وہ اس نبی اور اس کے ساتھ نازل کی گئی کتاب 'قرآن' سے ہدایت و روشنی حاصل کرے اور اپنی اخروی و دنیوی زندگی کامیابی کے ساتھ گزارے۔

قرآن نے انسانیت کو جہاں بے شمار انمول رموزِ حیات سے واقف کرایا وہیں یہ حکم بھی دیا کہ اس سے پہلے نازل کی گئی دیگر آسمانی کتابوں کی تصدیق کرنا بھی ضروری ہے، یعنی کہ قرآن کو ماننے والے ایک انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس سے پہلے منزل من اللہ سبھی کتب سماویہ کی حقانیت کا دل سے اقرار کرے اور گواہی دے کہ صاحب قرآن حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دنیا میں تشریف لانے والے تمام انبیا اور ان کے ساتھ آنے والی کتابیں سب کے سب برحق ہیں۔

یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ جس طرح سے انبیاء کی حقیقی تعداد نامعلوم ہے اسی طرح سے کتب سماویہ کل حقیقی تعداد کا علم بھی کسی کے پاس نہیں ہے اور جس طرح معلوم و نامعلوم تمام انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح سے تمام آسمانی کتابوں کی تصدیق بھی ضروری ہے، خواہ ہمیں ان سب کا نام معلوم ہو یا نہ ہو۔ اب یہاں پر ایک سوال اٹھتا ہے، وہ یہ کہ جب قرآن خود دیگر آسمانی صحیفوں پر ایمان لانا فرض قرار دے رہا ہے تو آخر ایک مسلمان کے لیے قرآن ہی کو اصول زندگی بنانا کیوں ضروری ہے؟ ایسا کیوں نہیں ہوسکتا کہ ایک آدمی اصلاً تو انجیل، توریت یا کسی دوسری آسمانی کتاب پر عمل پیرا ہو اور ساتھ ساتھ قرآن کی بھی تصدیق کر لے؟ یعنی کہ قرآن کو دیگر آسمانی کتابوں پر کیا امتیاز حاصل ہے کہ

جس کی وجہ سے اصل طریقۂ حیات اس کو بنایا جائے؟ اس اہم سوال کے جواب کے لیے ہمیں ایک مختصر سے جائزے کی ضرورت پڑتی ہے۔

صحف ابراہیم:

ان منتشر صحیفوں کو کہا جاتا ہے جن کو ہم آسمانی کتابوں کی تاریخ میں سب سے قدیم کہہ سکتے ہیں۔ ان کا تذکرہ قرآن مجید میں بھی ہے۔ یہ کچھ الگ الگ، حکام کے حامل صحیفے تھے جن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نوازا گیا تھا، لیکن اپنی حقیقی شکل میں تو بہت دور کی بات ہے۔ آج یہ صحیفے اپنی تحریف شدہ شکل میں بھی دنیا کے کسی گوشے میں یقینی طور سے موجود نہیں ہیں اور نہ کوئی قوم خود کو ان سے وابستہ کرتی ہے۔

زبور:

حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل کی گئی کتاب کا نام ہے۔ اپنے وجود کے اعتبار سے اس کا حال بھی صحف ابراہیم سے مختلف نہیں ہے، البتہ اس کے بارے میں اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ اس میں احکام و مسائل سے کئی گنا زیادہ آیات دعائیہ تھیں۔

امثال سلیمانی:

ان ہدایت کا نام ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام سے منسوب ہیں۔ یہ تعلیمات آپ کو اس لیے عطا کی گئی تھیں کہ آپ ان کے ذریعہ سے اپنی انتہائی وسیع و عریض سلطنت میں نظام عدل قائم کر سکیں، لیکن اپنی گمشدگی کے لحاظ سے یہ امثال صحف ابراہیم اور زبور سے بھی آگے ہیں۔

توریت اور اس کے احکام عشرہ:

وہ کتاب ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اتاری گئی۔ اپنے احکام کے اعتبار سے یہ

کتاب تمام معلوم آسمانی کتابوں میں سب سے جامع ہے۔ بے حساب تحریفات کے ساتھ یہ کتاب جیسی تیسی شکل میں بہرحال آج بھی موجود ہے اور یہودی اسے اپنی مذہبی کتاب تسلیم کرتے ہیں۔ اسی میں سب سے زیادہ اہمیت 'احکام عشرہ' کی ہے۔ یہ وہ ۱۰/احکام ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ بنی اسرائیل کو کوہ سینا کے دامن میں عطا کیے گئے تھے۔ ان ۱۰/احکام میں سب سے پہلا توحید، دوسرا تصویر اور مجسمہ سازی کی ممانعت، تیسرا خدا کے نام کی جھوٹی قسم کھانے کی کراہت اور چوتھا حکم سنیچر کے دن آرام کرنے کی ہدایت سے متعلق ہے۔ ان چاروں احکام کے علاوہ باقی اخلاقی احکام صرف اور صرف ۶/ ہیں۔ ان میں سے پہلا یہ ہے کہ تو اپنے ماں باپ کی عزت کر، دوسرا خون مت کر، تیسرا تو زنا مت کر، چوتھا تو چوری مت کر، پانچواں تو اپنے پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہی مت دے اور چھٹا حکم یہ ہے کہ تو اپنے پڑوسی کی بیوی، غلام، لونڈی، بیل، گدھے اور اس کی کسی دوسری چیز پر لالچ مت کر۔'' (خروج، باب:۲۰)

ان دس اخلاقی احکام کے علاوہ الگ الگ مقامات پر کچھ اسی طرح کے اخلاقی احکام اور بھی ہیں لیکن ان میں سے بہت سے مذکورہ احکام عشرہ کی تفصیل ہی کہے جاسکتے ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ کہ پوری توریت سے چن چن کر اگر اخلاقی احکام جمع کیے جائیں تو وہ کسی بھی صورت میں ۲۵/ سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔

انجیل:

عیسائی دنیا کی مذہبی کتاب ہے۔ یہ حضرت عیسیٰ سے تعلق رکھتی ہے۔ انجیل نہ صرف یہ کہ اخلاقی احکام کی تفصیل نہیں ہے، بلکہ اس میں اخلاقی تعلیمات کا احاطہ بھی نہیں کیا گیا ہے، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا مقصد اصلی بنی اسرائیل کو رسم پرستی کے خلاف روح اور شریعت کی ظاہری پابندی کے خلاف اصلاحِ باطن کی طرف دعوت دینا تھا، اس لیے خاص طور پر توریت اور زبور میں جو خالص بلند اخلاقی تعلیمات منتشر تھیں اور جن کو بنی اسرائیل اپنے قانونی مسائل کے سامنے بھلا بیٹھے تھے، ان کو یکجا کر کے آپ نے اپنے

مشہور وعظ میں پیش کیا۔ درحقیقت اس وعظ میں بیان کی گئی باتیں ہی انجیل کے اخلاقی احکام کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں، وہ تعلیمات یہ ہیں: دل کی غریبی، غمگینی، بردباری، راست بازی، رحم دلی، پاک دلی، صلح جوئی، صبر، عفو و درگزر، پاک دامنی، قسم کھانے کی ممانعت، ظالم کا مقابلہ نہ کرنا، قرض معاف کر دینا، دشمنوں کو پیار کرنا، ریا سے بچنا، توکل، عیب جوئی سے احتراز اور جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں ایسا تم بھی ان کے ساتھ کرو۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انجیل میں یہ مذکورہ تعلیمات تقریباً ان ہی الفاظ کے ساتھ ذکر کی گئی ہیں جن الفاظ کے ساتھ یہ توریت و زبور میں مذکور ہیں۔

قرآن کریم:

قرآن اللہ کی طرف سے انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجی گئی آخری کتاب ہے۔ یہ آخری نبی حضرت محمد ﷺ پر نازل کی گئی اور آج بھی اپنے نزول کے پہلے دن کی طرح جوں کی توں باقی ہے اور دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ اس کتاب کا دیگر کتب سماویہ کے سامنے یہ امتیاز ہے کہ مذکورہ آسمانی کتابوں میں جو دو کمیاں ہمیں واضح طور پر نظر آتی ہیں، یہ کتاب ان دونوں کمیوں سے صد فیصد محفوظ ہے۔ پہلی کمی جو قرآن کے علاوہ تمام آسمانی کتابوں میں موجود ہے وہ ہے ان کا تحریف و تبدل سے پاک نہ ہونا۔ ان کتابوں کے ماننے والوں کو خود اس حقیقت کا اعتراف ہے، جبکہ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ، حرف اور حرکات و سکنات سب کے سب کسی ادنیٰ سی تحریف سے بھی محفوظ ہیں۔

دوسرا امتیاز جو قرآن کو دیگر آسمانی کتابوں پر حاصل ہے وہ اس کی وسعت و جامعیت، یعنی کتابوں میں جو بات مختصراً بیان کی گئی ہے قرآن نے نہ صرف یہ کہ اس کو بیان کیا ہے بلکہ اس کو مزید وسعت و ہمہ گیریت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہم نے سابقہ سطور میں دوسری کتابوں میں بیان کیے گئے اخلاقی احکام کا جائزہ لیا۔ ان اخلاقی احکام کو جب ہم قرآن میں تلاش

کرتے ہیں ہمیں نہ صرف یہ کہ اخلاقیات کا بڑا ذخیرہ نظر آتا ہے بلکہ ان اخلاقی احکام کے بے شمار جزئیات بھی قدم قدم پر ہاتھ آجاتے ہیں۔ سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے قرآن کے اخلاقی احکام کی ایک مجمل فہرست تیار کی ہے جس میں ذکر کیے گئے احکام کی تعداد ڈیڑھ سو سے متجاوز ہے، پھر ان احکام کی روشنی میں بیان کی گئیں احادیث کو بھی اگر شمار کرلیا جائے تو یہ تعداد کئی سو سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے۔ مزید وضاحت کے لیے ایک مثال لیتے ہیں:

صدقہ وخیرات تمام مذاہب میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، لیکن توریت میں اس کو محض عشر اور سالانہ زکوٰۃ تک محدود رکھا گیا ہے، جبکہ انجیل نے سب کچھ غریبوں کو دے کر خود غریب بن جانے کی تعریف کی ہے۔ قرآن نے جب اس اخلاقی فریضے کا ذکر کیا تو سالانہ زکوٰۃ کے ذکر کے ساتھ ہم کو عام طور پر بھی صدقہ کرنے کا حکم دیا۔ ایک طرف (لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں تو کہہ دو جو تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو)۔ (البقرۃ: ۲۷) فرما کر اپنے آپ کو کنگال کر لینے سے روکا تو دوسری طرف جن انصار نے اپنی ضرورتیں روک کر مہاجرین پر خرچ کیا تھا ان کی تعریف بھی ان الفاظ کے ساتھ فرمائی: (وہ دوسروں کو اپنے پر ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ خود ان کو ضرورت ہوتی ہے)۔ (الحشر: ۱) یعنی اپنی ضرورت روک کر دوسروں کو دے دینا لازمی نہیں، لیکن کمالِ اخلاق کی دلیل قرار دیا گیا۔ پھر مزید آگے بڑھ کر سڑی گلی اور خراب چیزوں کو صدقہ کرنے سے بھی روکا اور فرمایا: (تم ہرگز نیکی کو نہیں پاسکتے جب تک اپنی محبوب اشیاء کو خرچ نہ کرو)۔ (آل عمران: ۱) غرض یہ کہ تمام مسائل کو قرآن نہ صرف یہ کہ ذکر کرتا ہے، بلکہ اس کی تمام جزئیات کو بھی کھول کھول کر بیان کر دیتا ہے۔ اپنے اس وصف میں قرآن دیگر تمام آسمانی کتابوں میں منفرد اور لاثانی ہے اور ایسا اس وجہ سے ہے کہ اپنی پیش رو آسمانی کتابوں کی طرح قرآن کسی خاص قوم کے لیے نازل نہیں ہوا ہے، بلکہ یہ قیامت تک پیدا ہونے والے ہر فرد اور معاشرے کے لیے ہے۔

☆☆

اشاعت قرآن مجید کی تجارت عظیم دینی خدمت

● فاروق ارگلی

سرکار دو عالم آنحضرت ﷺ کا وصال ۱۱ ہجری میں ہوا، اس کے بعد تقریباً ۴۰ ہجری تک اکابر صحابۂ کرامؓ اور ان سے چھوٹی عمر کے صحابہ تبلیغ دین متین اور قرآن وحدیث کی ترویج واشاعت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ صحابہ کرامؓ کو ایک طرف جہاں امتیاز حاصل ہے کہ انھیں آنحضرت ﷺ کی رفاقت میسر تھی تو وہیں وہ قرآن کریم کے اوّلین مخاطب تھے اور نبوت کی تمام برکات سے براہ راست مستفید ہونے کا انھیں شرف حاصل تھا۔ ان اصحاب نے جو کچھ دیکھا اور جانا تھا، وہ اپنے بچوں، عزیزوں، دوستوں اور ملنے والوں کو سناتے رہتے تھے۔ یہی ان کی زندگیوں کا مقصد ومشغلہ تھا۔ صحابہ کرام نے آنحضرتؐ کے فرمان "بلغوا عنی ولو آیة" (مجھ سے جو کچھ دیکھو اور سنو اس کی اشاعت کرو) کی تعمیل کو مقصد حیات بنالیا تھا۔ صحابہ کرامؓ کی اس مقدس جماعت میں اصحابِ صفہ کو خاص اہمیت حاصل ہے جنھوں نے زندگی کی تمام آسائشوں سے منھ موڑ کر خدمت اور تعلیم وتعلّم کو اوڑھنا وبچھونا بنالیا تھا۔ باہر کے مسلمانوں کو قرآن وحدیث کی تعلیم کی ضرورت ہوتی تو یہی اصحاب باہر بھیجے جاتے تھے۔

''مشہور مورخ البلاذری اپنی کتاب فتوح البلدان میں لکھتا ہے کہ جب اسلام آیا تو قریش میں ۱۷ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ جب غزوۂ بدر میں لڑائی کے بعد آنحضرت نے جنگی قیدیوں کے لیے حکم فرمایا کہ جو لوگ مفلسی اور ناداری کی وجہ سے فدیہ نہیں ادا

کر سکتے وہ صحابہ کرام کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو اس سے مسلمانوں میں لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ خلفائے راشدین کے دورِ خلافت میں اس کی طرف خصوصی توجہ ہوئی۔ انھوں نے تمام اضلاع میں احکام بھیج دیے کہ لوگوں کو کتابت اور شہسواری کی تعلیم دی جائے۔'' (الفاروق، شبلیؒ)

اشاعت اسلام کے بعد جن چیزوں پر اسلام کی اساس ہے اس میں سب سے مقدم کلام اللہ کی حفاظت اور اس کی تعلیم وترویج ہے۔ مسلمانوں نے جس طرح قرآن پاک کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کو تحریف سے محفوظ رکھا ہے وہ علمی تاریخ کی ایک منفرد مثال ہے۔ اگرچہ قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ہی مرتب ہو چکا تھا، لیکن کتابی شکل میں قرآن مجید کی مسلسل کتابت حضرت ابوبکر صدیق کا بڑا کارنامہ ہے اور جب تک قرآن حکیم اور ایک بھی کلمہ گو موجود ہے حضرت ابوبکر صدیق کے اس احسانِ عظیم سے سبکدوش نہیں ہوسکتا۔ عہد صدیقی میں جنگ یمامہ کے بعد قرآن پاک کی کتابت بغرض حاظت واشاعت حضرت عمر فاروق کے مشورے سے عمل میں آئی تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ''ازالۃ الخفا'' میں لکھا ہے: ''آج مسلمانوں میں جو کوئی قرآن مجید پڑھتا ہے اس کی گردن پر حضرت عمر فاروق کا احسان ہے۔'' قرآن پاک کے ضمن میں خلیفہ سوم حضرت عثمان غنی کی خدمات بھی نہایت اہم ہیں، جنھوں نے مسلمانوں کو قرآن مجید کی ایک قرأت اور ایک مصحف پر جمع کر دیا۔ جب فتوحات اسلامی کا دائرہ وسیع ہونے لگا اور عجمی بکثرت دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئے تو قرأت قرآن اور املا کی یکسانیت کو برقرار رکھنے کے لیے حضرت عثمانؓ نے عہد صدیقی میں مدوّن کیا ہوا نسخہ جو امّ المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس محفوظ تھا منگوایا اور اس کی نقلیں تمام ممالک اسلامیہ کو بھجوائیں۔ (سیوطی، تاریخ الخلفاء)

اور یہ وہی مصحف مقدس ہے جس میں آج ایک نقطے کی بھی تبدیل نہیں ہوئی۔ قرآن

حکیم کو ساری دنیا کی مذہبی کتابوں میں یہ تفوق بھی حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دور اور ہر وقت میں اپنے مقدس کلام کو لاکھوں حفاظ کے سینوں میں محفوظ رکھا ہے۔ دنیا کی کسی مذہبی کتاب کو یہ امتیازی خصوصیت حاصل نہیں ہے کہ ایک نقطے کے فرق کے بغیر اس کا متن انسانی حافظے میں محفوظ رہ جائے۔ یہ قرآن کا زندہ معجزہ ہے۔

قرآن اور فن کتابت کی لطافت:

طلوع اسلام کے بعد ہر دور میں قرآن کریم کی ترویج واشاعت کا کام اہم ترین دینی فریضے کے طور پر انجام پاتا رہا۔ علماء کرام اور ائمہ عظام نے قرآن کریم کی تعلیمات کو عام کرنے کے مقصد سے بڑے بڑے علمی کارنامے انجام دیے۔ کائناتِ انسانی کی اس سب سے بڑی کتاب کی خوبصورت کتابت کا فن بھی ایک مقدس فن لطیف کی صورت میں فروغ پایا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایجاد کردہ خط کوفی میں قرآن حکیم کی کتابت کے بعد اب تک کی گزشتہ تاریخ میں قرآن کریم کی خطاطی کے ایسے ایسے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں جن کی مثال قرآن کی زبان عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں مفقود ہے۔ خود ہندوستان میں اسلام کی آمد کے بعد قرآن کریم کی اشاعت وکتابت میں بے پناہ ترقی ہوئی۔ یہ قرآن کریم کی ہی برکت تھی کہ مسلم سلاطین کے ادوار میں خطاطی کو اشرافیہ میں وقار اور عزت کا باعث تصور سمجھا جاتا تھا۔ شہنشاہ اورنگ زیبؒ اور دوسرے سلاطین کے خود کتابت کردہ قرآن مجید کے نمونے آج بھی جنت نگاہ ہیں۔ مسلمانوں نے قرآن حکیم کی خطاطی اور تزئین کے فن میں بے اندازہ ترقی کی، آبِ زر سے لکھے ہوئے حسین ترین صحیفے دیکھ کر آج یہ حیرت ہوتی ہے کہ جب چھاپہ خانہ کی تکنیک معرضِ وجود میں نہیں آئی تھی، مسلمان کس طرح اپنے ہاتھوں سے قرآن حکیم کے ایسے نسخے تیار کر لیتے تھے کہ موجودہ ترقیات کے دور میں کمپیوٹر اور طباعت کی جدید مشینوں کے ذریعہ بھی ویسی صناعی ممکن نہیں۔

قرآن کی اشاعت اور منشی نول کشور:

۱۹ویں صدی میں جب طباعت کے لیے مشینوں کا رواج عام ہوا تو قرآن کریم کی ترویج واشاعت کے طریقوں میں بھی انقلاب آیا۔ ہندوستان میں منشی نول کشور جو انقلاب ۱۸۵۷ء سے پہلے لاہور کے اخبار 'کوہِ نور' میں کام کرتے تھے، غدر کے بعد لکھنؤ آ گئے اور یہاں انھوں نے اپنے مشہور عالم مطبع نول کشور قائم کیا جس کے ذریعہ اردو، عربی، فارسی ادبیات اور علوم فنون کی بڑے پیمانے پر اشاعت کے ساتھ ہی قرآن حکیم اور اسلامیات کی کتابوں کو اس معیاری طریقے پر پیش کیا کہ پورے ایشیا میں دھوم مچ گئی۔ منشی جی بظاہر ہندو تھے، لیکن اللہ نے اس نیک بندے کو اپنے دین کی ترویج واشاعت کی توفیق عطا فرمائی۔ منشی جی نے قرآن کریم اور دینی مطبوعات کی خطاطی اور تصحیح وتزئین کے لیے اپنے دور کے مایۂ ناز اہل علم وفن کو لکھنؤ میں جمع کیا تھا۔ قرآن حکیم کے احترام میں منشی جی کی احتیاط کا عالم یہ تھا کہ قرآن کریم اور دینی کتب کی طباعت و جلدسازی کے شعبوں میں جانے کے لیے ہر کارکن کا پاک اور باوضو ہونا لازمی تھا۔ مطبع نول کشور کے قرآن مجید اور دوسری مطبوعات آج بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ ان کے ورثاء راجہ رام کمار بک ڈپو اور تیج کمار بک ڈپو لکھنؤ نے اپنے جد اعلیٰ کا نام زندہ رکھا ہے، لیکن مرورِ وقت کے ساتھ اب یہ برائے نام ہے۔ پھر بھی ہندوستان میں قرآن مجید کی طباعت واشاعت کا جب بھی ذکر آئے گا منشی نول کشور کا نام عزت واحترام سے لیا جائے گا۔

تاج کمپنی لاہور اور قرآن کی اشاعت:

بیسویں صدی کے اوائل میں برصغیر کی تقسیم سے قبل قرآن کریم کی خوبصورت ترین کتابت، طباعت اور وسیع پیمانے پر اشاعت کا امتیاز، تاج کمپنی لاہور کو حاصل ہوا۔ اس ادارے کے مطبوعہ قرآن مجید کے نسخوں کی نقل آج بھی ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں کی جارہی ہے۔ ہر روز چھپنے والے لاکھوں نسخوں میں زیادہ تر تاج کمپنی کے مطبوعہ نسخوں

کا عکس ہوتے ہیں۔ تاج کمپنی نے قرآن مجید اور دوسری دینی وعلمی کتب کو اس قدر اعلیٰ معیار کے ساتھ پیش کیا جس کی کوئی مثال پرنٹنگ پریس کی ایجاد کے بعد ڈیڑھ پونے دو صدی کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ تاج کمپنی نے اس دور میں حسین ترین رنگین، حنائی، معری و مترجم قرآن مجید کی طباعت کو رواج دیا جب فوٹو آفیسٹ کی تکنیک ہندوستان میں عام نہیں ہوئی تھی اور کلر پرنٹنگ بلاک اور لیٹر پریس ہی کی محتاج تھی۔ تاج کمپنی کے مطبوعہ قرآن مجید، سیپاروں، پنج سورہ یا یازدہ سورہ وغیرہ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ شاید ہی کوئی مسلمان گھر، مدرسہ یا مسجد ہوگی جہاں تاج کمپنی کا چھپا ہوا کوئی نسخہ کلام مجید موجود نہ رہا ہو۔

شہر دہلی شروع سے ہی علم وادب، کتابت، طباعت اور اشاعت کا مرکز رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے قبل کمپنی کی حکومت میں ہی یہاں لیتھو پریس کا رواج عام ہو گیا تھا اور کئی بڑے مطابع قائم ہو گئے تھے۔ اس دور کے مطبوعہ اخبارات اور کتابوں کا معیار اس دور کے مزاج اور مذاق کے مطابق اعلیٰ درجہ کا تھا۔ بیسویں صدی کا نصف آخر صنعتی وتکنیکی ترقی کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں دیگر شعبۂ ہائے زندگی کی طرح طباعت و اشاعت کے میدان میں بھی نئی نئی مشینوں اور تکنیک نے عدیم المثال انقلاب برپا کیا۔ دہلی، ممبئی اور ملک کے دوسرے شہروں میں بڑے بڑے پریس اور اشاعتی ادارے قائم ہوئے، لیکن قرآن کریم اور اردو، عربی وفارسی خاص طور پر اسلامیات کی طباعت واشاعت کے لیے دہلی کو سب سے بڑے مرکز ہونے کا امتیاز حاصل رہا۔

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ قرآن مجید کی شاندار طباعت واشاعت کے لیے ممبئی کے ادارہ تاج آفس کو بیحد اہمیت حاصل رہی۔ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں اس کمپنی نے قرآن حکیم کے اعلیٰ ترین نمونے شائع کیے۔ مولانا فتح محمد خاں جالندھری کے مشہور زمانہ ترجمہ قرآن کریم بغیر عربی متن کے تاج آفس نے ہی ''روشن چراغ'' کے نام سے شائع کیا۔ یہ کتاب ہندوستان کے نامور خطاط نورالدین نے لاہوری خط میں کتابت کی تھی جو اس قدر

خوبصورت ہے کہ آج بھی ملک کے بیشتر ناشرین اسی کا عکس شائع کررہے ہیں۔

تاج آفس کی طرح ممبئی کے مطبع محمدی کا کاروبار بھی اسلامی کتب اور قرآن کریم کی اشاعت میں نمایاں رہا، لیکن دہلی کے اداروں نے کتابت وطباعت کے معاملہ میں ممبئی اور دوسرے شہروں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ نشر واشاعت کا کام ایک طرح سے دہلی میں گھریلو صنعت کی شکل اختیار کرگیا۔ اخبار، رسالوں، کتابوں اور خاص طور پر قرآن حکیم کی چھپائی کو یہاں بیحد فروغ حاصل ہوا، یہاں تک کہ کئی ہندو ادارے بھی اس میدان میں کود پڑے جن میں نراین داس جنگلی مل، رتن اینڈ کو اور گرگ اینڈ کو کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

تقسیم کے بعد لاہور سے دہلی منتقل ہونے والے جے ایس سنگ سنگھ اینڈ سنز نے ہندوستان آکر قرآن حکیم کی طباعت اور اشاعت کا کام بڑے پیمانے پر شروع کیا اور اسے ملک گیر ترقی ومقبولیت حاصل ہوئی۔ اس جگہ دہلی کے لاتعداد ناشروں کا ذکر ممکن نہیں جو فی الوقت قرآن کریم کی طباعت واشاعت کے کام میں سرگرم ہیں، لیکن اس میدان میں مکتبہ جماعت اسلامی، مدینہ بک ڈپو، ناز پبلشنگ ہاؤس، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، مکتبہ الحسنات، ادارہ اشاعت دینیات اور فرید بک ڈپو کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ مؤخر الذکر فرید بک ڈپو نے گزشتہ دو دہائیوں میں قرآن کریم کی اشاعت وترویج میں حیرت ناک ترقی کی ہے۔ آج اس کا شمار ایشیا کے بڑے اشاعتی اداروں میں ہوتا ہے، جہاں قرآن کریم کے اتنے زیادہ معیاری نمونے دستیاب ہیں کہ شاید اتنے متنوع نمونے عالم اسلام کے سب سے بڑے قرآنی ادارے ''قرآن پریس'' میں بھی نہیں تیار کیے جارہے ہیں جو کہ حکومت سعودی عربیہ کا ادارہ ہے۔ فرید بک ڈپو کی اس حیرت ناک ترقی کا سہرا اس کے بانی محمد فرید خان مرحوم کے سر ہے جنھیں قرآن کریم سے اس قدر عقیدت ومحبت تھی کہ اس کی ترویج واشاعت کو انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا اور اپنے چھوٹے سے جلدسازی کے کارخانے کو اللہ کی نصرت واعانت اور مسلسل جدوجہد کے سہارے دنیائے اسلام کا نامور اشاعتی ادارہ

بنادیا۔ یہ مرحوم فرید خان کے اخلاصِ نیت کا ہی ثمرہ ہے کہ ان کے لائق فرزند الحاج محمد ناصر خان کو بھی قرآن کریم کی ترویج واشاعت کا بے پناہ شوق ورثے میں ملا جنھوں نے اپنے والد کے مقدس مشن کو اپنی خداداد صلاحیتوں اور شبانہ روز کی کاوش ومحنت سے ترقی کے بام عروج تک پہنچادیا۔ آج فرید بک ڈپو کے مطبوعہ قرآن مجید کے مختلف شاندار نمونے، تراجم وتفاسیر نہ صرف ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور نیپال، بلکہ جنوبی افریقہ، ملیشیا، سنگاپور، انڈونیشیا، چین اور دوسرے ممالک کے فرزندان توحید میں بیحد مقبول ہیں۔

اللہ کی کتاب کا یہ کتنا بڑا کرشمہ ہے کہ ہر روز دنیا بھر میں اس کے کروڑوں نسخے چھاپے جارہے ہیں پھر بھی مانگ کبھی کم نہیں ہوتی، یہ خصوصیت بھی دنیا کی کسی اور کتاب کو حاصل نہیں ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ اشاعت قرآن کا کاروبار ایک عظیم دینی خدمت ہے جس کی توفیق اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے منتخب بندوں کو تفویض ہوتی ہے۔

☆☆

عورت۔ قرآن کی نظر میں

● ڈاکٹر ثمینہ تابش

انسانی معاشرے میں عورت کے مقام، کردار اور اس کے حقوق وفرائض کا مسئلہ قدیم و جدید ہر دور میں زیر بحث رہا ہے۔عورت انسانی معاشرے کا نصف ہے، بلکہ معاشرے کی تعمیر وترقی میں اس کا رول مرد سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ بجا طور پر اس بات کی مستحق ہے کہ معاشرے میں اس کے صحیح مقام ومرتبے کا ادراک کیا جائے اور اس کے حقوق کی ادائیگی کی فکر کی جائے، تاکہ تہذیب وتمدن کی گاڑی سکون اور اطمینان سے منزل کی طرف گامزن رہے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ عجیب المیہ بھی ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں عورت کے مقام ومرتبے کی تعین میں افراط وتفریط سے کام لیا گیا ہے۔

اہل یونان نے اس کو اس حد تک ناپاک سمجھا کہ اس کو ”رجس من عمل الشیطان“ جیسے القاب سے پکارا تو رومیوں نے بھی اس کے ساتھ محض غلاموں جیسا سلوک کیا۔ اہل عرب کا سر لڑکی کی پیدائش پر شرم سے جھک جاتا تھا تو اہل یورپ ایک صدی سے کچھ پہلے عورت کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنائے ہوئے تھے۔ آزادی نسواں کا مشہور علم بردار مل (Mill) اپنی کتاب ”محکومیت نسواں“ میں لکھتا ہے:

”تاریخ یورپ کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ باپ اپنی بیٹی کو جہاں چاہتا بیچ ڈالتا تھا اور اس کی مرضی کی کچھ پرواہ نہیں کرتا تھا، اس کو شیطان کی ’ایجنٹ‘ اور ’معصیت‘ کا دروازہ جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔“

مندرجہ بالا سطور سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ معاشرے میں عورت کے مقام و مرتبے کی تعین کے سلسلے میں قدیم وجدید تہذیبی عدم توازن کا شکار رہی ہیں۔ اس کے بعد جب ہم قرآن اور اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ صرف اسلام ہی دنیا کا وہ مذہب ہے جو مرد اور عورت سے متعلق اتنی واضح تعلیمات اور ہدایات دیتا ہے کہ دوسرے تمام ادیان اور تہذیبیں انگشت بدنداں رہ جاتی ہیں۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ اسلام دین فطرت ہے۔ وہ انسانی نفسیات کے ہر پہلو سے بہ خوبی واقف ہے، چنانچہ اس کی تعلیمات تقاضائے فطرت کے عین مطابق ہوتی ہیں۔ وہ انسان کے احترام اور تکریم کا قائل ہے اور اس سلسلے میں واضح ہدایات بھی پیش کرتا ہے۔ اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی اس نے عورت کے مقام اور مرتبے اور اس کے حقوق وفرائض سے متعلق نہایت واضح ہدایات دی ہیں۔ اسلام نے عورت کو ذلت ورسوائی کے مقام سے اٹھایا اور اتنی تیزی سے اٹھایا کہ صحابی رسولؐ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں:

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہم اپنی عورتوں سے گفتگو کرنے اور بے تکلفی برتنے میں بھی ڈرتے تھے کہ کہیں ہم سے متعلق کوئی حکم نازل نہ ہوجائے، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوگیا تو ہم ان کے ساتھ بے تکلف رہنے لگے۔“ (بخاری، کتاب النکاح، باب الوصاۃ بالنساء)

اسلام نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی عورتوں سے متعلق جن بنیادی اصلاحات کا اعلان کیا ان کا خلاصہ کچھ اس طرح سے کیا جاسکتا ہے:

(۱) عورت بھی مرد ہی کی طرح انسان ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: (اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو، جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا)۔ (النساء:۱)

اور انسان خود قرآن کی زبانی فطرت کا عظیم ترین اور مکرم شاہکار ہے، لہٰذا عورت بھی مرد ہی کی طرح لائق احترام اور مکرم ہے۔

(۲) سابقہ ادیان نے عورت کو ملعون و مقہور قرار دے رکھا تھا، اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ مذاہب آدم کے جنت سے نکلنے کا ذمہ دار عورت کو یعنی حوا کو قرار دیتے تھے۔ اسلام نے اس لعنت کا خاتمہ کیا اور دونوں (آدم وحوا) کو جنت سے نکلنے کا ذمہ دار قرار دیا:

''تو شیطان نے ان دونوں کو اس سے گمراہ کر دیا اور ان کو اس جگہ سے نکلوا دیا جس میں وہ تھے۔'' (البقرۃ:۳۶)

ان کی توبہ سے متعلق ارشاد فرمایا: ''اے ہمارے رب! ہم (دونوں) نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم یقیناً نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔'' (الاعراف:۲۳)

بلکہ بعض مقامات پر تو اس گناہ کی نسبت صرف آدم علیہ السلام کی طرف کی گئی ہے:

''اور آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو وہ راہ راست سے ہٹ گیا۔'' (الاحزاب:۳۵)

(۳) نیکی اور تقویٰ کی روش اختیار کرنے پر وہ مرد ہی کی طرح اجر وثواب کی مستحق ہے اور نتیجتاً جنت میں داخلے کی۔ اس کے برعکس معصیت کے ارتکاب پر دوزخ اور عذاب کی۔

ارشاد ربانی ہے:

(جس نے بھی نیک کام کیے چاہے وہ مرد ہو یا عورت تو ہم ضرور اسے پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور اس کے عمل کا بہترین بدلہ دیں گے) (النحل:۹۷)

(۴) بچی کی پیدائش پر رنج وافسوس کا اظہار عرب معاشرے میں عام تھا اور صرف عرب معاشرہ ہی کیا آج بھی مختلف اقوام میں لڑکی کی پیدائش کو باعث عار سمجھا جاتا ہے، چاہے وہ ہندوستانی معاشرہ ہو یا آزاد خیال مغربی معاشرہ۔ بچیاں آج بھی باعث ننگ و عار سمجھی جاتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اہل عرب اس کو زندہ درگور کر دیتے تھے اور آج اس کو پیدائش سے قبل ہی ختم کر دیا جاتا ہے، یا اگر غلطی سے پیدا ہو بھی جائے تو اسے گلا گھونٹ کر مار دینے، چلتی ٹرین سے پھینک دینے اور اس طرح کے ہزاروں انسانیت کو

شرمسار کر دینے والے واقعات آئے دن اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ سامنے آتے رہتے ہیں۔ قرآن نے بچی کو زندہ درگور کرنا حرام قرار دیا اور جاہ جا اس شنیع عمل کی مذمت کی۔

ارشاد ربانی ہے:

(اور جب زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ اسے کس جرم میں قتل کیا گیا)۔ (التکویر:۹)

(بغیر علم یقیناً بڑے نقصان میں ہیں وہ لوگ جنھوں نے اپنی اولاد کو بغیر علم کے محض بے وقوفی کی بنیاد پر قتل کیا)۔ (الانعام:۱۴۹)

(۵) مرد کی طرح عورت کو بھی علم حاصل کرنے پر ابھارا:

طلب العلم فريضة على كل مسلم.

(علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے)۔ (رواہ البیہقی)

یہ حدیث ''مسلمة'' کے لفظ کی زیادتی کے ساتھ معاشرے میں رواج پا گئی ہے جو کہ صحیح نہیں ہے۔ 'مسلم' سے مراد مرد اور عورت دونوں ہی ہیں۔

(۶) شوہر اور بیوی کے حقوق مقرر کیے اور اس طرح خاندانی ڈھانچے کو مضبوط کیا۔

ارشاد ربانی ہے:

(اور ان کے بھی مردوں پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے ان پر اور مردوں کو ان پر ایک درجہ فوقیت حاصل ہے)۔ (سورۃ البقرۃ:۲۲۸)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورت مرد کے مقابلے میں حقیر یا کم تر ہے، بلکہ خاندان کی سرپرستی اور قوامیت مرد کو دنیا فطرت انسانی اور کائنات کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ زوجین مساوی طور پر ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ اس میں ذلت وحقارت یا عزت و سربلندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن نے مختلف پہلوؤں سے اس حقیقت کی وضاحت

کی ہے۔ایک مقام پرفرمایا:

"ھن لباس لکم وانتم لباس لھن".

(وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو)۔

ارشاد ربانی ہے:

" و من اٰیٰتہٖ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا و جعل بینکم مؤدۃ ورحمۃ" (اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت ورحمت پیدا کردی)۔(الروم:۲۱)

(۷) قدیم مذاہب مالی اعتبار سے بھی عورت اور مرد کو ایک حیثیت دینے پر آمادہ نہ تھے، لہٰذا انھوں نے دونوں کے لیے الگ قوانین تجویز کئے، لیکن اسلام عورت کو وراثت میں حقدار ٹھہراتا ہے، چنانچہ قانون وراثت کے تحت اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: (جو کچھ ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑیں خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ اس میں مردوں کا بھی حصہ ہے اور عورتوں کا بھی حصہ ہے، ایک مقرر حصہ)۔(النساء:۷)

اس کے علاوہ قرآن عورت کو بحیثیت ماں، بیٹی اور بیوی کے عزت واحترام کا مستحق قرار دیتا ہے اور اجر وثواب بھی مقرر کرتا ہے۔طلاق ونکاح، وراثت، ولایت وغیرہ کے سلسلے میں واضح ہدایت دیتا ہے، جن کی گہرائی میں جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عورت کے حق میں عین رحمت ہیں۔وہ اس کو انسانی، اجتماعی اور حقوق ہر پہلو سے مضبوط اور محفوظ کرتا ہے اور اس کی حمایت میں ایسی تعلیمات پیش کرتا ہے جو آج تک کوئی بھی مدعی حقوق نسواں نہ کرسکا۔

موجودہ معاشرہ عورت اور مرد سے متعلق سماجی رابطے اور ضابطے طے کرنے میں ناکام ہے، چنانچہ عورت اپنے فطری دائرۂ کار سے نکل کر اس دائرے میں تگ ودو کرتی

نظر آتی ہے جو اس کے لیے نہیں بنا ہے۔عورت سے متعلق ان غلط تصورات نے تہذیبوں اور معاشروں کی چولیں ہلا دی ہیں۔ایسی صورت میں ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن کی روشنی میں مسلمان عورت اپنے مقام، مرتبے اور کردار کو سمجھے۔معاشرے کی اصلاح و تربیت میں اپنے اہم رول کو پہچانے اور خود بھی اس سلسلے میں تگ ودو کرے اور دوسرے مذاہب کی عورتوں کو بھی اس عظیم نعمت سے متعارف کرائے، تاکہ یہ دنیا بھر گہوارۂ سکون بن جائے۔

☆☆

عورت، بائیل اور قرآن میں

● ڈاکٹر حنا باری

عورت نصف انسانیت اور نصف حیات ہے۔ عورت کے بغیر نوع انسانی کے لیے بنایا گیا ہر منصوبہ ناقص اور ادھورا ہے۔ کسی ایسے معاشرے کا ہم تصور نہیں کر سکتے جو تنہا مردوں پر مشتمل ہو اور جس میں عورت کی ضرورت نہ ہو۔ عورت انسانی زندگی کے دو ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ مرد و عورت دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ نہ عورت مرد سے مستغنی ہو سکتی ہے نہ مرد عورت سے بے نیاز۔

عورت اعداد و شمار کے لحاظ سے معاشرے کا نصف ہے، لیکن اپنے شوہر، اپنی اولاد اور گرد و پیش پر اثر انگیزی کے اعتبار سے وہ نصف سے بھی زیادہ ہے۔ ایک عرب شاعر نے کہا:

"الأم مدرسة اذا اعددتها اعدت شعبا طيّب الاعراق"

(ماں ایک مدرسہ ہے، اگر آپ اس کو تیار کرتے سنوارتے ہیں تو گویا آپ اچھی نسل کی ایک قوم تیار کرتے ہیں)۔

عظیم لوگ اور عبقری شخصیتوں کی تعمیر میں عورت کا بڑا حصہ ہوتا ہے، اس لیے لوگ کہتے ہیں کہ ہر عظیم شخص کے پیچھے عورت کا رول ہوا کرتا ہے۔

عورت اتنی اہم ہستی کے باوجود معاشرے نے اس کے ساتھ انصاف کا برتاؤ نہیں کیا اور نہ ہی عورت کے تعلق سے معتدل راہ اختیار کر سکے۔ ہمیشہ افراط و تفریط کا شکار رہے کبھی

وہاں عورت جو ماں کی حیثیت سے آدمی کو جنم دیتی اور بیوی کی حیثیت سے زندگی کے ہر نشیب و فراز میں مرد کی رفیق رہتی ہے، خادمہ، بلکہ لونڈی کے مرتبہ پر رکھ دی گئی، اس کو بیچا اور خریدا جاتا، اس کو ملکیت اور وراثت کے تمام حقوق سے محروم رکھا جاتا۔ اس کو گناہ اور ذلت کا مجسمہ سمجھا جاتا، دوسری طرف وہی عورت اٹھائی اور ابھاری جاتی، لیکن اس طرح کہ اس کے ساتھ ہی بداخلاقی اور بدنظمی کا شدید طوفان اٹھ کھڑا ہوتا۔ وہ حیوانی خواہشات کا کھلونا بنائی جاتی، اس کو شیطان کا ایجنٹ بنا کر رکھ دیا جاتا، اس طرح انسانیت کی تباہی شروع ہو جاتی۔

لیکن اسلام نے اس کے تعلق سے ہمیشہ اعتدال کی راہ اختیار کی، اس نے عورت کو عزت و عظمت بخشی، اسے ایک بیوی، ایک ماں اور معاشرہ کا ایک اہم رکن، بلکہ ان سب سے پہلے ایک انسان کے روپ میں پیش کیا۔

آج اسلام کے خلاف سب سے پہلے یہی بات کہی جاتی ہے کہ اسلام نے عورت کو کم تر مقام دیا ہے۔ مسلمان عورت مظلوم اور محکوم ہے۔ انگریز مستشرق ایڈورڈ ولیم لین نے قرآن کے منتخب حصوں کا اردو ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ پہلی بار لندن سے ۱۸۴۳ء میں چھپا۔ اس ترجمہ کے ساتھ ایک دیباچہ شامل تھا، اس دیباچہ میں فاضل محترم نے اسلامی تعلیمات کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ اسلام کا تباہ کن پہلو عورت کو حقیر درجہ دیتا ہے۔

بہت سے مغربی مؤرخین یہ الزام لگاتے ہیں کہ اسلام نے اپنی شریعت میں سابقہ شریعتوں سے بہت کچھ اخذ کیا ہے، اس دعویٰ کا بطلان قرآن اور بائبل میں عورتوں کے مقام کے باہمی موازنہ سے ہی اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔

بائبل میں حضرت آدمؑ کا خدا کی نافرمانی اور سزا کے طور پر جنت سے نکالے جانے کا ذمہ دار حواؑ کو ٹھہرایا گیا۔ (کتاب پیدائش) جبکہ قرآن میں دونوں (آدم اور حوا) کو گمراہ کرنے کا ذمہ دار شیطان کو قرار دیا گیا ہے)۔ (البقرۃ: ۳۵-۳۸)

بائبل میں لڑکی کی پیدائش پر اظہار افسوس کیا گیا، لڑکی کو لڑکے سے کم تر اور ناپاک سمجھا

گیا ہے۔(احبار،۱۲:۲-۵)

قرآن نے لڑکیوں کو زندہ رہنے کا حق دیا اور لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کے عربوں کے قبیح فعل کی مذمت فرمائی اور اس فعل کی ممانعت کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (اللہ ہی آسمان اور زمین کا مالک ہے، جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے)۔

یعنی لڑکا اور لڑکی دونوں اللہ کے پیدا کردہ ہیں، پس ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے لڑکیوں کو باعث رحمت اور حصول جنت کا ذریعہ بتایا۔ آپ نے فرمایا: جس شخص کی لڑکی ہو اور وہ اسے نہ زندہ درگور کرے اور نہ اس کے ساتھ حقارت آمیز سلوک کرے اور نہ اس پر اپنے لڑکے کو ترجیح دے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا۔(ابوداؤد، کتاب الادب)

بائبل میں عورت کو یہ اجازت نہیں دی گئی کہ وہ کلیسا میں بولیں یا بحث کریں یا کسی کو تعلیم دیں۔(عورتیں کلیسا کے مجمع میں خاموش رہیں، کیونکہ انھیں بولنے کا حکم نہیں ہے، بلکہ تابع رہیں، جیسا تورات میں ہی لکھا ہے۔ اگر کچھ سیکھنا چاہیں تو گھر میں وہ اپنے شوہر سے پوچھیں کیونکہ عورت کا کلیسا کے مجمع میں بولنا شرم کی بات ہے)۔(اکرنتھیوں۱۴:۳۴-۳۵)

قرآن میں اللہ تعالیٰ عورت کو نبی کریم ﷺ سے بحث کرنے پر بھی تنبیہ نہیں کی، بلکہ عورت کے بحث ومباحثہ کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک اہم مسئلہ حل کیا اس وقت جب کہ حضرت خولہؓ نبی کریم ﷺ سے ظہار کے سلسلے میں بحث کر رہی تھیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملے میں تم سے بحث کر رہی ہے اور اللہ سے فریاد کیے جاتی ہے۔ اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا ہے، وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے)۔(سورۃ المجادلہ۵۸:۱)

بائبل کے قانون کے مطابق عورت اسی وقت وراثت کا حقدار ہو سکتی ہے جب کوئی

مرد نہ ہو بیوی کو تو پھر بھی کچھ حصہ نہیں مل سکتا۔(گنتی ۲۷:۱-۱۱)

قرآن میں ہے: (والدین اور اقرباء کے ترکہ میں سے مردوں کے لیے بھی ایک حصہ ہے اور عورتوں کے لیے بھی ایک حصہ ہے، خواہ ترکہ کم ہو یا زیادہ ایک مقررہ حصہ)۔(سورۃ النساء)

بائبل میں عورت کو بالکل اس لائق نہیں سمجھا گیا ہے کہ وہ گواہی دے سکے۔(استثنا ۲۲:۱۳-۲۱) جبکہ اسلام میں عورت کی گواہی تسلیم کی گئی ہے، البتہ بعض معاملات میں جس سے عورت کا زیادہ تعلق نہیں ہوتا عورت کی گواہی ایک مرد کے برابر تسلیم کی گئی ہے، البتہ عورت کے معاملات میں صرف ایک عورت کی گواہی ہی کافی ہوتی ہے۔ بائبل میں عورت کو گناہگار اور گناہ کی طرف مائل کرنے والی سمجھا گیا ہے۔ ''تب میں نے موت سے تلخ تر اس عورت کو پایا جس کا دل یہ ھندوں اور جالوں کے اور جس کے ہاتھ ہتھکڑیوں کے مانند ہیں وہ جو خدا کے حضور میں مقبول ہیں، سو اس سے بچتا رہے لیکن وہ جو گناہ گار ہے اس سے پکڑا جاتا ہے۔ دیکھو واعظ کہتا ہے میں نے ایک دوسرے سے مقابلہ کر کے نتیجہ نکالا، یہ پایا ہے جواب تک میرا جی ڈھونڈا کرتا پر مجھے مل گیا ہزار پیچھے ایک مرد میں نے پایا پر ایک عورت ان سبھوں میں نہیں پائی۔(واعظ ۷:۲۶-۲۷)

اس کے برعکس اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں مومنوں کی ہدایت کے لیے عورت کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (اور اللہ ایمان والوں کے لیے مثال بیان کرتا ہے فرعون کی بیوی کی جب کہ اس نے دعا کی: اے میرے رب میرے اپنے پاس جنگ میں ایک گھر بنا اور مجھ کو نجات دے ظالموں کی قوم سے اور مریم بنت عمران کی مثال بیان کرتا ہوں جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی۔ پس ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی اور اس نے اپنے رب کے کلمات اور اس کے کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت گزار لوگوں میں سے تھی)۔(تحریم ۶۶:۱۱-۱۲)

☆☆

قرآن اور برگزیدہ خواتین

● بیگم خورشید انور ادیب

قرآن مجید میں پیغمبروں، نبیوں، رسولوں کے ساتھ ساتھ چند برگزیدہ خواتین کا بھی ذکر ملتا ہے، جیسے حضرت حوا علیہ السلام، مکہ سبا، حضرت زلیخا، حضرت آسیہ، حضرت زبیدہ (حضرت موسیٰ کی والدہ)، حضرت سارہ، حضرت ہاجرہ، حضرت بی بی مریم۔ قرآن مجید میں ان خواتین کا ذکر مختلف سورتوں میں بہت تفصیل سے آیا ہے۔ ان میں کچھ تو بنی نوع انسان کی بقا اور ترویج کے لیے جانی جاتی ہیں اور کچھ بڑے بڑے پیغمبروں کی بیویاں اور مائیں رہی ہیں۔ اسلامی تاریخ میں ان کی شخصیتیں اپنا الگ الگ مقام رکھتی ہیں۔

حضرت حوا علیہا السلام:

یہ دنیا کی سب سے پہلی عورت ہیں۔ قرآن کی ''سورۃ البقرۃ'' میں ان کا تذکرہ ملتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد خدا نے حضرت آدم علیہ السلام کی تنہائی کو دور کرنے کے لیے حضرت آدم کی پسلی سے حضرت حوا کی تخلیق کی۔ ابلیس کو جب حضرت آدم کے سامنے سجدہ کرنے کے لیے کہا گیا تو تمام فرشتوں نے سجدہ کیا، لیکن ابلیس نے انکار کر دیا۔ ابلیس نے اس دن قسم کھائی تھی کہ ہر ہر لمحہ، ہر ہر قدم پر میں تیری مخلوق کو نافرمانی سکھاتا رہوں گا۔ حضرت آدم اور حوا علیہما السلام ہنسی خوشی اور بڑے ہی آرام سے جنت کے باغوں میں رہتے تھے۔ اللہ نے ان لوگوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ باغ کی ہر چیز کو اپنے لیے قابل

استعمال سمجھے، لیکن ایک درخت کے پھل کو چھونے اور کھانے سے منع کیا تھا۔ وہ گندم کا درخت تھا۔ ابلیس اس تاک میں تھا کہ کسی بھی طرح آدم اور حوا کو ورغلا کر اس پھل کو کھانے کے لیے مجبور کیا جائے۔ جب آدم پر ابلیس کی ساری کوششیں رائیگاں گئیں تو اس نے حضرت حوا پر اپنی کوشش شروع کی اور وہ اس میں کامیاب ہو گیا۔ حضرت حوا نے حضرت آدم کو اپنا ہم خیال بنا لیا اور انھوں نے درخت کا پھل کھا لیا۔ اس سے جنت کے باغات میں ایک غلط قسم کی بو پھیل گئی، جس کی وجہ سے اللہ ان سے ناراض ہو گیا اور انھیں جنت سے نکال کر زمین پر اتار دیا گیا، جو شاید زمین کے ہزاروں میل کے فاصلے پر دونوں کو الگ الگ مقام پر اتارا گیا۔ اللہ ارحم الراحمین سے ان دونوں کی جدائی نہیں دیکھی گئی اور ان کا ملاپ کروا دیا گیا۔ اس طرح بنی نوع انسان آدم اور حوا کی اولاد میں سے ہیں۔

ملکہ سبا:

اللہ کے بڑے بڑے پیغمبروں میں سے ایک سلیمان علیہ السلام تھے جن کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ انسانوں، بلکہ جنوں، جانوروں اور پرندوں کی بولی جانتے تھے، بلکہ ان پر حکومت کرتے تھے۔ سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں ایک خاص والی ملک عورت کا تذکرہ ملتا ہے جس کو ملکہ سبا کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ''سورۃ النمل'' کی آیتوں 20 تا 44 تک تفصیل سے اس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس واقعہ کو کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے اطراف انسانوں، جنوں، جانوروں اور پرندوں کی ایک فوج ہوتی تھی اور یہ لوگ سلیمان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ایک پرندہ ہدہد غائب تھا۔ سلیمان علیہ السلام کو اس کے بغیر اجازت چلے جانے پر بہت غصہ آتا ہے اور اس کی نافرمانی کی سزا دینے کے لیے دوسرے لوگوں کو ہدایت دیتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہدہد حاضر ہوتا ہے اور ملکہ سبا کے بارے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کو باخبر کرتا ہے کہ

یمن کے ایک حصہ میں ملکہ رہتی ہے جو بہت خوبصورت، دولت منداور امیر ہے اور اس کا تخت بہت بڑا اور عجیب سا ہے اور شیطان اس پر بہت مہربان ہے۔ وہاں کے لوگ سورج کی پوجا کرتے ہیں۔ سلیمان ایک خط لکھ کر ہدہد کو دیتے ہیں کہ ملکہ ان سے (سلیمان) سے آکر ملے۔ وہ (ملکہ) اپنے صلاح کاروں سے اس بارے میں صلاح لیتی ہیں تو کہا جاتا ہے کہ وہ (سلیمان) بہت طاقتور بادشاہ ہیں اور ان کے ساتھ جنگ کرنا مشکل ہے، لہٰذا تحفے تحائف لے کر حاضری دی جائے۔ ادھر سلیمان جنوں کو حکم دیتے ہیں کہ ملکہ سبا کے آنے سے پہلے اس کا تخت میرے دربار میں لاکر رکھ دیا جائے۔ جب ملکہ سبا سلیمان علیہ السلام کے دربار میں پہنچتی ہیں تو سلیمان سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ آپ کا تخت ہے؟ تو وہ حیران رہ جاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ یہ تو میرا ہی تخت ہے۔ پھر سلیمان علیہ السلام جنوں کو حکم دیتے ہیں کہ ایک عالیشان محل کانچ کا بنوایا جائے اور صحن میں کانچ کا فرش بنوایا جائے اور اس کے نیچے پانی کا حوض بنایا جائے۔ اس سے ایسا محسوس ہو کہ جس سے پانی صحن میں بہہ رہا ہو۔ جب ملکہ سبا سلیمان علیہ السلام سے ملنے کے لیے محل میں داخل ہوئیں تو انھوں نے پانی سے بچنے کے لیے پائینچے اوپر چڑھا لیے تب سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ آپ کو اس طرح اپنے پیر کھولنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہ پانی نہیں ہے۔ سلیمان علیہ السلام کی ذہانت سے ملکہ سبا اتنی متاثر ہوئیں کہ انھوں نے ان کا (سلیمانؑ) کا دین قبول کرلیا۔

حضرت زلیخا:

ان کا ذکر سورۂ یوسف میں ملتا ہے۔ وہ اس طرح کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائی کنویں میں ڈھکیل دیتے ہیں تو ایک قافلہ ان کو بچالیتا ہے اور غلام کی طرح بیچ دیتا ہے۔ یہ ملک مصر ہے، جہاں کا بادشاہ ان کو خرید لیتا ہے اور یوسف کا حسن اتنا زیادہ تھا کہ ہر شخص ان کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتا تھا۔ مصر کے بادشاہ کی ملکہ زلیخا آپ کے عشق میں

گرفتار ہو جاتی ہیں اور وہ چاہتی ہیں کہ یوسف ان پر توجہ دیں۔ یہ بات بادشاہ کو معلوم ہو جاتی ہے اور وہ حضرت یوسف کو قید کر دیتا ہے، مگر تمام درباری اس بات کو پسند نہیں کرتے اور انصاف کے طلب گار ہوتے ہیں۔ تو بادشاہ کچھ دانشوروں کو اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے مامور کرتا ہے۔ وہ لوگ تحقیق کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یوسف قصوروار نہیں ہیں، بلکہ حضرت زلیخا قصوروار ہیں۔ جب حضرت زلیخا کو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ قصوروار ہیں تو وہ خود کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے یہ دلیل پیش کرتی ہیں کہ حضرت یوسف کا حسن اس حد تک بے پناہ ہے کہ کوئی بھی عورت ان کو دیکھ کر اپنے قابو میں نہیں رہ سکتی۔ وہ دربار کی ساری معزز خواتین کے ہاتھوں میں ایک لیموں اور ایک چھری پکڑا دیتی ہیں اور ان سے استدعا کرتی ہیں کہ جیسے ہیں یوسف ہال میں داخل ہوں، لیموں کو کاٹ کر دو ٹکڑے کر دیں۔ یوسف جب ہال میں داخل ہوتے ہیں ان کی خوبصورتی کو دیکھ کر خواتین ششدر رہ جاتی ہیں، بجائے لیموں کے اپنے ہاتھ کاٹ لیتی ہیں۔ اس واقعہ سے حضرت زلیخاؑ اس معاملہ میں بری ہو جاتی ہیں۔

حضرت آسیہ:

فرعونِ مصر کے زمانے میں اس کے نجومیوں نے یہ بتایا تھا کہ اسی مملکت میں ایک بچہ ایسا پیدا ہونے والا ہے جو اس کا تخت و تاج کھینچ لے گا۔ اس آفت سے نجات پانے کے لیے فرعون نے سارے ملک میں یہ منادی کر دی کہ اس دوران جو بھی لڑکا پیدا ہو اس کو قتل کر دیا جائے۔ فرعون کی فوج نے تمام حاملہ عورتوں پر نظر رکھی، لیکن جب موسیٰؑ اپنے والدہ کے شکم میں آئے تو کوئی بھی سپاہی ان کے وجود کا پتہ نہیں چلا سکا۔ جب ولادت ہوئی تو ان کے والدین ان کو گھر میں کپڑوں کے نیچے چھپا دیتے ہیں۔ جب خطرہ بڑھ جاتا ہے تو آپ کو ایک ٹوکرے میں ڈال کر ندی میں بہا دیا جاتا ہے اور ایک کنیز کو ساتھ میں بھیج دیا جاتا ہے

کہ وہ یہ دیکھے کہ یہ ٹوکرا کہاں جا کر رکتا ہے۔ اس ندی کے کنارے فرعون کا محل تھا اور اس وقت فرعون کی اہلیہ حضرت آسیہ وہاں تفریح کے لیے آتی ہیں اور اس ٹوکرے کو دیکھ کر روک لیتی ہیں۔ اس میں ایک بچے کو دیکھ کر خوش ہوتی ہیں اور محل میں لے جاتی ہیں۔ کچھ دن فرعون سے اس بچے کو چھپا کر رکھتی ہیں لیکن جب فرعون کو اس بچے کے تعلق سے معلوم ہوتا ہے تو وہ ناراض ہوجاتا ہے اور اس کو قتل کرنا چاہتا ہے، لیکن ان کی بیوی بہت ہی منت اور سماجت سے فرعون سے اس بچے کی زندگی کو مانگ لیتی ہیں اور اس کے بعد بچے کو دودھ پلانے کے لیے بہت سی دودھ پلانے والیوں کو بلایا جاتا ہے، لیکن وہ بچہ جو آگے چل کر موسیٰ کلیم اللہ بنے کسی کا بھی دودھ نہیں پیتے۔ اس وقت ان کی حقیقی والدہ بھی وہاں پہنچ جاتی ہیں اور حضرت موسیٰ اپنی ماں کے دودھ کو پیتے ہیں۔

حضرت سارہ علیہا السلام:

حضرت سارہ علیہا السلام ابراہیم علیہ السلام کی پہلی شریک حیات تھیں اور اسحاق علیہ السلام کی والدہ ہوتی ہیں۔ جب ابراہیم کافی عمر کے ہوگئے تب بھی لاولد تھے۔ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اولاد کی خاطر اپنی کنیز حضرت ہاجرہ سے شادی کر لی۔ خدا کی رحمت نے جوش مارا اور اسماعیل حضرت ہاجرہ کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اس کے بعد ان کو ایک اور لڑکا تولد ہوتا ہے وہ لڑکا حضرت سارہ کے بطن سے پیدا ہوتا ہے جو اسحاق کے نام سے مشہور ہوئے۔

حضرت ہاجرہ علیہا السلام:

حضرت ہاجرہ علیہا السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ کے قریب ایک پہاڑی پر جو ریگستان میں تھی، وہاں پر کوئی آبادی نہ تھی، نہ کوئی

جانور تھا، نہ کوئی درخت، نہ کوئی چرند۔ ایسے ریگستان میں ان دونوں کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، ان کے پاس صرف پانی کا مشکیزہ اور کچھ کھانے کی چیزیں ہوتی ہیں۔ یہ چیزیں دو دن کے اندر ختم ہوجاتی ہیں۔ ان چیزوں کے ختم ہوجانے سے حضرت ہاجرہ کا دودھ بھی ختم ہوجاتا ہے۔ بچہ یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام بھوک سے نڈھال ہوکر بلک بلک کر رونا شروع کر دیتے ہیں۔ حضرت ہاجرہ بہت پریشان ہوجاتی ہیں اور کسی انسان یا کسی قافلہ کی تلاش میں ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی کی طرف بھاگتی ہیں، ان پہاڑوں کو صفا اور مروہ کہتے ہیں، لیکن کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ جب وہ ساتواں چکر مکمل کر کے آتی ہیں، تب بچہ روتے ہوئے جہاں ایڑیاں رگڑ رہا تھا وہاں سے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑتا ہے۔ اس واقعہ سے حضرت ہاجرہ بہت خوش ہوجاتی ہیں اور پہاڑ سے اترتے ہوئے زم زم پکارتی ہوئی آکر روک لگاتی ہیں۔ کچھ دنوں بعد وہاں پر ایک قافلہ آتا ہے اور پانی کا چشمہ دیکھ کر یہیں قیام کرتا ہے۔

حضرت مریم علیہا السلام:

حضرت مریم علیہا السلام کے والد زکریا علیہ السلام کو اولاد نہیں تھی۔ انھوں نے اللہ سے منت مانگی تھی کہ اگر انھیں اولاد عطا کی جائے تو وہ اللہ کی خدمت کے لیے چھوڑ دیا جائے گا۔ اللہ کی رحمت سے ان کے گھر اولاد ہوتی ہے۔ وہ بھی لڑکی تولد ہوتی ہے، وہ پریشان ہوجاتے ہیں کہ کیا کیا جائے، کیونکہ لڑکیوں کو چھوڑنے کا رواج نہیں ہوتا، پھر کاہنوں کے مشورہ سے مریم علیہ السلام کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وہ دن رات عبادت میں لگی رہتی ہیں اور بھوک و پیاس کی بھی فکر نہیں ہوتی، لیکن ان کے قریب مختلف انواع واقسام کے میوہ جات پائے جاتے ہیں۔ ایک رات جبریل امین تشریف لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمہارے لیے ایک خوش خبری لایا ہوں۔ تمھیں ایک لڑکا تولد ہوگا، جو عیسیٰ مسیح کہلائے گا۔ وہ

حیران ہوجاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ آج تک کسی بھی مرد نے مجھے چھوا تک نہیں اور جبریل فرماتے ہیں کہ یہ سب خدا کی مصلحتیں ہیں، جس کو ہم جھٹلا نہیں سکتے۔ جب عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا وقت قریب آتا ہے تو حضرت مریم ایک پوشیدہ جگہ پر چلی جاتی ہیں اور وہاں پر قدرت کے بہت سے کرشمے نظر آتے ہیں اور عیسیٰ کی پیدائش ہوتی ہے، لیکن لوگ عیسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر تسلیم نہیں کرتے تو وہ خود گفتگو کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے بھیجے گئے رسول ہیں۔

ان خواتین کے علاوہ مختصر طور پر حضرت نوح کی بیوی کا ذکر ہے، جو کشتی میں بیٹھنے سے انکار کردیتی ہیں۔ اس کے علاوہ موسیٰ علیہ السلام کی بیوی اور حضرت اسحاق کی بیوی کا بھی ذکر ہے۔

☆☆

برصغیر میں قرآن کریم کے خطاط

● مولانا طارق بن ثاقب

قرآن کی کتابت میں کبھی کوئی غلطی نہیں ہوئی:

قرآن کریم معانی اور مفاہیم کے اعتبار سے جہاں ابدی اور آفاقی ہے، وہیں اپنی کتابت کے اعتبار سے شاہکار اور فن کتابت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ قرآن کریم کی کتابت یوں تو حضور پاک ﷺ کے زمانۂ مبارک میں شروع ہوگئی تھی، آپ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں قرآن کے مختلف قرأت کو یکجا کرکے فن کتابت کی بنیاد ڈالی۔ اس وقت سے آج تک لاکھوں ماہرین فن پیدا ہوئے جنھوں نے قرآن کریم کو مختلف انداز میں لکھ کر اپنے فن، فن خطاطی کو دوام بخشا۔ یہ مبالغہ نہیں، بلکہ اس کو قرآنی معجزہ کہیں کہ قرآن شریف ہی دنیا کی واحد کتاب ہے جس کی کتابت میں کسی خطاط سے ایک لفظ کی بھی خطا نہیں ہوئی۔

اللہ نے کتاب مبین کی حفاظت کا ذمہ اپنے اوپر لیا ہے۔ ''**إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون**''. اسی وجہ سے دنیا کے بیشتر ملکوں میں جہاں ایسے افراد ملیں گے جو حفظ ومعانی ومفاہیم پر اپنی قوت ہمہ وقت صرف کرتے ہیں وہیں ایسے بھی بے شمار افراد آسانی سے دستیاب ہوجائیں گے جو اپنے فن کتابت اور اس فن کی زیبائش کا مظاہرہ قرآن کو لکھنے میں کرتے ہیں۔ دراصل یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو اعزاز حاصل ہے۔

ہندوستان برصغیر میں خطاطوں اور آرٹسٹوں کی پناہ گاہ رہا ہے۔ یہاں کے خطاطوں کا

شہرہ پوری دنیا میں ہے۔ یہاں کے خطاطوں نے بھی قرآن کریم کی خطاطی کا شرف حاصل کیا ہے۔ اگر ان ماہرین کی بایوگرافی جمع کی جائے تو ضخیم دستاویز تیار ہو جائے گا۔ خصوصاً عہد مغلیہ میں اس فن کو کافی عروج ملا۔ اس عہد میں فن خطاطی نے ایک صنعت کا درجہ حاصل کیا، چنانچہ عہد مغلیہ کے زمانہ کی عمارتیں اس بات کی گواہ ہیں۔ ان عمارتوں پہ کندہ قرآن کی آیتیں جہاں ان عمارتوں میں روحانیت بخش رہی ہیں وہیں اس بات کی شہادت دے رہی ہیں کہ قرآن کی خطاطی کو عہد مغلیہ سے کس قدر عروج ملا اور قرآن کی خطاطی کا فن کس قدر ارتقا کی منزلوں کو طے کرتا گیا۔ پیش ہیں چند خطاط کے اسماء گرامی جنھوں نے اس مبارک کام کو انجام دے کر قرآن کریم کی حفاظت کا ذریعہ بننے میں کتنا اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔

سلطان ابراہیم غزنوی بن سلطان مسعود بن سلطان محمود غزنوی: یہ نہایت نیک اور بہادر تھے۔ خوش نویسی میں کمال رکھتے تھے۔ ہر سال اپنے ہاتھوں سے دو قرآن شریف لکھتے تھے، ایک مدینہ منورہ بھیجتے، دوسرا مکہ معظّمہ۔ 492ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

سلطان ناصر الدین محمود بن التمش بادشاہ دہلی۔ طبقات ابن کبریٰ میں ہے کہ سلطان ایک سال میں قرآن پاک کے دو نسخے تیار کر لیتے تھے۔ سلطان کے انتقال کے سو سال بعد تک ان کے ہاتھوں سے لکھے ہوئے قرآن کے نسخے دہلی میں موجود تھے۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے: قاضی کمال الدین نے سلطان کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف مجھے دکھایا، خط اچھا تھا اور کتابت منشیانہ تھی۔ 664ھ میں ان کی وفات ہوگئی۔

مولانا جلال الدین مانک پوری: عالم و عابد اور صابر و متقی تھے۔ حضرت سلطان نظام الدین اولیاؒ کے خلیفہ شیخ محمد سے نسبت ارادت رکھتے تھے۔

عبداللہ ہروی: قرآن پاک کے سرآمد خطاط گزرے ہیں، انھوں نے یاقوت کے طرز تحریر کو یہاں تک اپنایا کہ خط میں تمیز مشکل ہوتی تھی۔ ایک عرصہ تک بغداد میں رہے، پھر تباہی بغداد کے بعد ہندوستان تشریف لے آئے۔ اس نادر روزگار خطاط نے 45 قرآن

مجید اپنی یادگار چھوڑے۔ 86 سال کی عمر میں 880ھ میں وفات پائی۔

ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ: بابر بادشاہ ایک عمدہ خطاط بھی تھے، ان کا خط ''خط بابری'' کہلاتا ہے۔ تیموریوں کی یہ عام رسم تھی کہ قرآن شریف اپنے ہاتھ سے لکھ کر مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ بھیجا کرتے تھے۔ بابر کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف وہاں نذر کرنے کی سعادت حاصل کی۔ بابر کا سلسلہ تلمذ میر علی تبریزی سے ملتا ہے۔

سلطان مظفر الحلیم گجراتی بن محمود بن احمد بن محمد بن مظفر: گجرات کے سلطان عادل تھے۔ آپ نے دو قرآن پاک بخط جلی آب زر سے لکھ کر حرمین شریفین بھجوائے۔ 932ھ/ 1525ء میں آپ نے وفات پائی۔ (اردو ترجمہ نزہت الخواطر، ص 356، ج 4)

عبدالکریم بن رکن الدین: ان کا تحریر کردہ ایک قلمی قرآن پاک کراچی میں موجود ہے جو جہانگیر کے بعد میں 1025ھ میں مکمل ہوا ہے۔ بطرز یاقوت کتابت کیا گیا ہے۔ اس میں سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کا پہلا رکوع یاقوت کے پانی سے لکھا گیا ہے اور پورے قرآن کریم کا حاشیہ آب زرّیں سے مرصع ہے۔ (بحوالہ روزنامہ جنگ، کراچی)

عبدالباقی یاقوت رقم: اصل نام عبداللہ تھا، مگر عبدالباقی سے مشہور ہوئے۔ شاہجہاں کے دور میں ایران سے ہندوستان آئے۔ خط نسخ کو طرز خاص سے آرائش و زینت دے کر عروس الخط بنا دیا۔ ہندوستان میں ایک عرصہ قیام کے بعد اپنے وطن ایران چلے گئے۔ یہاں انھوں نے اپنے چند شاگرد بطور یادگار چھوڑے جن میں شہرۂ آفاق خطاط محمد عارف المخاطب بہ یاقوت رقم خاں بھی شامل ہیں۔

حافظ محمد حسین لاہوری: انھوں نے تیس ورق پر مشتمل ایک نسخہ قرآن اس صفت سے تحریر کیا تھا کہ ہر صفحہ کی پہلی سطر کے علاوہ باقی تمام سطریں واؤ سے شروع ہوتی تھیں۔ حافظ محمد حسین 1080ھ تک باحیات تھے۔ ان کے فرزند محمد روح اللہ لاہوری بھی کاتب قرآن

تھے۔انھوں نے بھی تیس ورق پر مشتمل ایک نسخہ قرآن شریف تحریر کیا جس میں مذکورہ بالا سطروں کا التزام کیا۔

سید عنایت اللہ حسینی بن سید محمد بن سید الحداد بن سید موسیٰ بن امام سید ظہیر الدین: آپ قرآن پاک کے خطاب بھی تھے۔آپ نے 18/قرآن پاک تحریر فرمائے۔25/صفر المظفر 1117ھ کو آپ نے وفات پائی۔

داراشکوہ بن شاہجہاں بادشاہ باکمال مصنف، شاعر اور خطاط تھے۔نسخ و نستعلیق دونوں میں مہارت تامہ رکھتے تھے،ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قرآن پاک کا نسخہ عزیز باغ لائبریری حیدرآباد میں ہے جس کے حروف شروع سے آخر تک سنہرے ہیں۔ایک مطلا پنج سورہ کا نسخہ خط نسخ میں اور ایک 'دہ پندار سطور' کا نسخہ بخط نستعلیق وکٹوریہ میموریل ہال کلکتہ میں موجود ہے۔

سلطان محی الدین اورنگ زیب عالمگیر: یہ درویش صفت اور ولی سرشت بادشاہ اور قرآن پاک کا بلند پایہ خطاط تھا۔مآثر عالمگیری میں ہے کہ انھوں نے شہزادگی کے زمانہ میں ایک قرآن پاک لکھ کر تحائف اور ایک خطیر رقم بطور نذر کے ساتھ حرم مکہ معظّمہ روانہ کیا، پھر تخت نشینی کے بعد ایک اور نسخہ کلام پاک تحریر کر کے مدینہ منورہ بھیج کر حرم نبویؐ میں بطور نذر پیش کیا۔اس نسخہ کی جلد بندی اور جدول کی زیب و زینت پر مبلغ سات ہزار روپے صرف ہوئے۔سلطان نے صرف رضاء الٰہی کی خاطر یہ نسخے تحریر فرمائے۔92 سال کی عمر میں اس بادشاہ خدا آگاہ نے 28/ذی قعدہ 1118 کو وفات پائی۔

حاجی محمد اسماعیل ماژندانی: سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں شاہی فرمان نویس تھے۔نستعلیق، خط نسخ کے بلند پایہ خطاط تھے۔خط ثلث اور ریحان و رقاع بھی خوب لکھتے تھے۔یاقوت مستعصمی کے قلمی ایک قرآن مجید کے کچھ اوراق تلف ہو گئے تھے۔انھوں نے وہ لکھ کر اور پرانے بنا کر اس میں لگا دیے اور سلطان عالمگیر کے روبرو پیش کیا اور جب

تک انھوں نے خود نہیں بتایا سلطان خط میں تمیز نہیں کر سکے۔بہترین خطاط ہونے کے ساتھ باکمال شاعر اور انشاء پرداز بھی تھے۔غافل تخلص رکھتے تھے۔

مرزا محمد: قرآن پاک کے باکمال خطاط تھے۔سلطان عالمگیر کے منظور نظر خوش نویس تھے۔

حاجی عبداللہ: حاجی قاسم استاذ سلطان اورنگ زیب کے فرزند دوم نسخ بطرز یاقوت لکھتے تھے اور اس کے مسلم الثبوت استاذ تھے۔

سعید خطاط: درویش مشرب نسخ خوب لکھتے تھے۔طلانویسی میں ید بیضا رکھتے تھے۔عراق میں ان کی خوش نویسی کا بہت شہرہ تھا۔ہندوستان آ کر شاہی دربار سے وابستہ ہو گئے اور مصاحف و کتب لکھنے پر مامور رہے۔(اورینٹل کالج میگزین، اگست 1934، بحوالہ مرأۃ العالم)

احمد یار خاں یکتا: خط نسخ کے بہترین خطاط تھے۔شعر گوئی بھی کرتے تھے۔

محمد عارف یاقوت رقم: اصل وطن ہرات عبدالباقی حداد کے باکمال اور نامور شاگرد، خط نسخ و ثلث کے یگانہ روزگار استاذ، خط نسخ بطرز خاص لکھتے تھے جس کو ہندوستان میں بہت فروغ ہوا۔ان کا ایک قلمی قرآن مجید دہلی میوزیم میں بھی محفوظ ہے۔ان کے تلامذہ کی تعداد کثیر ہے۔مؤلف تذکرہ خوش نویساں کا بیان ہے کہ میں نے ان کے سب خط مشاہدہ کئے ان میں سے ہر ایک یاقوت کے برابر گزار ہے۔

سید احمد بلگرامی بن سید ضیاء اللہ بلگرامی: آپ نے کلام اللہ اور تفسیر مدارک یادگار چھوڑی ہے۔80/سال کی عمر میں 1143ھ میں بلگرام میں وفات پائی۔

سید عبدالواحد بلگرامی: خط نسخ بڑے خوبصورت انداز میں لکھتے تھے۔قرآن پاک اور دیگر کتابیں اپنے ہاتھ سے تحریر کی۔1141ھ میں وفات پائی۔

نواب مرید خاں: اصل نام سید محمد صادق طباطبائی، محمد شاہ رنگیلے کے امرا میں شامل

تھے۔ خط شکست، نسخ، نستعلیق، ثلث اور ریحان وغیرہ میں کمال خاص تھا۔ صاحب تذکرہ خوش نویساں لکھتے ہیں۔ انھوں نے قرآن شریف خط ریحان، ثلث اور خط نسخ میں مطلاً اور مذہب لکھا۔

مولانا غیاث الدین پشاروی: آپ نے بھی قرآن شریف تحریر فرمایا، عالم باعمل تھے اور مقبول بارگاہ خداوندی تھے۔

قاضی فیض اللہ: خط نسخ کے زبردست خوش نویس تھے، متعدد کلام اللہ یادگار چھوڑی۔ (تذکرہ خوش نویساں)

قاضی عصمت اللہ خاں: قاضی صاحب نے نہایت خوش آئند طرز وروش اور اسلوب نگارش کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے متعدد قرآن پاک اور حمائلیں صفحہ روزگار پر یادگار چھوڑیں۔ 1186ھ میں اس یگانہ روزگار خطاط نے وفات پائی۔

عباداللہ خاں بن قاضی فیض اللہ: قرآن کریم کے عظیم الشان خوش نویس، بارہویں صدی کے باکمال اور شہرۂ آفاق خوش نویس نسخ تھے۔ (تذکرۂ خوش نویساں)

میر کرم علی: قاضی عصمت اللہ خاں کے شاگرد تھے، متعدد قرآن مجید یادگار چھوڑے ہیں، کوچہ چیلان دہلی میں رہتے تھے۔

حکیم میر محمد حسین: مولانا فخر الدین چشتی دہلوی کے مرید خاص، نستعلیق میں خلیفہ سلطان اور نسخ میں قاضی عصمت اللہ کے شاگرد تھے۔ اکثر سپارے اور پنج سورہ لکھتے رہتے تھے۔ (صحیفہ خوش نویساں)

عصمت اللہ: مؤلف تذکرۂ خوش نویساں لکھتے ہیں:

در خطاطی کامل بودہ اکثر کلام اللہ
از روشنائی مرکب بنظر درآمدہ

عہد شجاع الدولہ 1149ھ تا 1188ھ تک بقید حیات تھے۔

غلام حسین خاں: طرز نسخ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، دہلی وطن تھا، 13ویں صدی ہجری میں انتقال ہوئے۔

محمد حفیظ خاں: ساکن دہلی، خط نسخ، نستعلیق، ثلث اور شکستہ کے باکمال خوش نویس تھے۔ ابتدا میں شاہی ملازم تھے۔ چند قرآن مجید بطرز یاقوت مطلا و مذہب تحریر فرمائی۔ آخری عمر تک تحریر قرآن مجید میں مشغول رہے۔ آپ کے تلامذہ کی فہرست کافی طویل ہے۔ مولانا محمد ہفت قلمی، خط نستعلیق میں میر ابوالحسن، قادر بخش، خط شکستہ میں منشی لکشمن، لچھمی رام پنڈت، لالہ سکھ رام، منشی محبوب الٰہی کے نام قابل ذکر ہیں۔

حافظ عبدالوہاب کشمیری: ان کا تحریر کردہ ایک قلمی قرآن شریف قندھار میں احمد شاہ ابدالی کے مزار پر محفوظ ہے۔

مفتی محمد حیات اللہ قصوری: عالم اجل ہونے کے ساتھ خط نسخ کے باکمال خطاط تھے۔ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف ان کے خاندان میں موجود ہے۔ 1198ھ میں وفات پائی۔

محمد منور کشمیری: انھوں نے قیمتی پتھروں سے رنگ تیار کر کے نہایت چابک دستی سے ایک حمائل شریف تیار کی اور اس کا ہر صفحہ آب زر سے مزین کیا۔ (ماہ نو کراچی، مارچ 1967)

حضرت شاہ ابوسعید مجددی: خلیفہ حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلوی، خالصتاً للہ مشق خط نسخ مشہور خطاط کلوخاں سے کی اور کلام اللہ لکھ لکھ کر وقف کر دیے۔ (تذکرہ اہل دہلی، ص18)

مولانا غلام محمد لاہوری بن مولانا محمد صدیق لاہور: یہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں تھے۔ زہد وتقویٰ کی بنا پر قرآن پاک کی کتابت کرتے تھے، اس سے جو میسر آتا کچھ حصہ اپنے اور کچھ درویشوں پر تقسیم کر دیتے تھے۔ 25/ذی الحجہ 1242ھ کو وفات پائی۔ (نقوش لاہور نمبر)

قاری محمد جان: 1857 کی جنگ آزادی کے چند سالوں بعد انھوں نے نہایت خوبصورت قرآن پاک تحریر کیا اور یہ نسخہ مطبع نظامی کانپور سے چھپ کر مقبول خلائق ہوا۔ (فہرست کتب مطبع نول کشور کانپور، 1857)

مفتی غلام محمد لاہوری: بہاء الدین زکریا ملتانی کی اولاد میں سے تھے، تدریس و طبابت میں سرگرم رہتے تھے اور حلال قوت کتابت قرآن پاک سے حاصل کرتے تھے۔ 1276 میں لاہور میں انتقال ہوا۔ (تذکرہ علماء دیوبند)

سردار محمد عمر کابلی: کابل میں پیدا ہوئے، اپنے والد کے ہمراہ انھوں نے قندھار، سندھ، بلوچستان، کشمیر اور لاہور کی سیاحت کی، یہ پشتو اور فارسی کے شاعر بھی تھے۔ ایک قلمی قرآن پاک انھوں نے یادگار چھوڑی ہے۔

آغا غلام رسول کشمیری: رام پور کے نواب کلب علی خاں کے یہاں شاہی خوش نویس تھے۔ قرآن حکیم کے بے پایاں خوش نویس تھے۔ 1295ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ (صحیفہ خوش نویساں)

میر امام علی رضوی: سید میر امام الدین کے فرزند، صاحب علم و فضل، بادشاہ ظفر کے استاذ تھے۔ داستان غدر میں لکھا ہے کہ ان کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے بیس قرآن پاک انقلاب 1857 میں ضائع ہوگئے۔ یہ سب مطلا و مذہب تھے۔ تیرہویں صدی ہجری میں ان کا انتقال ہوا۔ (خطاط و خطاطی)

محمد یحییٰ لکھنوی: خط نسخ کے استاذ کامل تھے، طباعت کے لیے پہلا قرآن شریف لکھنؤ میں آپ نے لکھا تھا۔

منشی ہادی علی: مطبع نول کشور سے آپ کے لکھے ہوئے قرآن پاک شائع ہوئے۔ نہایت عمدہ اور پاکیزہ خط ہے۔ آپ کا اصل وطن دہلی تھا، لیکن لکھنؤ میں ہی مقیم ہوگئے تھے۔ (صحیفہ خوش نویساں)

منشی محمد ممتاز علی نزہت رقم: آخری مغل تاجدار کے تلمیذ رشید تھے۔ دہلی کے مایہ ناز استاذ فن اور قرآن پاک کے نادر روزگار خطاط تھے۔ زیادہ تر حرمین شریفین میں قیام فرماتے تھے۔ وہیں کتابت قرآن پاک میں مشغول رہتے۔ ہندوستان میں اپنا مطبع بھی قائم کر رکھا تھا۔ ہزاروں نسخے طبع کر کے تاجروں سے اس کے ہدیے وصول کر کے حرمین شریف روانہ ہوجاتے۔ نزہت رقم کا وہ قرآن مجید جو حضرت مولانا قاسم نانوتوی قدس سرہ کی تصحیح کے ساتھ طبع مجتبائی سے شائع ہوا فن خطاطی کا بے نظیر نمونہ ہے۔ ان کے تلامذہ کی تعداد کثیر تھی، ان کا کتابت کردہ آخری قرآن شریف 1330ھ میں شائع ہوا۔

حافظ سید امیر الدین دہلوی: بہادر شاہ ظفر کے شاگرد تھے۔ آپ کی ایک حمائل شریف لندن میں طبع ہوئی، جس نے بہت شہرت حاصل کی۔ آپ کے تلامذہ میں منشی محمد قاسم لدھیانوی سلطان العلم جیسے باکمال خطاط شامل ہیں۔

مولوی فضل الدین صحاف: لاہور کے ممتاز خوشنویس میں تھے۔ خط نسخ و نستعلیق کے ماہر تھے۔ ان کی لکھی ہوئی ایک حمائل لندن میں طبع ہوئی، تعلیم خطاطی پر انھوں نے اپنا مجموعہ قطعات بھی شائع کیا تھا۔ 1900ء کے قریب ان کا انتقال ہوا۔ (ارمغان لاہور)

خلیفہ عبدالحمید دہلوی: خط نسخ کے بلند پایہ خطاط تھے، ان کا ایک جلی قرآن پاک مع ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر 20x30 سائز پر طبع ہوا۔

منشی اشرف علی انصاری: لکھنؤ کے رہنے والے تھے، استاذ فن خطاط تھے، مطبع نول کشور لکھنؤ سے آپ کا لکھا ہوا قرآن پاک طبع ہوا اور بہت مقبول ہوا۔

مولوی عبداللہ وارثی بن مولوی فضل الٰہی وارث: کوٹ ضلع گونجرانوالہ کے رہنے والے تھے۔ نسخ و نستعلیق کے بلند پایہ خطاط تھے، متعدد قرآن پاک انھوں نے تحریر کیے۔ منشی محمد قاسم کے ہم عصر اور زود نویس بھی تھے۔ آپ کے تلامذہ کی کثیر تعداد ہے جس میں مولوی عبدالقدوس، مولوی عبدالرشید قابل ذکر ہیں۔

سلطان القلم مولوی محمد قاسم لدھیانوی بن مولوی الٰہ دینا: خط نستعلیق میں مولوی سید احمد ایمن آبادی اور مولوی شمس الدین عاجز رقم سے استفادہ کیا۔ خط نسخ سید امیر الدین دہلوی اور مولوی محمد ممتاز علی نزہت رقم مہاجر مکی سے حاصل کیا۔ باکمال خطاط قرآن تھے۔ 1907 میں انھوں نے ایک ہفت رنت قرآن پاک اپنے مطبع قاسمی میں طبع کیا۔ یہ نسخہ قرآن پاک کی خطاطی کا ایک عظیم نمونہ ہے۔ 13/محرم 1351ھ کو ستر سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ سلطان القلم نے ایک اور قرآن پاک بھی ادھورا چھوڑا۔ یہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی تفسیر تھی۔ 25/ پاروں کی کتابت ان کے ہاتھ سے مکمل ہوئی، اس کی تکمیل ان کے فرزند اکبر نے کی۔ یہ قرآن پاک سلطان القلم کے اعجاز قلم کا عظیم الشان نمونہ ہے۔ سلطان القلم کے دو فرزند منشی محمد شفیع اور منشی محمد شریف نے کتابت قرآن پاک کا مشغلہ اختیار کیا۔ (نئی دنیا، قرآن کریم نمبر)

قدرت اللہ انتخاب رقم: دہلی کے رہنے والے تھے، حیدرآباد دکن میں شاہی خطاط تھے، خط نسخ اور نستعلیق کے ماہر خطاط تھے۔

منشی محی الدین: ان کا تحریر کردہ قرآن مجید کا نسخہ امرتسر پنجاب سے شائع ہوا جس کی ہر سطر الف سے شروع ہوتی ہے اور ایک اور قرآن شریف جس کی ہر سطر 'ک' پر ختم ہوتی ہے۔ اپنے وقت کے باکمال خطاط تھے۔ 1932 میں جب پہلی بار خانۂ کعبہ کا غلاف ہندوستان و پاکستان میں تیار ہوا تو اس پر آیت کریمہ کی خطاطی کا اعزاز سعادت منشی جی کو ہی حاصل ہوا۔ یوسف دہلوی جو خط نستعلیق کی ایک خاص طرز کے بانی ہیں منشی محی الدین کے فرزند ہیں۔

فاطمۃ الکبریٰ: منشی محی الدین کی صاحب زادی اور یوسف دہلوی کی ہمشیرہ تھیں۔ خط نسخ کی باکمال خطاط تھیں، اپنے والد سے ہی اکتساب فن کیا۔ ہند و پاک کی واحد خاتون خطاط ہیں جنھوں نے قرآن پاک کی خطاطی کر کے اپنا نام پیدا کیا۔

مولانا اشتیاق احمد دیوبندی: منشی محبوب رقم میرٹھی کے باکمال شاگرد تھے۔ 1312 میں دیوبند میں پیدا ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند میں شعبہ خطاطی میں بحیثیت صدر مامور رہے، آپ کے ہاتھ سے لکھے ہوئے مختلف سائز کے سات قرآن پاک شائع ہوئے ہیں۔

خطاط یوسف قاسمی: منشی اشتیاق قاسمی صدر کاتب دارالعلوم دیوبند سے فن خطاطی سیکھا۔ 1954ء سے فن خطاطی کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ صوبہ بہار کے ضلع نالندہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ نستعلیق اور خط نسخ کے مسلم الثبوت خطاط ہیں، خط نسخ میں آپ نے قرآن پاک الفی ورقی تحریر کیا ہے جو قرآن اکیڈمی ممبئی سے شائع ہو چکی ہے۔ دوسرا الفی نسخہ ابھی زیر طبع ہے جس کے ہر صفحہ کی پہلی سطر کے علاوہ تمام سطریں الف سے شروع ہوتی ہیں۔ ابھی زیر طبع ہے۔ آپ نے شاگردوں کے کئی کھیپ تیار کئے ہیں جن میں خطاط عبدالجبار، خطاط امتیاز نالندوی، حافظ صغیر مدھوبنی، محمد ادریس رحمانی اور مولانا یوسف کے صاحب زادے علی اطہر کے نام قابل ذکر ہیں۔

خطاط عبدالجبار: ضلع گوڈہ جھارکھنڈ کے ہیں، اونچی مسجد اجمیری گیٹ میں امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور وہیں رہ کر انھوں نے حافظی قرآن شریف تحریر فرمایا ہے، جو ابھی زیر طبع ہے۔ اس نسخہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے رسم الخط کی تحقیق پر رسم الخط کی جامع کتاب نثر المرجان جو سات جلدوں پر مشتمل ہے، ہر جلد 6 سے 7 سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اسی کے تناظر میں مفتی عبدالرشید سورت گجرات رسم الخط کی تحقیق کا کام کر رہے ہیں، اس کے علاوہ موصوف الگ الگ پاروں کی کتابت بھی کر رہے ہیں۔ عبدالجبار صاحب نے خط نستعلیق منشی معراج النبی خاں امروہوی سے سیکھا اور نسخ خطاط یوسف قاسمی صاحب سے۔

خطاط امتیاز نالندوی: خط نستعلیق اور خط نسخ کے باکمال خطاط ہیں، انھوں نے خطاط یوسف قاسمی سے کسب فیض کیا ہے۔ قرآن شریف واوی ان کا قابل ذکر کارنامہ ہے۔ ہر

سطر واؤ سے شروع ہوتی ہے۔ ہنوز دہلی میں رہ کر قحط الرجال کے دور میں فن خطاطی کو اپنے استاذ کی طرح سنوارنے میں لگے ہوئے ہیں۔

علی اطہر بن مولانا یوسف خطاط: خط نسخ اپنے والد سے سیکھا ہے اور 10/ پارہ اور حزب الاعظم کتابت کر رہے ہیں۔

ادریس رحمانی: جامعہ رحمانیہ مونگیر سے تعلیم حاصل کیا اور باقاعدہ مدرسہ حسین بخش سے فراغت حاصل کیا۔ فن خطاطی خصوصیً خط نسخ یوسف قاسمی صاحب سے سیکھا، اب تک قرآن شریف کے تین پارے کتابت کر چکے ہیں۔

حافظ صغیر احمد: خط نسخ کے اچھے کاتب ہیں، قرآن شریف کے کئی پارے کتابت کرنے کی سعادت حاصل کر چکے ہیں اور ہنوز اسی عمل میں مصروف ہیں۔ خطاط یوسف قاسمی سے کسب فیض کیا ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے خطاط ہیں جو قرآن شریف کی خطاطی کر رہے ہیں۔ احقر کی معلومات محدود تھی جن کا تذکرہ کر دیا۔

☆☆

قرآنی پیشین گوئیاں اور واقعات عالم

● مولانا عبدالحمید نعمانی

زندگی کے سفر میں یقین کا اہم ترین رول ہوتا ہے۔ 'تذبذب' سفر کو کھوٹا اور زندگی میں تشکیک کا زہر گھول کر اسے بے لطف بنا دیتا ہے۔ دنیاوی زندگی میں یقین واطمینان کا تو عمل دخل ہوتا ہی ہے، لیکن مابعد دنیا کی زندگی اور اس کے وجود کا مدار ہی یقین واطمینان پر ہوتا ہے۔ ایمان کا تعلق، دیکھی چیزوں سے زیادہ ان دیکھی چیزوں سے ہوتا ہے اور یہ سفر ہوتا ہے یقین واطمینان کے پیروں پر۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم، عالمی سطح پر واحد کتابِ الٰہی ہے جس نے یقین کی زمین پر حیات انسانی اور حقائق کائنات کی بنیاد رکھی ہے۔ قرآن حکیم کے سوا وحی الٰہی سے پرے، دنیا کے تمام مصنّفین بیان حقیقت کے سلسلے میں غالبًا ''ہوسکتا ہے''، ''ہونا چاہیئے'' سے آگے جانے کی ہمت وجرأت نہیں کر سکے ہیں، کیونکہ وہ ظن وتخمین اور قیاس سے کام لینے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔ کوئی بھی مخلوق تمام تر حقائق کائنات سے واقفیت اور ان کے احاطہ کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتی ہے، جبکہ قرآن حکیم کل اشیاء وحقائق کے جاننے والے علیم وخبیر کا کلام ہے۔ اس نے اس دنیا میں جہاں قرآن حکیم کے مثل لانے کا چیلنج دے کر قرآن کے بے مثل ہونے اور تمام حقائق وواقعات جاننے کی طرف اہل عالم کو توجہ دلائی ہے، آئندہ پیش آنے والے واقعات کی اطلاع اور پھر ان کے یقینی وقوع سے قرآن کے کلام خداوندی اور آنحضرت ﷺ کی رسالت کی صداقت کو بدرجہ اتم واکمل طور پر ثابت کر دیا ہے۔ قرآن کی پیشین گوئیاں بھی اس کے کتاب الٰہی ہونے کے ناقابل تردید

لائل میں سے ہیں، اس کی پیشین گوئیوں کی سو فیصد صداقت و وقوع اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے۔ وہ اسی ابتدائی صورت میں مکمل و محفوظ ہے، جیسا کہ وہ پیغمبر عالم ﷺ پر نازل ہوا تھا۔

بعد میں رونما ہونے والے واقعات کے تعلق سے جو پیشین گوئیاں کی ہیں، اگر ان سب کو متعلقہ مباحث کے ساتھ جمع کر دیا جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو جائے گی، قرآنیات کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں قرآن پیشین گوئیوں کو عنوان بنایا گیا ہے، ہم سر دست چند کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ آئندہ کے واقعات کے سلسلے میں پیشین گوئیوں کے ذیل میں فرعون کے وجود کا معاملہ ہے، جسے آج بھی پوری دنیا سر کی لکھی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہی ہے۔

سورۂ یونس کی آیت ۹۲ میں قرآن حکیم نے اس حقیقت کی نشان دہی اس طرح کی ہے، آیت میں کہا گیا ہے: (آج ہم بچائے دیتے ہیں ترے دن کو تا کہ بعد والوں کے لیے نشانی بن جائے اور بے شک بہت لوگ ہماری قدرتوں پر توجہ نہیں دیتے)۔

یہ قرآن کا عجیب حیرت انگیز انکشاف اور پیشین گوئی ہے، جب قرآن کا نزول ہوا تھا، اس وقت کسی کو معلوم نہیں تھا کہ فرعون کا محفوظ جسم کہاں ہے، البتہ یہ یقین تھا کہ ہے کہیں ضرور۔ عہد موسیٰ علیہ السلام میں، خدائے قدیر نے فرعون کو مع لشکر کے دریا میں غرق اور پھر ساحل پر ڈال کر موجود لوگوں کے لیے عبرت و نشانی کا باعث تو بنا دیا تھا۔ ''لمن خلفک'' کا اعلان کر کے ایک ایسی حقیقت کا انکشاف کیا ہے جس نے پوری دنیا کے متلاشیان صداقت کو حیرت میں ڈال دیا اور اس کے انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی ہے۔ اس سلسلے میں موریس بوکائے نے اپنی کتاب ''بائبل، قرآن اور سائنس'' میں حقیقت افروز روشنی ڈالی ہے۔ فرعون کی غرق یابی کا ذکر تو دیگر آسمانی کتب میں بھی ہے، لیکن اس کے بدن کو برائے نشانی و عبرت بعد والوں تک کے لیے محفوظ رکھنے کی

اطلاع صرف قرآن حکیم میں ہے۔

اس لیے موریس بوکائے مسرت و اہتزاز کے عالم میں لکھتے ہیں: ''جو لوگ مقدس صحائف کی صداقت کے لیے جدید معلومات میں ثبوت تلاش کرتے ہیں، وہ مصری عجائب گھر، قاہرہ کے شاہی ممی خانہ کا معائنہ کر کے فرعون کے جسم سے متعلق قرآنی آیات کی ایک شاندار مثال کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔'' اس میں تو اختلاف کی گنجائش ہے کہ فرعون کا ذاتی نام کیا تھا اور اس کا نمبر کیا تھا کہ مصر کے حکمراں کا خاندانی لقب فرعون تھا، لیکن یہ واضح ہے کہ قرآن نے جس فرعون موسیٰ کا ذکر بطور عبرت و نشانی کی ہے، اس کے وجود کے بقا کی جو پیشین گوئی کی ہے، وہ واقعات عالم میں سے ایک ثابت شدہ واقعہ ہے۔ اب تک کی تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ سب سے پہلے پروفیسر لاریٹ نے 1898 میں مصر کے ایک قدیم مقبرہ میں داخل ہو کر دریافت کیا کہ اس میں فرعون موسیٰ کی لاش ممی کی ہوئی موجود ہے۔ موریس بوکائے کی تحقیق کے مطابق 8/جولائی 1908 کو الیٹ اسمتھ نے اس لاش کے اوپر لپٹی ہوئی چادر کو ہٹایا، اس نے اس کی باقاعدہ سائنسی تحقیق کی اور 1912 میں شاہی ممی نام سے ایک کتاب لکھی جس میں بتایا گیا کہ یہ ممی کی ہوئی اس فرعون کی لاش ہے جو ۳/ہزار سال پہلے حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں غرق کیا گیا تھا۔ اسمتھ نے واضح الفاظ میں لکھا ہے ''فرعون کا مادی جسم خدا کی مرضی سے تباہ ہونے سے بچا لیا گیا، تا کہ وہ لوگوں کے لیے نشان عبرت بنے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔'' خود موریس بوکائی بھی پوری تحقیق اور ممی کی سائنسی جانچ پڑتال سے اس حتمی نتیجہ تک پہنچے کہ یہ اس شخص کے ممی شدہ جسم کی مادی طور پر موجودگی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے واقفیت رکھتا تھا، جس نے ان کے دلائل کو رد کیا اور جو اس وقت جب انھوں نے خروج کیا، ان کے تعاقب میں گیا اور جس نے اسی عمل میں اپنی جان سے ہاتھ دھوئے۔ (مزید دیگر تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہوں: بائبل، قرآن اور سائنس کا باب خروج) فرعون موسیٰؑ کے وجود کو بچائے رکھنے کی قرآن کی پیشین گوئی،

مشاہداتی طور پر قرآن کے کتاب خداوندی ہونے کو ثابت کرتی ہے۔

پیشین گوئیوں کے سلسلے کی ایک حیرت انگیز پیشین گوئی وہ ہے جس کا تعلق فتح مکہ سے ہے۔ یہ ایسے وقت میں کی گئی تھی، جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے تھوڑے سے اصحاب تھے، جو بہت ہی کسمپرسی کی حالت سے گزر رہے تھے۔ چاروں طرف کا ماحول سب کو نگلنے والا اور دشمن بنا ہوا تھا اور اہل مکہ کا ظلم وستم یہاں تک بڑھ گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجبور ہو کر ہجرت کا ارادہ کرنا پڑا۔ حدیث وتفسیر کی مستند کتابوں میں اس سلسلے کی جو تفصیلات ملتی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم مکہ مکرمہ سے نکلے، غار ثور میں تین دن قیام کے بعد مدینہ طیبہ کے لیے نکلے۔ جب مقام جحفہ کے قریب پہنچے تو وہاں سے مکہ مکرمہ جانے والی سڑک نظر آئی تو طبعاً وطن کی یاد آئی اور اسے مستقلاً چھوڑ دینے کے خیال سے بڑا قلق وافسوس ہوا۔ ایسے موقع پر قرآن کریم نے یہ پیشین گوئی کہ آپ ﷺ کو دوبارہ اس مقام پر لوٹایا جائے گا، قرآن کی سورۃ القصص کی آیت 85 میں کہا گیا ہے (جس نے حکم بھیجا تجھ پر قرآن کا وہ پھر لانے والا ہے، تجھ کو پہلی جگہ)۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اپنے تفسیری نوٹ میں لکھتے ہیں: دیکھو آج کفار کے ظلم وستم سے تنگ آ کر تم کو مکہ چھوڑنا پڑا ہے، مگر جس خدا نے آپ کو پیغمبر بنایا اور قرآن جیسی کتاب عطا فرمائی وہ یقیناً آپ کو نہایت کامیابی کے ساتھ اس جگہ واپس لائے گا۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ موضح قرآن میں لکھتے ہیں: یہ آیت اتری ہجرت کے وقت، یہ تسلی فرمادی کہ پھر مکہ میں آؤ گے سو خوب طرح آئے پورے غالب ہو کر۔ (حاشیہ ترجمہ شیخ الہند، ص 526) کتب تفسیر میں لفظ ''معاد'' کی تفسیر موت، جنت سے بھی کچھ حضرات نے کی ہے، لیکن بخاری شریف کی روایت اور مستند مفسر قرآن ابن کثیرؒ نے ''معاد'' کی تفسیر مکہ مکرمہ سے کی ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔ فتح مکہ اور آنحضرت ﷺ اور حضرات صحابہ کے غلبے سے متعلق پیشین گوئیوں کی دیگر آیات کو بھی اس سلسلے کے تحت رکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً (اللہ کا فیصلہ ہے کہ اپنی

روشنی کو مکمل کر کے رہے گا)۔ (الصّف:8)

(ہم نے آپ کو مکمل فتح دی ہے)۔ (الفتح:1) جن حالات میں اور جن واقعات کے سلسلے میں یہ سورت نازل ہوئی اور جو دیگر آیات ہیں، بظاہر اسباب، فتح مکہ کا کوئی امکان نہیں تھا۔ سالوں سے قریش نے مسلمانوں کے لیے بیت اللہ کا راستہ بند کر رکھا تھا۔ صلح حدیبیہ کے بعد کسی مسلمان کو انھوں نے حدود حرم کے قریب تک پھٹکنے نہیں دیا تھا، لیکن خدا کے فیصلے کے تحت قرآن کی پیشین گوئی کے بالکل مطابق سارا عرب آنحضرت ﷺ کے قدموں کے نیچے آ گیا۔ مادی اسباب واصطلاحات میں اس کی توجیہ نہیں ہو سکتی ہے کہ تھوڑے سے بے سروسامان، نہتے لوگ ان پر کیسے غالب آ گئے۔ جو تعداد میں بہت زیادہ تھے اور تمام سامانوں سے لیس اور ہتھیاروں سے مسلح تھے، اس کی توجیہہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے، اس لیے اس کی کوئی بھی پیشین گوئی غلط نہیں ہو سکتی تھی اور پیشین گوئی کے عین مطابق آپ اور آپ ﷺ کے اصحابؓ کا کامیاب ہونا یقینی تھا۔

قرآنی پیشین گوئیوں کے ذیل میں قرآن حکیم کی حفاظت کا اعلان اور پیشین گوئی صداقت کا جیتا جاگتا نمونہ ہے اور واقعات نے محسوسات ومشاہدات کی اس بلندی تک پہنچا دیا جس کے آگے اور کوئی بلندی نہیں ہے۔ خالق کائنات نے قرآن میں اعلان کیا ہے (اور ہم نے ہی اس قرآن کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)۔ (الحجر:9)

دنیا میں مختلف طاقتوں نے مثل قرآن لانے کی پوری پوری کوشش کی ہے، لیکن اپنے ارادے میں کلی طور پر ناکام ہوئی ہیں اور دوسری طرف قرآن حکیم میں کوئی ایک نقطہ زیر زبر تک کا فرق نہیں آیا ہے۔ یہ حفاظت قرآن کے تعلق سے پیشین گوئی کی واقعاتی شہادت ہے۔ مثل قرآن نہ لا سکنے کی پیشین گوئی نے قرآن کے کلام الٰہی ہونے کو انتہائی حد تک ایک ناقابل تردید واقعہ ومشاہدہ بنا دیا ہے۔

پیشین گوئیوں کے سلسلے میں ایک نمایاں ترین پیشین گوئی وہ ہے جس کا تعلق ایران پر روم کے غلبے سے ہے۔ یہ ایک ایسی پیشین گوئی ہے جس نے تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا۔ حدیث، تفسیر، سیر و تاریخ کی کتابوں میں اس کی صداقت سے متعلق جو تفصیلات ملتی ہیں، ان سے ہر انصاف پسند کے دل میں یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ ہم پیشین گوئی کی صداقت کا حصہ ہو جائیں۔ ''سورۃ الروم'' کی ابتدائی آیات میں جو پیشین گوئی کی گئی ہے اس کی طرف بڑے سے بڑا مبصر اشارہ تک نہیں کر سکتا ہے۔ آیات میں کہا گیا ہے: (قریب کی زمین میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں، مگر مغلوب ہونے کے بعد چند سالوں میں پھر وہ غالب آ جائیں گے۔ پہلے اور بعد سب اختیار خدا کے ہاتھ میں ہے اور اس دن مسلمان خدا کی مدد سے خوش ہوں گے، وہ جس کو چاہتا ہے مدد کرتا ہے، وہ غالب اور مہربان ہے۔ خدا کا وعدہ ہے، خدا اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا ہے)۔ (الروم: 6-1)

عرب سے باہر، مگر اس سے متصل دو طاقتور بلکہ کہیے کہ اس وقت کی دو سپر پاور حکومتیں تھیں: ایک رومی سلطنت، دوسری ایرانی سلطنت، پہلی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیرو اور دوسری آتش اور سورج دیوتا کی پرستار تھی۔ رومی سلطنت کے حکمراں فوکاس انتہائی نااہل تھا، حالات کچھ ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ روم، ایران میں تصادم ہو گیا۔ رومی حکمران اپنی نااہلی سے ایرانی حملہ کو روک نہیں سکا اور اس کے بیشتر علاقوں پر ایران کا قبضہ ہو گیا۔ انطاکیہ سے لے کر یروشلم پر اور فرات سے وادی نیل تک ایران کے زیر اثر آ گئے۔ رومی سلطنت کا افریقی گورنر بھی تمام تر کوششوں کے باوجود ایرانی قبضے کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا اور رومی سلطنت قسطنطنیہ کی چہار دیواری تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ایرانی حکومت نے رومی علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد عیسائیوں پر بے پناہ مظالم شروع کئے۔ بے قصور ایک لاکھ عیسائیوں کا قتل عام کیا، ہر جگہ آتش کدے تعمیر کیے گئے۔ آگ اور سورج کی جبری پرستش شروع کرائی گئی۔ ایرانی حکمراں خسرو پرویز کا دماغ یہاں تک خراب ہو گیا کہ اس نے ہرقل

کے نام خط میں اسے کمینہ اور بے شعور اور خود کو سب خداؤں سے بڑا خدا تمام روئے زمین کے مالک خسرو کی طرف سے لکھا اور یہ بھی لکھا کہ تو کہتا ہے کہ اپنے خدا پر بھروسہ ہے، کیوں نہ تیرے خدا نے یروشلم کو میرے ہاتھ سے بچا لیا۔ جب ہرقل کی طرف سے صلح کی پیشکش کی خبر پہنچی تو خسرو نے کہا: (مجھ کو یہ نہیں، بلکہ ہرقل زنجیروں میں بندھا ہوا میرے تخت کے نیچے چاہئے۔ میں رومی حکمراں سے اس وقت تک صلح نہیں کروں گا جب تک وہ اپنے صلیبی خدا کو چھوڑ کر ہمارے سورج دیوتا کی پرستش نہ کرے)۔

رومی ایرانی کے مابین رونما ہونے والے واقعات سے عرب کے مکہ میں کفار مکہ اور مسلمانوں میں بحث شروع ہوئی۔ ایران کے آتش پرست اور سورج دیوتا کے پجاری ہونے کے ناطے کفار مکہ کی ہمدردی اس کے ساتھ تھی، جبکہ رومی عیسائیوں کے اہل کتاب ہونے کے سبب، مسلمانوں کی ہمدردی ان کے ساتھ تھی۔ کفار ان کا مذاق اڑاتے تھے کہ ہمارے بھائی ایرانی جس طرح تمہارے ہم مسلک اہل کتاب عیسائیوں پر غالب آ کر انھیں ذلیل و مغلوب کر چکے ہیں اس طرح ہم تمہارے اوپر غالب آ کر تمہیں ذلیل و فتح کریں گے۔ مکہ میں مسلمان تو ایسے بھی بہت ہی کمزور حالت میں تھے، اوپر یہ طعن و تشنیع، زخم پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھا۔ اس حالت میں سورہ ''روم'' کی مذکورہ آیات نازل ہوئیں جن میں مسلمانوں کو بشارت و مسرت کا پیغام اور رومیوں کے غلبے کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ ظاہری اسباب کو دیکھتے ہوئے اس کی کوئی امید نہیں تھی، سقوط سلطنت روما کے مصنف گبّن نے اپنی کتاب کی پانچویں جلد میں تحریر کیا ہے کہ کوئی بھی پیشین گوئی والی خبر اتنی بعد از وقوع نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ ہرقل کے ابتدائی بارہ سال رومی سلطنت کے خاتمے کا اعلان کر رہے تھے۔

قرآن کی پیشین گوئی کے مطابق: ''چند سالوں'' 10 سال کے اندر ہی رومی ایران پر غالب بھی آ گئے اور اس سے اپنے تمام مقبوضات واپس لے لیے۔ یہ ایک ایسی پیشین گوئی ہے جس نے ''سقوط سلطنت روما'' کے مصنف اور دیگر مغربی یورپی مورخین کو حیرت میں

ڈال دیا، لیکن یہ حیرت کی بات نہیں ہے، بلکہ قرآن کے کلام الٰہی اور اس کی پیشین گوئیوں کی صداقت کا اعلان واثبات ہے۔ ادھر رومی ایرانی کو شکست دے چکے تھے، اُدھر اہل ایمان بے سروسامانی کے عالم میں میدان بدر میں مذاق اڑانے والے کفار مکہ کو شکست دے کر انھیں ذلیل ورسوا کررہے تھے اور آیت: "یومئذ یفرح المومنون بنصر اللہ". (اس روز اہل ایمان اللہ کی مدد سے خوش ہوں گے)۔ میں دی گئی بشارت و پیشین گوئی کی صداقت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

ان مذکورہ پیشین گوئیوں کے علاوہ قرآن حکیم میں اور بھی بہت سی پیشین گوئیاں ہیں، جو سب کی سب بلا استثنا صحیح ثابت ہوئیں، دیگر اقوام کے ماضی کے معجزات، صرف تاریخی بیان ہیں، لیکن اہل ایمان کے پاس قرآن کی صورت میں زندہ ہمیشہ ساتھ رہنے والا معجزہ ہے، اس لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا (مجھ کو جو معجزہ دیا گیا ہے وہ قرآن ہے)۔ (بخاری باب الاعتصام) اور قرآنی پیشین گوئیوں نے بھی ثابت کردیا ہے کہ قرآن خدا کا کلام بھی ہے اور اس کی آواز بھی، اگر اس کا پیغام آج بھی صحیح شکل میں لوگوں تک پہنچ جائے تو وہ اقوام عالم کو مسخر کرلے گا، اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

☆☆

قرآن کریم
ایک ناقابل تحریف کتاب

● محمد صابر طیبی اعظمی

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جس میں اعلان کے ساتھ نازل فرمایا کہ ہم نے اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں، اس لیے کہ انسان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اس کی حفاظت کرسکے۔ پچھلی امتوں پر اس کا تجربہ کیا جاچکا تھا۔ پچھلی آسمانی کتابوں میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جو محرف نہ ہو۔ صرف قرآن کریم ہی ایسی کتاب ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ قرآن کریم کی حفاظت جس طرح روز اوّل سے ہی کی گئی اور کی جارہی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حرف بہ حرف سچ ثابت ہوا۔ قرآن کریم میں کسی قسم کی تحریف وترمیم کی کوشش کامیاب ہوسکی ہے اور نہ کامیاب ہوسکے گی۔

اسلام دشمن عناصر کی جانب سے قرآن کے خلاف طرح طرح کی سازشیں رچی گئیں۔ قرآن کو ضائع کرنے، مٹانے اور بدلنے کی ہر ممکن کوششیں ہوئی ہیں اور اس کا بدل تیار کرنے میں پوری توانائی صرف کردی گئی، لیکن پورا قرآن تو کیا ایک آیت بھی کوئی تیار نہ کرسکا۔ قرآن کا بدل پیش کرنے میں کسی کو کامیابی ملے تو کیسے ملے؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(اگر انسان اور جنات مل کر قرآن جیسی کتاب پیش کرنا چاہیں تو اس جیسی کتاب پیش نہیں کرسکتے، خواہ ایک دوسرے کی اس سلسلے میں مدد بھی کریں)۔ (بنی اسرائیل: ۸۸)

مذکورہ آیت میں پورے قرآن کا بدل پیش کرنے کا چیلنج کیا گیا۔ ذیل کی آیت میں قرآن کی کسی سورت جیسی ایک سورت بنا کر لانے کی بات کہی گئی ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

(اگر تم کو اس کتاب کے بارے میں ذرا بھی شک وشبہ ہے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو اس جیسی ایک سورت ہی بنالاؤ اگر تم سچے ہو اور اللہ کے علاوہ جتنے تمہارے حمایت ہیں ان سب کو بلالو)۔ (البقرۃ:۲۳)

عرب قوم جنھیں اپنی فصاحت و بلاغت پر ناز تھا، خطابت وشاعری ان کی سرشت میں داخل تھی اور اپنے شعر وادب پر انھیں اتنا غرور تھا کہ وہ اپنے علاوہ تمام قوموں کو عجم (گونگا) کہہ کر پکارتے تھے، لیکن اس اعلان کے بعد ادباء وشعراء کی محفلوں میں سناٹا چھا گیا۔ ساری فصاحت و بلاغت، شعر وشاعری دھری کی دھری رہ گئی۔ کسی میں یہ ہمت نہ رہی کہ وہ اس چیلنج کو قبول کرنے کے لیے آگے آئے۔ یہ قرآن کریم کی حقانیت وصداقت کی دلیل اور اس کا اعجاز ہے، یہ ایسا کلام ہے جس کی نظیر پیش کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے۔

قرآن مجید پوری انسانیت کے لیے اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے، یہ وہ کتاب ہے جس کا دیکھنا، جس کا پڑھنا، جس کا سننا سنانا اور جس کا سیکھنا سکھانا دونوں جہاں کی عظیم سعادت ہے۔ قرآن سیکھنے سکھانے والے کو سب سے بہتر کہا گیا ہے۔ چونکہ قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے سر لے رکھی ہے، اس لیے اس کا بہترین انتظام کر رکھا ہے۔ ہر دور میں ایسے افراد پیدا کرتا رہے گا جو قرآن حکیم کی حفاظت وصیانت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیں گے اور اس پر کسی طرح سے کوئی آنچ نہ آنے دیں گے۔

دنیا میں اگر کوئی کتاب سب سے زیادہ پڑھی پڑھائی اور سنی جاتی ہے تو بلا مبالغہ وہ قرآن کریم ہے۔ قرآن کریم کے جہاں بہت سارے معجزات ہیں وہیں ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ اتنی ضخامت کے باوجود بڑی آسانی سے یاد ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم کے علاوہ کسی

آسمانی یا غیر آسمانی کتاب کی یہ خصوصیت نہیں ہے، کروڑوں مسلمانوں کے سینوں میں وہ محفوظ ہے، چنانچہ آج بھی پورے وثوق اور دعوے کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ لوگ آج بھی اسی قرآن کی تلاوت کرتے ہیں جو حضرت جبرئیل رسول اللہ ﷺ کے پاس لائے اور اس کے ایک حرف، ایک نقطے اور شوشے میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

یہ ایسی حقیقت ہے جسے منصف مزاج غیر مسلموں نے بھی تسلیم کیا ہے اور اس سے انکار کی جرأت نہیں کی۔

عیسائی مورخ مسٹر باڈلے کہتے ہیں: ''قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جس میں تیرہ سو برس سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہودی اور عیسائی مذہب میں کوئی ایسی چیز نہیں جو معمولی طور سے بھی قرآن کے مقابلے میں پیش کی جاسکے۔''

مہاتما گاندھی نے اپنے خیال کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے: ''میں نے تعلیمات قرآنی کا مطالعہ کیا ہے، مجھے قرآن کو الہامی تسلیم کرنے میں ذرّہ برابر تامل نہیں ہے، مجھے اس کی سب سے بڑی خوبی یہ نظر آئی کہ وہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔''

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے کہا ہے:

(وہ وقت دور نہیں جبکہ قرآن کریم اپنی مسلمہ صداقتوں اور روحانی کرشموں سے سب کو اپنے اندر جذب کرے گا)۔

قرآن کریم کی حفاظت روز اوّل سے ہی ہوتی آئی ہے اور ہوتی رہے گی، ہمیں بس اس نکتے پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کی حفاظت میں ہمارا کتنا حصہ ہے۔

☆☆

قرآن کریم دعا بھی، دوا بھی

● ذکیہ کوثر

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت و کامرانی کے لیے قرآن مجید نازل فرمایا ہے۔ کتاب پاک محض کتاب تلاوت ہی نہیں، بلکہ کتاب ہدایت ہے، اس کا دائرہ مخصوص لوگوں تک ہی محدود نہیں، بلکہ تمام لوگوں کے لیے ہدایت نامہ ہے، اس لیے تو قرآن پاک کو ''ہدی للناس'' کہا گیا ہے۔ اس کتاب میں پچھلی امتوں کے سبق آموز واقعات بھی اور آئندہ رونما ہونے والے حوادثات بھی ہیں۔ زمانہ حال کے مسائل کا حل بھی ہے، یہ کوئی فضول اور بکواس باتوں کا مجموعہ نہیں۔ جبکہ کفار اسے ''اساطیر الاولین'' کہا کرتے تھے۔ یہ کتاب ہدایت اور حکمت سے بھرا نصیحت نامہ ہے۔ یہی کتاب الٰہ العالمین کی مضبوط رسّی ہے، یہی صراطِ مستقیم ہے، یہی جہنم سے بچانے والی اور ہر کجی سے محفوظ رکھنے والی ہے۔ اسی کتاب سے قوموں کے عروج وزوال کی داستان وابستہ ہے۔ جس نے اس کتاب کو تھام لیا اس کو اللہ رب العزت نے بلند ترین مقام پر اٹھا دیا۔ جس نے اس کتاب کو ٹھکرا دیا اسے خدائے پاک نے ذلیل ورسوا کر دیا اور وہ ذلت کی پستی میں جا گرا۔ مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جس وقت اس کی تابعداری کی گئی اللہ نے اس وقت مسلمانوں کو بلندیاں عطا کیں اور جس وقت اس کتاب سے روگردانی کی گئی، اس کے قوانین سے انحراف کیا گیا، سرکشی کی گئی اس وقت اس زمانہ میں اس عہد میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اوج ثریا کی بلندی سے تحت الثریٰ میں گرا دیا۔ وہ آسمان پر تھے، ان کا ستارہ

عروج پر تھا، لیکن محض اس کتاب سے روگردانی کی وجہ سے وہ زمین پر پٹخ دیے گئے۔ زمین میں دھنسا دیے گئے۔ اس سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ ہم کتاب الٰہی کو تھامے رہیں، اسی میں ہماری عزت ہے، اس سے روگردانی سے ہمیں ذلت اٹھانی پڑے گی۔ یاد رکھئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جتنی نعمتوں سے انسانیت کو نوازا ہے ان سب نعمتوں میں سب سے بڑی، سب سے اونچی، سب سے فائق اور سب سے قیمتی نعمت قرآن پاک کی نعمت ہے۔ اس میں دنیا وآخرت کی راحت اور ہر طرح کا سکون ہے، یہ اللہ کا ذکر ہے اور اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو سکون ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (سنو! اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو سکون نصیب ہوتا ہے)۔

قرآن پاک میں اوّلین کے علوم بھی ہیں، آخرین کے علوم بھی ہیں، آسمان کے علوم بھی ہیں، زمین کے علوم بھی ہیں، چاند ستاروں کے علوم بھی ہیں، زہرہ اور مریخ کے علوم بھی ہیں، عالم ملکوت کے علوم بھی ہیں، عالم ناسوت کے علوم بھی ہیں، سائنس اور ٹیکنالوجی کے علوم، عبادات کے علوم بھی ہیں، تجارتوں کے علوم بھی ہیں، خلوتوں کے علوم بھی ہیں، جلوتوں کے علوم بھی ہیں، معاملات کے علوم بھی ہیں اور معاشرتوں کے علوم بھی ہیں، غرض یہ کہ قرآن پاک علوم کا خزانہ ہے، بیش بہا خزانہ ہے، اگر یہ علوم ہمیں نظر نہیں آئے تو ہماری کمی ہے، ہماری کوتاہ فہمی ہے۔ اسی طرح علما نے لکھا ہے کہ جس طرح آیات قرآنیہ کے ظاہر سے ہمیں ایک مطلب سمجھ میں آتا ہے، ایک حکم سمجھ میں آتا ہے، اسی طرح آیات کے باطنی یقینی اثرات بھی ہیں، یعنی ان آیات کے پڑھنے سے، ان آیات کو لکھ کر اپنے پاس رکھنے سے، ان آیات کو دھو کر پینے سے، آدمی پر ایک اثر مرتب ہوتا ہے، جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن پاک کی آیات میں آیات دعا بھی ہیں، ان آیات کے ذریعہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کرنا قبولیت کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ ان آیات کے مضامین جامع ترین مضامین ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب پاک کے ذریعہ بندوں کو دعائیں سکھائی ہیں، مانگنے کا

طریقہ سکھایا ہے۔

گریہ وزاری سکھائی ہے، رونا اور گڑگڑانا سکھایا، اس کتاب پاک کی پہلی سورت میں ہی اللہ رب العزت نے دعا سکھائی ہے، مانگنا بتایا ہے، طلب کرنے کے جامع الفاظ بتائے ہیں، پناہ مانگنا بتایا ہے، نجات مانگنا بتایا ہے، یہ پوری سورت ہی دعا کی سورت ہے۔ پہلے رب کائنات کی تعریف کی گئی ہے اور تعریف تفصیل سے کی گئی ہے، اس کے بعد درخواست پیش کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ ''**الحمد لله رب العالمين**''. میں رب کائنات کی حمد وثنا ہے، الرحمٰن میں اس کی شہنشاہیت کا بیان ہے، اس کے بعد سب سے بڑے داتا کی غلامی کا اور خالص غلامی کا اقرار ہے، جس کی تعبیر **ایاک نعبد و ایاک نستعین** سے کی گئی ہے۔ اس سے ہدایت کی صراطِ مستقیم پر گامزن کرنے، گامزن رکھنے کی درخواست ہے، جس کی تعبیر ''**اهدنا الصراط المستقيم**'' سے کی گئی ہے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ سے جب گمراہوں کے راستوں پر جانے سے بچانے کی درخواست پیش کی گئی ہے۔ ''**غير المغضوب عليهم ولا الضالين**'' غرض یہ کہ قرآن پاک کی پہلی سورت میں ہی یہ مضمون واضح ہے کہ یہ کتاب دعا بھی سکھاتی ہے، اس طرح یہ کتاب، کتاب دعا بھی ہے۔ پورے قرآن پاک کا مطالعہ کیجئے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے پانچ مقامات پر ''**اللهم**'' کا استعمال فرمایا ہے، جس کے معنی ہیں (اے اللہ!)۔

کہیں ''**اللهم فاطر السمٰوات والارض**'' کہیں ہے: ''**اللهم ملك الملك تؤتي الملك من تشاء**''. کہیں ہے: ''**اللهم ربنا انزل علينا مائدةً من السماء**''. اسی طرح اللہ رب العزت نے ساٹھ سے زائد مقامات پر ''**ربنا**'' کو دعا کے معنی میں استعمال فرمایا ہے۔ ''**ربنا**'' کے معنی بھی رب سے مانگو۔ ''**ربنا**'' کہہ کر مانگو، یہ انداز طلب نہایت پسندیدہ اور نہایت ہی مقبول ہے، اس لیے کہیں آپ پڑھتے ہیں: **ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم**. کہیں تلاوت کرنے میں **ربنا آتنا في الدنيا**

حسنة وفي الآخرة حسنة وقنا عذاب النار. کہیں دعا کرتے ہیں: **ربنا لاتواخذنا**، کبھی کہتے ہیں: **ربنا اغفر لنا**. یہ ساری آیتیں ہمیں بتاتی ہیں کہ قرآن پاک کتاب دعا بھی ہے، قرآنی دعائیں قبولیت کے زیادہ قریب ہیں۔

یہ بات بھی مہر نیم روز کی طرح واضح ہے کہ قرآن پاک میں جس طرح دعائیں بتائی گئی ہیں اسی طرح قرآن پاک کی آیات کو دواؤں کے لیے استعمال کرنا بھی ثابت ہے، جبکہ آیات کی بے ادبی نہ ہو، اس کی بے احترامی نہ ہو۔ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے بھی قرآن کی آیات کو دوا کے طور پر استعمال فرمایا ہے۔ یہ بات بہت سے علماء، صلحاء اور فقہاء سے ثابت ہے، اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن پاک کی دو سورتوں کا پڑھنا دنیا اور دین کے تمام مقاصد کے لیے مفید ہے، وہ ہیں ''**والضحیٰ**'' اور ''**الم نشرح**'' علما نے لکھا ہے کہ جو شخص قرآن پاک کی ان آیتوں کو جن میں ''**حٰمٓ**'' آیا ہے اگر برابر پڑھتا رہے اور اس کا اہتمام کرے تو وہ انشاء اللہ عذاب جہنم سے محفوظ رہے گا اور جو شخص ہر نماز کے بعد پابندی سے ''**لقد جآئكم رسول من انفسكم**'' کو دو آیتوں تک پڑھے اس شخص کو شفاعت نصیب ہوگی اور جو عورت ''**من يتخذ من دون الله انداداً يحبونهم كحب الله**'' آخر تک پڑھ کر کسی مٹھائی پر دم کر کے اپنے شوہر کو کھلا دے تو اس کے شوہر کی ناراضگی دور ہو جائے گی۔ اگر کسی شخص کو اولاد نہ ہوتی ہو اور وہ ''**رب هب لي من لدنك ذرية طيبة انك سميع الدعاء**'' پڑھے تو انشاء اللہ ضرور اس کا مقصد پورا ہوگا۔ اگر کوئی جانور سرکشی کرتا ہو اور اس کے کان میں یہ آیت پڑھ دیں تو وہ ضرور تابع ہو جائے گا، وہ آیت ہے: ''**افغير دين الله يبغون وله أسلم من في السمٰوات والارض طوعا و كرهاً واليه يرجعون**''. اگر ولادت میں پریشانی ہو رہی ہو اس وقت اگر عورت کے بائیں ران میں ''**اذا السماء انشقت**'' پانچ آیتوں کو لکھ کر باندھ دیا جائے تو ولادت میں آسانی ہو جاتی ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ قرآن پاک جس طرح سے کتاب ہدایت ہے اس طرح سے قرآن پاک میں دعائیں بھی بتائی گئی ہیں اور قرآن کی آیات دواؤں کے طور پر بھی استعمال کی جاتی ہیں اور ان کے اثرات مرتب ہوتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ قرآن کی بے ادبی نہ ہو، اس کا احترام باقی رہے۔

☆☆

قرآن عظیم: ایک تعارف

● ساحل احمد

قرآنِ عظیم کلام الٰہی ہے جو وحی کی صورت میں حضرت جبرئیل کے توسط سے حضور کریم ﷺ پر نازل ہوا۔ یہ اپنے ماقبل کی تمام آسمانی کتابوں کا ناسخ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ "**الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا**" (آج ہم نے تمہارا دین کامل و مکمل کر دیا ہے اور تم پر تمام نعمت پوری کر دی اور دین حنیف کو تمہارے لیے پسند کیا)۔

قرآنِ حکیم ایک آسمانی صحیفہ ہے جس میں انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک اور موت سے لے کر حیات بعد الموت تک کے سارے مسائل اور ضابطے موجود ہیں۔ جہاں ہمیں خدا کی عبادت و ریاضت کی مکمل تعلیم دیتا ہے وہیں اس میں تمام سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تجارتی رموز و مسئلے بھی مذکور ہیں۔ قرآنِ مقدس صداقت و حقانیت کا مظہر ہے۔

"**خزینۃ الاسرار**" میں قرآن پاک کے ۵۵ نام کی تصدیق کی گئی ہے۔ امام غزالی نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اسماء صفات میں سے دس نام لے کر قرآن کے نام لکھے ہیں جن میں آٹھ کا تعلق اسماء سے اور دو کا تعلق صفات سے ہے۔ وہ آٹھ اسماء اس طرح ہیں: عزیز، حکیم، عظیم، نور، مہیمن، مجید، کریم اور حق اسی لیے قرآن پاک کو قرآنِ مجید، قرآنِ حکیم اور قرآنِ کریم کہتے ہیں۔

قرآن پاک کا نزول ماہ رمضان میں ہوا۔ اس کے قبل کی بھی جو آسمانی کتابیں یا

آیات ہیں ان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک سو ایک سورتیں یکم رمضان کو، حضرت موسیٰؑ کی توریت ۶؍رمضان کو، حضرت داؤد کی زبور ۱۲؍رمضان کو اور حضرت عیسیٰؑ کی انجیل ۱۳؍رمضان کو اور آنحضرت محمد ﷺ پر قرآن مجید ۲۴؍رمضان (۲۵ شب قدر) کو نازل ہوا۔ حضور ﷺ کو غار حرا میں کئی ماہ کے اعتکاف وخلوت کے بعد ۱۲؍ربیع الاوّل پیر کو اقراء کی ۵ آیات ملیں جب آپ کی عمر ۴۰ برس کی تھی۔ ان آیات میں لکھنے پڑھنے کی ترغیب اور علم کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ یہی وہ ابتدائی تاریخ یا دن تھا جب قرآن کا نزول شروع ہوا۔ نزول کی کل مدت ۲۲ سال ۵ ماہ ہے۔ اس کی تکمیل تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ہوئی، تاکہ یاد کرنے اور عمل کرنے میں سہولت ہو۔ تمام دوسرے انبیاء کو لکھے ہوئے صحیفے یا آیات ملی تھیں، جبکہ رسول اللہ ﷺ کو حضرت جبرئیل یاد کراتے تھے، چونکہ رسول کریم لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے جبکہ ان کے سابق انبیاء لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ حضور کے اُمّی ہونے میں خدا کی مصلحت شامل تھی۔

قرآنِ حکیم تیس پارے اور سات منزلوں پر مشتمل ہے۔ قرآن پاک کی آیات مکی اور مدنی کہلاتی ہیں۔ مکی آیات وہ ہیں جو ہجرت سے قبل نبوت سے ۱۳؍سال تک پر محیط ہیں۔ اس وقفہ میں جتنا قرآن اترا وہ مکی کہلاتا ہے اور ہجرت سے دس سال تک جب آپ نے مکہ سے مدینہ کو ہجرت کی، یہ حصہ آیات مدنی کہلاتی ہیں۔ قرآن پاک کا تین چوتھائی حصہ مکی ہے اور ایک چوتھائی مدنی، یعنی قرآن میں کل ۱۱۴؍سورتیں ہیں جن میں ۸۶ سورتیں مکی اور ۲۸؍سورتیں مدنی ہیں۔ اسی طرح ۵۵۶ رکوع اور بہ قول عام چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ، مگر بہ بقول مختار چھ ہزار دو سو چھتیس آیات ہیں۔

رسول اکرم ﷺ کی اجازت سے صحابہ نے قرآن مجید کو سات حصوں میں تقسیم کرلیا تھا، تاکہ پورا قرآن پاک سات دن میں ختم کرسکیں، چنانچہ حضرت عثمان شب جمعہ کو قرآن شروع کرتے اور شب پنجشنبہ کو ختم کرتے، پھر عبداللہ بن عمر کو آنحضرت نے ایک ماہ میں

قرآن ختم کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ ۷۵ھ یعنی زمانہ حجاج بن یوسف میں قرآن پاک کو تیس پاروں میں تقسیم کیا گیا۔ ربع نصف، ثلث اور ارباع میں۔ سورتوں اور رکوع کی تقسیم میں اختلافات ہیں۔ ع رکوع کی علامت ہے۔ ہ فواصل توفیقی ہیں، ہر آیت کے لیے گول ایسا نشان (O) حجاج کے زمانہ میں شروع ہوا۔ قرآن پاک میں سجدہ طریق حنفی کے اعتبار سے ۱۴؍اور امام شافعی کے خیال سے ۱۵؍سجدے ہیں۔

مکی سورتوں میں عموماً توحید کیا ہے اور اس کے دلائل، خدا کی قدرت، اس کی رحمت اور اس کی مہربانیوں کا ذکر ہے۔ اس کے ساتھ ہی رسالت اور آخرت کے تصور کو دلائل اور مثال کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ خاص طور سے توحید کے ساتھ آخرت کا تصور مکی سورتوں میں زیادہ ابھرا ہوا ہے۔ دوسرے بداطواری اور غلط اعمال وافعال کے نتائج کا ذکر، رسول خدا کے پہلے کے نبیوں کا ذکر، نیکی اور اخلاق وشرافت کی ممانعت کرنے والوں کی سزاؤں کا ذکر، آندھی، آبی اور ہوائی طوفان، زلزلہ، قحط، ژالہ باری، بیماری، خدا کی قہاریت کا اظہار ہیں۔ جب انسان نے سچائی اور نیکی مخالفت کی اور سچائی کو جھٹلایا تو خدا نے عذاب نازل کئے۔

مدنی سورتوں میں شر فساد کی مذمت، اخلاق وصداقت کی تعلیم، اخوت واتفاق کی ترغیب، سچے مسلمانوں کا منافقین وشر پسندوں سے دور رہنے کی تلقین، خدا کی عبادت پر زور، کمزوروں کی حمایت اور آدمیت کو بچانے کی تلقین اور ملک میں امن وامان قائم رکھنے پر زور دیا ہے۔

☆☆

آیات ورکوع

سورہ	پارہ	مقام	آیات
۱۔فاتحہ	-	مکی	۷آیتیں
۲۔البقرہ	۱-۲-۳	مدنی	۲۸۶آیتیں،۴۰رکوع
الم سے شروع ہوکر تلک الرسل ۳/۴ تک			
۳۔آل عمران	۳-۴	مدنی	۲۰۰آیتیں،۲۰رکوع
تلک الرسل سے شروع ہوکر لن تنالوا (۱۱/۱۱/۲۰)تفلحون (۲۰۰)			
۴۔النساء	۴-۵-۶	مدنی	۱۷۷آیتیں،۲۴رکوع
رقیباً (۱).....علیم (۱۷۷)۴/۶/۲۴			
۵۔المائدۃ	۶-۷	مدنی	۱۲۰آیتیں،۱۶رکوع
ما یرید (۱).....قدیر (۱۲۰)۶/۵/۱۶			
۶۔الانعام	۷-۸	مکی	۱۶۵یا۱۶۶آیتیں،۲۰رکوع
یعدلون (۱).....رحیم (۱۶۶)النصف ۷/۱۱/۲۰			
۷۔الاعراف	۸-۹	مکی	۲۰۶آیتیں،۲۴رکوع
المّص (۱).....یسجدون (۲۰۶)۱۶/۱۸/۲۴			
۸۔الانفال	۹-۱۰	مدنی	۷۵آیتیں،۱۰رکوع
یسئلونک (۱).....علیم (۷۵)۶/۶/۱۰الربع			

۹۔التوبۃ	۱۰-۱۱	مدنی	۱۲۹آیتیں،۱۶رکوع
المشرکین (۱).....العظیم (۱۲۹)۵/۶/۱۶			
۱۰۔یونس	۱۱	مکی	۱۰۹آیتیں،۱۱رکوع
الحکیم (۱).....الحاکمین (۱۰۹)۱۶/۶/۱۱			
۱۱۔ھود	۱۱-۱۲	مکی	۱۲۳آیتیں،۱۰رکوع
خبیر (۱).....تعملون (۱۲۳)۱۰/۱۴/۱			
۱۲۔یوسف	۱۲-۱۳	مکی	۱۱۱آیتیں،۱۲رکوع
المبین (۱).....یؤمنون (۱۱۱)۶/۷/۱۲			
۱۳۔الرعد	۱۳	مدنی	۴۳آیتیں،۶رکوع
لایؤمنون (۱).....الکتاب (۴۳)۱۲/۶/۶			
۱۴۔ابراہیم	۱۳	مکی	۲۵آیتیں،۷رکوع
الحمید (۱).....الالباب (۵۲)۱۹/۱۱/۶			
۱۵۔الحجر	۱۳-۱۴	مکی	۹۹آیتیں،۶رکوع
مبین (۱).....الیقین (۹۹)۶/۲۰/۶			
۱۶۔النحل	۱۴	مکی	۱۲۸آیتیں،۱۶رکوع
یشرکون (۱).....محسنون (۱۲۸)۲۲/۹/۱۶			
۱۷۔بنی اسرائیل	۱۵	مکی	۱۱۱آیتیں،۱۲رکوع
البصیر (۱).....تکبیراً (۱۱۱)۱۲/۱۱/۱۲			
۱۸۔الکہف	۱۵-۱۶	مکی	۱۱۰آیتیں،۱۲رکوع
عوجاً (۱).....أحداً (۱۱۰)۳/۹/۱۲			
۱۹۔مریم	۱۶	مکی	۹۸آیتیں،۶رکوع

کھیٰعٓصٓ (۱)......رکزاً (۹۸)النصف۹/۱۶/۶

۲۰۔طٰہٰ ۱۶ مکی ۱۳۵آیتیں،۸رکوع

طٰہٰ (۱)......اهتدیٰ (۱۳۵)۱۷/۷/۸

۲۱۔الانبیاء ۱۷ مکی ۱۱۲آیتیں،۷رکوع

معرضون (۱)......ماتصفون (۱۱۲)النصف ۷/۱۹/۷

۲۲۔الحج ۱۷ مدنی ۷۸آیتیں،۱۰رکوع

عظیم (۱)......النصیر (۷۸)۱۷/۶/۱۰

۲۳۔المومنون ۱۸ مکی ۱۱۸آیتیں،۶رکوع

معرضون (۱)......الراحمین (۱۱۸)۶/۲۶/۶

۲۴۔النور ۱۸ مدنی ۶۴آیتیں،۹رکوع

تذکرون (۱)......علیم (۶۴)۱۵/۳/۹

۲۵۔ ۱۸-۱۹ مکی ۷۷آیتیں،۶رکوع

نذیراً (۱)......لزاماً (۷۷)الربع۴/۱۷/۶

۲۶۔الشعراء ۱۹ مکی ۲۲۷آیتیں،۱۱رکوع

طسٓمٓ (۱)......ینقلبون (۲۲۷)۱۵/۳۶/۱۱

۲۷۔النمل ۱۹-۲۰ مکی ۹۳آیتیں،۷رکوع

مبین (۱)......تعملون (۹۳)۳/۱۱/۶

۲۸۔القصص ۲۰ مکی ۸۸آیتیں،۹رکوع

طسٓمٓ (۱)......ترجعون (۸۸)الثلث۱۲/۶/۹

۲۹۔العنکبوت ۲۰-۲۱ مکی ۶۹آیتیں،۷رکوع

الٓمٓ (۱)......المحسنین (۶۹)۳/۶/۷

۳۰۔الروم ۲۱ مکی ۶۰آیتیں،۶رکوع

الٓمٓ (۱)......لایوقنون (۶۰)۹/۷/۶

۳۱۔لقمان ۲۱ مکی ۳۴آیتیں،۴رکوع

الٓمٓ (۱)......خبیر (۳۴)۱۳/۴/۴

۳۲۔السجدہ ۲۱ مکی ۳۰آیتیں،۳رکوع

الٓمٓ (۱)......منتظرون (۳۰)۱۶/۸/۳

۳۳۔الاحزاب۲۱-۲۲ مدنی ۷۳آیتیں،۹رکوع

حکیماً (۱)......رحیماً (۷۳)۶/۵/۹

۳۴۔سبا ۲۲ مکی ۵۴آیتیں،۶رکوع

الخبیر (۱)......مریب (۵۴)۱۲/۹/۶

۳۵۔الفاطر ۲۲ مکی ۴۵آیتیں،۵رکوع

قدیر (۱)......بصیراً (۴۵)۱۷/۸/۵

۳۶۔یٰسٓ ۲۲-۲۳ مکی ۸۳آیتیں،۵رکوع

یٰسٓ (۱)......ترجعون (۸۳)۴/۱۶/۵

۳۷۔والصّٰفّٰت ۲۳ مکی ۱۸۲آیتیں،۵رکوع

صفاً (۱)......العٰلمین (۱۸۲)۹/۶۶/۹

۳۸۔صٓ ۲۳ مکی ۸۸آیتیں،۵رکوع

الذکر (۱)......حین (۸۸)۱۴/۲۴/۵

۳۹۔الزمر ۲۳-۲۴ مکی ۷۵آیتیں،۸رکوع

الحکیم (۱)......العٰلمین (۷۵)الربع ۵/۵/۸

۴۰۔المؤمن ۲۴ مکی ۸۵آیتیں،۹رکوع

حٰمٓ (۱).....الکٰفرون (۸۵)۱۴/۷/۹

۴۱۔حٰم السجدہ ۲۴-۲۵ مکی ۵۴آیتیں،۶رکوع

حٰمٓ (۱).....محیط (۵۴)۱/۱۰/۶

۴۲۔الشوریٰ ۲۵ مکی ۵۳آیتیں،۵رکوع

حٰمٓ (۱).....الامور (۵۳)۶/۱۰/۵

۴۳۔الزخرف ۲۵ مکی ۸۹آیتیں،۷رکوع

حٰمٓ (۱).....یعلمون (۸۹)۱۳/۲۲/۷

۴۴۔الدخان ۲۵ مکی ۵۹آیتیں،۳رکوع

حٰمٓ (۱).....مرتقبون (۵۹)۱۶/۱۷/۳

۴۵۔الجاثیہ ۲۵ مکی ۳۷آیتیں،۴رکوع

حٰمٓ (۱).....الحکیم (۳۷)۲۰/۱۱/۴

۴۶۔الاحقاف ۲۶ مکی ۳۵آیتیں،۴رکوع

حٰمٓ (۱).....الفٰسقون(۳۵)الربع۴/۹/۴

۴۷۔محمد ۲۶ مدنی ۳۸آیتیں،۴رکوع

أعمالهم (۱).....أمثالکم (۳۸)۸/۱۰/۴

۴۸۔الفتح ۲۶ مدنی ۲۹آیتیں،۴رکوع

مبیناً (۱).....عظیماً (۲۹)۱۲/۳/۴

۴۹۔الحجرات ۲۶ مدنی ۱۸آیتیں،۲رکوع

علیم (۱).....تعلمون (۱۸)۱۴/۸/۲

۵۰۔ق ۲۶ مکی ۴۵آیتیں،۳رکوع

المجید (۱).....وعید (۴۵)۱۷/۱۶/۳

۵۱۔الذاریات۲۶-۲۷ مکی ۶۰آیتیں،۳رکوع

ذروأً (۱).....یوعدون (۶۰)۲/۱۴/۳

۵۲۔الطّور ۲۷ مکی ۴۹آیتیں،۲رکوع

والطور (۱).....النجوم (۴۹)۴/۲۱/۲

۵۳۔النجم ۲۷ مکی ۶۲آیتیں،۳رکوع

هوی (۱).....واعبدوا (۶۲)۷/۳۰/۱۳السجدہ

۵۴۔القمر ۲۷ مکی ۵۵آیتیں،۳رکوع

القمر (۱).....مقتدر (۵۵)۱۰/۱۵/۳

۵۵۔الرحمٰن ۲۷ مدنی ۷۸آیتیں،۳رکوع

الرحمن (۱).....والاکرام (۷۸)۱۳/۳۳/۳

۵۶۔الواقعہ ۲۷ مکی ۹۶آیتیں،۳رکوع

الواقعة (۱).....العظیم (۹۶)۱۶/۲۲/۳

۵۷۔الحدید ۲۷ مدنی ۲۹آیتیں،۳رکوع

الحکیم (۱).....العظیم (۲۹)۲۰/۴/۴

۵۸۔المجادلہ ۲۸ مدنی ۲۲آیتیں،۳رکوع

بصیر (۱).....المفلحون (۲۲)۳/۹/۳

۵۹۔الحشر ۲۸ مدنی ۲۴آیتیں،۳رکوع

الحکیم (۱).....الحکیم (۲۴)۶/۷/۳

۶۰۔الممتحنۃ ۲۸ مکی ۱۳آیتیں،۲رکوع

السبیل (۱).....القبور (۱۳)النصف ۸/۷/۲

۶۱۔الصّف ۲۸ مدنی ۱۴آیتیں،۲رکوع

الحکیم (۱).....ظاهرین (۱۴)۱۰/۵/۲

۶۲۔الجمعہ ۲۸ مدنی ۱۱آیتیں،۲رکوع

الحکیم (۱).....الرازقین (۱۱)۱۲/۳/۲

۶۳۔المنافقون ۲۸ مدنی ۱۱آتیں،۲رکوع

لکٰذبون (۱).....تعملون (۱۱)۱۴/۳/۲

۶۴۔التغابن ۲۸ مدنی ۱۸آیتیں،۲رکوع

قدیر (۱).....الحکیم (۱۸)۱۶/۸/۲

۶۵۔الطلاق ۲۸ مدنی ۱۲آیتیں،۲رکوع

أمراً (۱).....علماً (۱۲)۱۸/۵/۲

۶۶۔التحریم ۲۸ مدنی ۱۲آیتیں،۲رکوع

رحیم (۱).....القانتین (۱۲)۲۰/۵/۲

۶۷۔الملک ۲۹ مکی ۳۰آیتیں،۲رکوع

قدیر (۱).....معین (۳۰)۲/۱۶/۲

۶۸۔القلم ۲۹ مکی ۵۲آیتیں،۲رکوع

یسطرون (۱).....للعٰلمین (۵۲)الربع۴/۱۹/۲

۶۹۔الحاقۃ ۲۹ مکی ۵۲آیتیں،۲رکوع

الحاقة (۱).....العظیم (۵۲)۶/۱۵/۲

۷۰۔المعارج ۲۹ مکی ۴۴آیتیں،۲رکوع

واقع (۱).....یوعدون (۴۴)۸/۹/۲

۷۱۔نوح ۲۹ مکی ۲۸آیتیں،۲رکوع

الیم (۱).....تباراً (۲۸)النصف۱۰/۸/۲

۷۲۔الجن ۲۹ مکی ۲۸آیتیں،۲رکوع

عجباً (۱).....عدداً (۲۸)۱۴/۱/۲

۷۳۔المزمل ۲۹ مکی ۲۰آیتیں،۲رکوع

المزمل (۱).....رحیم (۲۰)۱۴/۱/۲

۷۴۔المدثر ۲۹ مکی ۵۶آیتیں،۲رکوع

المدثر (۱).....المغفرة (۵۶)الثلثة ۱۶/۲۵/۲

۷۵۔القیامہ ۲۹ مکی ۴۰آیتیں،۲رکوع

القیامة (۱).....الموتی (۴۰)۱۸/۱۰/۲

۷۶۔الدھر ۲۹ مکی ۳۱آیتیں،۲رکوع

مذکوراً (۱).....أیماً (۳۱)۲۰/۹/۲

۷۷۔المرسلات ۲۹ مکی ۵۰آیتیں،۲رکوع

عرفا (۱).....یؤمنون (۵۰)۲۲/۱۰/۲

۷۸۔النبا ۳۰ مکی ۴۰آیتیں،۲رکوع

یتسألون (۱).....تراباً (۴۰)۲/۱۰/۲

۷۹۔والنازعات ۳۰ مکی ۴۶آیتیں،۲رکوع

غرقاً (۱).....ضحٰها (۴۶)۴/۲۰/۲

۸۰۔عبس ۳۰ مکی ۴۲آیتیں،ارکوع

وتولی (۱).....الفجرة (۴۲)۵/۴۲/۱

۸۱۔التکویر ۳۰ مکی ۲۹آیتیں،ارکوع

کورت (۱).....العٰلمین (۲۹)۶/۲۹/۱

۸۲۔الانفطار ۳۰ مکی ۱۹آیتیں،ارکوع

انفطرت (۱).....للّٰه (۱۹)الربع ۷/۱۹/۱

۸۳۔المطففین ۳۰ مکی ۳۶آیتیں،ارکوع

للمطففین (۱).....یفعلون (۳۶)۸/۳۶/۱

۸۴۔الانشقاق ۳۰ مکی ۲۵آیتیں،ارکوع

الشقت (۱).....ممنون (۲۵)۹/۲۵/۱

۸۵۔البروج ۳۰ مکی ۲۲آیتیں،ارکوع

البروج (۱).....محفوظ (۲۲)۱۰/۲۲/۱

۸۶۔الطارق ۳۰ مکی ۱۷آیتیں،ارکوع

والطارق (۱).....رویداً (۱۷)۱۱/۱۷/۱

۸۷۔الاعلیٰ ۳۰ مکی ۱۹آیتیں،ارکوع

الاعلیٰ (۱).....موسیٰ (۱۹)۱۲/۱۹/۱

۸۸۔الغاشیہ ۳۰ مکی ۲۶آیتیں،ارکوع

الغاشیه (۱).....حسابهم (۲۶)النصف۱۳/۲۶/۱

۸۹۔الفجر ۳۰ مکی ۳۰آیتیں،ارکوع

والفجر (۱).....جنتی (۳۰)۱۴/۳۰/۱

۹۰۔البلد ۳۰ مکی ۲۰آیتیں،ارکوع

البلد (۱).....موصدة (۲۰)۱۵/۲۰/۱

۹۱۔الشّمس ۳۰ مکی ۱۵آیتیں،ارکوع

وضحٰها (۱).....عقبٰها (۱۵)۱۶/۱۵/۱

۹۲۔الیل ۳۰ مکی ۲۱آیتیں،ارکوع

یغشی (۱).....یرضی (۲۱)۱۷/۲۱/۱

۹۳۔الضحیٰ ۳۰ مکی ۱۱آیتیں،ارکوع

والضحیٰ (۱).....فحدث (۱۱)۱۸/۱۱/۱

۹۴۔الم نشرح ۳۰ مکی ۸آیتیں،ارکوع

صدرک (۱).....فارغب (۸)۱۹/۸/۱

۹۵۔التین ۳۰ مکی ۸آیتیں،ارکوع

والزیتون (۱).....الحٰکمین (۸)۲۰/۸/۱

۹۶۔العلق ۳۰ مکی ۱۹آیتیں،ارکوع

خلق (۱).....واقترب (۱۹)السجدہ۲۱/۱۹/۱

۹۷۔القدر ۳۰ مکی ۵آیتیں،ارکوع

القدر (۱).....الفجر (۵)الثلث۲۲/۵/۱

۹۸۔البینۃ ۳۰ مکی ۸آیتیں،ارکوع

البینة (۱).....ربه (۸)۲۳/۸/۱

۹۹۔الزلزال ۳۰ مدنی ۸آیتیں،ارکوع

زلزالها (۱).....یره (۸)۲۴/۸/۱

۱۰۰۔العادیات ۳۰ مکی ۱۱آیتیں،ارکوع

صبحاً (۱).....لخبیر (۱۱)۲۱/۱۱/۱

۱۰۱۔القارعۃ ۳۰ مکی ۱۱آیتیں،ارکوع

القارعة (۱).....حامیة (۱۱)۲۶/۱۱/۱

۱۰۲۔التکاثر ۳۰ مکی ۸آیتیں،ارکوع

التکاثر (۱).....النعیم (۸)۲۷/۸/۱

۱۰۳۔العصر ۳۰ مکی ۳آیتیں،ارکوع

والعصر (۱).....بالصبر (۳)۲۸/۳/۱

۱۰۴۔الہمزہ ۳۰ مکی ۹آیتیں،ارکوع

لمزة (۱).....ممددة (۹)۲۹/۹/۱

۱۰۵۔الفیل ۳۰ مکی ۵آیتیں،ارکوع

الفیل (۱).....ماکول (۵)۳۰/۵/۱

۱۰۶۔قریش ۳۰ مکی ۴آیتیں،ارکوع

قریش (۱).....خوف (۴)۳۱/۴/۱

۱۰۷۔الماعون ۳۰ مکی ۷آیتیں،ارکوع

بالدین (۱).....الماعون (۷)۳۲/۷/۱

۱۰۸۔الکوثر ۳۰ مکی ۳آیتیں،ارکوع

الکوثر (۱).....ألابتر (۳)۳۳/۳/۱

۱۰۹۔الکافرون ۳۰ مکی ۶آیتیں،ارکوع

الکٰفرون (۱).....ولی دین (۶)۳۴/۶/۱

۱۱۰۔النصر ۳۰ مکی ۳آیتیں،ارکوع

والفتح (۱).....تواباً (۳)۳۵/۳/۱

۱۱۱۔اللھب ۳۰ مکی ۵آیتیں،ارکوع

وتب (۱).....مسد (۵)۳۶/۵/۱

۱۱۲۔الاخلاص ۳۰ مکی ۴آیتیں،ارکوع

احد (۱).....احد (۲۰)۳۷/۵/۱

۱۱۳۔الفلق ۳۰ مدنی ۵آیتیں،ارکوع

الفلق (۱).....حسد (۵)۳۸/۵/۱

۱۱۴۔الناس ۳۰ مدنی ۶آیتیں،ارکوع

الناس (۱).....والناس (۶)۳۹/۶/۱

کل آیات: ۶۲۰۸۔ مکی:۴۶۳۹،مدنی:۱۵۶۹

کل رکوع: ۵۶۴۔ مکی:۳۶۶،مدنی:۱۹۸

مدنی سورتیں:

البقرة، آل عمران، النساء، المائدة، الانفال، التوبة، الرعد، الحج، النور، الاحزاب، محمد، الفتح، الحجرات، الرحمن، الحدید، المجادلة، الحشر، الصف، الجمعة، المنٰفقون، التغابن، الطلاق، التحریم، الزلزال، الفلق، الناس = ۲۶

مکی سورتیں:

فاتحة، الانعام، الاعراف، یونس، ھود، یوسف، ابراھیم، الحجر، النحل، بنی اسرائیل، الکھف، مریم، طٰہٰ، الأنبیاء، المؤمن، الفرقان، الشعراء، النمل، القصص، العنکبوت، الروم، لقمان، السجدة، سبا، فاطر، یٰس، الصٰفٰت، صٓ، الزمر، المومن، حٰم السجدة، شوریٰ، الزخرف، الدخان، الجاثیة، الاحقاف، قٓ، الذاریات، الطور، النجم، القمر، الواقعة، الممتحنة، الملک، القلم، الحاقة، المعارج، نوح، الجن، المزمل، المدثر، القیمة، الدھر، المرسلات، النبا، النازعات، عبس، التکویر، الانفطار، المطففین، الانشقاق، البروج، الطارق، الاعلی، الغاشیة، الفجر، البلد، الشمس، اللیل، الضحیٰ، الم نشرح، التین، العلق، القدر، البینة،

العادیات، القارعة، التکاثر، العصر، الهمزة، الفیل، القریش، الماعون، الکوثر، الکٰفرون، النصر، اللهب، الاخلاص . ۸۸.

قرآن عظیم کے رموز واوقاف کے متعلق

قرآن پاک کی تلاوت کے وقت کب ٹھہرنا لازم ہے اور کب نہ ٹھہرا جائے یا ٹھہرا جائے یکساں ہے۔ کہیں ٹھہرنا بہتر ہے اور کہیں نہ ٹھہرنا بہتر ہوتا ہے اور کہیں ٹھہرنا بہتر نہیں۔ ہاں کہیں زیادہ ٹھہرنا کہیں کم ٹھہرنا مناسب ہے اور کہیں یکساں ہوتا ہے۔ چونکہ ٹھہرنے یا نہ ٹھہرنے کو مطلب کی صراحت یا اس کے بیان میں معاون ہے، وہ علامتیں رموز واوقاف کہی جاتی ہیں۔ وہ کیفیت یا حالت اس طرح بیان کی گئی ہے۔

o۔ جہاں بات پوری ہو کر مطلب واضح ہو جاتا ہے، یہ چھوٹا سا دائرہ ہے۔ دراصل یہ گول ت ہے جو کہ ۃ کی طرح لکھی جاتی ہے جسے اصطلاحاً وقف تام کہا گیا ہے۔

م۔ یہ علامت وقف لازم کی ہے، اس پر ضرور ٹھہرنا چاہئے اور نہ ٹھہرنے سے معنی یا مطلب میں فرق آ سکتا ہے۔ بلکہ بعض جگہ نہ ٹھہرنا خلاف مراد واقع ہوتا ہے یہاں تک کہ کفر کا بھی اندیشہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً پڑھو۔ مت کھیلو۔ جس میں پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اور کھیلنے کو منع کیا گیا ہے۔ پڑھو اس لفظ کے بعد ٹھہرنا لازم ہے، اگر نہ ٹھہریں تو 'پڑھو مت کھیلو' ہو جائے گا۔

ط۔ یہ علامت وقف مطلق کی ہے۔ مراد یہ کہ بات تو پوری ہوئی مگر وضاحت نہیں ہو پائی، یعنی ابھی کچھ اور کہنا باقی ہے۔

ج۔ یہ وقف جائز کی علامت ہے جہاں ٹھہرنا بہتر نہ ٹھہرنا جائز ہے

ز۔ یہ تجاوز کا مخفف ہے۔ یہاں نہ ٹھہرنا بہتر ہے۔

ص۔ یہ لاعمت وقف مرخص کی ہے۔ یہاں ملا کر پڑھنا چاہئے لیکن تھک کر ٹھہر جائے تو بہ معنی رخصت کے ہیں۔ ہاں بہ نسبت وقف مجوز کے ملا کر پڑھنا ترجیح رکھتا ہے۔

صلے۔ یہ نشان الوصل اَولیٰ کا خلاصہ ہے۔ یہاں وصل قائم رکھنا یعنی ملا کر پڑھنا افضل ہے۔

ق۔ قیل علیہ الوقف کا اختصار ہے۔ ٹھہرنا مناسب تو ہے مگر نہیں ٹھہرنا چاہئے۔

صل۔ یہ قد یوصل کا خلاصہ ہے۔ کبھی ٹھہرا جاتا ہے اور کبھی نہیں لیکن ٹھہرنا بہتر ہے۔

قف۔ یہ لفظ قف ہے، یعنی ٹھہرنے کا امر ہے۔ مراد یہ کہ جہاں پڑھنے والے کے ملا کر پڑھنے کا احتمال ہو لیکن نہ ٹھہرنے سے معنی میں فرق نہیں پڑتا۔

س۔ یہ سکتہ کی علامت ہے۔ یہاں تھوڑا ٹھہرنا مگر سانس نہیں توڑنا۔ یہ شان اقرب بہ وصل کے معنی کے مترادف ہے۔

وقفہ۔ یہ علامت لمبے سکتہ کی ہے۔ یہاں سکتہ کی بہ نسبت زیادہ ٹھہرنا چاہئے لیکن سانس نہ ٹوٹنے پائے۔ وقفہ اور سکتہ میں یہی فرق ہے کہ یہاں سکتہ کے مقابل زیادہ ٹھہرنا چاہئے۔ لا۔ لا کے معنی نہیں کے ہیں۔ یہ نشان کہیں آیت کے اوپر بنا ہوتا ہے اور کہیں عبارت کے اندر۔ اگر عبارت کے اندر ہے تو قطعاً رکنا مناسب نہیں۔ اور اگر آیت کے اوپر ہے تو بعض کے نزدیک ٹھہرنا مناسب ہے اور بعض کے نزدیک مناسب نہیں لیکن ٹھہرنے یا نہ ٹھہرنے سے مطلب میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔ ٹھہرنا وہاں بہتر ہے جہاں لاعبارت کے اندر ہو۔ کبھی کسی خاص تاکید وتوضیح کے مقصد سے ایک ہی بات تسلسل قائم رکھنے کی خاطر کہی جاتی ہے۔ اس میں دو آیتوں کے درمیان o لا علامت ہوتی ہے وہاں ملا کر پڑھنے سے گویا ایک ہی مسلسل بات کا مطلب نکلتا ہے۔ ک۔ یہ علامت کذالک کی ہے، یعنی آیت سابقہ میں یا جملہ سابقہ میں جو رمز ہو وہی یہاں بھی سمجھا جائے۔

واللہ اعلم بالصواب

☆☆

نقشہ تعداد حروف تہجی

آیات کی تعداد = ۶۶۶۶

کلمات کی تعداد = ۲۶۴۳

حروف کی تعداد = ۳۲۲۶۷۰

الف = ۴۸۹۹۲	ب = ۱۲۲۲۸
ت = ۲۴۰۴	ث = ۳۱۰۵
ج = ۴۲۳۲	ح = ۴۱۲۰
خ = ۲۱۰۵	د = ۵۹۷۲
ذ = ۴۷۳۹	ر = ۱۲۲۴۰
ز = ۳۵۸۰	س = ۵۹۷۰
ش = ۲۱۱۵	ص = ۲۰۰۸۳
ض = ۶۸۲	ط = ۱۳۰۷
ظ = ۷۸۲	ع = ۹۲۷۴
غ = ۹۲۱۱	ف = ۴۴۱۸
ق = ۶۶۱۲	ک = ۱۰۶۲۸
ل = ۳۳۵۲۰	م = ۲۶۵۱۵
ن = ۴۴۱۹۰	و = ۲۵۵۸۹

ہ = ۱۶۰۷۰ ی = ۲۵۹۰۹

پہلی وحی: اقراء بسم ربک الذی خلق (۶۱۰ء) سورہ علق، آیت ۱ تا ۵

آخری وحی: واتقوا یوما ترجعون فیه إلی الله. سورۃ البقرۃ، آیت ۲۸۱

اَلْیَوْمَ أَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الإِسْلاَمَ دِیْناً. (المائدۃ: ۳)

قرآن پاک کی کل مدتِ نزول: تقریباً ۲۲ سال ۵ ماہ

پارے: ۳۰ منزلیں: ۷ سورتیں: ۱۱۴

رکوع: ۵۴۰ کل آیات: ۶۶۶۶

منازل کی تقسیم:

۱۔ سورہ فاتحہ تا سورہ نساء ۲۔ سورہ مائدہ تا سورہ توبہ

۳۔ سورہ یونس تا سورہ نحل ۴۔ سورہ بنی اسرائیل تا سورہ فرقان

۵۔ سورہ شراء تا سورہ یٰسین ۶۔ سورہ الصّٰفّٰت تا سورہ حجرات

۷۔ سورہ قٓ تا سورہ الناس

اقسامِ آیات:

آیاتِ وعدہ:	۱۰۰۰	آیاتِ وعید:	۱۰۰۰
آیاتِ نہی:	۱۰۰۰	آیاتِ امر:	۱۰۰۰
آیاتِ مثال:	۱۰۰۰	آیاتِ قصص:	۱۰۰۰
آیاتِ تحلیل:	۲۵۰	آیاتِ تحریم:	۲۵۰
آیاتِ تسبیح:	۱۰۰	آیاتِ متفرقہ:	۶۶

جملہ: ۶۶۶۶

کل حرکات (اعراب):

۱۔فتحات (زبر): ۵۳۲۲۳ ۲۔کسرات (زیر): ۳۹۵۸۲
۳۔ضمات (پیش): ۸۸۰۴ ۴۔مدات (سہ): ۱۷۷۱
۵۔تشدید (شد): ۱۲۷۴ ۶۔نقاط (نقطے): ۱۰۵۶۸۴

مقاماتِ احتیاط:

قرآن پاک میں ۱۹ مقام ایسے ہیں کہ جہاں اعراب وحرکات (زیر، زبر، پیش) کی تبدیلی سے آیات کے معانی اس حد تک بدل جاتے ہیں کہ نوبت کفر وشرک تک جا پہنچتی ہے۔ان مقامات کا خاص طور پر خیال رکھنا ضروری ہے۔

پارہ	مقام	آیت جس کے غلط پڑھنے سے کفر کے معنی ہوجائیں گے	کیا پڑھ دینے سے کفر کے معنی ہوجائیں گے
الحمد	الفاتحہ	اِیَّاکَ نَعْبُدُ ۴	اِیاک کی ''یا'' کو بلاتشدید پڑھنے سے
الحمد	الفاتحہ	اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۶	انعمت کی تا پر پیش پڑھنے سے
الم	البقرہ	وَاِذ ابتلیٰ اِبْرَاهِیْمَ رَبُّـهٗ	ابراہیم کی میم پر پیش اور ربہ کے با پر اپڑھنے سے
سیقول	البقرہ	وقتل داؤد جالوت	داوٗد کے آخری دال پر زیر اور جالوتَ کے تا پر پیش پڑھنے سے
تلک الرسل	آل عمران	الله لا اله الا هو	اللہ کے پہلے الف پر کھڑا یعنی اُللہ پڑھنے سے
لا یحب الله	النساء	رسلا مبشرین و منذرین	مبشرین اور منذرین کے ش اور ذال پر زبر پڑھ دینے سے

واعلموا	توبہ	ان الله بریء من المشرکین ورسوله	رسولہ کے لام پر کسرہ پڑھنے سے
سبحان الذی	بنی اسرائیل	وما کنا معذبین	معذبین کی ذال پر زبر پڑھنے سے
قال الم	طٰہٰ	وعصیٰ آدم ربه	آدم کی میم پر زبر اور ربہ کے با پر پیش پڑھنے سے
اقترب وقال الذین	الانبیاء الشعراء	انی کنت من الظلمین لتکون من المنذرین	کنت کی تا پر زبر پڑھنے سے منذرین کی ذال پر زبر پڑھنے سے
ومن یقنت	فاطر	انما یخشی الله م باده	لفظ اللہ کے حرف لام پر پیش پڑھنا
ومالی	صٓ	لقد ارسلنا فیهم منذرین	منذرین کی ذال پر زبر پڑھنے سے
حٰم	احقاف	لقد صدق الله ورسوله	اللہ کی ہا پر زبر اور رسولہ کے لام پر پیش پڑھنے سے
قد سمع الله	حشر	الخالق الباری المصور	المصور کے واوٗ پر زبر پڑھنے سے
تبرک الذی	الحاقہ	لا یاکله الا الخاطئون	الخاطئون کی طا پر زبر پڑھنے سے
تبرک الذی	مزمل	فعصیٰ فرعون الرسولَ	فرعون کے نون پر زبر اور الرسول کے لام پر پیش پڑھنے سے

تبرک	مرسلات	ان للمتقين في ظِلاَلٍ	ظلال کی ظا پر زبر پڑھنے سے
الذی		وعیون	
عم	النازعات	انما انت مُنْذِرُ من يخشٰها	منذر کی ذال پر زبر پڑھنے سے

رشد وہدایت

پارہ الم–۱ : (البقرۃ)

۱۔ آخرت پر جو لوگ یقین رکھتے ہیں وہ پورے کامیاب ہیں۔۴
۲۔ مفسدین کے کان حق سننے کے قابل نہ رہے، زبان حق بات کہنے کے لائق نہیں رہی، آنکھیں حق دیکھنے کے قابل نہیں رہیں۔۱۸
۳۔ جن کا مزاج شر فساد کرنا ہے وہ یقیناً پورے خسارے میں پڑھنے والے ہیں۔۲۲
۴۔ حق وناحق میں خدا نے فرق کرنے کو کہا خلط کرنے کو نہیں۔۴۲
۵۔ نماز پڑھو اور مدد لو صبر اور نماز سے، بیشک نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہے ان پر کچھ دشوار نہیں۔۴۵
۶۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے نظائر قدرت تم کو دکھلاتے ہیں کہ تم عقل سے کام کیا کرو۔۷۳
۷۔ نماز کی پابندی کرنا اور زکوٰۃ ادا کرتے رہنا اوّل فریضہ ہے۔۸۳
۸۔ باہم خون ریزی مت کرو اور ایک دوسرے کو ترک وطن پر مجبور مت کرو۔۸۴
۹۔ والدین کی خدمت قرابت داری کا خیال، بے ماں باپ کے بچوں، غریب محتاجوں اور تمام کمزور لوگوں کا خیال رکھنا۔۸۳
۱۰۔ جنھوں نے دنیا کو ہی سب کچھ سمجھ لیا ہے وہ دین پر دنیا کو فوقیت دیتے ہیں۔۸۶
۱۱۔ کفر کرنے والوں کی سخت ذلت بھی اور عذاب بھی، قہر خدا کے مستحق بھی۔۹۰
۱۲۔ زمین وآسمان کی ہر شئے اللہ کی ملکیت ہے اور حق تعالیٰ ہر شئے پر قادر ہے۔۱۰۶

۱۳۔ حق تعالیٰ کے سوا کوئی یار ومددگار نہیں۔۱۰۷
۱۴۔ پابندی سے نمازیں پڑھو، زکوٰۃ ادا کرو اور فلاح اور نیکی پر روبہ عمل رہو۔۱۱۰
۱۵۔ ظالموں کو دنیا میں بھی رسوائی ملے گی اور آخرت میں بھی سزا ملے گی۔۱۱۴
۱۶۔ گھر کو ہمیشہ پاک صاف رکو، عبادت کے واسطے، رکوع وسجدہ کے لیے یعنی مقام عبادت وریاضت کی پاکی ضروری ہے۔۱۲۵
۱۷۔ ملت ابراہیمی سے وہی روگردانی کرے گا جو اپنی ذات ہی سے احمق ہو۔۱۳۰
۱۸۔ بہ وقت آخر حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹوں سے فرمایا سو تم بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا۔۱۳۲

سیقول–۲ :

۱۹۔ صبر اور نماز سے سہارا لو۔۱۵۳
۲۰۔ جس نے اللہ کی راہ میں جان دی وہ مردہ نہیں زندہ ہے۔۱۵۳
۲۱۔ جو چیزیں حلال قرار دی گئیں ان چیزوں کو ہی بطور غذا استعمال کرو اور شیطان کے قدم بہ قدم مت چلو وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔۱۶۸
۲۲۔ دنیا پرست یقینی طور پر اپنے شکم میں آگ بھر رہے ہیں۔۱۷۳
۲۳۔ کتنوں نے ہدایت چھوڑ کر ضلالت اختیار کی۔۱۷۵
۲۴۔ سچے متقی وہی لوگ ہیں جو اطاعت گزار ہیں، اللہ کے رسول سے محبت کرتے ہیں، قرابت داروں سے، یتیموں سے محتاجوں سے، غریبوں سے، نیک لوگوں سے محبت کرتے ہیں اور وعدہ کر کے وعدہ پورا کرتے ہیں۔ قول وفعل میں تضاد بدترین گناہ ہی نہیں ناقابل معافی جرم ہے۔۱۷۷
۲۵۔ روزہ رکھو اور متقی بن جاوٴ۔۱۸۳

۲۶۔ اللہ تعالیٰ قانونِ شرعی سے باہر جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔۱۹۰
۲۷۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، تم سب کو خدا ہی کے پاس جمع ہونا ہے۔۲۰۳
۲۸۔ فاسد خیالات سے بچو، شیطان کے قدم بہ قدم مت چلو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔۲۰۸
۲۹۔ اللہ جس کو چاہتا ہے صحیح راستہ دکھا دیتا ہے۔۲۱۳
۳۰۔ تمہارے مال پر صرف تمہارا حق نہیں ماں باپ کا بھی ہے۔قرابت داروں کا، یتیموں کا محتاجوں کا اور مسافروں کا بھی ہے۔۲۱۵
۳۱۔ فتنہ برپا کرنا قتل کرنے سے بڑھ کر ہے۔۲۱۶

تلک الرسول—۳:

۳۲۔ اللہ نے جو نعمت دی ہے اس کو حد شرع میں رہ کر خرچ کرو اس سے پہلے کہ قیامت آپہنچے۔اس وقت نہ تو خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی۔۲۵۴
۳۳۔ بیجا روش اختیار کرنے والوں کو کوئی ہدایت نہیں۔۲۵۸
۳۴۔احسان جتلا کر یا ایذا پہنچا کر اپنی خیرات یا نیکی برباد مت کرو۔۲۶۴
۳۵۔ اپنے مال و اسباب میں سے ضرورت مندوں کو ان کی احتاج کی بموجب دیا کرو وہی چیز جو تمہیں عزیز ہو، ناکارہ جو تمہارے کام کی نہیں اسے دے کر کوئی نیکی تم سے منسوب نہیں ہوگی۔۲۶۷
۳۶۔اور یہ شیطان ہر شخص کو محتاجگی سے ڈراتا ہے کہ مال اپنا مت خرچ کرو جمع رکھو، یعنی شیطان تم کو نیک کام سے باز رکھتا ہے۔۲۶۸ (آل عمران)
۳۷۔ بعض مفسدین قرآن سے اپنے بچاؤ کا حوالہ ڈھونڈتے ہیں اور غلط معنی لگاتے ہیں حالانکہ ان کا مطلب بجز حق تعالیٰ کے کوئی اور نہیں جانتا۔۷
۳۸۔ جو لوگ علم دین میں پختہ کار اور فہیم ہیں وہ احکام الٰہی پر یقین رکھتے ہیں اور نصیحت وہی

قبول کرتے ہیں جو بافہم اور عاقل ہیں۔۷
۳۹۔ دنیاوی چیزوں سے رغبت رکھنے والوں کو یہ اشیاء بہت حسین اور خوبصورت لگتی ہیں، چنانچہ وہ ان کے حصول کے لیے ہر جتن کرتے ہیں، مثلاً مال و دولت، مویشی، سونا چاندی وغیرہ، حالانکہ یہ کم فہم نہیں جانتے ان کو کوئی بقا نہیں۔ یہ صرف دنیوی زندگی میں استعمال کی چیزیں ہیں۔۱۴
۴۰۔ اللہ جسے چاہے غالب کردے اور جسے چاہے پست کردے۔۲۶
۴۱۔ اور سب کو خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔۲۸
۴۲۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے جو آسمان میں ہے اور زمین میں ہے اور اسے ہر چیز پر قدرت کاملہ حاصل ہے۔۲۹
۴۳۔اللہ جسے چاہتا ہے بے استحقاق رزق عطا فرما دیتا ہے۔۳۶
۴۴۔ اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔۵۸
۴۵۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے فساد کرنے والوں کو۔۶۳
۴۶۔ اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں۔۶۴
۴۷۔ اللہ بے ڈھنگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔۶۸

لن تنالوا—۴:

۴۸۔ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرو بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا۔۱۰۲
۴۹۔ تم سب باہم متفق رہو اور نااتفاقی مت کرو۔۱۰۳
۵۰۔ سب مومن آپس میں بھائی بھائی (فرق مت کرو)۔۱۰۳
۵۱۔ تم سب خیر کی تلقین کرو۔۱۰۴
۵۲۔ ان لوگوں سے قطع تعلق کرو جو نفاق پیدا کرتے ہیں۔۱۰۵

۵۳۔ وہ لوگ جو نیکی اور خیر کا راستہ دکھاتے ہیں غلط کو غلط صحیح کو صحیح کہتے ہیں، نیک کاموں کی طرف بلاتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں۔۱۱۰

۵۴۔ اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے اور رحمت کرنے والے ہیں۔ اے ایمان والو! سود مت کھاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔۱۳۱

۵۵۔ اور تم ہمت نہ ہارو اور رنج مت کرو، غالب تم ہی رہو گے اگر تم پورے مومن رہے۔۱۳۹

۵۶۔ اللہ کے احکاموں کی تکذیب کرنے والوں کا انجام ہمیشہ خراب ہوا ہے۔۱۳۶

۵۷۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کو کبھی پسند نہیں کرتا۔۱۴۰

۵۸۔ جو لوگ دنیا کے طلب گار ہیں انھیں دنیا مل جاتی ہے اور جو آخرت کے طالب ہیں انھیں آخرت کی خوشی ملتی ہے۔۱۴۸

۵۹۔ خیانت خدا کے نزدیک سخت ناپسندیدہ عمل ہے۔۱۶۱

۶۰۔ جنھیں اللہ کی راہ میں موت ملی وہ مردہ نہیں زندہ ہیں۔۱۶۹

۶۱۔ اللہ کا حکم ہے شیطان سے مت ڈرو مجھ سے ڈرو۔۱۷۵

۶۲۔ دنیاوی زندگی کی کچھ حقیقت نہیں صرف دھوکے کا سودا ہے۔۱۸۵

۶۳۔ جو لوگ اپنے کردارِ بد پر خوش ہوتے ہیں، نیکی سے کیا غرض لیکن نیک کام نہ کرنے پر بھی اپنی تعریف چاہتے ہیں۔۱۸۸

۶۴۔ اللہ ہی کے لیے ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی اور اللہ ہی ان پر قادر ہے۔۱۸۹

۶۵۔ بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں دلائل ہیں اہل عقل کے لیے، جو ہر وقت ہر لمحہ اللہ کو یاد کرتے ہیں۔۱۹۱

۶۶۔ اے ایمان والو! خود صبر کرو اور مقابلہ میں صبر کرو اور مقابلہ کے لیے مستعد رہو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تا کہ تم پورے کامیاب ہو۔۲۰۰

(سورۃ النساء)

۶۷۔ بلاشبہ جو لوگ یتیموں کا مال بلا استحقاق کھاتے ہیں اور کچھ نہیں اپنے شکم میں آگ بھر رہے ہیں۔۱۰

والمحصنت—۵:

۶۸۔ والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو، اہل قرابت کے ساتھ بھی، یتیموں کے ساتھ اور غریب وغربا کے ساتھ بھی اور پاس والے پڑوسی کے ساتھ اور دور والے پڑوسی کے ساتھ اور ہم مجلس کے ساتھ بھی اور راہ گیر کے ساتھ بھی اور ان کے ساتھ بھی جو تمہارے مالکانہ قبضہ میں ہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے محبت نہیں رکھتے جو خود کو بڑا سمجھتے ہیں اور شیخی کی باتیں کرتے ہیں، بخل کرتے ہوں، ایسے ناسپاسوں کے لیے اہانت آمیز سزا مقرر ہے۔۳۲

۶۹۔ اور جو لوگ اپنے مال و جاہ کی نمائش کریں اور اللہ تعالیٰ پر آخری دن پر جو اعتقاد نہ رکھے ان کا مصاحب شیطان ہے۔۳۸

۷۰۔ ایک دوسرے کے مال و دولت پر ناحق حق مت جتاؤ اور نہ اسے استعمال کرو۔۲۹

۷۱۔ تجارت باہمی رضامندی سے کی جائے۔۲۹

۷۲۔ اللہ کی عبادت میں کسی اور کو شریک مت کرو۔۳۵

۷۳۔ ناپاکی کسی طرح کی ہو غسل واجب ہے۔۴۳

۷۴۔ جب لوگوں کا تصفیہ کیا کرو تو عدل سے تصفیہ کیا کرو۔۵۹

۷۵۔ وہ لوگ مفسد یا کافر ہیں جو شیطان کی طرف داری میں لڑتے ہیں، ان شیطانوں سے جہاد کرو۔ واقعہ یہ کہ ہر شیطانی تدبیر لچر ہوتی ہے۔۷۶

۷۶۔ ہر دوسرے کا ہاتھ تھامو، نماز کی پابندی کرو، زکوٰۃ دیتے رہو۔۷۷

۷۷۔ دنیا کا تمتع محض چند روزہ ہے اور آخرت ہر طرح سے بہتر ہے۔۷۷

۷۸۔ موت برحق ہے تم چاہے کہیں بھی ہو موت آئے گی اور دبا دے گی۔۷۸

۷۹۔ جس شخص نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔۷۹

۸۰۔ جو کوئی خوش حالی پیش آتی ہے وہ جانب اللہ ہے لیکن جو کوئی بدحالی پیش آئے وہ سب خود کا ہے یعنی اپنا خود کا ہے۔۷۹

۸۱۔ اور جب تم کو کوئی (مشروع طور پر) سلام کرے تم اس سے اچھے الفاظ میں سلام کرو۔۸۵

۸۲۔ کسی مومن کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے۔۹۲

۸۳۔ اور جو شخص کسی مسلمان کو قصداً قتل کر ڈالے تو اس کی سزا جہنم ہے۔۹۳

۸۴۔ سفر کرو تو اللہ کی راہ میں سفر کرو۔۹۴

۸۵۔ یقیناً نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے۔۱۰۳

۸۶۔ اللہ کی راہ میں ہجرت کرنا مستحسن ہے۔۱۰۰

۸۷۔ اللہ کی یاد میں سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے مصروف رہو۔۱۰۳

۸۸۔ شیطان کی اطاعت گزاری کو معافی نہیں۔۱۱۷

۸۹۔ جس نے اللہ کو چھوڑ کر شیطان کی اطاعت کی وہ صریحی نقصان میں ہے۔۱۱۹

۹۰۔ شیطان صرف جھوٹے وعدے کرتا ہے اس کے وعدہ پر عامل شخص کا ٹھکانہ جہنم ہے۔۱۲۰

۹۱۔ زمین و آسمان ہر چیز خدا کی ملکیت ہے۔۱۲۶

۹۲۔ خواہش نفس کا اتباع مت کرو، حق سے منحرف مت ہو اور نہ کج بیانی اختیار کرو۔۱۳۵

۹۳۔ منافقوں اور کافروں کا انجام یکساں ہوگا۔۱۴۰

۹۴۔ منافقوں کو جہنم کے سب سے نچلے حصہ میں جگہ ملے گی۔۱۴۵

لایحب اللہ—۶

۹۵۔ تم اپنے دین میں حد سے مت نکلو اور خدا تعالیٰ کی شان میں غلط بات مت کہو۔۱۷۱

(المائدۃ)

۹۶۔ اے ایمان والو! بے حرمتی نہ کرو۔ خدا تعالیٰ کی نشانیوں کی اور نہ حرمت والے مہینہ کی اور نہ (حرم میں) قربانی ہونے والے جانور کی اور نہ ان جانوروں کی جن کے گلے میں پٹے پڑے ہوئے ہوں۔۲

۹۷۔ عدل کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو۔۸

۹۸۔ جو شخص کسی شخص کو قتل کر ڈالے تو گویا اسی نے تمام آدمیوں کو قتل کر ڈالا اور جو شخص کسی نیک شخص کو بچا لیوے اس نے گویا تمام آدمیوں کو بچا لیا۔۳۲

۹۹۔ جو لوگ ملک میں فساد پھیلاتے پھرتے ہیں ان کی یہی سزا ہے کہ قتل کئے جاویں یا سولی دیے جاویں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف جانب سے کاٹ دیے جائیں یا زمین پر سے نکال دیے جائیں۔۳۳

۱۰۰۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اسی کا قرب ڈھونڈھو اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا کرو۔۳۶

۱۰۱۔ اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔۴۶

۱۰۲۔ دنیا میں ناحق کا غلومت کرو اور ان لوگوں کے حالات پر مت چلو جو پہلے خود بھی غلطی میں پڑ چکے ہیں اور بہتوں کو غلطی پر ڈال چکے ہیں۔۷۷

وإذا سمعوا—۷

۱۰۳۔ اللہ تعالیٰ نے جو پاک ولذیذ چیزیں تمہارے واسطے حلال کی ہیں انھیں حرام مت کرو اور حدود سے آگے مت نکلو۔ اللہ حد سے آگے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔۸۸

۱۰۴۔ شیطان یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ آپس میں عداوت اور بغض پیدا (واقع) کرے اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے تم کو باز رکھے۔۹۱

۱۰۵۔ اے ایمان والو! اپنی فکر کرو۔۱۰۵

۱۰۶۔اللہ تعالیٰ فاسقوں کی رہنمائی نہیں کرتا۔۱۰۸

۱۰۷۔اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی اور ان چیزوں کی جو ان میں موجود ہیں۔۱۲۰

(سورۃ الانعام)

۱۰۸۔جنھوں نے سچی کتاب کو جھٹلایا ہم ایسی جماعتوں کو ہلاک کر چکے ہیں۔ہم نے ان پر خوب بارشیں برسائیں اور نیچے سے نہریں جاری کیں، پھر ہم نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب ہلاک کر ڈالا اور اس کے بعد دوسری جماعتوں کو پیدا کیا۔۶

۱۰۹۔ذرا زمین پر چلو پھرو، پھر دیکھو کہ تکذیب کرنے والوں کا کیسا انجام ہوا۔۱۱

۱۱۰۔ اور یہ لوگ اپنے ہی کو تباہ کر رہے ہیں اور کچھ خبر نہیں رکھتے۔۲۶

۱۱۱۔ اور دنیوی زندگی تو کچھ بھی نہیں بہ جز لہو ولعب کے۔۳۲

۱۱۲۔ اس نے رات کو راحت کی چیز بنائی ہے۔سورج اور چاند کی رفتار کا حساب رکھا ہے۔۹۶

۱۱۳۔اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہوسکتی اور وہ سب نگاہوں کو محیط ہوجاتا ہے اور وہی بڑا باریک بیں باخبر ہے۔۱۰۳

ولو أننا—۸:

۱۱۴۔ اکثر لوگوں کی باتیں بے راہ روی کی ہیں وہ بالکل قیاسی باتیں کرتے ہیں۔۱۱۷

۱۱۵۔ حق تلفی کرنے والوں کی کبھی فلاح نہ ہوگی۔۱۳۶

۱۱۶۔ شیطان کے قدم بہ قدم مت چلو وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔۱۴۳

۱۱۷۔ ماں باپ کے ساتھ احسان کیا کرو اور اپنی اولاد کو افلاس کے سبب قتل مت کیا کرو اور ہم تم کو اور اس کو رزق دیں گے۔ بے حیائی کے قریب مت جاؤ وہ علانیہ ہوں یا پوشیدہ۔۱۵۲

۱۱۸۔ ناپ تول پوری کیا کرو انصاف کے ساتھ۔جب تم بات کیا کرو تو انصاف رکھا کرو اللہ سے کیا عہد پورا کیا کرو۔۱۵۳

۱۱۹۔ جن لوگوں نے دین میں تفرقہ پیدا کیا، گروہ بنائے، یہ معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔۱۶۰

(سورۃ الاعراف)

۱۲۰۔ اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین پر فساد مت پھیلاؤ۔۷۳

قال الملأ-۹

۱۲۱۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی اَن دیکھی یا بے حرمتی کرنے والوں کے کارخانے اور اونچی اونچی عمارتیں درہم برہم کردی گئیں۔۱۳۷

۱۲۲۔تمام آسمانوں اور زمین میں اس (اللہ تعالیٰ) کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔۱۵۸

۱۲۳۔اور جن کی آنکھیں ایسی ہیں جن سے نہیں دیکھتے اور جن کے کان ایسے ہیں جن سے نہیں سنتے، یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بے راہ ہیں غافل ہیں۔۱۷۹

۱۲۴۔اور جب قرآن پڑھا جایا کرے تو اس کی طرف کان لگایا کرو اور خاموش رہا کرو، امید ہے کہ تم پر رحمت ہو۔۲۰۳

(سورۃ الانفال)

۱۲۵۔ تم اللہ سے ڈرو، باہمی تعلقات کی اصلاح بھی کرو، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اگر تم ایمان والے ہو۔۱

۱۲۶۔جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے اللہ اس کو ضرور سزا دیتا ہے۔ یہ جان رکھو کہ کافروں کے لیے جہنم کا عذاب مقرر ہے۔۱۳

۱۲۷۔یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارا رفیق ہے اور بہت اچھا مددگار ہے۔۴۰

واعلموا–۱۰: (التوبة)

۱۲۸۔ دنیوی زندگی کا تمتع آخرت کے مقابلے میں بہت قلیل ہے۔۳۸

۱۲۹۔ اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو۔۴۱

۱۳۰۔صدقات کا تو صرف حق غریبوں کا اور محتاجوں کا ہے۔۶۰

۱۳۱۔ مسلمان مرد اور عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دینی رفیق ہیں۔ نیک باتوں کی تعلیم دیتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں، نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں۔۷۱

یعتذرون–۱۱:

۱۳۲۔اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور عمل میں صرف بچوں کے ساتھ رہو۔۱۲۰

۱۳۳۔اللہ تعالیٰ کی امداد صرف متقی لوگوں کے ساتھ ہے۔۱۲۳

(یونس)

۱۳۴۔ بلاشبہ رات اور دن یکے بعد دیگرے آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے ان سب میں توحید کے دلائل ہیں۔۶

۱۳۵۔ جب ہم اس کی وہ تکلیف اس سے ہٹا دیتے ہیں اور اپنی پہلی حالت پر آجاتا ہے، گویا جو تکلیف اس کو پہنچی اس کے ہٹانے کے لیے کبھی ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔۱۲

۱۳۶۔جن لوگوں نے یہ کام کئے ان کی بدی کی سزا اس کے برابر ملے گی۔ ان کو اللہ کے عذاب سے کوئی نہ بچا سکے گا۔ ان کے چہروں کی کدورت ایسی ہوگی جیسے کہ ان کے چہروں پر اندھیری رات کے پرت کے پرت لپیٹ دیے گئے ہیں۔۲۷

۱۳۷۔ظالموں یعنی مشرکوں سے کہا جاوے گا کہ ہمیشہ کا عذاب چکھو۔۵۳

وما من دآبة–۱۲:(ھود)

۱۳۸۔ جو لوگ مستقل مزاج ہیں اور نیک کام کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے بڑی مغفرت اور بڑا اجر ہے۔۱۱

۱۳۹۔ جو ظالم اور ضدی تھے اور اس دنیا میں لعنت ان کے ساتھ رہی اور قیامت کے دن بھی۔۶۰

۱۴۰۔ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔۱۱۵

وما أبرىء–۱۳

۱۴۱۔ آخرت کا اجر کہیں زیادہ بڑھ کر ہے ایمان اور تقویٰ والوں کے لیے۔۵۷

۱۴۲۔واقعی جو شخص گناہوں سے بچتا ہے اور صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتا۔۹۱

۱۴۳۔ یہ قرآن تمام جہان والوں کے لیے نصیحت ہے۔۱۰۳

(الرعد)

۱۴۴۔ ہر شئے اللہ کے نزدیک ایک خاص انداز سے مقرر ہے۔۸

۱۴۵۔کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہوسکتا ہے یا کہیں تاریکی اور روشنی برابر ہوسکتی ہے، اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہی واحد ہے غالب ہے۔۱۶

۱۴۶۔نصیحت تو سمجھ دار ہی لوگ قبول کرتے ہیں۔۱۹

۱۴۷۔سمجھ دار لوگوں نے اللہ سے جو عہد کیا اسے پورا کرتے ہیں، رب سے ڈرتے ہیں، عذاب کا اندیشہ رکھتے ہیں، نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور بدسلوکی کو حسن سلوک سے ٹال دیتے ہیں۔۲۲

۱۴۸۔جس کو خدا تعالیٰ گمراہی میں رکھے اس کو کوئی راہ پر لانے والا نہیں۔۳۳

۱۴۹۔ان کیلئے دنیوی زندگی میں بھی عذاب ہےاورآخرت کاعذاب اس سے زیادہ سخت ہے۔۳۴

۱۵۰۔اللہ تعالیٰ سے (تو) کوئی چیز بھی مخفی نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں۔۳۸

ربما-۱۴:(الحجر)

۱۵۱۔اورہم نے آسمانوں کواورزمین کواوران کی درمیانی چیزوں کوبغیر مصلحت کے پیدانہیں کیا۔۸۵

(النحل)

۱۵۲۔اللہ تعالیٰ پوشیدا ورظاراحوال سب جانتا ہے۔۲۰

۱۵۳۔اللہ کی نعمتوں کو گننے لگوتو نہ گن سکو۔۱۹

۱۵۴۔اللہ تعالیٰ کوتمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے۔۲۸

۱۵۵۔تکبرکرنے والوں کابراٹھکانہ ہے۔۲۹

۱۵۶۔جتنی چیزیں چلنے والی آسمانوں اورزمین میں موجود ہیں اور(بالخصوص) فرشتے تکبر نہیں کرتے۔۳۹

۱۵۷۔تم کوکان دیئےاورآنکھ اوردل، تاکہ تم شکرکرو۔۷۸

۱۵۸۔اللہ تعالیٰ ایسےلوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو پرہیزگاراورنیک کردارہوتے ہیں۔۱۲۸

سبحان الذی-۱۵:(بنی اسرائیل)

۱۵۹۔جولوگ آخرت پرایمان نہیں رکھتے ان کے لیے دردناک سزاتیارکررکھی ہے۔۱۰

۱۶۰۔اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کی خطامعاف کردیتا ہے۔۲۵

۱۶۱۔بہ حکم الٰہی قرابت دارکومحتاج اورمسافرکوحق دیتے رہنااورمال کوبےموقع مت اڑانا۔۲۷

۱۶۲۔اپنی اولادکوناداری کے اندیشہ سےقتل مت کرو۔۳۱

۱۶۳۔شیطان سخت کلامی کراکےلوگوں میں فساد ڈلوادیتا ہے۔واقعی شیطان انسان کاصریح

دشمن ہے۔۵۳

۱۶۴۔آفتاب ڈھلنے کے بعد سے رات کے اندھیرے ہونے تک نمازیں اداکریں اورصبح کی نماز بھی۔بےشک صبح کی نماز(فرشتوں کے)حاضرہونے کاوقت ہے۔۲۹

قال الم-۱۶:(مریم)

۱۶۵۔جنھوں نے نماز کو برباد کیا اورنفسانی خواہشوں کی پیروی کی، سو یہ لوگ عنقریب آخرت میں خرابی دیکھیں گے۔۶۰

(طٰہٰ)

۱۶۶۔اس زمین پر چلنے کے واسطےراستے بنائے اورآسمان سے پانی برسایااوراسی پانی کے ذریعہ نباتات پیدا کئے۔۵۳

۱۶۷۔آفتاب نکلنے سے پہلے (مثلاً نماز فجر) اوراس کے غروب سے پہلے (نماز ظہراور عصر)اوراوقات شب میں(بھی)تسبیح کیا کیجئے(مثلاً نمازمغرب وعشاء)۔۱۳۱

اقترب للناس-۱۷:(الأنبياء)

۱۶۸۔زمین وآسمان کی ہر شئے شب وروز بغیرکسی وقفہ کے تسبیح کرتے،عبادت کرتے کبھی تھکتے نہیں۔۲۰

۱۶۹۔ہرجاندارموت کاذائقہ چکھےگااورخداہرحال میں آزماتا ہے۔۳۵

(الحج)

۱۷۰۔نماز کی پابندی کے ساتھ زکوٰۃ اداکرتے رہو، وہی تمہاراکارساز ہے، مددگار ہے، ہر کسی کی مخالفت ضائع ہوجائے گی۔۷۸

قد أفلح-۱۸:(المؤمنين)

۱۷۱۔اے میرے رب! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں شیطان کے وسوسوں سے۔۹۷

(النور)

۱۷۲۔اللہ جو چاہتا ہے بناتا ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

۱۷۳۔اللہ تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے۔۵۴

وقال الذین-۱۹:(الفرقان)

۱۷۴۔جو شخص (معصیت سے) توبہ کرتا ہے اور نیک کام کرتا ہے تو وہ عذاب سے بچا رہے گا۔۷۱

(الشعراء)

۱۷۵۔جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھ کو شفا دیتا ہے۔۸۰

۱۷۶۔کیا تم ہر اونچے مقام پر ایک یادگار (کے طور پر عمارت) بناتے ہو جس کو محض فضول (بلاضرورت) بناتے ہو اور بڑے بڑے محل بناتے ہو جیسے دنیا میں تم کو ہمیشہ رہنا ہے۔۱۳۰

۱۷۷۔تم پہاڑوں کو تراش تراش کر اتراتے (اور فخر کرتے) ہوئے مکان بناتے ہو، سو اللہ سے ڈرو (حضرت صالح علیہ السلام) اور میرا کہنا مانو ان کا کہنا مت مانو جو سرزمین پر فساد کیا کرتے ہیں اور کبھی اصلاح کی بات نہیں کرتے۔۱۵۲

۱۷۸۔حضرت شعیبؑ نے فرمایا: کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتے، میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، سو تم اللہ سے ڈرو میرا کہنا مانو۔تم لوگ پورا ناپا کرو اور صاحب حق کا نقصان مت کیا کرو، زمین پر فساد مت مچایا کرو۔۱۸۳

(النمل)

۱۷۹۔اس میں ۹۳ آیتیں اور ۷ رکوع ہیں۔یہ آیت ایمان والوں کے لیے موجب ہدایت اور مژدہ سنانے والی ہیں جو مسلمان نماز کی پابندی کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر پورا یقین رکھتے ہیں۔۳

امن خلق-۲۰:

۱۸۰۔آسمان اور زمین میں ایسی کوئی مخفی چیز نہیں جو لوح محفوظ میں نہ ہو۔۷۵

(القصص)

۱۸۱۔اور جو کچھ تم کو دیا دلایا گیا ہے وہ محض (چند روزہ) دنیوی زندگی کے برتنے کے لئے ہے اور یہیں کی زیب وزینت ہے۔۶۰

۱۸۲۔آپ کا رب سب چیزوں کی خبر رکھتا ہے جو ان کے دلوں میں پوشیدہ رہتا ہے۔۶۹

۱۸۳۔رات میں آرام کرو، دن میں روزی تلاش کرو، اللہ کا شکر ادا کرو۔۷۳

۱۸۴۔دنیا میں فساد کا خواہاں مت ہو، اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔۷۷

۱۸۵۔جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتا ہے اور نہ فساد کرنا، نیک نتیجہ متقی لوگوں کو ملتا ہے۔۸۳

(العنکبوت)

۱۸۶۔جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں انھیں ان کے اچھے اعمال کا اچھا بدلہ ملے گا، بہ حکم الٰہی۔۷

۱۸۷۔اللہ نے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔۸

۱۸۸۔رزق خدا کے پاس سے تلاش کرو، اس کی عبادت کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔۱۷

۱۸۹۔اللہ ہر چیز پر قادر ہے جس کو چاہے گا عذاب دے گا اور جس پر چاہے گا رحمت فرمائے گا۔۲۱

۱۹۰۔سوا اللہ کے نہ تمہارا کوئی کارساز ہے اور نہ کوئی مددگار۔۲۲

۱۹۱۔ اللہ کی عبادت کرو اور قیامت سے ڈرو، زمین پر فساد مت پھیلاؤ۔۳۶

۱۹۲۔اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو مناسب طور پر بنایا ہے، ایمان والوں کے لیے اس میں بڑی دلیل ہے۔۴۴

اُتل ما أوحی -۲۱:

۱۹۳۔ بے شک نماز بے حیائی اور شائستہ کاموں سے روکتی ہے۔ اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے۔۴۵

(الروم)

۱۹۴۔ یہ لوگ صرف دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں، آخرت سے بے خبر ہیں۔۷

۱۹۵۔ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں، سب اور سب اسی کے تابع ہیں۔۲۷

۱۹۶۔ خدا کی طرف رجوع ہو کر فطرت الٰہیہ کا اتباع کرو اور اس سے ڈرو، نماز کی پابندی کرو اور شرک کرنے والوں میں سے مت رہو۔۳۲

۱۹۷۔ قرابت دار کو اس کا حق دیا کرو اور مسکین اور مسافر کو بھی، جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں وہی فلاح پانے والے ہیں۔۳۸

(لقمان)

۱۹۸۔ جو نماز کی پابندی کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، آخرت کا پورا یقین رکھتے ہیں، فلاح پانے والے ہیں۔۵

۱۹۹۔ اس دن سے ڈرو جس میں نہ کوئی باپ بیٹے کی طرف کچھ مطالبہ ادا کر سکے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی باپ کی طرف سے مطالبہ ادا کرے گا، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے سو تم کو دنیوی زندگی دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ دھوکہ باز شیطان۔۳۴

ومن یقنت -۲۲: (الأحزاب)

۲۰۰۔ تم اللہ کو خوب کثرت سے یاد کرو اور صبح شام اس کی تسبیح کرتے رہو، وہ ایسا رحیم ہے، وہ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے رہتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ تم کو تاریکیوں سے نور کی طرف لے آوے۔ اللہ تعالیٰ مومنین پر بہت مہربان ہے۔۴۴

۲۰۱۔ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور راستی کی بات کہو۔۷۰

(فاطر)

۲۰۲۔ اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہو سکتے، نہ تاریکی اور روشنی، نہ چھاؤں اور نہ دھوپ، نہ زندہ اور مردے۔۲۲

ومالی -۲۳: (یٰسٓ)

۲۰۳۔ نہ آفتاب کی مجال ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے اور دونوں ایک ایک دوسرے میں تیر رہے ہیں۔۴۰

فمن أظلم -۲۴: (الزمر)

۲۰۴۔ اللہ جس کو چاہتا ہے زیادہ رزق دیتا ہے اور وہی تنگی بھی کر دیتا ہے۔۵۲

۲۰۵۔ جو لوگ اللہ کی آیتوں کو نہیں مانتے وہ بڑے خسارے میں رہیں گے۔۶۳

(المؤمن)

۲۰۶۔ گناہ کو بخشنے والا ہے، توبہ کو قبول کرنے والا ہے، سخت سزا دینے والا ہے، قدرت والا اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، اس کے پاس سب کو جانا ہے۔۳

۲۰۷۔ اللہ کی پناہ مانگتے رہیے، بیشک وہی ہے سب کچھ سننے والا سب کچھ دیکھنے والا۔۵۶

۲۰۸۔ تمام خوبیاں اسی اللہ کے لیے ہیں جو پروردگار ہے تمام جہان کا۔۶۵

(حٰمٓ السجدہ)

۲۰۹۔ جس نے زمین کو باوجود اتنی وسعت کے دو روز میں پیدا کر دیا۔۹

۲۱۰۔ آپ کا رب بڑی مغفرت والا اور دردناک سزا دینے والا ہے۔۴۳

۲۱۱۔ قرآن پاک ایمان والوں کے لیے تو راہ نما اور شفا ہے اور جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں ڈاٹ ہے۔۴۴

الیہ یُردُّ -۲۵:

۲۱۲۔اللہ جب آدمی کو نعمت عطا کرتا ہے تو اس کے احکام سے منہ موڑ لیتا ہے اور کروٹ پھیر لیتا ہے اور جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو خوب لمبی چوڑی دعائیں کرتا ہے۔ (دعائیں مانگتا ہے رفع تکلیف کے لیے)۔۵۱

۲۱۳۔یادرکھو کہ وہ ہر چیز کو احاطہ (اپنے علم میں) کیے ہوئے ہے۔۵۴

(الشوریٰ)

۲۱۴۔وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے اور ان ظالموں کا (قیامت کے روز) کوئی حامی مددگار نہیں۔۸

۲۱۵۔اللہ ہی کارساز ہے وہی مردوں کو زندہ کرے گا اور وہی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔۹

۲۱۶۔جو شخص (خدا کی طرف) رجوع کرے اس کو اپنے تک رسائی دے دیتا ہے۔۱۳

۲۱۷۔جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو ہم اس کو اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے۔۲۰

۲۱۸۔اور جو شخص کوئی نیکی کرے گا ہم اس میں اور زیادہ کر دیں گے۔ بیشک اللہ بڑا بخشنے والا بڑا قدر دان ہے۔۲۳

۲۱۹۔ اللہ تعالیٰ باطل کو مٹایا کرتا ہے اور حق کو اپنے احکام سے ثابت کیا کرتا ہے۔ وہ دلوں کی باتیں جانتا ہے اور وہ ایسا رحیم ہے کہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور وہ تمام گناہ (گزشتہ) معاف فرما دیتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ اس (سب) کو جانتا ہے۔۲۵

۲۲۰۔اور خدا کے سوا تمہارا کوئی بھی حامی و مددگار نہیں۔۳۱

۲۲۱۔ جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔۴۳

(الزخرف)

۲۲۲۔اور جو شخص اللہ کی نصیحت (یعنی قرآن) سے اندھا بن جاوے تو ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں۔۳۶

۲۲۳۔وہی ذات ہے جو آسمان میں بھی قابل عبادت ہے اور زمین میں بھی قابل عبادت ہے۔۸۴

حٰمٓ -۲۶:(الاحقاف)

۲۲۴۔کتاب (قرآن) حق اور راہ راست کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔۳۰

(محمد)

۲۲۵۔اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں اللہ ان کے اعمال کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔۴

۲۲۶۔اور جو لوگ کافر ہیں وہ عیش کر رہے ہیں اور اس طرح کھاتے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں اور جہنم ان لوگوں کا ٹھکانہ ہے۔۱۲

۲۲۷۔دنیوی زندگی تو محض ایک لہو ولعب ہے۔۳۶

۲۲۸۔ جو شخص بخل کرتا ہے تو وہ خود اپنے سے بخل کرتا ہے اور اللہ تو کسی کا محتاج نہیں اور تم سب محتاج ہو۔۳۸

(الحجرات)

۲۲۹۔گناہوں سے بچو، سراغ رسی مت کرو اور نہ کسی کی غیبت کرے۔۱۲

۲۳۰۔تم سب میں وہی شریف ہے جو پرہیز ہو۔۱۴

(الذاریات)

۲۳۱۔ جو دنیا میں نیکوکار تھے وہ لوگ رات کو بہت کم سوتے تھے اور اخیر شب میں استغفار کیا کرتے تھے۔۲۱

قال فما خطبکم -۲۷:

۲۳۲۔اللہ خود ہی سب کو رزق پہنچانے والا، قوت والا اور نہایت قوت والا ہے۔۵۸

(الطور)

۲۳۳۔آپ کے رب کا عذاب ضرور ہو کر رہے گا کوئی اس کو ٹال نہیں سکتا۔ آسمان تھرتھرانے

لگے گا، پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے۔۱۰

(النجم)

۲۳۴۔کیا انسان کو ان کی ہر تمنا مل جاتی ہے۔خدا کے ہی اختیار میں ہے آخرت اور دنیا۔۲۵

۲۳۵۔تم تکبر کرتے ہو، اللہ کی اطاعت کرو اور (اس کی بلاشرکت) عبادت کرو۔۶۲

(الرحمٰن)

۲۳۶۔تم تولنے میں کمی بیشی نہ کرو اور انصاف (اور حق رسانی) کے ساتھ وزن ٹھیک رکھو اور تول گھٹاؤ مت۔۹

قد سمع الله-۲۸:(المجادلة)

۲۳۷۔نماز کے پابند رہو، زکوٰۃ دیا کرو، رسول کا کہنا مانا کرو۔۱۳

۲۳۸۔اللہ ہی کا گروہ فلاح پانے والا ہے۔۲۲

(التغابن)

۲۳۹۔جو شخص نفسانی حرص سے محفوظ رہا، ایسے ہی لوگ (آخرت میں) فلاح پانے والے ہیں۔۱۸

(الطلاق)

۲۴۰۔جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا وہ اس کے ہر کام میں آسانی کر دے گا۔۴

تبٰرک الذی-۲۹:(الملک)

۲۴۱۔جس نے موت و حیات کو پیدا کیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے۔۲

۲۴۲۔بیشک جو لوگ اپنے پروردگار سے بے دیکھے ڈرتے ہیں ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم مقرر ہے۔۱۲

(القلم)

۲۴۳۔بے شک آپ اخلاق (حسنہ) کے اعلیٰ پیمانہ پر ہیں۔۴

(الحاقة)

۲۴۴۔یہ قرآن (اللہ کا) کا کلام ایک معزز فرشتہ کا لایا ہوا ہے۔یہ کسی شاعر کا کلام نہیں۔۴۱

۲۴۵۔یہ قرآن متقیوں کے لیے نصیحت ہے۔۴۸

(الجن)

۲۴۶۔جو شخص مسلمان ہو گیا انھوں نے تو بھلائی کا راستہ ڈھونڈ لیا اور جو بے راہ ہیں دوزخ کا ایندھن ہیں۔۱۵

۲۴۷۔اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت مت کرو۔۱۸

(المزمل)

۲۴۸۔وہ مشرق اور مغرب کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں۔۹

۲۴۹۔رات اور دن کا پورا اندازہ اللہ ہی کر سکتا ہے۔۲۰

۲۵۰۔تم لوگ جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکو پڑھ لیا کرو۔۲۰

عم-۳۰:(النباء)

۲۵۱۔خدا سے ڈرنے والوں کے لیے بے شک کامیابی ہے۔۳۱

(المطفّفین)

۲۵۲۔بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی۔۱

(الاعلیٰ)

۲۵۳۔بامراد ہوا جو شخص قرآن سن کر (خبائث عقائد و اخلاق سے) پاک ہو گیا اور اپنے رب کا نام لیتا اور نماز پڑھتا رہا۔۱۵

۲۵۴۔اے منکرو!تم آخرت کا سامان نہیں کرتے بلکہ تم دنیوی زندگی کومقدم رکھتے ہو۔۱۶

(التین)

۲۵۵۔جولوگ ایمان لائے اوراچھے کام کئے ان کے لیےاس قدرثواب ہے جوکبھی منقطع نہ ہوگا۔۸

(البینة)

۲۵۶۔یکسوہوکرنماز کی پابندی رکھیں اورزکوٰۃ دیا کریں۔۵

(التکاثر)

۲۵۷۔دنیاوی ساز وسامان پرفخر کرنا(جوکہ علامت ہے محبت وطلب کی)تم کوآخرت سے غافل کیے رکھتا ہے یہاں تک کہ تم قبرستانوں میں پہنچ جاتے ہو۔۳

(الماعون)

۲۵۸۔ایسے نمازیوں کے لیے بڑی خرابی ہے جواپنی نماز کو بھلا بیٹھے ہیں(یعنی ترک کردیتے ہیں)جوایسے ہیں کہ(جب نماز پڑھتے ہیں تو)ریاکاری کرتے ہیں اور زکوٰۃ بالکل نہیں دیتے۔۷

(النصر)

۲۵۹۔اپنے رب کی تسبیح وتحمید کیجیےاوراس سے استغفار کی درخواست کیجئے،وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔۳

(الاخلاص)

۲۶۰۔اللہ ایک ہے،وہ کسی کامحتاج نہیں،اس کے سب محتاج ہیں۔۳

(الناس)

۲۶۱۔میں آدمیوں کے مالک آدمیوں کے بادشاہ آدمیوں کے معبود کی پناہ لیتا ہوں۔۳

اعوذ باللہ اور بسم اللہ

۱۔ قرآن پاک کی تلاوت شروع کرنے سے پہلے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم،بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا جانا چاہئے۔

۲۔ تلاوت کے درمیان اگر دوسری سورت شروع ہوجاتی ہےتو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ لینا چاہئے۔

۳۔ پارہ واعلموا-۱۰میں سورۂ توبہ کے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں پڑھنا مناسب ہے، لیکن بعض عالموں نے کہا ہے کہ توبہ کی تلاوت شروع کی جائے تو اُعوذ باللہ کے ساتھ بسم اللہ پڑھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔

۴۔ تلاوت کے درمیان بولنا پڑ جائے تو جہاں آیت کا دائرہ بنا ہو،ٹھہر کر بات کی جاسکتی ہے۔آیت کے درمیان بات کرنا مناسب نہیں،اگر بات کی گئی ہےتو بعد گفتگوتلاوت کے پہلے اعوذ باللہ پڑھنا چاہئے،بسم اللہ پڑھےتو کوئی حرج نہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلٰى رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنزَلَ مِن قَبْلُ وَمَن يَكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا.(النساء: ۱۳۶)

''اے ایمان والو!اللہ تعالیٰ پر،اس کے رسول(ﷺ)پراوراس کتاب پر جواس نے اپنے رسول(ﷺ)پر اتاری ہےاوران کتابوں پر جواس سے پہلے اس نے نازل فرمائی ہیں،ایمان لاؤ۔جوشخص اللہ تعالیٰ سےاوراس کے فرشتوں سےاوراس کی کتابوں سےاوراس کے رسولوں سےاورقیامت کے دن سے کفر کرے وہ تو بہت بڑی دور کی گمراہی میں جاپڑا۔''

- مجمع الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ للدراسات الاسلامیہ
- ایوان امام الہند شاہ ولی اللہ محدث الدہلویؒ
- جامع الامام محمد قاسم النانوتویؒ
- مرکز التوحیدی الاسلامی للدعوہ والارشاد

چھ ہزار طلباء وطالبات کی تعلیم وتربیت اور قیام وطعام کے لئے جامعہ کے تعمیری وترقیاتی منصوبے اور "القاسم اسلامک یونیورسٹی" کا تخمینی بجٹ تقریبا 1,50,20,93,768.00 ڈیڑھ سو کروڑ روپے سے زائد ہے۔ جو بھی خواہان ملت اسلامیہ صاحب جود وسخا اور باتوفیق اہل خیر کے تعاون سے اللہ رب العزت ہی پورا کرانے والا ہے۔ حق جل مجدہ کا پاک ارشاد ہے:

"جس نے اچھے کام کئے ہوں، ہم کبھی اس کا اجر ضائع نہیں کرتے" (الکہف: ۳۰ ترجمہ: امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ "ترجمان القرآن")

اللہ ہی ہمارا اور آپ کا حامی وناصر ہے۔

Published by:

Jamiatul Qasim Darul Uloom-il-Islamia

At & Po. Madhubani, G.P.O. Partap Ganj, Distt: Supaul - 852125 Bihar (India)
Ph: +91-9811125434, 9931906068, 9931515312
www.jamiatulqasim.com / E-mail: jamiatulqasim@yahoo.com
www.facebook.com/muftimahfoozurrahman.usmani
youtube.com/jamiatulqasim

Delhi Office:

K-79, 2nd Floor, Street No.5, Abul Fazal Enclave-I,
Jamia Nagar, New Delhi-110025 (India)
Ph: +91-11- 26981876, 26982907 Mob: +91-9899766786
Printed at : M.R. Printers, 2818, Gali Garaiya, Darya Ganj, New Delhi-110002